خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ
اگست 2025
قیمت 200 روپے
بانی
معراج رسول
جشن آزادی مبارک
pklibrary.com

سسپنس ڈائجسٹ
CNP MEMBER APNS

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

معاون
اطہر حسین

مارکیٹنگ و
سرکولیشن مینجر
ثمر عباس
0301-2454188

06 انشائیہ — جون ایلیا
صاحبِ دانش و بینش کے لیے پریشانی و بیزاری کا سبب بن جانے والے ایک نام..... ایک جملے کا احوال

08 آپ کے خط — مدیر اعلیٰ
سسپنس کی مجلسِ مشاورت قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پُرخلوص مشورے

12 ظالم مظلوم — زویا صفوان
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

35 اُدھورا سودا — عائشہ نصیر
زرخیز دماغوں اور طاقتور لوگوں کی ذہانت کے درمیان دلچسپ معرکہ آرائی کا احوال

46 رمز شناس — نازیہ کامران کاشف
خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے ایک رمز شناس کی سنسنی خیز داستان

69 بھیدی — جاوید بسام
نادیدہ طاقتوں کو جھٹلانے والی ایک صنفِ نازک کی فریب کاریاں

80 مآل کار — مرزا امجد بیگ
اپنوں کو اپنے گھر سے بے گھر کرنے والے..... اور وکیلوں سے لڑنے والے ننھے مندوں کی مندی عقل کا عجیب قصہ

جلد 54 • شمارہ 08 اگست 2025 • زرِ سالانہ 3000 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 200 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: (021) 35895313 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

pklibrary.com

103

عشاقِ وطن

عیرج بخاری

جشنِ آزادی کے موقع پر محبِ وطن
کے لیے ایک خوبصورت تحفہ

110

محفلِ شعر و سخن

قارئین

آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمنِ رنگ رنگ
آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

113

یوٹرن

آصفہ ضیا احمد

حرص و ہوس کے ہاتھوں جرم کی دلدل
میں اترنے والوں کا لرزہ خیز انجام

132

جنگ باز

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

معاشرتی ناسوروں اور رذیلوں کی خوں ریز سازشوں اور
زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

155

دھوکا

غلام قادر

بھروسے اور اعتماد سے کھیلنے والے چالاک
مجرموں کی بے وقوفی کا عبرت اثر واقعہ

161

انوکھا فراڈ

عاطر شاہین

روپ بدلتے چہروں اور محبت کی یقین دہانی
کے جھانسے میں آنے والے لوگوں کا قصہ

165

ماضی کا بھوت

صائمہ دانش

ماضی کے دن مجسم سامنے دیکھ کر حیران رہ
جانے والے ایک گمشدہ مسافر کا قصہ

175

قابیل اور ہابیل

ضیا تسنیم بلگرامی

دنیا کو چلانے والے بہترین و
راہنما اصولوں پر مشتمل ایک پُرفکر تحریر

183

امانت دار

محمد عثمان ذوالفقار

وحشت اور رنج والم میں اپنے مقصد کو انجام تک
پہنچانے والے ایک عظیم انسان کا کارنامہ

196

گمنام منزلیں

طاہر جاوید مغل

گمنام منزلوں کے مسافر کی قدم قدم
پُرآزمائشوں سے بھری درد بھری داستان

pklibrary.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول ٭ مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس سین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن ٭ مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

پیو یار تنگ نہ کر

یہ 1959ء کے آخر یا 1960ء کے شروع کی بات ہے کہ میں نے انجمن ترقی اُردو کی آخری منزل پر چائے نوشی کے دوران قبلہ مولوی عبدالحق مرحوم سے پوچھا کہ حضرت صاحب! آپ مجھے عزتِ مآب پپو کے بارے میں کچھ بتایئے۔ میں آں جناب کا نام رکشوں اور بسوں کی پشت پر لکھا ہوا دیکھ کر اپنی نگاہ اور اپنی جان سے بیزار ہو چکا ہوں۔ جس رکشے اور بس کو دیکھیے، اس کی پشت پر ایک ہی جملہ لکھا ہوا ملتا ہے۔

''پپو یار! تنگ نہ کر''

مجھے یہ نام یا یہ لفظ اردو کے کسی بھی لغت میں نہیں ملا حالانکہ مجھے اُردو کے لغت حفظ ہیں۔

مولوی صاحب نے فرمایا کہ بعض فقرے یا شعر اپنی ساخت اور ہلکے پھلکے ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کو بہت اچھے لگتے ہیں اس لیے رکشوں اور بسوں والے انہیں اپنے رکشوں اور بسوں کی پشت پر لکھوا دیتے ہیں جیسے

چلا جا مسکراتا جھومتا موجِ حوادث پر
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

یا ''پھر ملیں گے اگر خدا لایا'' یا

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گلِ گلزار ہوتا ہے

مگر مولوی صاحب کے اس جواب سے میری تشفی نہیں ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں مولوی صاحب سے رخصت ہوا اور سب سے نچلی منزل کے کمرے میں خواجہ خواجگان چشت، متولی بہشت عزیزم مشفق خواجہ کے پاس جا بیٹھا جو رضا کارانہ طور پر مولوی صاحب کے نام آنے والے خط مولوی صاحب تک پہنچاتے اور ان کا جواب لکھواتے تھے۔

برادر عزیز مشفق خواجہ نے کراچی یونیورسٹی میں سب سے پہلی بار میرے لیے ایک مشاعرہ برپا کیا تھا۔ وہ مشاعرہ میری کراچی کی مشاعرانہ زندگی کا سب سے اہم مشاعرہ تھا کہ وہ کراچی میں میرا پہلا مشاعرہ اور حضرت قمر جمیل کا آخری مشاعرہ تھا۔ اللھم اغفرلہ۔ یہ 1957ء عیسوی کی بات ہے۔

مشفق خواجہ میرے بھانجے شمن (پروفیسر ممتاز سعید) اور میرے بھائی سید محمد تقی کے سالے نقی اختر کے، جو اب شکاگو میں طبیعیات کے پروفیسر ہیں، یارِ غار تھے۔ اس رشتے سے مجھے مشفق خواجہ کے بڑے بھائی کی حیثیت حاصل تھی۔ نقی اختر اور ممتاز سعید دونوں اصطلاح سازی میں مولوی صاحب کی معاونت کرتے تھے۔ مشفق خواجہ، ممتاز سعید اور نقی اختر، یہ تینوں بلا کے ذہین تھے۔ یہ ایک تثلیث تھی۔ آپ ''اقانیم ثلاثہ'' کہہ لیجیے۔ ان میں کا ایک ''اقنوم'' یعنی مشفق خواجہ عجب چیز تھا۔ وہ نوجوان نسل کا آشوبِ کار بلکہ فتنۂ روزگار واقع ہوا تھا۔

برادرِ عزیز ولذیذ مشفق خواجہ بہت سرگرم اور فطین نوجوان تھا اور اس پر اس کی شرارت مستزاد۔ بہرحال میں نے مشفق سے کہا۔ ''خواجہ! یہ پپو کون ہے؟''

''یعنی؟''

''یعنی'' یہ کہ ''پپو یار تنگ نہ کر۔''

''اچھا! مگر یہ بات تو قاضی عبدالودود ہی بتا سکتے ہیں۔''

''مگر وہ تو ہندوستان میں ہیں اور وہ بھی بہار میں۔'' میں نے بہت ہی بے دلی کے انداز میں کہا۔

غرض میں پپو کی..... جس کی اہمیت روز بروز، ماہ بہ ماہ اور سال بہ سال بڑھتی ہی رہی، معرفت حاصل کرنے میں مسلسل غلطاں و پیچاں رہا۔

''پپو یار! تنگ نہ کر'' پاکستان کے عوام کا یہ عاجزانہ احتجاج، نواب زادہ لیاقت علی خان کے قتل سے لے کر آج تک جاری ہے۔ جو بھی حکومت آئی وہ ''پپو'' کی صوابدید پر آئی۔ جس حکومت کا بھی تختہ الٹا وہ ''پپو'' کی صوابدید پر الٹا۔ پاکستان ٹوٹا اور مشرقی پاکستان نے بنگلا دیش کی حیثیت اختیار کی تو یہ بھی ''پپو'' ہی کی صوابدید پر ہوا۔

ملک کے جس حصے میں بھی بم کے دھماکے ہوئے اور ہوتے رہے اور ہو رہے ہیں یا کوئی نسلی، انسانی اور مذہبی خوں ریزی ہوئی اور ہو رہی ہے، وہ بھی ''پپو'' ہی کے اشارے پر۔

''پپو یار! تنگ نہ کر''

بہت دنوں کی بات ہے، میں حلقۂ فکر جدید کے احباب کے درمیان بیٹھا ہوا اردو ادیبوں اور معلّموں کی زبان کی غلطیاں گنوا رہا تھا۔ صابر ظفر، اردو کا بہت ٹیڑھا، نکیلا اور انحراف پسند شاعر، میرے موقف کی حرف بہ حرف تائید کر رہا تھا۔ میں گفتگو میں غرق تھا کہ اچانک مجھے ''پپو'' کا خیال آیا۔ میں نے معروف ادیب اور افسانہ نگار ''علی چندر'' یعنی علی حیدر ملک سے پوچھا۔ ''علی چندر! تم اردو کے پروفیسر ہو اور وہ بھی اردو کے کلیسا یعنی اردو کالج میں۔ جانم جانی! ذرا یہ تو بتاؤ کہ یہ ''پپو'' کیا چیز ہے؟ آخر اس کے کیا معنی ہیں یا یہ کہ یہ کون ہے؟''

علی چندر بولے۔ ''جون بھائی! آپ تو نو برس تک ترقی اردو بورڈ سے متعلق رہ کر اردو کے سب سے بڑے لغت کی تدوین میں مصروف رہے ہیں اور ''پپو'' کے معنی مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''بھائی میاں! یہ مسئلہ لغت کی سطح سے بہت بلند ہے۔''

اس کے بعد کسی شام کا ذکر ہے کہ میں نے اپنے نفس کو مطمئن کرنے کے لیے برادر عزیز معراج رسول سے پوچھا کہ جانم! یہ ''پپو'' آخر کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ''پپو'' جنوبی ایشیا کی ایک مافیا ہے۔ میں نے سنا اور پھر میں غش کھا گیا۔

بہر حال میں تمام تر مایوسی کے باوجود ''پپو'' کے پیچھے لگا رہا۔ میں نے سندھ اور پنجاب کے ''سیاسی حقہ کشوں'' اور محققوں سے بھی ''پپو'' کے سلسلے میں استفادہ کیا۔ اس استفادے کا حاصل یہ ہے کہ ''پپو'' فقط ایک شخص ہی نہیں بلکہ عجیب و غریب شے بھی ہے۔ یہی نہیں بلکہ شاید ہے یوں کہ وہ ''اسم واحد'' نہیں بلکہ ''اسم جمع'' ہو یعنی وہ ایک گروہ اور ایک طبقے کی حیثیت رکھتا ہو۔

مجھے لائل پور (فیصل آباد) میں ایک صفِ اول کے صحافی نے بتایا کہ ''پپو'' کوئی شے یا شخص نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایجنسی ہے۔

میں یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ ''ایجنسی..... کیا مطلب؟''

موصوف نے کہا کہ مطلب کچھ نہیں، بس خاموش رہیے اور میں آپ سے ازراہِ احتیاط یہ بھی عرض کر دوں کہ اس کا تعلق کہیں سے بھی ہو سکتا ہے۔

سیالکوٹ میں تاریخ سیاست کے ایک عالم اور سیاسیات کے ایک مفکر نے کہا کہ برِصغیر کی سیاست میں خاص طور پر انیسویں صدی سے بلکہ اٹھارویں صدی سے ہمیشہ ایک ''پپو'' سیاہ و سفید کا مالک رہا ہے۔

میں بے حد سوچ بچار کے بعد اس نتیجے تک پہنچا ہوں کہ ''پپو'' کا سدِباب کوئی حکمراں، کوئی ''برتر طبقہ'' اور کوئی سیاست داں نہیں کر سکتا۔ اس کا سدباب صرف عوام کی حکمت اور قوت ہی کر سکتی ہے۔ اگر عوام نے اس باب میں اپنی فیصلہ کن حیثیت کا ادراک حاصل کر لیا تو پھر ہمیں کبھی یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی کہ ''پپو یار! تنگ نہ کر!''

pklibrary.com

قارئین کرام.....السلام علیکم!

اگست 2025ء کا شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔ یوں تو اگست کا مہینا تمام پاکستانیوں کے لیے بہت اہم ہے کیونکہ اس ماہ اللہ رب العزت نے ہمیں ایک آزاد اسلامی ریاست سے نوازا اور اس سال اتفاقاً اسلامی سال کا پہلا بابرکت مہینہ محرم الحرام بھی شروع ہوا۔ اس ماہ کو محرم الحرام اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں جنگ و قتال حرام ہے۔ لفظ محرم، حرم سے ماخوذ ہے جس کے معنی عزت و احترام کے ہیں۔ اس ماہِ مقدس کا دسواں دن یوم عاشورہ کہلاتا ہے۔ اس دن 61 ہجری میں نواسۂ رسول ﷺ جگر گوشہ بتول سیدنا حضرت امام حسینؓ اور ان کے گھرانے کی کربلا کے تپتے صحرا میں شہادت ہوئی۔ خاندانِ رسولؐ نے اپنی مقدس جانوں کا نذرانہ دے کر سجدہ اور دینِ اسلام کو بچایا۔ محبوبِ خدا کے پیارے اہلِ بیت اطہار نے بے انتہا ظلم برداشت کیے، تیر کھائے مگر ہر قدم پر صبر و استقلال کی عظیم اور جلیل القدر مثال نظر آئے۔ امام حسینؓ اور آپ کا گھرانا رہتی دنیا تک حق و شجاعت کی زندہ مثال رہے گا۔ سال کے آخری مہینے ذی الحج میں دنیا بھر کے مسلمان فریضۂ حج ادا کر کے دسویں تاریخ کو اپنے اللہ کے حضور قربانی پیش کرتے ہیں۔ گویا ہم مسلمانوں کا آغاز بھی قربانی اور انتہا بھی قربانی ہے۔ امتِ مسلمہ کو چاہیے کہ اس عظیم قربانی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اسلام کی سربلندی، حق و سچ اور ظالموں کے خلاف ڈٹ جانے کو اپنی زندگی کا شعار بنائیں اور وقت پڑنے پر کسی بھی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ اسی طرح اگست کا مہینا بھی ہمارے لہو کو گرماتا ہے۔ جس میں ہمارے اسلاف نے اس پاک سرزمین کے حصول کے لیے اپنی جانوں، یہاں تک کہ عزت و آبرو تک قربان کر دیں۔ خاندان کے خاندان شہید ہوئے۔ لاکھوں قربانیوں کے بعد یہ ارضِ پاک ہمیں عطا ہوئی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے ذاتی مفاد اور ذاتی عناد کو ایک طرف رکھ کر اس ملک کی ترقی کے لیے اہم کردار ادا کریں۔ اس کے لیے جذبۂ ایمانی کی ضرورت ہے جسے ہر پاکستانی کو اپنے اندر جگانا ہوگا۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اس پاک سرزمین کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے، آمین۔ تمام اہالیانِ وطن کو جشنِ آزادی بہت بہت مبارک ہو۔ چلتے ہیں محفلِ خطوط میں جہاں ہمارے کرم فرماؤں کے سندیسے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔

✠ دانیال حسن چغتائی کا طویل تبصرہ، کہروڑ پکا ضلع لودھراں سے۔ ''امید کرتا ہوں کہ سسپنس ڈائجسٹ کے تمام قارئین اور انتظامیہ خیریت سے ہوگی۔ جولائی کے سرورق پر براجمان خاتون کسی گہری سوچ میں مگن نظر آئیں۔ انہیں میرا مشورہ ہے کہ آج کل کے دور میں اتنا نہیں سوچنا چاہیے۔ پہلے ہی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ ''انشائیہ'' میں جون ایلیا نے بالکل درست کہا کہ ہمیں روزمرہ کی ضروریات میں اتنا الجھا دیا گیا ہے کہ ہمیں اب کسی اور چیز کا ہوش ہی نہیں رہا اور ہم اسی میں ہی زندگی تمام کیے جا رہے ہیں۔ خطوط کی محفل میں کراچی سے روبینہ اشعر، لیہ سے سید محی الدین اشفاق، بھل سے روبینہ شاہین اور سمیرا ارشد فاروقی کے خطوط بہت زبردست رہے۔ ''محبت خواب سفر'' میں زویا صفوان ایک بار پھر ماضی کے بااختیار انسانوں کے واقعات کے ساتھ نظر آئیں۔ زمین اور اقتدار کے لیے جنگ ہر دور میں جاری رہی ہے۔ آج کے عہد میں بھی ہم یہی دیکھ رہے ہیں لیکن یہ زمین، یہ اختیار سب کچھ عارضی ہوتا ہے۔ انسان اسی کے لیے لڑتے مرتے ہیں اور اپنی زندگیاں بھی اسی میں تباہ کر جاتے ہیں۔ اگلی کہانی ''دور اندیش'' محترم طاہر جاوید مغل صاحب کی رہی۔ محبت کی کہانی بھی بڑی عجیب ہوتی ہے، نہ ملے تو حسرت بن کر رہ جاتی ہے اور کچھ جب مل جاتے ہیں تو پھر زمانہ ان کے خلاف ہو جاتا ہے۔ موت قدم قدم پر ان کے تعاقب میں ہوتی ہے لیکن فریحہ اور بہروز اس طرح خوش قسمت رہے کہ قسمت کی دیوی ان پر مہربان رہی اور اس نظام کو شکست ہو گئی جو نفرتوں کو ہی جنم دیتا ہے۔ نازیہ کامران کا شف کا ''رمز شناس'' پورے جوبن کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ چونکہ یہ سب ماضی کے واقعات ہیں اس لیے پچھلی قسط کے ساتھ ربط ذہن میں رکھنا پڑتا ہے لیکن مصر، مغرب اور ہندوستان کے ساتھ جڑے اس کہانی کے تمام تر واقعات بہت حیرت انگیز ہیں۔ عمیق بخاری ایک نئی کہانی ''ڈراما'' جو مغربی طرزِ زندگی کی کہانی رہی، کے ساتھ نظر آئیں۔ یہ کہانی بھی محبت، لالچ اور خاندانی تعلقات میں درپیش آنے والے مسائل پر لکھی کہانی رہی لیکن یہاں کچھ جگہوں پر ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ جلدی کر گئیں یا یہ طویل کہانی کی تلخیص تھی۔ ترجمے میں بھی کئی جگہ پر جھول نظر آیا جو عموماً ان کی کہانی میں نہیں ہوتا۔ جرم و سزا کی دنیا میں ''مقدمہ'' کے ساتھ ملک صفدر حیات ایک اور جرم کی داستان لے کر حاضر تھے۔ جرم کے یہ واقعات اچانک سے وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ کسی کو کچھ سوچنے کا موقع نہیں ملتا اور بعض اوقات ہم کچھ ایسے لوگوں پر بھی اعتماد کر جاتے ہیں کہ وہی پھر ہمارے لیے بعد میں مسائل کا سبب بن جاتے ہیں۔ ''وجدان'' دو مختلف انتہا کے لوگوں کی کہانی

کہ جس میں رانیہ اپنی زندگی کے گھٹن زدہ حالات سے نکلنے کے لیے اپنے باس کی طرف ملتفت ہوگئی تھی اور پھر باس کی زندگی میں متاثر ہونا شروع ہوئی لیکن وہ جہاندیدہ شخص ہونے کی وجہ سے بہت جلد واپس آگیا اور اسے بھی ایک اچھا ہمسفر نظر آگیا تھا۔ محفل شعر و سخن میں تمام اشعار کا انتخاب بہت عمدہ رہا۔ ''پس پردہ'' مغربی طرز کی تحریر جسے عائشہ نصیر نے اردو کا قالب پہنایا اور اس میں مجرم نے قانون کی نظر میں یوں دھول جھونکنے کی کوشش کی کہ خود کو معاشرے کا ایک مفید شہری بنا کر استعمال کیا۔ اس میں اپنے دوستوں کو بھی استعمال کیا اور مذہب کو بھی استعمال کیا۔ قانون کے رکھوالوں کے درمیان رہ کر وہ شاید خود کو محفوظ تصور کر رہا تھا لیکن ہر مجرم نفسیاتی طور پر کہیں نہ کہیں کمزور ہوتا ہے اور یہی چیز اس کے جرم میں بھی اسے قانون کے شکنجے میں لانے میں معاون ثابت ہوئی۔ ''جنگ باز'' ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر بہت عمدگی کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی سازشوں اور ان کے مقابل قانون کے رکھوالوں کی یہ کہانی بہت دلچسپی کا عنصر لیے ہوئے ہے۔ ''نرم گوشہ'' کراچی سے ابن آس کی تحریر اور دل کے بارے میں شاید ٹھیک کہا گیا ہے کہ یہ اگر اچھا ہونے پر آئے تو پورا جسم اچھا ہو جاتا ہے اور اس کی بُرائی پورے جسم کو بُرا بنا دیتی ہے۔ مدیحہ اور داور کی کہانی بہت عمدگی کے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ پھر دل تو دل ہے۔ کبھی بھی کسی پر آجاتا ہے اور جب یہ معاملہ داور کے ساتھ درپیش آیا تو اس نے بڑی صفائی کے ساتھ آگے بڑھنے کے لیے مدیحہ کو راستے سے ہٹا دیا۔ بہت دلسوز اختتام رہا۔ وہم و گمان عمران قریشی کی تحریر جس میں دو پریمی لوگوں کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ جب کوئی چیز آسانی سے مل جاتی ہے تو اس کی قدر بھی اس طرح نہیں ہوتی جیسے ان دونوں کا آپس میں معاملہ رہا۔ جسپر اور اینی دونوں ہی ایک دوسرے کے جذبات کو نہیں سمجھ سکے۔ بالکل آخری لمحات میں دونوں کو جب اپنی غلطی کا احساس ہوا تو تب کفِ افسوس ملنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اللہ کے پیغمبر حضرت طالوت علیہ السلام کی داستانِ حیات کا دوسرا اور آخری حصہ بہت ایمان افروز رہا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کا تاریخ کے اوراق سے چناؤ بہت قیمتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ غربت سے بادشاہت تک کا یہ سفر بہت سحر انگیز رہا اور پھر نسلوں تک چلا۔ ''نورمحل'' مہوش اسد شیخ کی تحریر۔ عام طور پر یہ ان کا طرزِ تحریر نہیں ہے کیونکہ وہ سماجی اور رومانی معاملات پر بہت عمدگی کے ساتھ قلم چلاتی ہیں لیکن پہلی بار مادرائی طرز کی ان کے قلم سے تحریر پڑھی اور انہوں نے اپنے موضوع سے خوب انصاف کیا۔ ماضی کے ایک ناکردہ جرم سے جڑی ہوئی داستان لمحہ بہ لمحہ تحیر انگیز رہی۔ جس طرح کے واقعات میرب اور ہشام کو پیش آئے، اگر کوئی بھی اور ہوتا تو شاید جان چھڑا کر بھاگ جاتا لیکن انہوں نے بہت ہمت اور حوصلے کا مظاہرہ کیا اور ساتھ ہی آخری لمحات میں نور کو بھی انصاف مل گیا اور یوں یہ ویران پڑا مکان بھی آباد ہوگیا۔ مکان تو ان کو بہت سستا ملا لیکن نورمحل کا نام بھی مل گیا۔ اسما قادری ڈائجسٹ لی دنیا کی تحریروں کا بہت بڑا نام اور ان کا ''شیش محل'' کون بھول سکتا ہے، ایک اور خوبصورت تحریر ''الوداع'' لیے سسپنس ڈائجسٹ کے گولڈن صفحات پر نظر آئیں۔ محبت مل جائے تو زندگی گلزار ہو جاتی ہے اور نہ ملے تو ساری زندگی فسوں میں گزر جاتی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ دولت کو بھی شاید اسی لیے فتنہ کہا گیا ہے کہ یہ رشتوں کے تمام تر آداب بھلا دیتی ہے۔ یہاں بھی ایک ماں، اس کی بیٹی اور اس کے رشتے داروں کے مسائل کو جوڑ کر بہترین کہانی تخلیق کی گئی اور پھر ماں نے بھی بیٹی کے خلاف ظلم پر خاموش ہو کر بیٹھنا گوارا نہیں کیا۔ اپنی بیٹی کے انصاف کے لیے ہر آخری حد تک گئی اور بیٹی کو انصاف دلا کر ہی رہی۔ ہر خاتون کو ایسے ہی مضبوط کردار کا ہونا چاہیے۔ لیجیے جی تبصرہ مکمل ہوا۔ زندگی باقی ملاقات باقی۔ سانسوں نے مہلت دی تو ان شاء اللہ اگلے ماہ پھر سسپنس کی اسی محفل میں ملاقات ہوگی۔''

✠ احمد فراز صافی نامعلوم جگہ سے خط ارسال کر رہے ہیں۔ ''خط کی اصل خوبصورتی کاغذ کے لمس، قلم کی عظمت اور روشنائی کی مہک سے ہے۔ اسی لیے اسے نصف ملاقات کا درجہ حاصل ہے لیکن وائے حسرت کہ آج کل اس کی قدر نہیں۔ ہم اپنے جذبات و احساسات کو قرطاس پر بکھیر کر جن کے حوالے کرتے ہیں، وہ اس کی وقعت سے بے خبر بڑی بے رحمی سے اسے اپنی بے پروائی کی آگ میں جھونک دیتے ہیں۔ مجبوراً ہمیں ''ڈاک کے نظام'' سے آنکھیں چرا کر بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ''ڈاک کے ڈاکوؤں'' سے کنی کترا کر دیگر جدید و سریع ذرائع مواصلت سے کام چلانا پڑتا ہے۔ سوئے اتفاق کہ میں کچھ عرصے سے ایسے کسی ''متبادل'' سے بھی محروم ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ احبابِ محفل کی محبتوں اور عنایتوں پر بروقت لبیک نہ کہہ سکا لیکن یہ ناقدری مجھے اندر ہی اندر کچوکے لگاتی رہی۔ لہٰذا ہمت کر کے لکھنے بیٹھا ہوں۔ اب جو بھی ''دال دلیا'' ہوگا اسے اپنے ''بٹنوں والے نوکیا'' موبائل پر ایک ایک بٹن کو دو دو، تین تین مرتبہ اور بعض کو چھ چھ، سات سات دفعہ دبا دبا کر ٹائپ کر کے سسپنس کے ''جیتے جیتے'' جنید علی کو بھیجوں گا اور وہ آگے ادارے کو ارسال کر دیں گے۔ جون کی خون چوس گرمی میں جب دماغ ''پولا'' ہو کر غش غش کر رہا تھا تو ایسے میں جولائی کا خوش رنگ شمارہ دیکھ کر دل اش اش کر اٹھا۔ سرورق خاتون کی شکل میرے ایک دوست ''زین

العابدین'' سے ملتی ہے۔ اس لیے میں اسے ''زین العابدات'' کا نام دوں گا۔ جون ایلیا کے بیانیے نے شعور، بصیرت اور ذخیرۂ الفاظ میں گراں قدر اضافہ کیا۔ اداریے میں معاشی عدم توازن اور سیاسی ناہمواری کو بڑے اندیشناک طریقے سے کسی ''شیش ناگ'' کی طرح متعارف کرایا گیا۔ محفل میں نشستِ اول پر ''کراچی مارکہ'' روبی (بہن روبینہ اشعر) کا تبصرہ حسبِ حال اور جامع تھا۔ بہت عمدہ لگا۔ دانیال بھائی کا غائر نظری سے کیا گیا تجزیہ بھی زبردست تھا۔ سید محی الدین اشفاق نے قومی مؤقف کی کیا خوب ترجمانی کی، ساتھ ہی دعاؤں اور ترغیب کا سلسلہ بھی چلایا۔ ''تھل مارکہ'' روبی (بہن روبینہ شاہین) نے بھی بڑے اختصار اور موقعے کی مناسبت سے عمدہ افکار پیش کیے۔ آفرین ہے آپ کو کہ تھل کی بھنی ہوئی سوجی جیسی ریت کی حدت اور تپش کے باوجود آپ کا ذوقِ مطالعہ اور شوقِ تحریر سلامت ہے۔ سوجی سے اگر کسی کو حلوا یاد آجائے تو میرے دروازے کھلے ہیں۔ شوق سے چلے آیئے یا پھر جنید بھائی سے بھی رابطہ کرسکتے ہیں جو ایسے پکوان ''کھلانے'' میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ سیتا آپا کی موسمی پیشگوئی پڑھ کر دانتوں اور آنتوں پسینے آگئے۔ ساتھ ہی ان کی ہم شہر بہن سمیرا ارشد فاروقی کا پہلا اور والہانہ تبصرہ ''سسپنس'' کے ساتھ ان کی دیرینہ محبت کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ خوش آمدید۔ بھائی ملک وحید! میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ آپ کے مختصر مگر جامع خطوط کو ہدفِ تنقید بنایا۔ حالانکہ آپ تو مبارکباد کے مستحق ہیں کہ بلاناغہ شرکت کرتے ہیں۔ یہ سراسر میری کم ظرفی اور کوتاہ نگاہی تھی کہ مجھے آپ کے تبصرے میں ''کنوئیں کا مینڈکانہ پن'' تو نظر آگیا لیکن آپ کی مستقل مزاجی احاطۂ شعور میں نہ آسکی۔ ایک بار پھر معذرت اور سلامِ محبت! مغل صاحب کی کہانی میں فریحہ کی دوراندیشی نے نہ صرف اس کی محبت کا انجام بخیر کیا بلکہ یہ بھی ثابت کیا کہ ماضی کی غلطیوں کو سدھار کر وقت سے دوستی ممکن ہے۔ اسما قادری کا نام بڑے عرصے بعد دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ انہوں نے معاشرے کے جزو لاینفک (عورت) کے حقوق اور تحفظات کی طرف توجہ دلائی۔ قوم کا مستقبل بچے جبکہ حال عورت ہوتی ہے جو ماضی کی طرح آج بھی ''بے حال'' ہے۔ ''جنگ باز'' میں ایک طرف راحیلہ ''مغل'' ہوگئی ہے اور دوسری طرف کوئی تنظیم سہراب کی تلاش میں ہے۔ شاید یہ یوموبرگا کی ''تلاشِ نو'' کا چکر ہو۔ خیر، دیکھتے ہیں کون سی بساری نکلتی ہے اور کس طرح کا سانپ نکلتا ہے۔ ''رمز شناس'' میں توقع تھی کہ المیر اکا جھکاؤ عیاد کی طرف ہوگا لیکن فی الحال یہ جذبہ حلیمہ کے حصے میں آگیا ہے۔ اب نہ جانے قسمت اور ''قلم'' کو کیا منظور ہوتا ہے بیچ اس مسئلے کے۔ دوسری طرف راج گڑھ کے واقعات بلکہ سانحات میں گمبھیرتا اور تیزی آرہی ہے۔ اس حصے کے مرکزی کردار کا انتظار بڑھتا جارہا ہے۔ مہوش اسد کی ''نورمحل'' شاندار تھی۔ ایسی مشرقی طرز کی خوفناک کہانی ہر ماہ ہونی چاہیے۔ عیوق بخاری کا انتخاب ''ڈراما'' بھلے مانسوں کے لیے مجرب نسخہ ہے کیونکہ شرافت ہر ایک کو راس نہیں اور گیدڑ سنگھی سب کے پاس نہیں..... پھر اس کا علاج کیسا ہونا چاہیے۔ ابنِ آس کی کہانی میں ''نرم گوشہ'' کی تکرار بہ الفاظِ دیگر ''گردان'' نے بھیجا چاٹ کر رکھ دیا جو سنجیدہ بلکہ سفاک موضوع کے ساتھ کچھ جچا نہیں۔ مزاحیہ کہانی ہوتی تو الگ بات تھی۔ زویا صفوان نے ''عرب'' (محمود درویش) کو صفحۂ اول پر سب سے اوپر بڑی خوبصورتی سے درج کیا جس نے قومی مفاد کی خاطر اپنی محبت کی قربانی تو دے ڈالی لیکن ریٹا (تمر) کو نہ تو یکے بعد دیگرے دو شادیوں کے باوجود بھلا پایا اور نہ سگریٹ اور بوتل ہی اس کا غم غلط کرسکی۔ آجا کے بس شاعری میں ہی پناہ ملی۔ ''مقدمہ'' اپنی نوعیت کا انوکھا اور منفرد واقعہ تھا۔ رذیل زمانہ جبر و کا موقع پر ہی حساب بے باق ہوگیا جبکہ چودھری کا تو اب اللہ ہی مالک ہے۔''

✠ روبینہ اشعر کی کراچی سے آمد۔ ''جون کے آخری ہفتے کی جھلسا دینے والی گرمی اور تپتی دوپہر میں جولائی کے شمارے کی آمد بہار کے مانند لگی۔ کسی گاؤں کے پس منظر میں سجایا گیا ٹائٹل پسند آیا۔ فہرست پر سرسری نگاہ دوڑاتے ہوئے جون ایلیا کے انشائیے ''بے دولتی'' سے مستفید ہوئے جس میں انہوں نے اپنے ملک کے ہنرمندوں کی بے قدری کے بارے میں پُرمغز باتیں کیں۔ انہوں نے درست فرمایا کہ اس ملک کے حاکموں اور ان کے حریفوں نے یہاں کی جوہردار ذہانتوں کو دوسری قوموں کا گداگر بنا دیا ہے۔ یہ ہنرمند افراد ملکوں ملکوں جا کر محنت کرتے ہیں اور اپنی محنت کا پیسہ اپنے ملک میں بھیج دیتے ہیں مگر یہاں ان کی قدر نہیں۔ خطوط کی محفل میں مدیرہ صاحبہ ملکی حالات اور معاشرے کے بگاڑ پر سیر حاصل گفتگو کرتی نظر آئیں۔ خود کو کرسیِ صدارت پر موجود پا کر جون کی تپش میں بھی ٹھنڈی پھوار کا احساس ہوا۔ دانیال حسن چغتائی اپنے مخصوص انداز میں دلچسپ تبصرہ کرتے ہوئے حاضر رہے، تبصرہ پسند آیا۔ سید محی الدین اشفاق کا تبصرہ بھی جاندار رہا، ان کی ہر دعا پر آمین کہتے ہیں۔ ہمارا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ سیدہ روبینہ شاہین محفل میں شامل ہو کر رونق بڑھاتی نظر آئیں، تبصرہ بھی اچھا رہا۔ سیتا شاہ کی حاضری اچھی رہی۔ سمیرا ارشد فاروقی کو محفل میں خوش آمدید۔ تبصرہ جاندار رہا۔ امید ہے یہ حاضری مستقل رہے گی۔ ملک وحید صاحب نے مختصر تبصرے کے ساتھ اپنی حاضری یقینی بنائے رکھی۔ ان کے لیے بس یہی کہیں گے کہ..... وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں..... کہانیوں میں سب سے پہلے اپنی پسندیدہ کہانی

pklibrary.com

نازیہ کامران کاشف کی ''رمز شناس'' کی پانچویں قسط پڑھی۔ کہانی بہت ہی دلچسپ اور سنسنی خیز واقعات کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ سارے کردار واضح ہو گئے ہیں۔ مصر، اسکاٹ لینڈ، ہندوستان تک پھیلی ہوئی اس داستان نے قاری کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے اور پھر آگے کے واقعات پڑھنے کے لیے اگلے ماہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ ابتدائی صفحات پر زویا صفوان کی تحریر ''محبت، خواب سفر'' میں مقدس سرزمین فلسطین کے جلاوطن افراد کی مشکلات، درد، کرب قربانیوں کے بارے میں پڑھ کر دل اداس ہو گیا۔ فلسطینیوں کی اپنے وطن سے محبت نے انہیں آزمائشوں میں مبتلا رکھا اور یہ سفر آج بھی جاری ہے۔ طاہر جاوید مغل کی ''دور اندیش'' اچھی رہی۔ فریحہ نے اپنے باپ اور بھائی کی رائفلوں کی گولیاں بدل دیں اور پھر وہ اور بہروز فائرنگ سے بچ گئے۔ عمیق بخاری کی ''ڈراما'' دلچسپ تحریر رہی۔ کلارا کی ہوشیاری نے اسے یتیم کی چالبازی سے بچالیا اور وہ اپنے زیورات اور دولت محفوظ رکھنے میں کامیاب رہی۔ جرم و سزا کے گرد گھومتی ملک صفدر حیات کی ''مقدمہ'' دلچسپ تحریر رہی۔ چودھری یاور حیات نے اپنا کھاتا کھا کر دکھایا اور اپنے بیٹے کے قاتل جیرو کو اپنے ہاتھوں انجام تک پہنچا دیا۔ اے آر راجپوت کی کہانی ''وجدان'' متاثر کن تحریر تھی۔ عائشہ نصیر کی کاوش ''پسِ پردہ'' پسند آئی۔ ابنِ آس کی تحریر ''نرم گوشہ'' زبردست رہی۔ عمران قریشی کی کہانی ''وہم و گمان'' نے متاثر کیا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی ''حضرت طالوتؑ'' کا دوسرا اور آخری حصہ بھی شاندار رہا جس میں حضرت طالوتؑ کے بارے میں کافی کچھ پڑھنے کو ملا۔ مہوش اسد شیخ کی کاوش ''نورمحل'' شاندار تحریر تھی۔ آخری صفحات پر اسما قادری کے قلم سے تحریر کردہ ''الوداع'' زبردست رہی۔ اسما قادری کافی عرصے بعد جلوہ گر ہوئیں اور چھا گئیں، ویلڈن۔ محفل شعر و سخن میں اشعار کا انتخاب خوب رہا۔ کترنوں کے علاوہ کارٹونز کا اضافہ اچھا لگا۔''

✠ ملک وحید کا مختصر نامہ، کراچی سے۔ ''ماہِ جولائی کا شمارہ جون کے آخر میں مل گیا۔ ٹائٹل اچھا لگا۔ فہرست کو دیکھتے ہوئے جون ایلیا کے مرغزا شایئے''۔ بردولتی'' سے مستفید ہوئے۔ خطوط کی محفل میں مدیرہ صاحبہ کا اداریہ شاندار رہا۔ روبینہ اشعر کو کرسیِ صدارت کی مبارک باد۔ اچھا تبصرہ کیا۔ دیگر احباب میں دانیال حسن چغتائی، سید محی الدین اشفاق، سیدہ روبینہ شاہین، سیتا شاہ کی حاضری خوب رہی۔ محفل میں سمیرا ارشد فاروقی کو خوش آمدید۔ پہلا تبصرہ ہی شاندار رہا۔ کہانیوں میں نازیہ کامران کاشف کی ''رمز شناس'' کی پانچویں قسط بھی لاجواب رہی۔ زویا صفوان کی کہانی ''محبت، خواب سفر'' میں فلسطین کے جبری بے دخل کیے گئے افراد کی مشکلات و مصائب کے بارے میں پڑھ کر افسوس ہوا۔ طاہر جاوید مغل کی ''دور اندیش'' متاثر کن تحریر تھی۔ عمیق بخاری کی ''ڈراما'' اچھی لگی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ''جنگ باز'' دلچسپ موڑ میں داخل ہو گئی ہے۔ ملک صفدر حیات کی ''مقدمہ'' ہمیشہ کی طرح اچھی لگی۔ اے آر راجپوت کی کہانی ''وجدان'' پسند آئی۔ عائشہ نصیر کی کاوش ''پسِ پردہ'' نے بھی متاثر کیا۔ ابنِ آس کی تحریر ''نرم گوشہ'' اچھی رہی۔ عمران قریشی کی تحریر ''وہم و گمان'' پسند آئی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی ''حضرت طالوتؑ'' کا دوسرا اور آخری حصہ اچھا رہا۔ مہوش اسد شیخ کی تحریر ''نورمحل'' زبردست تحریر تھی۔ اسما قادری کے قلم کا جادو ''الوداع'' میں سر چڑھ کر بولا۔ محفل شعر و سخن میں اشعار اور کترنوں کا انتخاب خوب تھا۔''

✠ محمد ظفر اللہ ضیا کی ناراضگی، کمالیہ پنڈی سے۔ ''کچھ عرصے سے سسپنس کی محفل میں کاغذ کے گھوڑے دوڑا رہا ہوں مگر آپ ان کو گھاس ہی نہیں ڈالتے۔ محفل شعر و سخن میں اشعار ارسال کرنے کے علاوہ کٹ پیس کی کئی تحریریں ارسال کر چکا ہوں مگر مجال ہے کہ کبھی آپ نے کسی کو اہمیت دی ہو۔ آپ کے اس رویے سے دلبرداشتہ ہو کر میں نے خط لکھنا اور تحریریں ارسال کرنا ہی چھوڑ دیا کہ خاموش قاری رہنا بہتر ہے بجائے اس کے کہ حوصلہ شکنی سے دل کو ملول کریں مگر جولائی کا شمارہ دیکھ کر بے حد افسوس ہوا کہ پورے شمارے میں کٹ پیس نام کی کوئی تحریر شاملِ اشاعت نہیں۔ کٹ پیس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قاری کہانی پڑھنے کے دوران اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ محفل شعر و سخن میں ہر ماہ معیاری اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں مگر اس بار چند اشعار ہی معیار پر پورے اترے۔ بس یہی کچھ بتانے کے لیے خط لکھا ہے۔ زیادہ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کیونکہ مجھے پتا ہے کہ میرا خط نامعلوم وجوہ کی بنا پر ردی کی ٹوکری کی خوراک بنتا ہے (جناب ایسا آپ سوچ رہے ہیں ویسا بالکل نہیں۔ آپ کا خط اور اشعار وغیرہ ہم تک نہیں پہنچ پاتے ورنہ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ قاری کا خط اور دیگر مواد شاملِ اشاعت ہو۔ آپ اپنا خط بذریعہ ای میل بھی بھیج سکتے ہیں۔ آپ محفل کا حصہ بنیں، یہ آپ ہی کی محفل ہے)۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

احسان اللہ، بھکر۔ نسیم شوکت، میانوالی۔ رانا مبشر، پھالیہ۔ سلطان احمد، لیہ۔ محمد عدیل، کراچی۔ محمد نسیم، فیصل آباد۔ مشتاق خان، لاہور۔ مہتاب احمد، حیدرآباد۔ احسن اختر، سیالکوٹ۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

ظالم مظلوم

زویا صفوان

تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ جب ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو مظلوم بھی ظالم بن جاتا ہے لیکن... اس کی شخصیت کے کئی روپ بھی سامنے آتے ہیں... جسے دنیا دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے... وہ معصوم بچی جسے اپنے بھگوان سے چھوٹا سا شکوہ تھا کہ اسے حُسن کی ذرا سی خیرات سے بھی ترسادیا... معمولی شکل وصورت کی حامل یہ بچی آگے چل کر کیا قیامت برپا کرسکتی ہے کسی کو خبر نہ تھی... تاریخ میں اس ہستی کا نام پھولن دیوی کے نام سے رقم ہے جسے زمانے کے ظلم وستم نے اس راہ کا مسافر بنادیا جہاں بچے اپنے بچپن کو بہت پہلے خیرباد کہہ دیتے ہیں... اس نے بھی بہت چھوٹی عمر سے گرم سرد موسموں کا مقابلہ کیا اور ساتھ ہی آنکھوں میں بسنے والے خوابوں کی بھی حفاظت کرتی رہی... اور جب ظلم حد سے سوا ہوا تو اس بچی نے پھولن دیوی کا روپ دھار لیا۔

pklibrary.com

pklibrary.com

دیوی دین اور مولہ کی غربت دیکھ کر غریبی بھی شرما جاتی تھی۔ اس پر مستزاد انہیں اپنے گاؤں میں نہایت ناروا اور کمتر سلوک کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس امتیازی برتاؤ کیے جانے کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ دونوں ''ملاح'' برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی ہر صبح کا آغاز خاردار سوچوں سے ہوتا۔ دن بھر مشقت کی چکی میں پستے ہوئے اہلِ علاقہ کی زہریلی باتیں سنتے اور رات کو اپنی آنکھوں میں نئے خواب سجائے چارپائیوں پر پڑ جاتے۔ یہ خواب دولت، عزت، مرتبے اور خوشحالی کے علاوہ اپنی اولاد کے شاندار مستقبل پر مشتمل ہوتے تھے۔ رات بھر انہی خوابوں کی بنت کاری کرتے سورج کی پہلی کرن انہیں حقیقت کی دنیا میں لا پٹختی۔

صبح کا آغاز ہوتے ہی مولہ گوبر کے ڈھیر کے سامنے آبیٹھتی اور اپنے ہاتھوں کی مخصوص جنبش سے اُپلے بنانے لگتی۔ اس سرگرمی کے نتیجے میں کچھ ہی دیر میں اُپلوں کی طویل قطار وجود میں آجاتی۔

''اے پھولن! ذرا جلدی ہاتھ چلا۔ ابھی کھیت کے پرلے کنارے پر پہلے کے خشک اُپلے بھی اتارنے ہیں۔'' اس نے اپنی بیٹی کو گھرکا۔

پھولن کی عمر تقریباً نو سال تھی۔ اس کی رنگت سیاہ اور ناک چپٹی تھی۔ وہ اپنے ہی خیالات میں مگن رہنے کے باعث مولہ سے اکثر گوشمالی کروایا کرتی تھی۔

''جلدی ہی تو کر رہی ہوں۔'' وہ منمنائی۔

''ماں کے ساتھ مکر کرتی ہے۔'' مولہ نے اسے ایک دھموکا رسید کیا۔

''مجھے یہ کام بہت مشکل لگتا ہے۔'' اس نے مزید منمناتے ہوئے کہا۔ ''گوبر لیس کی طرح ہاتھوں سے چپک جاتا ہے۔''

مولہ نے خشمگیں نگاہوں سے بیٹی کی جانب دیکھا اور اس کی ''بے بسی'' کو کام میں رکاوٹ سمجھتے ہوئے بڑی بیٹی کو آواز دی۔

''رکمنی..... ارے او رکمنی!''

''آئی ماں!'' رکمنی نے فوراً جواب دیا۔

''اس کمبخت کو کھیت کے پرلے کنارے پر لے جا۔ یہ وہاں سے خشک اُپلے اتارے گی۔'' مولہ نے نئی ہدایت دی۔

''آجا پھولن! سے بہت کم ہے۔'' اس نے بہن کو مخاطب کیا۔

''اپنی بہن سے ہی کچھ سیکھ لے کمبخت!'' مولہ نے غصے سے پھولن کو دیکھا۔

پھولن سر جھکائے رکمنی کے ہمراہ چل دی۔

''ذرا تیز چل لو پھولن!'' رکمنی نے اُسے ملامت سے کہا۔ ''ابھی اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔''

پھولن نے اپنی تیرہ سالہ بہن کی جانب دیکھا اور سرد آہ بھر کے رہ گئی۔ رکمنی کی رنگت سفید اور نقوش تیکھے تھے۔ اس کا قدوقامت، بال اور چال ڈھال بھی شخصیت کی دلکشی میں اضافہ کرتے۔

''ہم کب تک اس گوبر کے اُپلے بناتے رہیں گے دیدی؟'' اس نے بیزاری سے دریافت کیا۔

''کب تک کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے پھولن!'' رکمنی نے اسے سرزنش کی۔ ''ہمارے باپ دادا یہی کام کرتے آئے ہیں۔ ہم بھی کر رہے ہیں اور ہماری سنتان بھی یہی کرتی رہے گی۔''

''مجھے اس گوبر کی باس بالکل پسند نہیں ہے۔'' وہ جھرجھرائی۔

''جب تمہیں اس گوبر سے نفرت محسوس ہونے لگے تو اپنے من میں یہ خیال پیدا کرنا کہ یہ ہمارے جیون کے لیے بہت ضروری ہے۔ گوبر کے انہی اُپلوں سے ہم کھانا پکاتے ہیں، سردیوں میں آگ تاپتے ہیں اور یہی گوبر مٹی میں مل کر فصلوں کو جیوت کرتا ہے۔''

پھولن کے پاس اس دلیل کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے بڑی بہن کے ساتھ چلتی رہی۔

''تم خشک اُپلوں کا ایک دائرہ بنالو۔'' رکمنی نے کہا۔

پھولن خاموشی سے حکم کی تعمیل کرنے لگی۔ وہ کچھ ہی دیر میں ایک اونچا ڈھیر بنا چکی تھی، اس کے بعد چوٹی پر ہاتھ پہنچانے میں دشواری ہونے لگی۔ رکمنی اس کی مشکل بھانپ کر آگے بڑھی اور اپنی طویل قامتی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پھولن کا مسئلہ حل کر دیا۔ پھولن نے مطمئن سانس لی اور نیا ڈھیر بنانے میں جت گئی۔

شام کے سائے گہرے ہونے کا آغاز ہوا تو کھیت میں ہر طرف اُپلوں کے تودے سر اٹھائے کھڑے دکھائی دینے لگے۔ اب ان کی رنگت خاکستری کے بجائے سرخ محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

گھر واپسی کے سفر کا آغاز ہوا تو ان سبھی کے ٹخنے اور پاؤں بھی اسی مٹی میں لتھڑ چکے تھے۔ سورج مغربی افق کی جانب گامزن تھا۔ رکمنی اور پھولن نے اپنے سر پر ٹوکریاں اٹھا رکھی تھیں۔

pklibrary.com

''چھوٹی! تم بھی ایک ٹوکری اٹھالو۔'' پھولن نے اپنی ہم قدم ننھی بہن کو مخاطب کیا۔

رام کلی نے خوشی و جوش سے اثبات میں سر ہلایا تو پھولن نے اسے بھی ایک ٹوکری تھمادی۔

کچھ ہی دیر میں وہ اپنے گاؤں میں پہنچ چکی تھیں۔ گاؤں کا رنگ بھی مٹی کی طرح سرخ ہی دکھائی دیتا تھا۔ گھروں کی دیواریں اسی مٹی کے گارے سے بنائی اور لیپی پوتی گئی تھیں۔ وہ متوازن قدموں سے چلتی گھر کے احاطے میں داخل ہوگئیں۔

اس گھر کے چھوٹے سے صحن میں دیوی دین ایک کھاٹ پر بیٹھا تھا۔ اس کا سیاہ روچہرہ جھریوں سے بھرا تھا۔ دیوی دین کی مجموعی شخصیت سے آزردگی اور افسردگی جھلکتی تھی۔ وہ گھٹنوں اپنا سر کھجاتا رہتا تھا۔ اس سرگرمی کا محرک ان سوچوں سے چھٹکارا پانا تھا جو ''جوؤں'' کی طرح اس کا خون چوستی رہتی تھیں۔ دیوی دین کے زرد دانت نصف سے زائد اپنا وجود کھو چکے تھے۔

وہ انہیں دیکھتے ہی پژمردگی سے کہنے لگا۔ ''روٹیاں بنالو جلدی، بہت بھوک لگ رہی ہے۔''

''شیو نارائن کہاں ہے؟'' مولہ نے اپنے اکلوتے بیٹے کے بارے میں دریافت کیا۔

''ابھی تو یہیں تھا۔'' دیوی دین نے کہا۔ ''شاید باہر کہیں کھیلنے نکلا ہو۔''

مولہ نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے ٹوکریاں ایک ترتیب سے رکھ دیں۔ دیوی دین کی نگاہیں اس کے شکم کی جانب مرکوز تھیں۔

'بھگوان کرے اس بار بیٹا پیدا ہوجائے۔' اس کے ذہن میں ایک سوچ ابھری۔ 'تین بیٹیوں کا بوجھ ڈھونے کے لیے دو بیٹوں کا سہارا مل جائے۔ کاش ایسا ہوجائے۔'

مولہ اس کی نگاہوں کے ماخذ اور خیالات سے بے خبر نہیں تھی۔ وہ بھی شب و روز انہی دعاؤں میں مگن رہتی تھی۔ والدین کی ان سوچوں اور تناؤ سے بے نیاز رکمنی برق رفتاری سے آٹا گوندھنے لگی۔ پھولن پُرشوق نگاہوں سے بڑی بہن کی جانب دیکھ رہی تھی۔ رکمنی نے کھیتوں میں جانے سے قبل چکی پر آٹا پیسا تھا اور اب بلاتکان دیگر کام بھی اسی توانائی سے سرانجام دینے لگی۔

''پہلے باپو اور شیو نارائن کو کھانا دے دو رکمنی!'' مولہ نے اسے مخاطب کیا۔

رکمنی نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے ہاتھوں میں مزید پھرتی پیدا کردی۔ اس نے تنکے مروڑ کر انہیں آگ دکھائی اور چولہا جلادیا۔ ایک ہاتھ گھٹنے پر رکھتے ہوئے جھک کر چولہے میں پھونک ماری اور دوسرے ہاتھ سے پیشانی پر آئی ہوئی بالوں کی لٹ پیچھے ہٹانے لگی۔ اس کا چہرہ آگ کی روشنی میں تمتما رہا تھا۔

''ہماری رکمنی کتنی سندر ہے نا؟'' دیوی دین نے محبت سے اس کی جانب دیکھا۔

''ہاں، پھولن اور رکمنی میں بہت فرق ہے۔'' مولہ نے گہری سانس لی۔

''رکمنی کا بیاہ جلد ہوجائے گا۔ ہمیں اس کا بر ڈھونڈنے میں زیادہ سمسیا نہیں ہوگی۔'' وہ پُرامید تھا۔

''بھگوان کرے ایسا ہی ہو۔'' مولہ مضطرب تھی۔

''میں جانتا ہوں تم داج کے کارن ایسا کہہ رہی ہو۔ چنتا نہ کرو، میں اس کا بھی بندوبست کرلوں گا۔'' اس نے دلاسا دیا۔

رکمنی نے اب سب کے لیے کھانا چن دیا تھا۔ پھولن بھی حتی المقدور اس کی مدد کرتی رہی۔

''باپو! میرا جنم دن کب آتا ہے؟'' پھولن نے کھانا کھاتے ہوئے دریافت کیا۔

''تمہیں جنم دن جاننے کی کیا ضرورت پڑگئی ہے؟'' رکمنی ہنسی۔ وہ ہنوز سب کے لیے روٹیاں بنارہی تھی۔

''مجھے جاننا ہے بس۔'' وہ ٹھنکی۔ ''میری سب سکھیاں اپنے جنم دن کی باتیں کرتی ہیں۔ مجھے ان کا مذاق اڑانا بالکل اچھا نہیں لگتا۔''

''مجھے تو یاد ہی نہیں۔'' دیوی دین نے بے بسی سے کندھے اچکائے۔

''اور مجھے بس اتنا یاد ہے کہ اس دن پھولوں کا کوئی تہوار تھا۔ اسی لیے تمہارا نام بھی پھولن رکھ دیا گیا۔'' مولہ نے بتایا۔

پھولن والدین کو شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے خاموش ہوگئی۔

☆☆☆

اگلی صبح کا آغاز بھی حسب سابق تھا۔ پھولن نہایت کسلمندی سے اپنی کھاٹ پر لیٹی تھی۔

''کیا بات ہے پھولن! تم اٹھ کیوں نہیں رہیں؟'' رکمنی نے اسے مخاطب کیا۔

''مجھے رات کو ٹھیک طرح نیند ہی نہیں آئی۔'' اس نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

''کیوں، ایسا کیا ہوگیا تھا؟'' رکمنی کو اچنبھا ہوا۔

پھولن حیرت سے اس کی جانب دیکھ کر رہ گئی۔ تھکاوٹ سے بے حال رکمنی رات کو اس قدر گہری نیند سوتی تھی کہ اسے قرب وجوار میں شور وغل کی خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔ صورتِ حال کچھ اس طرح تھی کہ کھیتوں میں دن بھر کام کے بعد تھکے ماندے مرد ادنیٰ باتوں پر الجھ پڑتے تھے۔ خواتین دودھ کے برتن پر جھگڑا کرتیں تو کبھی اپنے بچوں پر چیخ وپکار کرنے لگتیں۔ اس بے ہنگم شور میں نیند بھی بھرپور ناز ونخرے دکھاتی تھی۔

''اب اٹھ بھی جاؤ پھولن! ہمیں بہت سے کام کرنے ہیں۔'' رکمنی نے اسے لتاڑا۔

''اس موسم میں اٹھنے کا من ہی نہیں کرتا۔'' وہ جھنجلائی۔

پھولن کی یہ بیزاری اور کوفت بے سبب نہیں تھی۔ موسم گرما میں ہوا اس قدر بوجھل ہوتی تھی کہ مکھیاں معلق نظر آیا کرتیں، چیچی درختوں میں دم سادھ لیا کرتے۔ دن بھر لو چلا کرتی اور اس دوران صرف بندر اور مچھر ہی دکھائی دیتے تھے۔ بندر درختوں تلے ایک دوسرے کی جوئیں پکڑتے اور مچھر انسانوں کے جسم سے خون چوسنے میں مگن رہتے۔

''دیدی! میرے ساتھ کھیتوں میں چلوگی؟'' پھولن انگڑائی لیتے ہوئے کھاٹ سے اتری۔

رکمنی نے تاسف سے اس کی جانب دیکھا اور بے نیازی سے گویا ہوئی۔

''اسی لیے میں کہہ رہی تھی کہ جلدی اٹھ جاؤ۔ اب ایسا کرو چھوٹی کو ساتھ لے جاؤ۔''

''دیدی! تمہیں بھی پتا ہے کہ میں چھوٹی کو ساتھ نہیں لے جاسکتی۔'' وہ جز بز ہوئی۔

رکمنی ہونٹ بھینچ کر خاموش ہوگئی۔ اسے علم تھا کہ پھولن کا یہ اضطراب بے سبب نہیں تھا۔ ان لوگوں کو رفعِ حاجت کے لیے گاؤں سے باہر کھیتوں میں جانا پڑتا تھا۔ ان کھیتوں کا راستہ ''بہاری'' کے بڑے اور اونچے گھر کے پاس سے گزرتا تھا۔ سن رسیدہ بہاری ایک ظالم اور کمینہ صفت انسان تھا۔ وہ پھولن، رام کلی اور مولہ کو دیکھتے ہی مغلظات سے استقبال کرتا۔

''میں چھوٹی کو ساتھ لے جاتی ہوں۔'' پھولن نے رکمنی کی خاموشی سے عاجز آکر کہا۔

☆☆☆

بہاری کا مکان قریب آتے ہی پھولن کے اعصاب میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔ وہ حسبِ معمول اپنی بانس کی کھاٹ پر بیٹھا تھا۔ پھولن اور رام کلی کو دیکھتے ہی وہ غراتے ہوئے کہنے لگا۔

''اپنی ماں سے پوچھنا اس بار کون سا نیا جانور پیدا کرے گی؟''

پھولن نے غصے سے اس کی جانب دیکھا اور منہ میں بدبدائی۔

''ظالم..... بھینسا۔''

رام کلی کی حسرت زدہ نگاہیں بہاری کے گھر پر مرکوز تھیں۔ اس پختہ اور دو منزلہ گھر کی آرائش شاہانہ تھی۔ گھر کے دروازے چوبی اور پھاٹک منقش تھے، صحن میں کنوئیں کی موجودگی کے باعث بہاری کی بیویوں کو پانی کے لیے اپنی باری کا انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس کے برعکس گاؤں کے بیشتر گھروں کی دیواریں گارے کی اور چھت پھونس کی تھی۔ اس چھت کو بالائی سمت سے لیپا جاتا تھا۔

رام کلی کے پردۂ تصور پر اپنے گھر کے مناظر چھب دکھانے لگے۔ چوبی دروازہ نقش ونگار سے عاری تھا۔ چھوٹے سے صحن کے اندر چند کمرے تھے۔ ایک کمرا آرام کے لیے اور دوسرا رسوئی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ تیسرے کمرے میں دونوں گائیں باندھی جاتیں۔ ان سبھی کمروں میں ایک ہی بات مشترک تھی کہ یہاں کھڑکیاں اور دروازے ناپید تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اندرونی سمت ٹھنڈک اور اندھیرے کا بسیرا رہتا۔

اس اندھیرے کو دور کرنے کے لیے ٹین کے ایک چھوٹے سے ڈبے سے تیل کا دیا بنایا گیا تھا۔ اس کے ڈھکن میں سوراخ کرکے بتی پھنسائی گئی تھی۔ ان کے گھر میں آرائش کی واحد شے پوجا کا چھوٹا سا مندر تھا۔ اس کے علاوہ اسباب کے نام پر صرف تین کھاٹ تھیں۔

''بہت اکڑ آگئی ہے تم لوگوں میں کمبختو!'' بہاری ان کی خاموشی سے طیش زدہ ہوا اور اپنی کھاٹ کے قریب ہی رکھا ایک پتھر تاک کر انہیں دے مارا۔

''دیدی! یہ بہاری ایسے کیوں کرتا ہے؟'' رام کلی نے آزردگی سے پھولن کی جانب دیکھا۔ ''وہ ہر بار یہاں سے گزرنے پر مجھے مارتا ہے۔''

''ماں کہتی ہے کہ وہ ہم سے پیچھا چھڑوانا چاہتا ہے۔'' پھولن نے بتایا۔

''لیکن کیوں..... ہم نے آخر ایسا کیا کردیا ہے؟'' وہ الجھ گئی۔

پھولن گہری سانس بھر کے خاموش ہوگئی۔ وہ چھوٹی

بہن کو یہ بات نہیں سمجھا سکتی تھی کہ بہاری ہمیشہ مولہ سے اس بات پر الجھا کرتا تھا۔ کہ رکمنی، پھولن اور رام کلی باعث مصیبت ہیں۔ وہ اس کے کھیتوں میں گھس کر رفع حاجت کرتی ہیں۔ بہاری ان کی کم روئی اور کم حیثیتی پر بھی طنز و تشنیع کیا کرتا تھا۔

بہاری کی انہی حرکات سے عاجز آ کر وہ کھیتوں میں جانے کے لیے طویل راستہ بھی اختیار کرلیا کرتی تھیں لیکن اس صورت میں اکثر مشکل پیش آجاتی تھی۔ پھولن ایسے کسی بھی موقعے پر دریا کا رخ کرتی اور کپڑے دھونے کے بعد خشک ہونے کے لیے وہیں کسی جھاڑی پر ڈال دیتی۔ اس کے پاس لباس کا ایک ہی جوڑا تھا اور جوتے بالکل ہی ناپید تھے۔ حقیقت بہرحال یہ بھی کہ ان سبھی اہلِ خانہ میں کسی کے پاس بھی جوتے نہیں تھے۔

''پتا ہے چھوٹی! کبھی کبھی میرا من کیا چاہتا ہے؟'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

رام کلی سوالیہ نظروں سے پھولن کی جانب دیکھنے لگی۔

''میرا من چاہتا ہے کہ کسی روز جب یہ بہاری اپنی کھاٹ پر لیٹے ہوئے بڑی سی ناک میں سے خراٹے لے رہا ہو تو تمہیں ساتھ لے کر یہاں آؤں اور کسی پتھر سے اس کا سر کچل دوں۔''

''سچ میں دیدی! تم ایسا ہی کرنا۔'' وہ پُرجوش ہوئی۔ ''مجھے بھی بہاری بہت بُرا لگتا ہے۔''

''میں ایک دن ایسا ضرور کروں گی۔'' پھولن پُرعزم تھی۔ ''اس نے ہمارا جیون بھرشٹ کر رکھا ہے۔ ماں سے کہتا ہے کہ ہم لوگوں کو گاؤں میں رہنے کا کوئی ادھیکار نہیں۔ ہم کتے سے چمٹے ہوئے غلیظ پسوؤں سے بھی زیادہ گندے ہیں۔''

''وہ ایسا شاید اس لیے کہتا ہے کہ ہم ملاح ہیں۔'' رام کلی مزید آزردہ ہوئی۔

''کبھی کبھی میرا من یہ بھی چاہتا ہے کہ مجھے کہیں بھگوان مل جائے۔'' پھولن نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔

''بھگوان سے مل کر کیا کروگی دیدی؟'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔

''میں اس سے پوچھوں گی کہ اس نے ہمیں ایسا کیوں بنایا ہے؟'' وہ دانت پیسنے لگی۔

''اچھا یہ بھی کہنا کہ ہمیں اگلے جنم میں کسی ٹھاکر کے گھر پیدا کرے۔'' رام کلی نے فرمائش جڑی۔

''تم ایسا کرنا چھوٹی! تم بھی میرے ساتھ ہی بھگوان سے مل لینا۔'' پھولن نے رسان سے کہا۔ ''میں اسے پہلے کچھ اور باتیں یاد کروادوں گی۔''

''کون سی باتیں دیدی؟'' وہ متجسس ہوئی۔

''میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ اس نے ہمیں غریب پیدا کرنے کا فیصلہ آخر کیوں کیا؟ ہمیں بہاری کی طرح پکا اور چوبارے والا مکان کیوں نہیں دیا، ہمارے باپو کے پاس گندم کے کھیت کیوں نہیں ہیں، ہمیں آموں کے درخت، بہت سی گائیں، بھینسیں اور بیل گاڑی کب ملیں گی؟'' پھولن روانی سے کہتی چلی گئی اور ایک توقف کے بعد رام کلی کی جانب متوجہ ہوکر کہنے لگی۔

''تم بھگوان سے کیا پوچھو گی چھوٹی؟''

''بہت سی باتیں۔'' اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''میں بھگوان سے کہوں گی کہ جب ہم آم کھانا چاہتے ہیں تو ہمارے پاس کیول آلو ہی کیوں ہوتے ہیں۔ باپو کو گھوڑے سے گیہوں اور ذرا سے دیسی گھی کے لیے اتنی محنت کیوں کرنا پڑتی ہے؟ جب ہم ماں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتی ہیں تو دوپہر میں کھانے کو کیول نمک لگی مونگ پھلیوں سے بالکل پیٹ نہیں بھرتا۔ شام کو ملنے والا کھانا بھی سب سے پہلے باپو کو دیا جاتا ہے۔''

پھولن اسے ستائشی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اسے چھوٹی کے اس طرزِ فکر کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔

''میں تو ایک اور بات بھی سوچتی ہوں چھوٹی! رکمنی دیدی سب سے آخر میں کھانا کھاتی ہے۔ اس کا بیاہ ہوگیا تو یہ کرتو یہ مجھے نبھانا ہوگا۔ میں اس کی جگہ کیسے سنبھالوں گی؟ مجھ سے تو بھوک بالکل بھی برداشت نہیں ہوتی۔'' وہ بے بسی سے کہنے لگی۔

انہی باتوں، اندازوں اور تجزیوں میں وہ رفعِ حاجت کے مخصوص مقام پر پہنچ گئیں۔ انہیں اپنے اعصاب میں قدرے فرحت محسوس ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

دیوی دین تھکا ماندہ گھر لوٹا تو پھولن کی نگاہیں اس کے چہرے پر الجھنے لگیں۔

''باپو کے چہرے کی جھریاں کتنی زیادہ ہونے لگی ہیں۔'' اس کے دل میں تشویش کی ایک لہر اٹھی۔

دیوی دین کی آزردگی، پریشانی اور پژمردگی اسے ہمیشہ یونہی بوجھل کیفیت میں مبتلا کردیا کرتی تھی۔

''پھولن! کل صبح پردھان کے پاس چلی جانا۔'' اس نے کھانستے ہوئے بیٹی کو مخاطب کیا۔

''مجھے وہاں جانا پسند نہیں ہے بابو!'' وہ ٹھنکی۔

pklibrary.com

''اری کمبخت! تیرے پسند کرنے یا نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے؟'' دیوی دین جھلا گیا۔ ''اگر گاؤں کے کسی بھی آدمی کو ہماری ضرورت پڑ جائے تو ان کا کام کرنا ہمارا کرتوبہ ہے۔''

''باپو! ان کے کام تو ختم ہی نہیں ہوتے۔'' پھولن نے منہ بسورا۔ ''ان کے مویشیوں کی دیکھ بھال، ان کی فصلیں اٹھانا اور پھر ان کی چند یا سے جوئیں صاف کرنا ہمارا ہی کرتوبہ کیوں ہے؟ ان کے نوکر چاکر بھی تو یہ سب کر سکتے ہیں۔''

پھولن کا یہ شکوہ اپنی جگہ بالکل بجا تھا۔ گاؤں میں پردھان کی حیثیت مسلمہ تھی۔ وہ ضلع بھر کے دیہاتوں کا سربراہ تھا۔ دیوی دین نے بیٹی کی اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور کسلمندی سے کھاٹ پر لیٹ گیا۔ اس کی یہ حالت دیکھتے ہوئے رکمنی نے اپنے ہاتھوں میں تیزی پیدا کر دی۔

اگلی صبح پھولن، مولہ کے ساتھ کھیتوں میں کام ختم کروانے کے بعد حسبِ ہدایت پردھان کی طرف چل دی۔ اسے دیکھتے ہی پردھان نے تحکمانہ کہا۔

''پھولن! میرے سر میں تیل کی مالش کرو۔''

پھولن کی نگاہیں اس کے سامنے پختہ فرش پر دھرے پکے ہوئے آموں کے ڈھیر پر مرکوز ہو گئیں۔ یہ آم تازہ تازہ ہی باغ سے توڑ کر لائے گئے تھے۔ پھولن کے منہ میں پانی بھر آیا۔ دل و دماغ میں ایک اضطراب برپا ہو گیا تھا۔ وہ قبل ازیں پردھان کی خدمت گزاری کے لیے یہاں آتی رہی تھی لیکن کبھی بھی کوئی شے مانگنے کی ہمت نہ پڑی تھی۔ اس روز آموں کی کشش نے اسے پہلی بار لب کشائی پر مجبور کر دیا کیونکہ اس نے اپنے گھر میں کبھی آم کھائے ہی نہیں تھے۔

''کیا میں ایک آم لے لوں؟'' اس نے لجاجت سے کہا۔

پردھان کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ اس نے پھولن کے چہرے پر ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔ طمانچے کی شدت نے پھولن کے حواس ہی مختل کر دیے۔ آنکھوں کے سامنے ستارے رقصاں ہو گئے تھے۔ اس کا دھان پان سا وجود پردھان کے اس وحشیانہ عمل کی تاب نہ لاتے ہوئے زمین بوس ہو گیا۔

''نیچ، کم ذات! تیری یہ جرأت، تُو مجھ سے آم مانگ رہی ہے۔'' وہ دہاڑا۔

''شا..... کر..... دو۔'' پھولن اس کے تیور دیکھ کر گھگیا گئی۔

پردھان طیش سے بے قابو ہو کر اس کی جانب بڑھا اور غراتے ہوئے کہنے لگا۔

''آج تُو نے آم مانگا ہے، کل کچھ اور مانگے گی۔''

پھولن نے اذیت و بے بسی سے خود کو بچانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ خوف اس قدر شدید تھا کہ اس کا پیشاب خطا ہو گیا۔

''یہ کیا کر دیا حرام خور!'' وہ چلایا۔ ''اسے صاف کر..... ترنت صاف کر ورنہ تیری زبان سے صاف کرواؤں گا۔''

پھولن نے لرزیدہ ہاتھوں سے فی الفور پختہ فرش کی صفائی مکمل کی اور اپنے گھر کی جانب دوڑ لگا دی۔ اس کے دل میں ہنوز ایک خوف جاگزیں تھا۔ مولہ اس کے گیلے کپڑے دیکھ کر اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتی۔

''ہے بھگوان! آج ماں گھر پر نہ ہی ہو۔'' وہ آسمان کی سمت دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں گڑگڑائی لیکن وہ قبولیت کا لمحہ نہیں تھا۔

مولہ گھر پر ہی تھی۔ وہ پھولن کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

''کیا ہوا ہے تجھے؟''

پھولن کی آنکھوں سے ایک بار آنسو بہہ نکلے۔ وہ ہذیانی انداز میں کہنے لگی۔

''میں اس کے گھر کبھی نہیں جاؤں گی۔ وہاں کوئی کام بھی نہیں کروں گی۔''

''پردھان کے گھر میں کچھ ہوا ہے کیا؟'' مولہ کو ایک ہی لمحے میں ہزار ہا وسوسوں نے گھیر لیا۔

''بھگوان کرے اسے کیڑے کھائیں۔'' پھولن نے روتے ہوئے اسے تمام تر ماجرا سنا دیا۔

اس گفت و شنید کے دوران اس کے دل و دماغ میں یہ خدشہ بھی جاگزیں تھا کہ مولہ اسے ہی قصوروار ٹھہراتے ہوئے کوئی نہ کوئی سزا دے گی لیکن اس روز گنگا الٹی بہہ نکلی تھی۔ مولہ کی سیاہ آنکھوں میں پہلی بار پھولن کے بجائے کسی اور کے لیے غصے کی چنگاریاں سلگی تھیں۔ وہ اس کا بازو تھام کر گھسیٹتی ہوئی پردھان کے گھر لے گئی۔ پھولن رستہ بھر حیرت سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

مولہ نے پردھان کے گھر پہنچتے ہی بہ آوازِ بلند چلانا شروع کر دیا۔

''تم کیا سمجھتے ہو..... آخر کیا سمجھتے ہو؟ ہم نے یہ بچے تمہاری غلامی کے لیے پیدا نہیں کیے۔ میری بیٹی پر ہاتھ اٹھانے کے بجائے اسے جان سے ہی مار دیا ہوتا۔ پھر یہ تم سے آم تو کیا، کچھ بھی نہ مانگتی۔''

پھولن کا رخسار ایک بار پھر جلنے لگا۔ مولہ نے اسے وحشیانہ انداز میں آگے دھکیلا اور حلق پھاڑ کر کہنے لگی۔

''لو..... مار دو اسے..... مار دو..... آج اسے جان

pklibrary.com

سے ہی مار دو.....!''

مولہ کی اس چیخ و پکار سے گلی میں کئی لوگ جمع ہو گئے تاہم وہ سبھی خاموش تماشائی تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ان کی ہمدردی یا اخلاقی تعاون کے لیے آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ اس بے بسی اور اذیت نے پھولن کا دل لہولہان کر دیا۔

☆☆☆

دیوی دین کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو وہ مولہ پر شدید برہم ہوا۔

''تجھے کیا ضرورت تھی یہ سب تماشا کرنے کی؟''

مولہ نے غصے سے بھناتے ہوئے شوہر کو سخت سست سنانا چاہیں لیکن وہ پھولن کی جانب متوجہ ہو چکا تھا۔

''اور تجھے کیا ضرورت تھی اس سے آم مانگنے کی؟''

''کیونکہ میرا من چاہ رہا تھا۔'' اس نے آزردگی سے جواب دیا۔

''کسی چیز کا من چاہے تو ماں یا باپو سے مانگتے ہیں۔'' دیوی دین نے اسے سمجھایا۔

''رہنے دو باپو!'' وہ تلخی سے کہنے لگی۔ ''میں نے تو اپنے جیون میں کبھی یہاں پھل آتے دیکھا ہی نہیں۔''

مولہ اور دیوی دین کی رنگت متغیر ہو گئی۔

''اور ویسے بھی اس گھر میں ہر شے رکمنی دیدی کے لیے ہوتی ہے۔''

پھولن کے اس شکوے میں بھی کوئی مبالغہ آرائی نہیں تھی۔ دیوی دین کو اپنے کام پر کسی بھی شخص سے ملنے والی شے میں رکمنی کا حصہ ہی مسلم ہوتا تھا۔

''اس کا بیاہ جو ہونے والا ہے۔'' دیوی نے رسان سے سمجھانا چاہا۔ ''اسے صحت مند اور سندر لگنا چاہیے۔''

''نہیں، یہ سچ نہیں ہے۔'' وہ مصر رہی۔ ''تم دونوں رکمنی دیدی سے زیادہ پریم کرتے ہو۔ اس کا رنگ سفید ہے، وہ مجھ سے اور چھوٹی سے زیادہ سندر ہے۔''

پھولن کی اس منطق پر وہ دونوں بے بسی سے اس کی جانب دیکھ کر رہ گئے۔

''سب ماتا، پتا اپنی سنتان سے ایک جیسا ہی پریم کرتے ہیں پھولن!'' مولہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''مجھ سے کوئی بھی پریم نہیں کرتا۔ میں دیدی، چھوٹی اور شیونارائن سے زیادہ تیز دوڑ سکتی ہوں، درختوں پر آسانی سے چڑھ جاتی ہوں، دریا میں تیر سکتی ہوں، ہر قسم کے کام کاج کر لیتی ہوں، اپنی درانتی سے مویشیوں کے لیے گھاس کاٹ سکتی ہوں، چارا کتر کے کنویں سے پانی کے گھڑے اٹھا لاتی ہوں پھر بھی دودھ کا گلاس اور چپاتی رکمنی دیدی کے لیے ہی رکھی جاتی ہے۔ مجھ سے کوئی بھی پریم نہیں کرتا۔'' وہ روانی سے کہتی چلی گئی۔

''بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔'' دیوی دین بھنایا۔

''میں یہ کہہ رہا تھا کہ گاؤں والوں کی سیوا کرنا ہمارا کرتویہ ہے۔ ہمیں ہر حال میں انہیں پرنام کر کے چرن چھونے ہیں۔ بدلے میں اگر وہ ہمیں کچھ کھانے کے لیے دے دیں تو یہ ان کی کرپا ہو گی۔ ہم نے ان سے کچھ نہیں مانگنا۔''

''کیوں باپو! ان کے پاس ہمیں ذلیل کرتے رہنے کا ادھیکار کیوں ہے؟'' پھولن جھلا گئی۔

''کیونکہ بھگوان نے ہمیں اسی طرح پیدا کیا ہے۔'' اس نے روایتی منطق دی۔

''بھگوان کس طرح کا ہوتا ہے باپو؟'' پھولن نے اپنی ایک اور الجھن کو گویائی دی۔

''اس کی بہت سی شکلیں ہیں۔'' دیوی دین نے بتایا۔

اسی اثنا میں رکمنی اس کے لیے کھانا لے آئی۔ وہ سب کچھ پس پشت ڈالے کھانے میں مگن ہو گیا۔

☆☆☆

اس شب پھولن بے پناہ سوچوں میں گھری تھی۔ اس کی ذہنی رو دیوی دین اور مولہ کے عقائد کی کشمکش میں الجھی تھی۔ دیوی مذہب پسند اور پوجا پاٹ پر یقین رکھنے والا شخص تھا۔ وہ اپنی اولاد کو پوجا کرنے کی تحریک دیا کرتا۔ اس کے برعکس مولہ اپنی زندگی میں محرومیوں اور خلش کے باعث مندر میں آویزاں اس مورتی سے شکوہ کناں ہی رہتی تھی۔ وہ اکثر اپنے ابھرے ہوئے شکم پر ہاتھ رکھتے ہوئے درد سے دہری ہو جاتی۔

''بھگوان! اس بار تو بیٹا دے دینا۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔

والدین کے مزاج میں تضاد پر غور و فکر کرتے ہوئے پھولن ایک بار پھر اپنی ازلی الجھن کی بابت سوچنے لگی۔

'بھگوان کہاں رہتا ہو گا؟ شاید اس دریا میں جہاں مرنے والوں کے پھول پھینکے جاتے ہیں۔ کل میں وہاں جاؤں گی اور بھگوان سے کہوں گی کہ اس بار ماں کو لڑکا ہی دینا ورنہ وہ پچھلی بار کی طرح مورتی اٹھا کر کنویں میں پھینک دے گی۔ پھر باپو اور ماں میں جھگڑا ہو گا۔''

اگلی صبح پھولن ایک بھینس کی دم سے چمٹ کر دریا میں اتر گئی۔ وہاں کیچڑ کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ رام گلی کنارے پر کھڑی بے تابی سے اس کی منتظر تھی۔

pklibrary.com

''کیا ہوا، کچھ ملا؟'' اس نے پھولن کو پانی سے برآمد ہوتے دیکھ کر استفسار کیا۔

''نہیں، اندر تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' وہ مایوسی سے کہنے لگی۔

''تم بھول رہی ہو، باپو نے بتایا تھا کہ بھگوان مندر میں ملتا ہے۔'' رام کلی نے اسے یاد دہانی کروائی۔

''میں کئی بار مندر جا چکی ہوں چھوٹی! وہاں صرف دیوی اور دیوتاؤں کی مورتیاں ہوتی ہیں۔'' پھولن حسبِ عادت جھلائی۔

''تمہیں یاد نہیں باپو نے ایک بار کہا تھا اگر سچے دل سے پوجا کی جائے تو یہ مورتیاں زندہ ہو کر منش کو برہما کا راستہ دکھاتی ہیں۔'' وہ اپنی کم عمری کے باعث والدین کی بات کو ہی حرفِ آخر سمجھتی تھی۔

پھولن کچھ لمحوں کے لیے گہری سوچ میں غرق ہوگئی۔ اس نے رام کلی کا ہاتھ تھاما اور مندر کی طرف چل دی۔ مندر میں پہنچتے ہی وہ مورتیوں کے مقابل کھڑے ہو کر ان کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

''میں سچے دل سے پرارتھنا کر رہی ہوں۔'' اس نے زیرِلب کہا۔ ''ماں کو لڑکا دے دینا۔ اس نے چھوٹی کے پیدا ہونے پر بہت شور مچایا تھا۔ چھوٹی کے بعد دو بچیاں اور آنے پر وہ غصے سے ہمیں پیٹنے لگی تھی۔ وہ دونوں لڑکیاں ایک ہی دن وقفے وقفے سے تمہارے پاس آئیں تو ماں بہت خوش تھی۔ اس نے کہا تھا کہ لڑکیوں کی فوج بنا کر کیا کرنا ہے؟ وہ ہر روز لڑکے کی پرارتھنا کرتی ہے۔ اسے لڑکا ہی دینا ورنہ وہ ہمیں نوچ کھائے گی۔''

پھولن اور مولہ کی یہ بھی دعائیں رائگاں گئیں۔ مولہ کے بطن سے اس بار بھی ایک لڑکی نے ہی جنم لیا تھا۔

☆☆☆

''بھوری'' کی پیدائش پر مولہ کی آہ وفغاں نہایت دلدوز تھی۔ وہ چوتھی لڑکی کی پیدائش کے لیے ذہنی طور پر تیار ہی نہ تھی۔ دھیرے دھیرے یہ دکھ اور رنجش غصے میں ڈھلنے لگی۔ اس کے استخوانی چہرے پر آنکھیں خلافِ معمول بڑی اور بے حد خوفناک محسوس ہوا کرتیں۔

''بھوری اتنا رو کیوں رہی ہے؟'' دیوی دین نے ایک شام گھر آنے کے بعد اس سے دریافت کیا۔

''مجھے نہیں پتا۔'' اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

''تو پھر کسے پتا ہے؟'' وہ اس جواب پر حیران ہوا۔

''اپنے بھگوان سے پوچھ لو جا کر۔ وہ تمہاری تو ہر بات سن لیتا ہے۔'' مولہ چیخی۔

دیوی دین لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا اور قیاس کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''کہیں اسے بھوک تو نہیں لگی؟''

''مجھے نہیں پتا۔'' مولہ کے جبڑے بھنچ گئے۔

دیوی نے گہری نگاہوں سے اس کے بدن کا جائزہ لیا اور سرسراتے لہجے میں گویا ہوا۔

''تم بھوری کو اپنا دودھ نہیں پلا رہی ہو کیا؟''

''نہیں۔'' اس نے بلا تامل جواب دیا۔

''لیکن کیوں؟ اس نردوش بچی کو کس بات کی سزا دے رہی ہو؟'' وہ دکھ سے کہنے لگا۔

''کیونکہ میرے شریر میں اب اتنی طاقت نہیں ہے کہ کھیتوں میں کام کر کے ہڈیاں گھساؤں اور تمہاری سنتان کو دودھ بھی پلاؤں۔ میرے شریر کی یہ طاقت تمہارے چار بچے پہلے ہی نچوڑ چکے ہیں۔'' مولہ نے دوٹوک جواب دیا۔

''ایسا مت کرو مولہ! تم کیسی ماں ہو؟'' اس نے اپنا غصہ بہ مشکل ضبط کیا۔

''میں بھوری کو پانی پلایا کروں گی۔ اس کی دیکھ ریکھ بھی پھولن اور چھوٹی ہی کریں گی۔'' وہ حتمی انداز میں کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھولن کا سیاہی مائل چہرہ تشویش سے مزید بوجھل دکھائی دینے لگا۔ اس نے رام کلی سے سرگوشی میں کہا۔

''میں بھوری کو کسی بھی طرح دودھ پلاؤں گی۔''

''لیکن دودھ لاؤ گی کہاں سے؟'' وہ حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''کہیں سے بھی..... چاہے مجھے دوسروں کی بکریوں کے تھنوں سے ہی کیوں نہ چرانا پڑے۔'' پھولن پُرعزم تھی۔

''باپو کہتا ہے کہ چوری کرنا پاپ ہے۔'' رام کلی ہول گئی۔

''کسی نردوش کی بھوک سے جان نکلتے دیکھنا اس سے بھی بڑا پاپ ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اٹل انداز میں کہنے لگی۔

پھولن نے اپنے اس عزم کو اگلے ہی روز سے عملی جامہ پہنانے کا آغاز کر دیا۔ رام کلی بھی بالآخر اس امر میں شاملِ حال ہو چکی تھی۔ وہ اپنے گھر کے آس پاس کسی بھی آوارہ بکری کی تاک میں رہتی تھیں۔ بکری کی آمد کے بعد وہ محتاط نگاہوں سے قرب و جوار کا جائزہ لیتیں اور اسے جلدی سے اپنے صحن میں لے آتیں۔ برق رفتاری سے دودھ دوہتے ہوئے اس بات کا خیال بھی رکھنا پڑتا تھا کہ اس کے مالک کو شبہ نہ ہونے پائے۔

pklibrary.com

اس تمام تر عمل کے بعد بکری کو احتیاط سے سابقہ مقام تک پہنچا دیا جاتا۔ بھوری کو اس مسروقہ دودھ میں پانی ملا کر پلانے کی خوشی ناقابلِ بیان ہوتی تھی۔ پھولن کی آنکھوں میں نمی اور دل میں ہزارہا شکوے مچلنے لگتے۔

اس کی سوچ اب شوریدہ سری کی جانب مائل ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

نوزائیدہ بھوری کی اس مناسب دیکھ بھال نے اسے بقیدِ حیات رکھا تھا۔ وہ اب گھٹنوں کے بل رینگنے لگی تھی۔ گھریلو حالات میں رتی بھر تبدیلی نہیں آئی تھی۔ غربت و پسماندگی میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ پردھان اور بہاری بھی انہیں ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ ایک صبح رفعِ حاجت کے لیے کھیتوں میں جاتے ہوئے پھولن اور رام کلی اس کی چھڑیوں کی ضربات سے محفوظ نہ رہ پائی تھیں۔ ان کے بدن پر چھڑیوں کے نشانات دیکھ کر دیوی دین نے تشویش سے دریافت کیا۔

"یہ کیا ہوا ہے تمہیں؟"

"اس ظالم بھینسے بہاری نے مارا ہے۔" پھولن نے نفرت سے بتایا۔

دیوی دین کی رنگت متغیر ہوگئی۔ تشویش کے جذبات لمحہ بھر میں ہی غائب ہو گئے تھے۔

"بہاری کے لیے ایسے شبدھ استعمال نہ کرو۔" اس کے لہجے میں سختی در آئی۔ "اس کی عزت کیا کرو۔"

"لیکن کیوں باپو؟" پھولن چلا اٹھی۔ "وہ شخص ہم سے اتنی نفرت کرتا ہے، ہم اس کی عزت کیوں کریں؟"

"کیونکہ وہ تمہارا چچا ہے۔" اس نے ایک بھولی بسری حقیقت یاد کروائی۔

"مجھے وشواس نہیں ہے۔" وہ حیرت سے کہنے لگی۔

"تمہارے وشواس نہ کرنے سے حقیقت تو نہیں بدلے گی۔"

پھولن اور رام کلی سخت مخمصے میں مبتلا تھیں۔ رکمنی البتہ مزید سنجیدہ دکھائی دینے لگی تھی۔ اسے ان حقائق سے کافی حد تک آگاہی تھی۔

"وہ تو اتنا امیر ہے۔ اس کے پاس بہت سے نوکر چاکر بھی ہیں۔" پھولن نے اپنی الجھن کو گویائی دی۔

"اس کا چوبارہ پکا ہے۔" رام کلی نے بھی لقمہ دیا۔

"ہاں، ہم تو بالکل بھی اس جیسے نہیں ہیں۔ وہ ہمارا چچا کیسے ہو سکتا ہے؟" پھولن مضطرب تھی۔

دیوی دین گہری سانس بھر کے رہ گیا۔ اس نے اپنی اولاد کو ان دیرینہ خاندانی معاملات اور رنجشوں سے مکمل طور پر آگاہ نہیں کیا تھا۔ پھولن اور رام کلی کو اس کی یہ خاموشی کھلنے لگی۔

"بتاؤ نا باپو!" پھولن مصر ہوئی۔ "اگر وہ سچ مچ ہمارا چچا ہے تو ہمارا اپمان اور پٹائی کیوں کرتا ہے؟ اسے تو ہماری سہائتا کرنی چاہیے۔"

"پتا ہے باپو! وہ سارے گاؤں میں یہ کہتا پھرتا ہے کہ اس کی مصیبتوں کا کارن صرف ہم لوگ ہیں۔" رام کلی نے بتایا۔

"تم ان کو سچ کیوں نہیں بتاتے؟" مولہ نے تیکھی نظروں سے شوہر کی جانب دیکھا۔

"کیا بتاؤں؟" وہ بے بسی سے کہنے لگا۔ "کیا کیا بتاؤں؟"

"اس نے تمہاری زمین پر زبردستی قبضہ جما رکھا ہے۔ اس کے کارن ہم اچھے کپڑے پہن سکتے ہیں نہ ہی پیٹ بھر کے کھانا کھا سکتے ہیں۔ میں اپنی ساڑیاں کاٹ کر ان لڑکیوں کے کپڑے سیتی رہی ہوں۔" وہ تلخی سے گویا ہوئی۔

دیوی دین کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ان دونوں کی مائیں مختلف تھیں۔ بہاری کی امارت کا سبب یہی تھا کہ اس نے دیوی دین کے حصے کی تمام تر زمینوں اور مویشیوں پر اپنا تسلط جما رکھا تھا۔ وہ دیوی دین کو اپنے مرحوم والد کی اولاد تسلیم کرنے سے ہی انکاری تھا اس لیے گاؤں بھر میں علی الاعلان کہا کرتا۔

"جانے کس کا خون ہے یہ؟ جب اس کی ماں نے میرے باپو سے بیاہ رچایا تھا تو اسے بھی اپنے ساتھ ہی گھسیٹ لائی تھی۔"

"تو یہ تمہارا بھائی نہیں ہے؟" اہلِ علاقہ چٹخارہ لینے کی غرض سے دریافت کرتے۔

"بھگوان جانے کس کا پاپ ہے یہ۔" وہ تمسخر سے جواب دیتا۔

بہاری کے اس غاصبانہ تسلط اور متواتر ہرزہ سرائی کے بعد دیوی دین کے پاس قانونی چارہ جوئی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اپنے بڑھئی کے کام سے کمائے جانے والے پیسے مقدمہ بازی میں خرچ کر دیتا۔ کالپی کی مقامی عدالت نے دیوی دین کے حق میں فیصلہ سنایا تو بہاری نے بڑی عدالت میں مقدمہ دائر کر کے ان کی خوشیوں پر پانی پھیر دیا۔ "ادرائے" کی یہ عدالت بہت دور تھی۔ دیوی دین تاریخ پر جانے کے لیے علی الصباح گھر سے روانہ ہوتا اور تھکا ماندہ شام ڈھلے ہی لوٹ پاتا تھا۔

pklibrary.com

''یہ مقدمہ اور کب تک چلے گا؟'' مولہ کی آواز نے اسے اپنے خیالات سے چونکایا۔

''وکیل پیسے مانگ رہا ہے۔ میرے پاس اب ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔'' اس نے ایک سرد آہ بھری۔

مولہ ہونٹ بھینچ کر خاموش ہوگئی۔

''پتا ہے چھوٹی! مجھے جب بھی بھگوان کہیں دکھائی دیا تو میں اسے بتاؤں گی کہ اسے دھرتی پر ہر گھر میں پیسوں کا پیڑ اگانا چاہیے تھا۔'' پھولن نے سرگوشی میں چھوٹی بہن کو مخاطب کیا۔

''ہاں، ضرور بتانا۔'' رام کلی بھی دیوی دین کی اس آزردگی پر دلگیر تھی۔

☆☆☆

اس روز کے بعد پھولن، دیوی دین کی ہر ایک جنبش کا بغور جائزہ لینے لگی۔ وہ اس کی خاموشی، اضطراب اور خلا میں کسی نادیدہ نکتے کی جانب تکتے رہنے کا محرک بھی سمجھ گئی تھی۔ اسے بہاری سے مزید نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔

''گدھ کہیں کا۔'' وہ اسے دیکھتے ہی جلبلانے لگتی۔

''اگر بہاری ہمارے باپو کا بھائی ہے تو پھر یہ بھی ملاح ہی ہوا نا؟'' رام کلی اپنی دانست میں دور کی کوڑی لائی۔

''ہاں چھوٹی! یہ ظالم بھینسا ملاح ہی ہے۔'' اس نے نفرت سے زمین پر تھوکا۔ ''ہماری زمین اور پیسوں پر قبضہ کر کے خود کو ٹھاکر سمجھنے لگا ہے۔''

''کل رات ماں، رکمنی دیدی کو بتا رہی تھی کہ باپو کو سرپنچ نے پنچایت میں بلایا ہے۔'' رام کلی نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''مجھے تو اس سرپنچ پر بھی وشواس نہیں ہے۔'' پھولن نے ایک توقف کے بعد کہا۔ ''وہ بہاری سے ہمارے لیے کیوں لڑے گا؟''

پھولن کا یہ اندازہ بالکل درست تھا۔ سرپنچ نے دوٹوک انداز میں دیوی دین کو ایک راہ سجھائی۔

''تمہیں بہاری کے خلاف مقدمہ واپس لے لینا چاہیے۔''

''لیکن کیوں؟ اس نے میری زمین پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ اس سے بھی زیادہ تکلیف تو اس بات سے ہوتی ہے کہ وہ مجھے اپنے باپو کی سنتان ہی نہیں سمجھتا۔''

''اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے دیوی دین!'' سرپنچ نے رسان سے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تجھے تیری ماں بیاہ کے سمے اپنے ساتھ نہیں لائی تھی۔ تو بہاری کا ہی سوتیلا بھائی ہے۔''

دیوی دین کی آنکھوں میں تشکرانہ نمی چھلکنے لگی۔

''تم نے اپنی بیٹیوں کے بارے میں کبھی سوچا ہے؟'' سرپنچ نے اپنایت جتائی۔ ''ان کے بیاہ کی چنتا کرو۔''

''مجھے ان کی بہت چنتا ہے۔'' اس نے بلا تامل جواب دیا۔ ''میں بہت جلد رکمنی کا بیاہ کر دوں گا۔''

''چار بیٹیوں کا داج کیسے پورا کرو گے؟'' سرپنچ نے اسے حقیقت کا آئینہ دکھایا۔ ''پیسے مقدمے پر ہی خرچ کرتے رہو گے تو داج کے لیے پھوٹی کوڑی نہیں بچے گی۔''

دیوی دین سناٹے کی زد میں آ گیا۔ وہ سرپنچ کی اس طلبی اور تمہید کا اصل محرک سمجھ گیا تھا۔

''بھگوان کے لیے مجھے انیائے دلوا دو سرپنچ جی!'' اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''بے وقوف مت بنو۔ تم بہاری سے ٹکر نہیں لے سکو گے۔'' سرپنچ نے رکھائی سے بتایا۔

دیوی دین کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ آگہی کا لمحہ تھا۔ دیوی دین کو بھی یہ حقیقت سمجھ آ گئی تھی کہ گاؤں کے سبھی سرکردہ افراد بہاری کے ہاتھ مضبوط کرتے رہیں گے۔ اس کی شنوائی کہیں بھی نہ ہو پائے گی۔

اس نے گھر واپسی کے بعد مولہ کو صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ بھنا کر رہ گئی۔

''یہ لوگ تمہاری نرمی سے یونہی فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ تمہاری یہ نرمی کائرتا ہے۔ تم ایک کائر انسان ہو۔''

دیوی دین بیوی کی اس زہریلی باتوں پر خاموشی سے سر جھکانے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا۔

''تم گاؤں والوں کے پاس کیوں نہیں جاتے؟'' مولہ نے ایک توقف کے بعد اسے راہ سجھائی۔

''میں کئی بار ان سب کی منت کر چکا ہوں کہ تم لوگ میرے ملاح بھائی ہوتے عدالت میں ایک بار گواہی دے دو کہ میں اپنے باپ کا سگا بیٹا ہوں۔'' وہ بلبلا اٹھا۔

''کیا ان میں سے کوئی ایک بھی سچ بولنے کے لیے تیار نہیں ہے؟'' مولہ نے شکستگی سے دریافت کیا۔

''نہیں، وہ سب بہاری سے ڈرتے ہیں۔ وہ سچ جانتے ہیں لیکن میرے لیے کبھی آواز نہیں اٹھائیں گے۔ اگر کسی نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی تو بہاری اسے اپنے پالتو غنڈوں سے پٹوا دے گا۔''

''بھگوان کرے اسے کیڑے کھائیں۔'' پھولن نے نفرت سے کہا۔

اسی اثنا میں بہاری کی آواز نے انہیں بے طرح چونکا دیا۔ وہ دیوی دین سے ملاقات کے لیے آیا تھا۔ اس کے

pklibrary.com

چہرے کی مسکراہٹ اور آنکھوں میں نمی ایک ناقابلِ یقین منظر تھا۔

''کیا لینے آئے ہو یہاں؟'' مولہ نے رکھائی سے اسے مخاطب کیا۔

''میں اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہوں۔'' وہ ندامت سے ہونٹ کچلتے ہوئے کہنے لگا۔

''کام کی بات کرو بہاری!'' دیوی دین نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''دیکھو میرے بھائی! اس مقدمے بازی میں کچھ نہیں رکھا۔ یہ وکیل لوگ بہت ظالم ہوتے ہیں۔ یہ اپنے پیسوں کے لیے مقدمہ لٹکاتے رہیں گے۔ مجھے تمہاری بچ میں بہت چنتا ہوتی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ رکمنی کا بیاہ بھی سر پر ہے۔ تمہیں اس سے پیسوں کی زیادہ ضرورت ہوگی۔''

بہاری کی اس بات اور اندازِ تخاطب پر دیوی دین پیچ گیا۔

''اگر تم اس مقدمے کو بھول جاؤ تو میں تمہیں ساٹھ بیگھے زمین دینے کے لیے تیار ہوں۔'' اس نے پیشکش کی۔

دیوی دین کی آنکھوں میں نیم رضامندی جھلکنے لگی۔

''تم اگلی پیشی پر عدالت میں نہیں جاؤ گے۔'' بہاری نے مطالبہ کیا۔

''اور میری زمین؟'' وہ مضطرب ہوا۔

''میں کاغذ تیار کرواتا ہوں۔ بس تم اپنا انگوٹھا لگا دینا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دیوی دین کی آنکھوں میں خوابوں کے جگنو دمکنے لگے۔ اس نے اگلی پیشی پر عدالت میں حاضری درخور اعتنا نہ سمجھی۔ اب اسے شدت سے کاغذات پر انگوٹھا لگانے کا انتظار تھا۔ ان خوابوں کا شیش محل زیادہ دیر تک سلامت نہیں رہ سکا تھا۔ بہاری نے اسے دیکھتے ہی حیرت سے کہا۔

''دیوی دین! آج تمہارے مقدمے کی باری تھی۔ تم وہاں پہنچے کیوں نہیں؟''

''میری زمین کے کاغذ تیار ہو گئے یا نہیں؟'' اس نے ہذیانی انداز میں دریافت کیا۔

''کون سی زمین؟ میرے پاس تو اپنے باپو کی زمینیں ہیں۔ تم اس میں بھاگیدار کیسے بن سکتے ہو؟''

بہاری کی اس طوطا چشمی نے دیوی دین کے وجود کو مزید شکستہ کر دیا۔ اسے اپنی کمر پہلے سے بھی زیادہ خمیدہ محسوس ہونے لگی۔ پھولن کے دل میں بہاری کے لیے نفرت وعناد میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

☆☆☆

پھولن، مولہ کا کھیتوں میں ہاتھ بٹانے کے بعد گھر لوٹی تو رکمنی کے بشرے میں اضطراب محسوس کر کے ٹھٹک گئی۔

''کیا بات ہے دیدی؟'' اس نے دریافت کیا۔

''آج برہمن آیا تھا۔'' رکمنی نے سرگوشی میں بتایا۔

پھولن کا حلق کڑوا ہو گیا۔ برہمن گاؤں کا پنڈت تھا۔ اس گاؤں میں دو مندر تھے۔ کالی کے مندر میں دیوی دین بھی چڑھاوا چڑھانے اور کالی دیوی سے پرارتھنا کے لیے جایا کرتا تھا۔ دوسرے مندر کی آرائش وزیبائش ہی شاندار تھی۔ شیوا کے اس مندر میں امراء منتیں ماننے اور اپنی دولت وثروت کے لیے شکر گزاری کا اظہار کرتے تھے۔ برہمن انہی مندروں کی دیکھ بھال پر مامور تھا۔ وہ گاؤں کے بچوں کی تعلیم کے لیے کوشاں رہتا تھا۔

''باپو نے اس کی بات مان لی ہے کیا؟'' اس نے ڈرتے ہوئے استفسار کیا۔

''تمہیں باپو کی اچھا پتا تو ہے۔'' رکمنی نے گہری سانس لی۔ ''بہاری چچا کی اس سازش کے بعد وہ اپنی سنتان کو عدالت میں کام کرتے دیکھنا چاہتا ہے۔''

پھولن کا حلق خشک ہونے لگا۔ وہ دیوی دین کی اس خواہش اور محرکات سے بخوبی واقف تھی تاہم اسے کچھ سال پہلے پڑھائی لکھائی کا سابقہ تجربہ بھی تا حال فراموش نہیں ہوا تھا۔ اس وقت پھولن کی عمر بہ مشکل پانچ برس تھی۔ قد وقامت اتنا بھی بلند نہ تھا کہ وہ بھینس کے تھنوں کو چھو سکتی۔ دیوی دین نے اسے اپنے مخصوص شفیق انداز میں مخاطب کرتے ہوئے بتایا۔

''میرے ساتھ چلو پھولن! ہم نے ایک بہت ضروری کام کے لیے جانا ہے۔''

''کہاں جانا ہے باپو؟'' وہ خوشی سے اچھل پڑی۔

''میں تمہیں اسکول لے کر جا رہا ہوں۔''

''وہاں کیا ہوتا ہے باپو؟'' اس نے اپنی آنکھیں پٹپٹائیں۔

''برہمن تمہیں بولنا اور پڑھنا سکھائے گا۔ تم بہت دھیان سے اس کی باتیں سننا۔ وہ تجھے ہر روز سبق یاد کرنے کے لیے دے گا، اسے یاد کر لینا۔'' دیوی دین نے آسان الفاظ میں سمجھایا۔

پھولن ان باتوں پر الجھ کر رہ گئی۔ اسے باپو کی کوئی بھی بات سمجھ نہیں آئی تھی۔ دیوی دین نے اس کا ہاتھ تھاما اور مختلف رستوں سے چلتا ہوا اس رستے پر چلا آیا جو پردھان کے گھر جاتا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ لکڑی کے ایک بڑے سے پھاٹک کے آگے رک گیا۔ اس پھاٹک پر لکھے گئے الفاظ

pklibrary.com

''پرائمری اسکول'' پھولن کے لیے بالکل نامانوس تھے۔
''یہاں تم پڑھنا، لکھنا اور گنتی کرنا سیکھو گی۔'' دیوی دین نے بتایا۔
اس کے بعد پھولن کی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوگیا۔ وہ دیگر بچوں کے ہمراہ پردھان کے صحن میں پختہ فرش پر بیٹھ جایا کرتی۔ ان سبھی بچوں کو ایک ایک کتاب فراہم کردی جاتی۔ اس کتاب پر بنی تصویریں پھولن کے لیے خاصی دلچسپی کا باعث تھیں لیکن اگلا مرحلہ شروع ہوتے ہی اس کا دل ڈوبنے لگتا۔ اسے برہمن کے اندازِ تدریس سے خوف محسوس ہوتا تھا۔ برہمن اپنی چھڑی سے تختۂ سیاہ پر لکھے ہوئے الفاظ کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہتا۔
''پڑھو..... ایک..... دو..... تین..... چار..... پانچ۔''
پھولن اور کئی دیگر بچے حروف شناسی میں بہت غبی تھے۔ برہمن اپنی عصیلی طبیعت کے زیر اثر چند ہی لمحوں میں سخ پا ہونے لگتا۔ وہ انہیں گالیاں دیتا، چھڑی سے ٹھوکے مارتا اور مزید غصے کی صورت میں ان بچوں کے سر آپس میں ٹکرا دیتا۔ جوؤں کی بہتات کے باعث بچوں میں اکثریت کے سر مونڈے ہوئے تھے۔ گنجے سر ٹکرانے کے باعث بچوں کو سخت درد محسوس ہوا کرتا۔ اس پر برہمن کی چنگھاڑ نما آواز خوف و دہشت کا سبب بن جاتی۔
''پڑھو..... ایک..... دو..... تین..... چار..... پانچ۔'' وہ طیش سے بے قابو ہونے لگتا۔
اس پُرتشدد عمل کے نتیجے میں پھولن کی قوتِ مدافعت بہت جلد کمزور ہوگئی۔ اس نے پڑھائی لکھائی کو مکمل طور پر خیرباد کہہ دیا تھا اور اب رکمنی سے برہمن کی دوبارہ آمد کا ذکر سنتے ہی اس کے اوسان خطا ہونے لگے۔
''دیدی! بھگوان کے لیے میری سہائتا کرو۔ میں وہاں نہیں جانا چاہتی۔'' اس نے بڑی بہن کا بازو تھام لیا۔
''باپو کی اچھا ہے پھولن! وہ چاہتے ہیں کہ کسی ایک کو وکیل بنا دیں۔'' رکمنی نے آزردگی سے بتایا۔
''چھوٹی کو پڑھا لیں..... شیونارائن کو وکیل بنا دیں۔ میں ان کے حصے کا بھی کام کردیا کروں گی۔''
پھولن کی اس ہذیانی کیفیت نے رکمنی کو ششدر کردیا۔ وہ ایک توقف کے بعد کہنے لگی۔
''اچھا، چنتا نہ کرو۔ میں ماں سے بات کروں گی۔ وہ باپو کو سمجھا لے گی کہ کھیتوں میں بہت کام ہوتا ہے۔ پھولن کا وہاں رہنا ضروری ہے۔'' اسے بالآخر ایک راہ سجھائی دے گئی۔
پھولن یہ سنتے ہی پُرسکون ہوگئی۔ اسے علم تھا کہ رکمنی کی متوقع شادی کے باعث مولہ اس کی بات کم ہی ٹالتی تھی۔

☆☆☆

شب و روز کے اس سفر میں ہر ایک فرد کی مصروفیات میں اضافہ ہو رہا تھا لیکن حالات میں بہتری آ کے ہی نہ دے رہی تھی۔ دیوی دین نے شکستگی کے باوجود خود کو کولہو کا بیل بنا رکھا تھا۔ وہ دن بھر کام کرتا۔ بسا اوقات کسی امیر زمیندار کے کھیت ادھار پر لیتے ہوئے ان میں ہل چلاتا، بیج بوتا اور فصل تیار ہوجانے کے بعد اس میں سے اپنا حصہ لے لیتا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ یہ حصہ توقع یا معاہدے کے مطابق نہیں ہوتا تھا۔ فصل اچھی نہ ہو پانے کی صورت میں اس حصے کا تناسب مزید کم ہوجاتا۔
کسان کے فرائض سرانجام دینے کے علاوہ وہ بہ وقتِ ضرورت ''راج'' اور ''بڑھئی'' بھی بن جاتا۔ اسے لکڑی سے عمدہ قسم کی چیزیں بنانے کا فن آتا تھا۔ وہ کھاٹ، دروازے اور ناؤ جیسی اشیا بھی بہ آسانی بنا لیتا تھا لیکن اس عمدہ اور نفیس کام کے باوجود معاوضے میں آٹے کا ایک ہی پیالہ ملتا تھا۔ اس کے باوجود دیوی دین صبر اور جدوجہد کا دامن تھامے رکمنی کی شادی کے لیے پائی پائی جوڑنے کے لیے کوشاں تھا۔
''کل میں تیونگا جاؤں گا۔'' اس نے مولہ کو بتایا۔
تیونگا، جمنا کے پار ایک گاؤں تھا جہاں رکمنی کے اہلِ سسرال مقیم تھے۔
''وہ ہمارے واج کے لیے مان جائیں گے کیا؟'' مولہ نے خدشہ جتایا۔
''آشا تو ہے۔'' دیوی دین نے بوجھل سانس لی۔ ''میں پانچ ہزار روپے، ایک گائے، ایک بھینس اور برتن دینے کا وچن کر آؤں گا۔''
مولہ کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں لرزنے لگیں۔ اسے علم تھا کہ دیوی دین اپنی استطاعت سے بڑھ کر ہی جہیز کا سامان تیار کر رہا ہے۔ اس نے اگلے روز سخت لو اور گرد سے خاکستری رنگت اوڑھ لینے والے زمین و آسمان سے بے نیاز تیونگا کے سفر کا آغاز کردیا۔ باپ کے روانہ ہوتے ہی پھولن اور رام کلی دریا پر جانے کی بابت سرگوشیوں میں منصوبہ بندی کرنے لگیں۔
''میں سب سمجھتی ہوں کہ تمہارے من میں کیا چل رہا ہے۔'' مولہ نے انہیں گھورا اور پھولن سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ''گوبر کون اکٹھا کرے گا؟ رکمنی گیہوں پیسنے میں مصروف ہے۔ تم ترنت ٹوکری اٹھاؤ اور گوبر لے آؤ۔''

پھولن کو بھی علم تھا کہ دریا پر جانے کی اجازت لینے کے لیے مولہ کی ایسی دسیوں باتیں ماننا ضروری ہیں۔ اس نے بلا تامل گوبر اٹھانے کا کام خوش اسلوبی سے نمٹا دیا۔ مولہ نے بھی فیاضی سے انہیں روانگی کی اجازت دے دی تاہم حسب عادت چند ہدایات دینا نہیں بھولی تھی۔

''کسی پرائے بندے سے بات نہیں کرنی۔ پردھان کے پاس تو بالکل مت جانا۔''

پھولن نے بے دھیانی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسے اپنی ماں کے خدشات کی اصل ماہیت سے آگاہی نہ تھی۔ پردھان عورتوں اور بچیوں پر بدنظری کا مرتکب ہوا کرتا تھا۔ اسے اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل میں کسی کا خوف تھا نہ ہی لحاظ۔ اس نے گاؤں میں کئی خواتین اور بچیوں کی عصمت دری کی تھی۔ پھولن صرف اسی امر سے خوش و بے نیاز تھی کہ بہاری گزشتہ کئی ماہ سے سانس کی کسی بیماری میں مبتلا تھا۔ وہ ان پر آوازے کسنے کی کوشش کرتا تو اس کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز ہی نکل پاتی تھی۔ ان دنوں اس نے پھولن اور رام کلی پر چیخنا چلانا ترک کر رکھا تھا۔

''پھولن! تم سن رہی ہو نا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں؟'' مولہ نے گھرکا۔

''ہاں، میں جانتی ہوں۔'' وہ فوراً متوجہ ہوئی۔ ''اگر کوئی ہمیں چھونے کی کوشش کرے یا اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کہے تو اس کی بات نہیں ماننی۔ اگر کوئی ہمیں پیسے دینا چاہے تو ترنت گھر آ کر بتانا ہے۔ اگر ہم نے تمہاری یہ باتیں نہ مانیں تو تم ہمارے ٹکڑے کر کے ہمیں دریا میں پھینک دو گی۔''

مولہ کے چہرے پر اطمینان کے رنگ بکھر گئے۔

''چھوٹی کا خیال رکھنا۔ اسے اپنی نظروں کے سامنے ہی رکھنا۔''

پھولن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے رام کلی کا ہاتھ تھاما اور دریا کی طرف دوڑ لگا دی۔

☆☆☆

دیوی دین اور مولہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ رکمنی کی شادی بالآخر طے ہو گئی تھی۔ اس کے سسرال نے پانچ ہزار روپے، ایک بھینس، ایک گائے اور برتنوں پر مشتمل جہیز کے عوض شادی پر ہامی بھر لی تھی۔ اس خوشی و فرحت میں مولہ کی رنگت گاہے بگاہے متغیر ہونے لگتی۔

''چنتا کیوں کرتی ہے، بھگوان سب بھلی کرے گا۔'' دیوی دین نے اسے دلاسا دیا۔

''کہیں اس بار بھی کوئی اپ شگون نہ ہو جائے۔ مجھے اس کمبخت بہاری پر بالکل وشواس نہیں ہے۔'' مولہ شدید مضطرب تھی۔

دیوی دین کی آنکھوں میں بھی بے بسی نما اذیت ہلکورے لینے لگی۔ وہ اہلیہ کے ان خدشات کے پس منظر سے بخوبی واقف تھا۔ بہاری نے ماضی قریب میں اپنی فطرت سے مجبور ہو کر رکمنی کی شادی میں کئی بار روڑے اٹکائے تھے۔

''مجھے تو آج بھی کانپور سے آنے والی اس برات کے انتظار کی تکلیف نہیں بھولی۔ رکمنی بھی کتنی خوش تھی اس دن۔'' مولہ نے سرد آہ بھری۔

''ہاں، برات تو یہاں آنے کے لیے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ دُلہا براتیوں کے آگے گھوڑی پر سوار تھا۔'' دیوی دین کے لہجے میں نمناک حسرت تھی۔

''لیکن اس بہاری نے ہمارے گاؤں کی طرف مڑنے سے پہلے ہی برات کو کالپی کی بڑی سڑک پر روک لیا۔'' مولہ دانت کچکچاتے ہوئے کہنے لگی۔

اسے بعد ازاں گاؤں کے چند لوگوں نے حقیقت سے آگاہ کیا تھا کہ بہاری اور پردھان ایک مشترکہ سازش کے تحت چند پولیس اہلکاروں کے ہمراہ وہاں پہنچے تھے۔ انہوں نے دُلہا کے والدین کی سماعت میں زہر انڈیلتے ہوئے کہا تھا۔

''تم لوگوں کے ساتھ دھوکا ہو رہا ہے۔ دیوی دین کی بیٹی تو ابھی شادی کے لائق ہی نہیں۔ وہ بیٹی کا سودا کر رہا ہے۔ لڑکی قانونی طور پر شادی کے قابل نہیں ہے۔ اس کا باپ تو لالچ میں اندھا ہو گیا ہے لیکن میں اپنی بھتیجی کا جیون نرک کیسے بننے دوں؟''

دُلہا کے والدین نے اپنی شرافت اور صلح جو طبیعت کے باعث خاموشی سے واپسی کی راہ لے لی۔ بہاری نے یہ مذموم کوشش پہلی بار نہیں کی تھی۔ وہ اس سے قبل بھی دو بار اسی حرکت کا مرتکب ہو چکا تھا۔ اس نے اہلِ علاقہ کو واضح لفظوں میں دھمکاتے ہوئے کہا تھا۔

''رکمنی کی شادی کے لیے دیوی دین کو ایک پھوٹی کوڑی بھی ادھار مت دینا۔ وہ تم لوگوں کا پیسا کبھی واپس نہیں کرے گا۔''

اس دھمکی اور انتباہ کے نتیجے میں دیوی دین جہیز کی مطلوبہ رقم جمع کرنے سے قاصر رہا تھا۔ نتیجتاً طے شدہ شادی منسوخ کر دی گئی۔

''تم نے اس بار لڑکے والوں کو بتا دیا ہے نا کہ رکمنی سے پہلے ہمارے تین بچے بھگوان کو پیارے ہو گئے تھے۔''

pklibrary.com

مولہ کے دل میں ایک اور اندیشہ سر سرایا۔

''ہاں، بتا دیا تھا۔'' دیوی دین نے اسے دلاسا دیا۔

''اس بار بہاری کسی کو یہ نہیں کہہ سکے گا کہ ہم نے رکمنی کو گود لیا تھا۔ وہ ہماری بیٹی نہیں ہے۔''

''اب اگر بہاری نے میری بیٹی کی خوشیاں چھیننے کی کوشش کرنی چاہی تو وہ سہہ نہیں پائے گی۔'' مولہ مضطرب تھی۔

اسے رکمنی کی ذہنی کیفیت کا بخوبی اندازہ تھا۔ وہ تیسری بار شادی منسوخ ہوجانے کے بعد بدنامی کے خوف سے خود کو نذرِ آتش کر دینے کے درپے ہوگئی تھی۔

''پتا نہیں وہ یہ سب کیوں کرتا ہے؟'' دیوی دین نے تاسف سے سر ہلایا۔

''تم تو اپنے سوتیلے بھائی کے پریم میں اندھے ہو چکے ہو۔ تمہیں ایک چھوٹی سی بات سمجھ نہیں آتی کہ اس کے دل میں ڈر ہے۔ رکمنی کا بیاہ کسی اچھے پریوار میں ہوگیا تو وہ ہم پر رعب نہیں جما سکے گا۔ اسے ہماری زمین بھی واپس کرنی پڑے گی۔'' مولہ نے اسے حقیقت کا آئینہ دکھایا اور کسی سوچ کے تحت کہنے لگی۔

''تمہیں ایک بار پھر تیونگا جانا ہوگا۔ سمدھیوں کو بتا دو کہ لڑکی کا چچا ایک راکھشس ہے۔ وہ اس کے بیاہ میں اڑچن ڈالتے رہنا چاہتا ہے۔''

''میں نے انہیں اپنے طریقے سے یہ بات کہہ دی تھی۔ وہ بہاری کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ انہوں نے وچن دیا ہے کہ اس رشتے سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔'' اس نے بتایا۔

''تم نے شاید جیون میں پہلی بار کوئی بدھی والا کام کیا ہے۔'' وہ پُرسکون ہوگئی۔

☆☆☆

شادی کا دن بالآخر آ گیا تھا۔

دیوی دین اور مولہ سب کام خوش اسلوبی سے نمٹ جانے کے لیے دعا گو اور کوشاں تھے تو دوسری جانب رکمنی، پھولن اور رام کلی بے حد خوش تھیں۔ اس روز رکمنی نے پہلی بار اپنے دلہا کو دیکھا۔ اسے اپنے روح و قلب میں ایک عجیب سنسنی و سرشاری امڈتی محسوس ہونے لگی۔ دلہا گھوڑی پر بیٹھ کر برات لایا تھا۔ اس کا لباس بہت خوبصورت تھا۔ سر پر گلابی پگڑی اور سہرا بھی الگ ہی چھب دکھا رہے تھے۔ پیشانی پر سیندور اور پہلو میں تلوار کی دید سے مرعوبیت محسوس ہونے لگی تھی۔

براتی دلہا کی گھوڑی کے پیچھے ہم رکاب تھے۔ اس کے سنگی ساتھی ڈھول باجے والوں کے آگے آگے ناچ گانے میں مگن تھے۔ دیوی دین کے گھر آمد سے قبل وہ شگون کے لیے مندر کی جانب مڑ گئے۔

پھولن کی خوشی بے بہا تھی۔ اس کی نظریں رکمنی سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ رکمنی بلاشبہ ان سب بہنوں میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی لیکن اس روز اس کا روپ دو آتشہ تھا۔ مولہ نے اسے عروسی ساڑی پہنا کر خوب سنگھار کیا تھا۔ کلائیوں میں چوڑیاں، ناک، کان اور ماتھے پر سجے زیورات نے اس کی زیبائش قابلِ دید بنا دی تھی۔

''دیدی! تم اس گاؤں کی سب سے سندر دلہن ہو۔'' پھولن نے محبت سے اس کی جانب دیکھا۔

''سچی میں؟'' رکمنی شرمائی۔

''بالکل سچی میں۔'' رام کلی نے کہا۔ ''گاؤں میں ایسی سندر دلہن آج تک کسی نے دیکھی ہی نہیں ہوگی۔''

اسی اثنا میں برات کی آمد کا غلغلہ بلند ہوگیا۔ دیوی دین اور مولہ نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ مولہ نے اپنے ہاتھ میں ایک بڑا سا تھال تھام رکھا تھا جس میں چاول، پھول، پتیاں اور سیندور تھا۔ اس نے تھال کو دلہا کے سر کے گرد تین بار گھمایا اور پھر چٹکی بھر سیندور اس کی پیشانی پر سجا دیا۔ اس رسم کے بعد مولہ نے اپنے داماد پر چاول اور پھول پتیاں نچھاور کر دیں۔

پھولن اپنے بہنوئی کی شخصیت اور خوبروئی سے بے حد متاثر ہوئی۔

''جیجا جی اور دیدی کی جوڑی بہت سندر لگے گی۔'' اس نے رام کلی سے سرگوشی میں کہا۔

''ہاں، آج تو بہاری کی سبھی چالیں ناکام ہوگئیں۔'' رام کلی نے حظ اٹھایا۔

''اس سے اس کا چہرہ دیکھنے والا ہوگا۔'' پھولن پردۂ تصور پر اس کا طیش و جھنجلاہٹ محسوس کرنے لگی۔

براتیوں کو کھانا پروسنے کا آغاز ہو چکا تھا۔ کھانے سے فراغت ملتے ہی دلہا اور دلہن کو کیلے کے چار سرسبز پتوں سے بنائی گئی ایک چٹائی پر ساتھ ساتھ بٹھا دیا گیا۔ ان کے سروں پر پھول اور ہاروں پر مشتمل ایک چھتری تان دی گئی تھی۔ رکمنی عروسی ساڑی میں لپٹی تھی۔ اس کا چہرہ پلو سے ڈھانپا گیا تھا۔ مہندی سے سجی ہتھیلیوں کے علاوہ بدن کا کوئی بھی حصہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پنڈت نے آگ روشن کی اور مخصوص جاپ کرنے لگا۔ اس جاپ کے دوران رکمنی اور دلہا نے آگ کے گرد سات پھیرے لینے کا آغاز کر دیا۔ دلہا

ہر پھیرے کے دوران اپنی دلہن کی حفاظت اور دکھ سکھ میں ہمیشہ ساتھ نبھانے کا عہد نبھا رہا تھا۔

پھیرے مکمل ہوتے ہی دیوی دین کے عزیز و اقارب نے رکمنی کو تحائف دینے کا آغاز کر دیا۔ دیوی دین اپنی خمیدہ کمر لیے آگے بڑھا اور لرزتے ہاتھوں سے رکمنی کے ہاتھوں پر پسی ہوئی ہلدی ملتے ہوئے اس کا ہاتھ دلہا کے ہاتھ میں دے دیا۔

کنیادان کی یہ رسم مکمل ہوتے ہی دلہن کی راہنمائی کرنے والی نائن نے پہلی بار اس کا گھونگھٹ اٹھایا۔ یہ دلہا کے لیے ایک اشارہ تھا کہ اب وہ اپنی دلہن کی مانگ میں سیندور بھر سکتا ہے۔ اس رسم کے ختم ہوتے ہی باجے بجنے اور شور مچنے کا آغاز ہو گیا۔ براتی خوشی و جوش سے رقص میں مصروف ہو گئے۔ پھولن کو یہ سب رسومات بہت لطف دے رہی تھیں۔ اس کی نگاہیں اپنے بہنوئی پر ہی مرکوز تھیں۔ اسے اس مختصر عرصے میں ہی اس قدر لگاؤ ہو گیا تھا کہ وہ اس کی دھوتی کا پلو تھامے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ رکمنی بھی خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ اسے اب ایک مخصوص مدت کے بعد سسرال رخصت کر دیا جانا تھا۔

دیوی دین کے آنگن نے پہلی بار اتنے شاداں و فرحاں لمحات دیکھے تھے۔

☆☆☆

شادی کی رسومات ختم ہوتے ہی معمولاتِ زندگی کا ازسرِنو آغاز ہو گیا۔ اس روز پھولن اور رام کلی کو شام کے وقت جنگل روانہ ہونا تھا۔ انہیں جنگل سے زیادہ بہاری کے گھر کی راہ گزر خوفناک محسوس ہوتی تھی لیکن مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق یہ مسافت بہرصورت طے بھی کرنا تھی۔

''بیدی! یہاں سے بھاگ چلو۔'' رام کلی نے سرگوشی کی۔ ''وہ راکھشس ہمیں ہی گھور رہا ہے۔''

پھولن کی نگاہیں البتہ کچھ اور ہی دیکھ رہی تھیں۔ اس وقت بہاری کی آنکھوں میں مخصوص غیظ و غضب اور حقارت مفقود تھی۔ اس نے خرخراتی ہوئی آواز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''پھولن! یہاں آؤ۔''

''کہیں اس نے ہماری بات تو نہیں سن لی؟'' وہ مضطرب ہوئی۔

''میں نے اسے راکھشس کہا تھا۔ اب یہ چھڑی سے مجھے پیٹے گا۔'' رام کلی کے بدن میں لرزش پیدا ہونے لگی۔

''یہاں آؤ پھولن!'' اس نے ایک بار پھر وہی الفاظ دہرائے۔

پھولن کے قدم ساکت ہو گئے۔ بہاری کی آواز میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اسے ٹھٹکا رہی تھی۔

''دیدی! یہ پہلے تو ایسے نہیں بولتا تھا۔ اس کی آواز اتنی عجیب کیوں ہو گئی ہے؟'' رام کلی نے بھی یہ تبدیلی محسوس کر لی تھی۔

''لگتا ہے اس بار کی بارشوں نے اسے بہت بیمار کر دیا ہے۔'' اس نے قیاس کیا۔

''میں اندر نہیں جاؤں گی۔ مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔'' وہ آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ تھی۔

''چنتا نہ کرو۔ اب وہ ہمیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہماری رکھشا کے لیے دیدی کے سسرال والے موجود ہیں۔'' پھولن نے اس کی ہمت بندھائی۔ ''میں اندر جاتی ہوں، تم یہیں کھڑی رہو۔ اگر اس نے مجھے پیٹنے یا کچھ کہنے کی کوشش کی تو تم ترنت بھاگ کر کسی کو بلا لانا۔''

رام کلی نے تعمیلی انداز میں سر ہلایا۔ پھولن اب نہایت احتیاط سے قدم اٹھاتی اندرونی سمت بڑھنے لگی۔

''پھولن! میری پیاری بھتیجی، بھگوان کا شکر ہے کہ تم آ گئیں۔ مجھے بہت پیاس لگی ہے، پانی پلا دو۔'' وہ خرخرایا۔

بہاری کے اس اندازِ تخاطب نے اسے ششدر کر دیا۔ اس کے لب و لہجے میں ایسی بے بسی اور شفقت پہلی بار محسوس ہوئی تھی۔ وہ چوکنا ہو کر صحن اور کمروں کا جائزہ لینے لگی۔ گھر میں اس وقت کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اپنے کمرے کے باہر کھاٹ پر لیٹا بہاری بھی بخار میں پھنک رہا تھا۔ بہاری نے اسے اپنے سامنے دیکھ کر پرنام کے انداز میں ہاتھ جوڑ دیے۔ پھولن بھی شدید حیرت کے زیرِ اثر روایتی انداز میں اس کے پاؤں چھونے لگی تاہم دل و دماغ میں ہنوز یہ خوف جاگزیں تھا کہ بہاری اسے دبوچ کر پیٹنے لگے گا۔

''کیا ہوا چچا! تمہاری طبیعت ٹھیک معلوم نہیں ہو رہی ہے؟'' اس نے دریافت کیا۔

''مجھے دمے کا دورہ پڑا ہے۔'' بہاری کے حلق سے شدید خرخراہٹ برآمد ہوئی۔ ''بھگوان کا واسطہ ہے، مجھے پانی پلا دو۔''

پھولن کے ہاتھ میں طہارت کے پانی والا ایک لوٹا تھا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا ہو گئی۔

''کیا گھر میں کوئی بھی نہیں ہے؟''

بہاری نے اذیت سے نفی میں سر ہلا دیا۔

''میں تو جنگل جا رہی تھی۔ تمہیں گھر سے پانی لا دیتی

ہوں۔ یہاں کنوئیں کو چھولیا تو تمہارے گھر والے مجھے جان سے ہی مار دیں گے۔"

"اپنے باپو کو بھی بلا لانا۔" اس کا تنفس بے طرح پھولنے لگا۔

پھولن نے اثبات میں سر ہلایا اور رام کلی کے ہمراہ برق رفتاری سے گھر روانہ ہوگئی۔ بہاری کی حالتِ زار کا علم ہوتے ہی دیوی دین بے طرح مضطرب ہوگیا۔

"تم اسے وہیں سے پانی پلا دیتیں پھولن!" وہ کراہا۔

"مجھے اس کے سب گھر والوں سے خوف آتا ہے باپو!" اس نے اعتراف کیا۔

"تم کہیں نہیں جاؤ گے۔" مولہ اپنے شوہر کو خشمگیں نگاہوں سے گھورنے لگی۔

"میرا جانا بہت ضروری ہے۔ شاید وہ مجھ سے زمین کی کوئی بات کرنا چاہتا ہو۔" دیوی دین نے قیاس کیا۔

"وہ ایک چور، فریبی اور دغاباز منش ہے۔ تم ہی جانے کیوں ہر بار اس پر وشواس کرلیتے ہو؟" وہ بھڑک گئی۔

دیوی دین اسے نظر انداز کرتے ہوئے دونوں لڑکیوں کے ہمراہ بہاری کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

"باپو! اگر وہ زمین لوٹانے کی بات کرے تو سونا بیگھے مانگ لینا۔" پھولن نے تجویز دی۔

رام کلی بھی زمین کی ملکیت اور بہاری کی موت کے ممکنہ تصور سے بہت خوشی محسوس کررہی تھی۔

"اپنے من کو لالچ سے پوتر رکھو پھولن!" دیوی دین نے رسان سے سمجھایا۔ "بھگوان کی جو اچھا ہوئی، ہمیں اتنی زمین مل ہی جائے گی۔"

پھولن پر اس نصیحت کا چنداں اثر نہ ہوا۔ وہ بھی پردۂ تصور پر بہاری کی موت اور زمین کے حصول کا منظر دیکھنے لگی تھی۔ اسی اثنا میں وہ سب بہاری کے گھر پہنچ چکے تھے۔ دیوی دین نے اسے فرش پر اوندھے پڑے دیکھا تو بے تابی سے اس کی جانب بڑھا اور اگلے ہی لمحے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بہاری کی روح بدن کے قفس سے آزاد ہوچکی تھی۔ پھولن اور رام کلی حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس بے جان وجود کو دیکھنے لگیں جس نے اپنے خوف اور نفرت سے ان کی زندگیاں اجیرن کررکھی تھیں۔

اسی لمحے دروازے پر ایک آہٹ ہوئی اور بہاری کا سب سے بڑا بیٹا "میادین" تیز قدموں سے چلتا اندر چلا آیا۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین بوس ہوا اور باپ کی لاش سے لپٹ کر رونے لگا۔

"باپو کے اتم سے یہاں کون تھا؟" اس نے کچھ لمحوں کے بعد انہیں مخاطب کیا۔

پھولن اس کی وحشت سے سرخ آنکھوں سے خوفزدہ ہوگئی۔ اس نے اپنے لعاب سے حلق تر کرتے ہوئے... بہ دقت کہا۔

"یہاں میں تھی۔"

میادین کی آنکھوں سے اشکوں کی ایک نئی باڑ امڈ آئی۔

"میری ننھی دیدی! باپو اتم سے کیا کہہ رہا تھا؟"

پھولن اس کے اندازِ تخاطب پر دنگ رہ گئی۔ اس روز قسمت حیرت کے نئے جھٹکے دے رہی تھی۔

"پانی مانگ رہا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"آہ..... میں کتنا ابھاگیہ ہوں۔ اپنے باپو کی اتم اچھا بھی پوری نہ کرسکا۔" میادین وحشیانہ انداز میں سر دائیں بائیں پٹخنے لگا۔

دیوی دین کی آہ وزاری میں بھی شدت آگئی تھی۔

"دیدی! مجھے ایسا لگ رہا ہے یہ ابھی اٹھ جائے گا اور تمہیں پانی نہ پلانے کے آروپ میں مارنے لگے گا۔" رام کلی ہنوز اسی خوف کے زیر اثر تھی۔

پھولن کو اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہونے لگا۔

☆☆☆

بہاری کی ارتھی اگلے روز شمشان گھاٹ لے جائی گئی۔ اس کی آخری رسومات میں سارا گاؤں ہی شریک تھا۔ دیوی دین البتہ مولہ سے شدید بحث ومباحثے کے بعد ہی اپنے سوتیلے بھائی کی ارتھی کو کندھا دینے آپایا تھا۔ مولہ اسی بات پر مصر تھی کہ وہ بعد ازاں مُنڈن کی رسم نبھا کر دریا میں اشنان کرلیں گے۔

بہاری کی چتا نذرِ آتش ہوتے ہی آسمان سیاہ دھوئیں کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اس کی ہڈیاں گنگا بدر کرنے کے لیے ایک مرتبان میں ڈال دی گئیں۔ اب روایت کے مطابق میادین کو کانپور جا کر یہ سب گنگا میں بہانا تھا۔ واپسی پر وہ گنگا کا پانی اپنے ہمراہ لاتا اور سب اہل خانہ اسے نوش کرلیتے۔

مرگ کی یہ تمام تر رسومات مکمل ہوتے ہی میادین ایک دن دیوی دین کے گھر چلا آیا۔ پھولن اسے دیکھتے ہی ایک اوٹ میں چلی گئی۔ اسے میادین کو دیکھتے ہی جھرجھری محسوس ہوتی تھی۔ میادین کا چہرہ کسی چھپکلی سے مشابہ تھا۔ طوطے جیسی چوڑی ناک، بڑے بڑے نتھنے اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں ایک ہولناک تاثر دیتے تھے۔ اس نے آتے ہی دیوی دین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''نمسکار چاچا! کیسے ہو؟''

دیوی دین بھی اس کی آمد اور اندازِ مخاطب پر دنگ رہ گیا۔ میادین اس کے ساتھ ہی کھاٹ پر بیٹھ گیا۔

''میں آپ کے من کو سمجھ سکتا ہوں چاچا!'' اس نے نہایت رسان سے گفتگو کا آغاز کیا۔ ''اب آپ ہی اس پریوار کے بڑے ہو۔ باپو نے جو بھی کیا، اسے بھول جاؤ۔ ہم ایک نئے جیون کی شروعات کرتے ہیں۔ آج سے آپ میرے چاچا اور میں آپ کا بھتیجا ہوں۔''

میادین نے اتنا کہہ کر ایک توقف کیا اور مولہ کی جانب متوجہ ہو کر گویا ہوا۔

''کیسی ہو چاچی؟ میری بہن رکمنی کے بیاہ کی بدھائی ہو۔''

مولہ کی آنکھوں میں بھی حیرت کے رنگ جھلملانے لگے۔ میادین کی اس تبدیلی نے دل کے کسی کونے میں ایک آس زندہ کر دی تھی کہ ان کی غصب شدہ زمین بالآخر واپس مل جائے گی۔ اسے اپنے ذہن سے ایک بارِ گراں ہٹتا محسوس ہونے لگا۔

''چاچا! اب ہمارے دکھ سکھ ایک ہی ہیں۔ آپ لوگوں کو جس چیز کی ضرورت ہو مجھے بتانا۔'' میادین نے اس کا ہاتھ محبت سے تھام لیا۔

دیوی دین کا دل گداز ہو گیا، آنکھوں میں نمی چمکنے لگی۔

''بھگوان کا دیا سب کچھ ہی ہے۔'' اس نے اپنے اعصاب پُرسکون کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''پھولن کے ننھیال والوں نے ایک رشتہ بتایا ہے۔ اب اس کے بیاہ کی تیاریاں شروع کروں گا۔''

''چاچا! ابھی تو رکمنی کا بیاہ کیا ہے۔ اتنا خرچ کہاں سے لاؤ گے؟'' وہ اپنائیت سے کہنے لگا۔

''اس کا اُپائے بھی سوچ لیا ہے۔'' دیوی دین نے ایک توقف سے بتایا۔ ''میں تم کو وہ دو بیگھہ زمین واپس کروا دوں گا۔ اس نے ہماری تین بیگھا زمین گھیر رکھی ہے۔ اس کی لکڑی بیچ کر کم از کم ایک ہزار روپیہ مل جائے گا۔''

پھولن کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اسے نیم کے اس درخت سے بہت انسیت تھی۔ وہ درخت اس قدر بڑا تھا کہ پھولن اور رام کلی اپنے بازوؤں کا گھیرا بنا کر بھی اسے حصار میں نہیں لے پاتی تھیں۔

''ٹھیک ہے چاچا! اس کے بعد آپ ایک کام اور کرنا۔'' میادین نے کہا۔ ''کچہاڑی پر کام کرنے یا دوسرے لوگوں کی زمین ادھار پر لینے کے بجائے میرے ساتھ زمینوں پر کام کر لینا۔ جب تک فصل تیار نہیں ہوتی، میں آپ کو ہر مہینے غلہ دیتا رہوں گا۔ سارا حساب کتاب میرے ذمے ہوگا۔ اگلے ساون پر ہم دونوں بیٹھ کر جمع تفریق کر لیں گے۔ کیا خیال ہے؟''

دیوی دین کو قسمت کی اس یاوری پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ مولہ کے سینے سے بھی ایک آسودہ سانس خارج ہوئی۔ وہ اپنی اولاد کے لیے شکم بھر کھانے کے تصور سے آبدیدہ ہونے لگی۔

''پھولن کے لیے رشتہ کہاں دیکھا ہے؟ میری ننھی دیدی کا دلہا چھان پھٹک کر تلاش کرنا۔'' وہ تشویش مند تھا۔

''اس کا نام پتی لال ہے۔ وہ ایک رنڈوا ہے اور مہیش پور میں رہتا ہے۔ پریوار بھی بہت اچھا ہے۔'' دیوی دین نے بتایا۔

میادین کے چہرے سے نیم رضامندی جھلکنے لگی۔

''پھولن کی شادی کے سب انتظامات میں خود کروں گا۔ کنیادان کا بندوبست بھی میرے ذمے۔ ہم ننھی دیدی کی شادی بہت دھوم دھام سے کریں گے۔''

دیوی دین کا وجود ہیجان کی زد میں تھا۔ اسے ایک عجیب تقویت محسوس ہو رہی تھی۔ مولہ کی کیفیات بھی کم و بیش یہی تھیں۔ پھولن البتہ ناقابلِ فہم محسوسات سے دوچار تھی۔ بہاری کے بیٹے کا یہ انقلاب اور اپنی شادی کا تصور اسے بھی ہیجان میں مبتلا کرنے لگا۔

''میں بھی رکمنی دیدی کی طرح دلہن بنوں گی۔ سرخ جوڑا، زیورات اور پھول پہنوں گی۔'' اس نے خود کلامی کی۔

''پتی لال کے بارے میں اچھی طرح پوچھ تاچھ کر لی ہے نا آپ لوگوں نے؟'' میادین نے دریافت کیا۔ ''ویسے وہ رنڈوا ہے تو داج بھی کم ہی دینا ہوگا۔''

''پوچھ تاچھ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔'' دیوی نے بتایا۔ ''اس کی پہلی پتنی مولہ کے پریوار سے تھی۔ مولہ کے بھائی ہی برات کا انتظام کریں گے۔ جوتشی جی لگن کی تاریخ کا فیصلہ کر لیں تو ہم پتی لال کے ماتھے پر سیندور لگا کر شگن پورا کر آئیں گے۔''

اس لمحے پھولن کو ایک عجب سرشاری محسوس ہوئی۔ وہ بھاگتی ہوئی گھر سے باہر آئی اور بارش کی رم جھم میں رقص کرنے لگی۔ کچھ ہی لمحوں میں نیم کا درخت یاد آیا تو دل افسردگی سے لبریز ہو گیا۔ اس درخت سے بچپن کی انمول یادیں وابستہ تھیں۔

ان متفرق کیفیات میں گھری پھولن کو اندازہ ہی کہاں تھا کہ میادین اور پتی لال کی صورت میں اس کی زندگی ایک

pklibrary.com

بھیانک طوفان کی زد میں آنے والی ہے۔ اس کا بچپن، معصومیت، خواب، خوشیاں اور تمام تر سکھ ایک لامتناہی آزار کی لپیٹ میں آکر نابود ہونے والے تھے۔

☆☆☆

پھولن کے شب و روز ایک نئی تبدیلی کی زد میں آگئے تھے۔ والدین کی جانب سے رکمنی کو ملنے والی اہمیت اور ناز برداریاں اس کا دل للچاتی تھیں۔

''اب مجھے بھی پیٹ بھر کے روٹی اور دودھ ملے گا۔'' وہ مسرور ہوئی۔ ''میرا بیاہ طے ہوتے ہی ماں رکمنی دیدی کی طرح مجھے بھی خوب لاڈ پیار کیا کرے گی۔''

''دیدی! تم بھی بیاہ کے بعد اپنے سسرال چلی جاؤ گی تو میں بالکل اکیلی ہوجاؤں گی۔'' رام کلی کے تصورات متضاد تھے۔

''ارے بدھو! بیاہ کے بعد تو میں کچھ سے یہیں رہوں گی۔ وداعی تو تھوڑے سے بعد ہی ہوا کرتی ہے نا۔'' اس نے بہن کی معلومات میں اضافہ کیا۔

وہ ان دنوں خود کو بے حد عقلمند اور معتبر سمجھنے لگی تھی۔

''جاؤ گی تو سہی نا۔ دیر یا سویر۔ پھر میں اکیلی کیا کروں گی؟'' وہ منہ بسورتے ہوئے کہنے لگی۔

''تم اکیلی کیسے ہوگی بھلا؟ تمہارے ساتھ بھوری ہوگی نا۔'' پھولن نے یاد دلایا۔

''وہ تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔'' رام کلی اسے درخور اعتنا نہیں سمجھتی تھی۔

''تب تک بڑی ہوجائے گی پھر تم اس کی دیدی بن کر خوب رعب جمانا۔'' اس نے راہ سجھائی۔

رام کلی کی آنکھوں میں ایک چمک بیدار ہوگئی۔ اسے یہ نیا منصوبہ بے حد بھایا تھا۔

اسی دوران دیوی دین کو اپنے پیشہ ورانہ امور کے سلسلے میں دریا کے دوسری جانب واقع کسی گاؤں میں جانا پڑا۔

''میں چھ دن بعد لوٹ آؤں گا۔ بہت اچھا کام ملا ہے۔ ایک زمیندار کے صحن میں کنوئیں کی اینٹیں دوبارہ لگانی ہیں۔'' اس نے روانگی سے ایک شب قبل مولہ کو بتایا۔

''اتنے دن گھر سے باہر رہو گے۔ پیسے بھی تو اچھے ملنے چاہئیں۔'' مولہ جز بز ہوئی۔

''آشا تو ہے، اچھے ہی ملیں گے۔'' وہ پُرامید تھا۔

''ہر بار یہی سپنا دیکھتے ہو۔'' اس نے منہ بنایا۔ ''اور ہر بار ہم سب ہی نراش ہوتے ہیں۔''

''بس تھوڑے سمے کی بات ہے۔ اپنے میادین کے ساتھ کام شروع کردوں گا تو سب خوشحال منگل ہوجائے گا۔'' دیوی دین نے آسودگی سے کہا۔

مولہ نے اثبات میں سر ہلایا اور گمبھیر انداز میں گویا ہوئی۔

''میرے بھائیوں نے مجھے مہیش پور بلایا ہے۔ پھولن کے بیاہ کی تیاریاں دیکھنی ہیں۔''

''تو رکمنی کو ساتھ لے جانا۔ سب دیکھ ریکھ اچھے سے کرلینا۔'' اس نے تجویز دی۔

''ہم دونوں ہی گھر پر نہیں ہوں گے۔ باقی سب کو کون دیکھے گا؟'' وہ تشویش مند تھی۔

''ارے میادین کے ہوتے ہوئے کس کی جرأت ہے کہ ہمارے پریوار کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔'' وہ تن کر کہنے لگا۔ ''میں اس سے کہہ دوں گا کہ بچوں کا خیال رکھنا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ایک دن میں ہی لوٹ آؤں گی۔'' مولہ نے اپنا فیصلہ سنایا۔

والدین کی گھر سے روانگی کے بعد در و دیوار میں ایک عجیب سناٹا در آیا تھا۔ پھولن اور رام کلی صحن میں بچھی ایک کھاٹ پر لیٹی تھیں۔ رام کلی تو فوراً ہی نیند سے ہم آغوش ہوگئی البتہ پھولن کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ وہ ستاروں بھرے آسمان پر نظریں جمائے اپنے مستقبل کی بابت سوچتے ہوئے خوابوں کی پگڈنڈی پر اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔ اس مسافت میں کسی لمحے آنکھ لگ گئی۔ عالم نیند میں بھی وہی خیالات خواب کی صورت میں ہم رکاب تھے۔

شب کے آخری پہر کا آغاز ہوا تو پھولن کسی انجانے احساس کے تحت ہڑبڑا کر بیدار ہوگئی۔ اس نے مُندی ہوئی آنکھوں سے قرب و جوار کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی بیداری کا ماخذ دریافت کرنے کی کوشش کی لیکن ہر سو سناٹا طاری تھا۔ اسی لمحے ایک نامانوس آواز سماعت میں پڑی۔

''چھوٹی! اٹھو، یہ شور کیسا ہے؟'' اس نے رام کلی کو جھنجوڑا۔

''کیسا شور، کیا ہوا ہے، کیا گاؤں میں ڈاکو آگئے ہیں؟'' وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

''نہیں، یہ ڈاکوؤں کی آواز نہیں ہے۔'' پھولن نے اپنی سماعت مکمل طور پر بیرونی سمت مرکوز کی اور بے اختیار بدکتے ہوئے گویا ہوئی۔

''چھوٹی! یہ تو درخت پر کلہاڑی چلنے کی آواز ہے۔''

''شاید کوئی نیم کا درخت کاٹ رہا ہے۔'' رام کلی نے قیاس کیا۔

''چلو، دیکھ کر آتے ہیں۔'' اسے اضطراب لاحق ہوا۔ نیم کے درخت سے وابستہ بچپن کی تمام تر یادوں نے

pklibrary.com

دل کو بے طرح بھینچ لیا تھا۔

''دیدی! رات کے اس سمے باہر جائیں گے تو کوئی نقصان بھی ہوسکتا ہے۔ باہر کسی کتے نے کاٹ لیا تو دوادارو کے لیے ماں کو کہاں سے لائیں گے؟'' رام کلی نے صورتِ حال کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا۔

پھولن کی بے چینی کسی بھی طور کم ہو کے نہیں دے رہی تھی۔

''باپو نے ہی مزدوروں کو کہا ہوگا۔ تمہارے بیاہ کے لیے پیسے جوڑنے ہیں نا۔'' وہ دلاسا دینے لگی۔

''یہ کام باپو اپنے سامنے ہی کرواتا چھوٹی!'' پھولن نے دلیل دی۔

''تم کیوں وہم کر رہی ہو دیدی؟'' رام کلی زچ ہوئی۔ ''یہ کسی اور درخت کی کٹائی بھی تو ہوسکتی ہے۔ اب بھگوان کے لیے مجھے سونے دو۔''

پھولن چاروناچار خاموش ہوگئی۔ اس کی سماعت ہنوز کلہاڑی کی ضربات پر ہی مرکوز تھیں۔ ہر ایک ضرب کے بعد نیم کا وہ چھتنار درخت، اس پر لدی سنہری نمبولیاں اور شاخوں میں پھدکتی گلہریاں پردۂ بصارت پر نمودار ہوجاتیں۔ ان خیالات کو سر سے جھٹکنے کے لیے وہ ایک بار پھر ستاروں سے لدے پھندے آسمان کی سمت متوجہ ہوگئی لیکن نیند آ کے ہی نہ دی۔

اگلی صبح سورج کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی اس نے رام کلی کو بیدار کیا اور زقند بھرتی ہوئی اس قطعۂ زمین کی طرف روانہ ہوگئی جہاں نیم کا وہ درخت اس کی پیدائش سے بھی قبل سے ایستادہ تھا۔ وہاں پہنچتے ہی ان کا دل دھک سے رہ گیا۔

☆☆☆

قطعۂ زمین سے نیم کے درخت کا وجود ختم ہو چکا تھا۔ کھیت میں مزدوروں کی کافی تعداد موجود تھی۔ وہ ٹریکٹر کے پیچھے لگی ایک ٹرالی میں لکڑی لاد رہے تھے۔ پھولن پھٹی پھٹی نگاہوں سے یہ منظر دیکھنے لگی۔

اسی اثنا میں اس کی نظر ٹریکٹر ٹرالی کے قریب ایک خوبصورت روغن سے آراستہ بیل گاڑی پر پڑی۔ سفید بیلوں کے گلے میں چاندی کی گھنٹیاں بہت مانوس تھیں۔

''نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔'' اس نے اپنے اندیشوں کو جھٹکا۔

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اجلے دھوتی کرتے میں ملبوس میادین بھی بیل گاڑی پر سوار ہوگیا۔ وہ ایک ناقابلِ بیان لمحہ تھا۔ پھولن کا ذہن بالکل بے قابو ہوگیا۔ اس کے اعصاب میں یکلخت ہی کوئی برق کوندی۔ رگوں میں دوڑتا لہو گویا پارے کی حیثیت اختیار کر گیا۔

''میادین!'' اس نے چلاتے ہوئے اپنی مٹھیاں بھینچیں۔

وہ چونک کر اس کی جانب متوجہ ہوا اور بے نیازی سے بیل گاڑی پر سوار ہونے ہی لگا تھا کہ پھولن کی آواز نے اس کے قدم ساکت کر دیے۔

''تو نے ثابت کر دیا کہ تو ایک راکھشس باپ کی کمینی سنتان ہے۔'' وہ حلق کے بل چلائی۔ ''تیری وہ اچھائی ایک ڈھونگ تھی۔ تو نے میرے باپو سے وشواس گھات کیا ہے۔''

میادین کے چہرے پر ایک استہزائیہ کیفیت جھلکنے لگی۔

''تو ایک ہتھیارا ہے۔ تو نے ہمارے اس پیڑ کی ہتھیا کی ہے۔ بہاری کی طرح اس کا بیٹا بھی چور ہے۔ بہاری نے ہماری زمین پر قبضہ کیا اور بیٹا رات کے اندھیرے میں اس کی لکڑی چرا کے لے جا رہا ہے۔'' پھولن کو اپنے بدن کا ہر ایک رواں جلتا محسوس ہونے لگا۔

''پرے ہٹ چڑیل!'' اس نے دھتکارا اور بیل گاڑی پر سوار ہوگیا۔

''اپنی اصلیت دکھا دی نا تو نے۔'' وہ غرائی۔ ''ننھی دیدی سے چڑیل بنا دیا مجھے۔ اب میں تجھے دکھاؤں گی کہ چڑیل کیسی ہوتی ہے۔''

پھولن وحشیانہ انداز میں آگے بڑھی اور اچھلتے ہوئے بیل کی نکیل تھام لی۔ میادین نے اسے اپنی چھڑی سے ضربات رسید کیں لیکن پھولن نے نکیل چھوڑنے کے بجائے اسے مزید قوت سے کھینچ لیا۔

بیل کی نازک ناک پھولن کی یہ وحشت اور وجود کا تمام تر زور سہار نہیں پا رہی تھی۔ وہ اذیت سے غضب ناک ہونے لگا لیکن پھولن ہر خطرے سے بے نیاز ہو چکی تھی۔

''میں تجھے یہ لکڑی نہیں لے جانے دوں گی۔'' وہ چلاتے ہوئے نکیل کو مزید قوت سے کھینچنے لگی۔

میادین کی چھڑی اب مسلسل برس رہی تھی۔ وہ اس کے سر، بازوؤں، کمر اور ٹانگوں کو بے دریغ نشانہ بنا رہا تھا۔ اسے یہ بھی خدشہ لاحق تھا کہ بیل کی ناک پھٹ جانے کی صورت میں وہ بے قابو بھی ہوسکتا تھا۔ پھولن ان تمام تر عوامل سے بے نیاز اپنی ہی وحشت کی زد میں تھی۔ اس کا بدن لہولہان ہو چکا تھا۔ سر سے بہنے والا خون آنکھوں میں آ کر بصارت متاثر کرنے لگا تھا۔ رام کلی بڑی بہن کی یہ حالت دیکھتے ہوئے سراسیمگی سے مدد کے لیے چلاتی کھیتوں میں بھاگ کھڑی ہوئی۔

''میری دیدی کو بچاؤ۔ کوئی تو ہمارے پیڑ کی چوری

روک لو۔'' وہ اپنی بھرپور قوت سے چلّانے لگی۔

اس شور وغل کے نتیجے میں گاؤں کے کئی افراد وہاں آپہنچے لیکن سبھی خاموش تماشائی کی طرح میادین اور پھولن کی یہ ٹسل دیکھنے میں مصروف تھے۔ ان میں سے کسی میں بھی اتنی جرأت وہمت نہ تھی کہ میادین کے مقابلے میں اس کی مدد کرسکتا۔

''تو ایسے باز نہیں آئے گی کالی چڑیل!'' میادین نے حقارت سے کہا اور اپنے دو گرگوں کو مخصوص اشارہ کردیا۔

اس کا اشارہ پاتے ہی وہ افراد آگے بڑھے اور اسے دبوچ کر تھپڑوں کی زد میں رکھ لیا۔ پھولن نے اپنے وجود کی تمام تر وحشت وقوت سے ٹکیل کھینچ لی۔ بیل کی قوتِ برداشت ختم ہوچکی تھی۔ وہ ڈکراتا ہوا اچھلنے لگا۔ میادین کے گماشتوں نے پھولن کو دبوچ کر گھاس کی گٹھڑی کے مانند ایک جانب پھینک دیا۔

پھولن کسی گیند کی طرح دوبارہ اچھلی اور بیل گاڑی کے پہیے سے چمٹ گئی۔

''حرام خور، چور، ہتھیارے! تو یہ لکڑی میری لاش سے گزر کر ہی لے جاسکتا ہے۔'' وہ چلائی۔

''اس لڑکی میں کوئی پریت آتما گھس گئی ہے۔'' اہلِ گاؤں سرگوشیاں کرنے لگے۔

میادین ایک نئی کشمکش میں مبتلا ہوگیا۔ اس وقت وہاں پچاسیوں افراد جمع ہوچکے تھے۔ وہ ان کے سامنے پھولن کو جانی نقصان پہنچانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ پھولن، میادین کے تذبذب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بیل گاڑی پر چڑھی اور اس کا ریشمی کُرتہ چیتھڑوں میں تبدیل کردیا۔

میادین کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اس نے اپنے بڑے بڑے ہاتھوں سے پھولن کا حلق دبوچ لیا اور گرفت مضبوط تر کرنے لگا۔ پھولن اضطراری ردِعمل کے طور پر مچھلی کی طرح پھسلی اور اس کے بازو کو اپنے دانتوں سے جھنجھوڑ کر لہولہان کردیا۔ میادین کو اس عالم میں دیکھ کر چار گماشتے آگے بڑھے اور پھولن کو دبوچ کر اس کے آنگن میں پٹخ دیا۔ پھولن کا بدن ایک پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا تاہم اس تکلیف سے زیادہ دیوی دین کے خوابوں کی شکستگی اور اعتبار کا شیش محل زمین بوس ہونے کی ممکنہ اذیت کا تصور ہولناک تھا۔

☆☆☆

پھولن درد واذیت سے کراہنے لگی تھی۔ رام کلی اپنی سمجھ بوجھ کے تحت اس کی ہر ممکن دیکھ بھال کررہی تھی۔ وہ اسے منت سماجت کرتے ہوئے کسی نہ کسی طور دریا پر لے گئی تاکہ وہ اپنے بدن سے لہو اور گرد صاف کرسکے۔ راہ گیروں کی طنزیہ نگاہیں اسے ازسرِنو طیش زدہ کرنے لگیں۔

''کیا مل گیا تمہیں یہ سب تماشا کرکے؟'' وہ اسے کچوکا لگاتے۔

''تمہیں کیا ملا میرے باپو سے وشواس گھات کرکے؟'' پھولن ایک شخص پر الٹ پڑی۔

یہ شخص ان مزدوروں میں شامل تھا جنہوں نے رات بھر کٹائی کے بعد نیم کے درخت کی ایک بھی ٹہنی وہاں سلامت نہ رہنے دی تھی۔

''میادین نے مجھے باجرے کا تھیلا دینے کا وچن دیا ہے۔'' اس نے اطمینان سے بتایا۔

''وہ شیطان کبھی اپنا وچن نہیں نبھائے گا۔'' پھولن زہرخند ہوئی۔

وہ شخص استہزائیہ نظروں سے اسے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ رام کلی اب اسے دریا پر لے آئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں دریا کا پانی اس کے بدن کا لہو، گرد اور آنکھوں سے بہتے آنسو اپنے دامن میں سمیٹ چکا تھا۔ پھولن خالی الذہنی کے عالم میں گھر لوٹ آئی۔ رام کلی ایک آوارہ بکری کا دودھ دوہ کر بہن کے لیے لائی اور نہایت محبت سے اسے پلانے لگی۔

ان دونوں کو ہی اب مولہ کی واپسی کا انتظار تھا۔

مولہ سورج غروب ہونے کے بعد گھر لوٹی تو رام کلی نے فوراً ہی تمام تر ماجرا اس کے گوش گزار دیا۔ وہ یکدم زمین پر ڈھے گئی۔

''بھگوان کرے تجھے کیڑے کھائیں میادین!''

رام کلی نے فوری طور پر ماں کے بازوؤں سے بھوری کو تھاما اور پھولن کا چھوڑا ہوا دودھ پلانے لگی۔ مولہ اب پھولن کے زخموں کی سمت متوجہ ہوگئی تھی۔ وہ اس کی پنڈلیاں، بازو اور ٹانگیں ٹٹولتے ہوئے ہڈیوں کی سلامتی یقینی بنا رہی تھی۔

''یہ تو نے کیا کردیا پھولن؟'' وہ روتے ہوئے کہنے لگی۔

''میں نے کیا کردیا ہے؟'' پھولن حیران ہوئی۔

اسے اپنی ماں کی یہ کیفیت سمجھ نہیں آرہی تھی۔

''اب ہم تمہارا بیاہ کیسے کریں گے؟'' مولہ کی ذہنی کیفیت حقیقتاً پراگندہ ہوچکی تھی۔

''تو مت کرو میرا بیاہ۔'' وہ چیخ گئی۔ ''جب سے رکمنی دیدی کا بیاہ ہوا ہے، گھر میں آلوؤں کے سوا کچھ بھی نہیں پکا۔ اگر بیاہ کرنے سے اتنی ہی دقت ہوتی ہے تو مجھے یہ

مصیبت اپنے گلے نہیں ڈالنی۔''

اس لمحے پھولن اپنے تمام تر تصورات اور نوزائیدہ خواب فراموش کیے اس مار پیٹ کی اہانت کے زیر اثر تھی جو اہلِ گاؤں کے سامنے برداشت کرنی پڑی تھی۔ میادین کی زبان سے برآمد شدہ پُرحقیر الفاظ روح کو گھائل کر چکے تھے۔

''بیاہ نہیں کرو گی تو کیا سارا جیون یوں ہی ہمارے سر پر سوار رہو گی؟'' مولہ بدکی۔

''میں باپو کی طرح راج یا ترکھان بنوں گی۔ بہت سارا کام کروں گی۔ ڈھیروں روپے کما کر لاؤں گی۔ ہمارے گھر میں اناج کی کوئی کمی نہیں ہوگی۔'' اس نے عزم ظاہر کیا۔

''یہ سب کام منش کیا کرتے ہیں بدھو! ناری صرف گھر بسا کر بچے پیدا کرتی ہے۔'' مولہ کو اس کی ذہنی صحت پر شبہ ہونے لگا۔

''میں بھی منش کی طرح کام کر سکتی ہوں۔ میرے ساتھ کوئی وشواس گھات نہیں کر سکے گا۔ بدھو میں نہیں، تم لوگ ہو۔ کسی کی بھی باتوں میں آجاتے ہو۔ ہمارا نیم کا یہ پیڑ تم لوگوں کے کارن ختم ہوا ہے۔'' وہ تلخ ہوئی۔

مولہ کے پاس اس صاف گوئی کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اسے دیوی دین کا ممکنہ ردِعمل بھی ہولا رہا تھا۔

☆☆☆

دیوی دین کو یہ اطلاع کسی کرم فرما نے پہنچا دی تھی۔ اس نے بہ وقت تمام اپنا کام مکمل کیا اور طویل مسافت طے کرنے کے بعد گھر لوٹ آیا۔ مولہ کی آنکھوں کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ وہ کسی سنگی مجسمے کی طرح کھاٹ پر بیٹھی تھی۔ دیوی دین پر نگاہ پڑتے ہی کہنے لگی۔

''میں تمہارے پیارے بھتیجے کے خلاف تھانے میں رپٹ لکھوانے جاؤں گی۔''

''کیا اس سے ہمارا درخت واپس مل جائے گا؟'' وہ شکستگی سے کھاٹ پر نیم دراز ہو گیا۔

''مجھے تم سے اسی کایرتا کی آشا تھی۔ تم ایک کم ہمت اور کایر انسان ہو۔ تم سے اچھی تو پھولن ہے جو اپنے ادھیکار کے لیے لڑنا جانتی ہے۔'' مولہ زہرخند ہوئی۔

''میں ابھی دیکھ کر آیا ہوں۔ وہاں کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ درخت کی جڑیں تک اکھاڑ کر گڑھے میں مٹی بھر دی گئی ہے۔'' دیوی دین کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''تمہارے بھتیجے کو تم سے کتنا پریم ہے۔ اس نے تمہاری آسانی کے لیے سب کچھ خود ہی کر دیا۔'' وہ طنزیہ کہنے لگی۔

دیوی دین سرد آہ بھر کے خاموش ہو گیا۔ مولہ اسے کسی بھی قسم کی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ اگلے ہی روز اس کے ہمراہ تھانے پہنچ گئی اور تھانیدار کے پاؤں چھوتے ہوئے تمام تر ماجرا سنا دیا۔

''تم دونوں کا دماغ تو نہیں چل گیا؟'' تھانیدار نے خشونت سے انہیں دیکھا۔ ''میادین ایک امیر شخص ہے۔ اسے تم لوگوں کے کسی پیڑ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟''

''یہ کام اسی نے کروایا ہے۔'' مولہ مصر رہی۔ ''اس نے پیڑ کی لکڑی کہیں بیچ دی ہے۔''

''تمہارے پاس اس بات کا کوئی گواہ ہے؟'' تھانیدار نے اسے گھورا۔ ''اگر تم اپنی بات ثابت کرنے کے لیے کوئی گواہ نہ لائے تو میں تمہیں جھوٹے آروپ لگانے کے جرم میں سزا بھی دے سکتا ہوں۔''

اس دھمکی نے مولہ کا جوش سرد کر دیا۔ وہ خاموشی سے گھر لوٹ آئی۔

☆☆☆

پھولن کی ذہنی کیفیت نہایت پراگندہ ہو چکی تھی۔ اسے خواب میں بھی اپنا مسروقہ درخت دکھائی دینے لگا تھا۔ اس درخت کے ساتھ میادین بھی ہاتھ میں کلہاڑی لیے نمودار ہوتا تو پھولن کا بدن عالمِ نیند میں ہی اینٹھنے لگتا۔ وہ کہیں سے چابک برآمد کرتی اور میادین کا بدن لہولہان کر دیتی۔ اس کے بعد اسی کی کلہاڑی سے اعضا بریدگی کا عمل شروع کر دیا کرتی۔

پھولن کا یہ غصہ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ احساس بے بسی کسی ردِعمل کے لیے متحرک رکھنے لگا۔ اگلے چند روز میں اس نے اپنی ان کیفیات کا ہدف تلاش کر لیا۔ پھولن کا یہ ہدف میادین کی ماں تھی جسے وہ ابتدا سے ہی سخت ناپسند کرتی تھی۔

ناپسندیدگی کا یہ جذبہ درحقیقت دوطرفہ تھا۔ تاہم پھولن کے زخمی وجود میں سلگتی آتشِ انتقام اب اسے سوختہ کر دینے کے درپے ہو چکی تھی۔ وہ نہایت اطمینان سے اس کے گھر کے پاس سے گزرتی اور اسے کھاٹ پر لیٹا دیکھ کر زہرخند ہوتی۔

''کیا خوب راکھشس پیدا کیا ہے تُو نے۔''

''میادین! اس منحوس کو پکڑ۔'' وہ چلّانے کی کوشش میں ہانپ جاتی۔ ناتواں وجود میں اتنی قوت ہی نہ تھی کہ اپنی آواز اندرونی سمت موجود بیٹے تک پہنچا سکتی۔

pklibrary.com

''اگر تُو نے اپنے بیٹے کو بلایا تو میں اسے زہر دے دوں گی۔'' پھولن نے دھمکایا۔

بڑھیا کی رنگت متغیر ہوگئی۔ پھولن کو اس کی یہ حالت بہت لطف دیتی۔ اس نے بہاری اور میادین سے انتقام کے لیے اسے مشقِ ستم بنائے رکھنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ پھولن نے ایک مخصوص ڈگڈگی تیار کی اور جنگل یا دریا پر آمد و رفت کے دوران اسے بجاتے ہوئے کہتی۔

''ناچ بندریا..... ناچ!''

''میادین! اسے پکڑ لے۔'' وہ اپنا پاؤں زمین پر پٹختے ہوئے بیٹے کو متوجہ کرنے کی کوشش کرتی۔

بڑھیا کی اس کوشش کے نتیجے میں پھولن ڈگڈگی بجانے کا عمل تیز تر کردیتی۔ کچھ ہی روز بعد وہ میادین کی غیر موجودگی میں رام کلی کے ہمراہ اس کے گھر پہنچ گئی۔ دیگر اہلِ خانہ دوپہر کے کھانے کے بعد سو چکے تھے۔ پھولن کے ہاتھ میں ایک لمبی چھڑی موجود تھی۔

''اگر ذرا بھی آواز نکالی تو جان سے ماردوں گی۔'' اس نے بڑھیا کو دھمکایا اور رام کلی کی مدد سے اس کی چارپائی گھسیٹ کر صحن میں موجود کنوئیں تک لے آئی۔

یہ کنواں بہاری نے اپنی شان و شوکت کے اظہار میں کھدوایا تھا۔ اس کے گھر کی خواتین گاؤں کے کنوئیں پر پانی بھرنے نہیں جاتی تھیں۔ چارپائی گھسیٹنے کے دوران پھولن کی سماعت میں بہاری کی اسے کنوئیں میں پھینک دینے کی تمام تر دھمکیاں گونج رہی تھیں۔ پھولن کی وحشت مہمیز ہوگئی۔ اس کے لیے بڑھیا کا دھان پان سا وجود قابو کرنا مشکل نہیں تھا۔

''تم ایک چور کی پتنی اور چور، ہتھیارے کی ماں ہو۔'' وہ زہر خند ہوئی اور اسے سر کے بل کنوئیں میں لٹکا دیا۔

بڑھیا خوف و دہشت سے چلانے کی کوشش کرتی رہی لیکن نحیف آواز کسی کی سماعت میں پہنچنا ممکن ہی نہیں تھا۔ بڑھیا بے طرح دہشت زدہ ہوچکی تھی۔ پھولن نے رام کلی کی مدد سے اسے دوبارہ چارپائی پر لٹایا اور سابقہ مقام تک پہنچادیا۔

''اگر تُو نے کسی کے سامنے ہمارا نام لینے کی کوشش کی تو اگلی بار میں تجھے اسی کنوئیں میں پھینک دوں گی۔'' اس نے دھمکایا۔

پھولن کی یہ انتقامی کارروائیاں اب ایک نیا رخ اختیار کرچکی تھیں۔ وہ میادین کی غیر موجودگی میں دریا پر جاتے ہی مینڈک کو چارا بنائے سانپ پکڑتی اور نہایت دیدہ دلیری سے بڑھیا کے پاس چلی آتی۔

''بتا چڑیل! تیرا بیٹا ہماری زمین کب واپس کرے گا؟'' وہ اس کی آنکھوں کے سامنے سانپ لہراتی۔

پھولن کی خوش قسمتی بہرحال یہ تھی کہ اہلِ خانہ بڑھیا کی حالتِ زار اور طویل علالت کے باعث اسے صحن میں کھاٹ بچھا کر اپنے کام کاج میں مشغول رہتے۔ وہ بلاوجہ کوئی بھی خطرہ مول نہیں لیتی تھی۔

''تجھے بھگوان کا واسطہ ہے۔ میں تجھے زمین واپس کروادوں گی۔'' بڑھیا اس کے سامنے ہاتھ جوڑتی۔ ''اسے پرے کرلو۔''

پھولن سانپ کو اس کی ٹانگوں اور بازوؤں پر پھیرتے ہوئے چہرے کے قریب تر لاتی اور دہشت خیز نظروں سے گھورتی ہوئی لوٹ جاتی۔

☆☆☆

میادین کی ماں کی علالت طویل تر ہوتی جارہی تھی۔ پھولن موقع پاتے ہی اسے کسی نہ کسی نئی اذیت سے دوچار کردیتی۔ اسی دوران اسے علم ہوا کہ بڑھیا گزشتہ ایک ہفتے سے بسترِ مرگ پر ہے لیکن جان نکل کے ہی نہیں دے رہی۔ وہ بہاری کے گھر پہنچی تو میادین کی دید نے دل و دماغ سلگا کر رکھ دیے۔

''تو یہاں کیا کرنے آئی ہے؟'' وہ غرایا۔

''چاچی کے لیے پرارتھنا کرنے۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''کیا بھول گیا ہے کہ تیرے باپو کے انتم سمے میں بھی اس کے پاس میں ہی تھی۔''

''منحوس کہیں کی۔'' وہ اسے نفرت سے دیکھنے لگا۔

پھولن کا وجود انگاروں کی سی سوزش محسوس کرنے لگا۔ وہ بڑھیا کی جانب متوجہ ہوگئی جو سکڑی سمٹی حالت میں کھاٹ پر پڑی تھی۔ اس کا چہرہ بالوں کی طرح ہی سفید اور نہایت ہولناک لگ رہا تھا۔ سانسوں کی رفتار بھی بے حد مدھم تھی۔ پھولن اس کے چہرے پر جھکی اور سرگوشی میں کہنے لگی۔

''میری پیاری چاچی! آج ایک نیا سانپ تمہارے بدن سے کھیلنا چاہتا ہے۔''

بڑھیا کی آنکھیں اور ہونٹ بے طرح لرزنے لگے۔ اس کے سینے سے ایک ہچکی برآمد ہوئی اور بدن بے جان ہوگیا۔ پھولن نے اپنی زندگی کا پہلا ''قتل'' نہایت صفائی اور کامیابی سے سرانجام دے دیا تھا۔ (جاری ہے)

ماخذات

میں ہوں پھولن دیوی، از: پھولن دیوی

چقندر کے پودے بکھری ہوئی ٹیڑھی میڑھی قطاروں میں اُگے تھے۔ کہیں کہیں کسی زیرِ زمین مخلوق نے سوکھی مٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے کھڑے کر کے اس بدنظمی کو اور بڑھا دیا تھا۔ سیاہ ہوتے پتے ایک دوسرے کے پہلو میں ڈھیر ہوئے پڑے تھے جیسے انہیں ایک خاص حد تک بڑھنے دیا گیا ہو اور پھر کسی منصوبہ بندی کے تحت برباد کر دیا گیا ہو۔

مائیک کے خیال میں آکسنارڈ سے دو میل دور وہ بارہ ایکڑ زمین جنوبی کیلی فورنیا کی سب سے بیکار جگہ تھی۔ تو یہ

ادھورا سودا

عائشہ نصیر

ضروری نہیں کہ زندگی میں کیے جانے والے سارے سودے کامیابی سے انجام کو پہنچیں۔ لیکن یہ ادھورا سودا... ادھورا رہ کر بھی اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا کیونکہ اس کے ادھورے پن میں ہی اس کی مکمل آگاہی جو پوشیدہ تھی اور اس آگاہی کی قیمت دس ہزار ڈالرز تھی... اور یہی قیمتی راز اس کی تباہی کا سبب بن گیا... جسے پانے کے لیے جانے کتنے لوگ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

زرخیز دماغوں اور طاقتور لوگوں کی ذہانت کے درمیان دلچسپ معرکہ آرائی کا احوال

pklibrary.com

کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کہ الیٹر وس فلمز نے اپنی نئی ویڈیو ریلیز فلم کے لیے اسی جگہ کا انتخاب کیا۔

ڈیرک بکس کا ٹریلر کچلے ہوئے ٹائروں پر بے بسی سے جما کھڑا تھا۔ اس کا رنگ اتر کر چاک جیسا پھیکا ہو چکا تھا اور کھڑکیوں پر چپکی ٹیپ اب جگہ جگہ سے اکھڑنے لگی تھی۔ ایک پل کے لیے مائیک کو لگا جیسے یہ ٹریلر بھی اسی بدقسمت زمین سے اُگا ہو جہاں پودے گرمی اور قحط کے نیچے دبے سسک رہے تھے۔ دروازے پر پینٹ کیا گیا شوخ زرد ستارہ دیکھنے والے کو طنزیہ مسکراہٹ جیسا محسوس ہوتا۔

دروازہ اس کی دستک پر اچانک کھلا تھا۔ وہ ٹکر سے بچنے کے لیے پیچھے ہٹا۔

''مسٹر مائیک؟'' دروازہ کھولنے والے نے سوال کیا۔

''صرف مائیک کہیں اور آپ مسٹر ڈیرک؟'' مائیک نے تصدیق چاہی۔

''تم بھی صرف ڈیرک کہو۔ اب چونکہ ہم دوست ہیں۔''

کیا اس کے لہجے میں تمسخر تھا؟ نوجوان فلم آرکائیوسٹ مائیک کو یقین نہ ہوا۔ بچپن میں ڈیرک اپنے طنزیہ اندازِ گفتگو کے لیے جانا جاتا تھا مگر جب اس نے جھک کر مائیک سے ہاتھ ملایا تو اسے ڈیرک کی گرفت میں گرمجوشی محسوس ہوئی۔

''میرے پاس صرف بیس منٹ ہیں۔ کرین پھر خراب ہوگئی ہے۔ عام طور پر ہم کوئی اور سین شوٹ کر لیتے مگر ہمارے پاس زومبیز صرف سات بجے تک ہیں۔ پھر ان کا سائی فائی پرنائٹ شوٹ ہے۔'' ڈیرک نے بتاتے ہوئے سو گز دور بیٹھے عجیب وغریب ڈھنگ کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کیا جو لنگوٹ پہنے پکنک ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ قریبی بے جان کرین کے نیچے پروڈکشن کا عملہ بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔

ڈیرک کی عمر تیس سال تھی لیکن وہ پندرہ سال بڑا لگتا تھا۔ اس کا سر گنجا ہونے لگا تھا اور اس کے سامنے سے کھلے ہاتھ روب سے اس کا ڈبلا سینہ اور ہلکا سا نکلا ہوا پیٹ صاف نظر آرہا تھا جس پر پینٹ سے مصنوعی پٹھے بنائے گئے تھے۔ بیس سال پہلے وہ ''کنگ براٹ'' نامی سٹ کام میں ایک ہوشیار بچے کا کردار ادا کر چکا تھا مگر اب منشیات کی زیادتی اور سستی تھراپی نے اس کے معصوم بچپن کے سارے نقوش مٹا دیے تھے۔

مائیک نے ٹریلر میں قدم رکھا اور ٹھٹک کر رک گیا۔

ٹریلر کی دیواروں پر اصل فلمی پوسٹرز آویزاں تھے جو کلاسک ٹارزن فلموں کی تشہیر کر رہے تھے اور ہر کونے پر ایڈگر رائس بروز کے ناولوں کے انبار لگے تھے۔ ابتدائی ایڈیشنز، بظاہر ان کی گرد آلود جلدوں سے اندازہ ہوتا تھا، کونوں میں نیزے رکھے تھے اور ایک شیر کا بوسیدہ سر شیشے جیسی آنکھوں سے گھور رہا تھا۔

''شاندار۔'' مائیک نے تبصرہ کیا۔

''یہ ساری زندگی کی جمع پونجی ہے۔'' ڈیرک نے بتایا۔ ''اسٹوڈیو کے نیلام گھروں میں میری شہرت ٹی وی سے زیادہ ہوگئی تھی۔ یہ آخری چیزیں میں نے یہاں چھپا دی تھیں تاکہ IRS (ٹیکس والوں) سے بچا سکوں۔ تم میری چغلی تو نہیں کرو گے؟''

مائیک نے کندھے اُچکائے۔ ''یہ تمہارا اور ٹیکس مین کا معاملہ ہے۔ میں نے سنا تھا کہ تم شوقین ہو۔ کیا اسی لیے تمہیں یہ کردار ملا؟''

''اس کے لیے میں نے آڈیشن دیا تھا۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''دس اور بیکار اداکاروں نے یہ کردار ٹھکرا دیا تھا۔ یہ دیکھو، کیوں۔'' اس نے کتابوں کے ایک ڈھیر سے ایک پرانی قسم کی اسکرین پلے کی کاپی اٹھا کر مائیک کی طرف پھینکی۔

اس نے ٹائٹل پیج پر نظر ڈالی۔

ٹارزن بمقابلہ زولوز و میبز

اسکرین پلے از ایلن تھی

یہ نام اکثر کسی ایسے مصنف کا ہوتا ہے جو اپنی تحریر پر شرمندہ ہو۔ مائیک نے ایک صفحہ پلٹے بغیر وہ کاپی واپس کر دی اور کہا۔ ''کافی باتیں ہوگئیں۔ میرے ڈیپارٹمنٹ کی سیکریٹری نے کہا تھا کہ تم مجھے کچھ اور بھی دکھانا چاہتے ہو۔''

''پیسے لائے ہو؟'' ڈیرک نے اسے گھورا۔

مائیک نے ایک چیک بک دکھائی اور پھر اسے اندرونی جیب میں واپس رکھ دیا۔

ڈیرک نے اثبات میں سر ہلایا، ایک دراز کھولی اور اس میں سے فلم کی ریل نکال کر اسے تھما دی۔ اسی دراز سے اس نے ایک کروم پلیٹڈ ریوالور بھی نکال کر ٹیبل پر رکھا اور اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''کچھ پرسنل نہیں دوست! جب تمہیں بار بار لوٹا گیا ہو تو بندہ مشکوک ہو ہی جاتا ہے۔ میں اب پہلے جیسا تیز نہیں دوڑ سکتا۔ میرے ایکشن سینز میں کیمرا سست چلاتے ہیں تاکہ میں دوڑتے ہوئے برق رفتار گھوڑا لگوں۔'' ڈیرک نے جیسے پستول نکالنے کے لیے معذرت کی۔

مائیک ریل لے کر کھڑکی کی طرف گیا، خیال رکھا کہ اپنی پشت مسلح میزبان کی طرف نہ کرے۔ اس نے تقریباً

ڈیڑھ فٹ فلم کھولی اور اسے روشنی کی سمت کیا۔ جہاں تک سادہ فریم تھے جنہیں پروجیکٹر میں ڈالنے کے لیے رکھا جاتا ہے۔ ان کے بعد منظر شروع ہوا۔ ایک جھاڑیوں جیسے بالوں والا، چوڑے سینے والا ایطولنکن صرف ایک کندھے پر بندھی ہوئی شیر کی کھال پہنے ایک دیوہیکل گوریلے سے لڑتا ہوا نظر آیا۔ 1918ء میں بننے والی سلور نائٹریٹ فلم کے لحاظ سے یہ حیرت انگیز طور پر اچھی حالت میں تھی۔ یہ ریل اس نے بہت زیادہ احتیاط سے واپس کی، بہ نسبت اس مضحکہ خیز ''ٹارزن بمقابلہ زولوز وہیز'' کے۔

''یہ واقعی گمشدہ فلم نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''یہ اُس دور کی چند باقیات میں سے ایک ہے اور جتنا میں دیکھ سکا، یہ صرف آخری ریل ہے۔ تم یونیورسٹی کو کیا آفر کر رہے ہو جو ان کے پاس پہلے سے نہیں؟''

''یہ رہا پورا ڈبا۔'' ڈیرک نے ریل کے بدلے میں ایک چپٹا، پرانا ڈبا اسی دراز سے نکالا اور اسے تھما دیا۔ اس کے ڈھکن پر Tarzan of the Apes کا عنوان، سال اور پروڈکشن نمبر تدھم سیاہی سے اسٹینسل کیا گیا تھا اور نیچے تقریباً غیر مرئی الفاظ میں پنسل سے لکھا تھا TRT:58 MINS., 21 SECS.

''سرکاری دورانیہ پچپن منٹ ہے۔''

مائیک کو لگا جیسے اس کے اندر کچھ لرزنے لگا ہو۔ بالکل ایسے ہی جیسے دولت آنے سے پہلے ہتھیلی پر کھجلی ہونے لگے۔ اس نے خود کو یہ کہہ کر سنبھالا کہ یہ محض وہم ہے اور اپنا توازن برقرار رکھا۔

''شاید کیمرامین نے اس وقت شوٹ کرنا بند نہیں کیا تھا جب ڈائریکٹر نے ''کٹ'' کا نعرہ لگایا۔'' ڈیرک بولا۔ ''اس نے تین منٹ سے کچھ زیادہ پردے کے پیچھے کی فوٹیج شوٹ کی تھی۔ وہ ابھی تک نیگیٹو میں موجود ہے، فلم کے آخر میں جوڑ دی گئی ہے۔ اداکاروں اور عملے کے سیٹ پر مستی کرتے ہوئے مناظر کو اس میں منتقل کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ڈی وی ڈی ایکسٹراز تو ابھی سو سال دور تھے۔''

''یہ بہت مزاحیہ ہے۔'' وہ بولتا رہا۔ ''ایک عملے کے رکن نے شوٹنگ ختم ہونے کی خوشی میں لنکن کے سر پر بارش کا پانی انڈیل دیا۔''

''یہ تمہارے ہاتھ کیسے لگا؟'' مائیک نے بے اختیار خواہش کی۔ کاش! اس کا باس اور سرپرست پروفیسر کائل ہیڈ اس وقت یہاں ہوتا تو اس کے لہجے کی بے نیازی کو ضرور سراہتا۔ سنیما کی ایک تاریخی فلم کی نئی دریافت شدہ خام فوٹیج؟ اس کا دل اس زور سے دھڑک رہا تھا جیسے پسلی چٹخا دے گا۔

''فریسو میں ایک وراثتی نیلامی میں، دس سال پہلے۔'' ڈیرک بتانے لگا۔ ''میں نے یہ آن لائن دیکھی اور قسمت آزمائی۔ دو عدالتوں کے درمیان وقت کاٹنے کو کچھ چاہیے تھا۔ اس آدمی کی بیٹی کو پتا ہی نہیں تھا کہ اس کے پاس کیا خزانہ ہے۔ کسی اور کو بھی نہیں۔ میں ہی واحد بولی لگانے والا تھا اس کباڑ کے ڈبے پر۔ میں نے ریل رکھ لی اور باقی چھوڑ آیا۔ اس نے بتایا کہ اسے یہ فلم ریل اپنے باپ کی الماری کے پچھلے حصے سے ملی جب وہ دفنانے کے لیے اس کا سوٹ نکال رہی تھی۔ وہ اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں صرف اتنا جانتی تھی کہ وہ ڈپریشن کے زمانے میں ملک بھر میں فری ٹرینوں پر سفر کرتا رہا۔ شاید اسے کسی اسٹوڈیو کے پچھواڑے کی راکھ کی ٹوکری سے نکال لایا ہو۔ ان پرانے فلمی سرمایہ داروں کو ان تاریخی فلموں کی حفاظت کی کوئی پروا نہ تھی۔ جب اسٹوریج کی جگہ کم پڑتی تو پرانا سامان بیچ دیتے یا پھینک دیتے۔''

''مجھے اچھی طرح معلوم ہے یہ سب۔ کیا تمہیں اس آدمی کا نام یاد ہے؟'' مائیک نے سوال کیا۔

اس نے سر ہلایا۔ ''کیا یہ ضروری ہے؟''

''شاید نہیں۔'' مائیک نے ایک گہری سانس لی۔ ''بعض اوقات حقوق کا مسئلہ ہوتا ہے لیکن یہ فلم تو کب کی پبلک ڈومین میں آ چکی۔ بس مجھے ہمیشہ تجسس رہتا ہے کہ یہ چیزیں کن کن ہاتھوں سے ہوتی ہوئی میرے پاس پہنچتی ہیں۔ تم اس کے بدلے کیا مانگ رہے ہو؟''

''دس ہزار ڈالرز۔'' اس نے کہا۔

☆☆☆

''ڈاکٹر ڈیرک بکس!'' مائیک بڑبڑایا۔ ''تم ''ٹارزن آف دی ایپس'' کو میرے ڈیپارٹمنٹ کو دینا چاہتے ہو، اس شرط پر کہ تمہیں کیلی فورنیا یونیورسٹی سے اعزازی ڈاکٹریٹ ملے؟'' مائیک نے گویا ایک بار پھر تصدیق چاہی۔

''اور دس ہزار ڈالرز۔'' ڈیرک نے لقمہ دیا۔ ''اسے میں ایرانی ہیروئن پر اُڑا دوں گا لیکن پی ایچ ڈی ہمیشہ کے لیے ہے۔ یہ خرچ نہیں ہوتی۔''

مائیک کو محسوس ہوا اس کا پُرسکون چہرہ اب بکھرنے لگا ہے۔

اس نے خود کو سنبھالا۔ ''میرے پاس تعلیمی اعزاز دینے کا اختیار نہیں۔ وہ ایک الگ شعبہ ہے، بالکل مختلف ترجیحات کے ساتھ۔ محض تین منٹ کی فلم کے بدلے وہ شاید

pklibrary.com

ہی اپنے اصول توڑیں۔"

"بس، یہی میری شرط ہے۔" ڈیرک نے کندھے اُچکائے۔

اگر ڈیرک وہی الفاظ کسی اور لہجے میں بولتا تو آرکائیوسٹ مائیک اس کے وقت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بنا وقت ضائع کیے وہاں سے چل دیتا مگر یہ بات کرتے ہوئے ڈیرک کی آواز اس طرح لرزی جیسے کسی نوعمر لڑکے کی۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں بے بسی سے بھری امید تھی۔

مائیک کو ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی گناہگار انسان کے پاس آخری موقع کے طور پر آیا ہو اور شاید وہی اس کی زندگی بدل سکے۔

دروازے پر ہوتی دستک نے اسے اپنے خیالات سے باہر نکالا۔

"کرین ٹھیک ہوگئی ہے ڈیرک!" کسی نے آواز دی۔ "لو کہہ رہا ہے جلدی آجاؤ، کہیں پھر سے خراب نہ ہوجائے۔"

"لو سے کہو میں بس ایک منٹ میں آیا۔" اسے جواب دے کر ڈیرک کی نظریں مائیک پر جم گئیں۔

مائیک نے کہا۔ "میں اپنے سپروائزر سے بات کروں گا۔ وہی اس کی قیمت کا اندازہ لگا سکتا ہے اور ممکن ہے وہ انہیں ماننے پر آمادہ کر سکے لیکن میں کوئی وعدہ نہیں کرتا۔" وہ کچھ رکا۔ "کیا ڈیپازٹ کے لیے چیک ٹھیک رہے گا؟ میرے پاس نقدی نہیں ہے۔ سچ پوچھو تو میں نے سوچا تھا کہ اگر ہم متفق ہو بھی گئے تو قیمت زیادہ ہوگی۔"

ڈیرک نے کندھے اُچکائے۔ مائیک نے چیک پر رقم لکھی، میمولائن میں 1918 اور پروڈکشن نمبر لکھا اور چیک اسے تھما دیا۔

"منسوخ شدہ چیک ہی میری رسید ہوگا۔ فی الحال وہ ریل کہیں محفوظ رکھنا۔"

ڈیرک نے چیک باتھ روب کی جیب میں ڈال لیا۔ اس بار اس کی مسکراہٹ بچوں جیسی تھی۔ دس سال کے دلکش لڑکے کی جھلک۔

"بے فکر رہو، اس ٹیم کے ساتھ تو یہ بالکل محفوظ ہے۔ ڈائریکٹر پورا وقت ٹائروں کی سیل کرتا ہے اور اس کا اسسٹنٹ لائبریرین ہے۔ یہاں اس چندر کے کھیت میں کوئی بھی اسٹوٹلنگن کو نہیں جانتا۔ اجازت دو، اب میں اپنے کردار میں ڈوب جاؤں۔"

اس نے باتھ روب اتارا، لنگوٹ سنبھالا اور شیر کی طرح دہاڑ کر باہر نکل گیا۔

اس کی یہ دھاڑ سن کر مائیک کو احساس ہوا شاید یہی وہ چیز تھی جس نے اسے آڈیشن میں کامیاب کیا تھا۔

☆☆☆

پروفیسر کائل ہیڈ نے یونیورسٹی کیمپس میں استعمال ہونے والے واحد تمباکو کی چٹکی بھری اور اسے سلگانے کے لیے ماچس جلائی۔ اس کے انگوٹھے کی جلد کئی بار جھلس چکی تھی کیونکہ وہ پائپ کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار نہیں کرتا تھا۔ یہی بے صبری اس کے اُلجھے ہوئے، بغیر کٹے ہوئے سفید بالوں اور اس کے سویٹر پر جمی راکھ کی تہوں میں بھی نظر آتی تھی۔

"تین منٹ۔" اس نے کہا جب شعلہ سلگنے لگا۔ اس نے ماچس بجھائی اور دھواں چھت پر بنے نکوٹین کے داغ کی طرف چھوڑا۔

"اور اکیس سیکنڈ۔" مائیک نے بات مکمل کی۔ "وہ فلم جو 107 برس میں کبھی عوام کے سامنے نہیں آئی۔"

"یونیورسٹی بورڈ کو اس کی کوئی پروا نہیں۔ چاہے وہ اگلے سو سال مزید عوام کے سامنے نہ آئے۔ خیر، میں کچھ کرلوں گا۔ چلو کچھ کھا لیتے ہیں۔ پیسے تم دو گے۔"

وہ باہر نکلے تو دفتر کے باہر ہال میں ایک آدمی کھڑا تھا۔ وہ بہت لمبا اور چوڑے شانوں والا تھا۔ بھورا سوٹ پہنے جس کے کالر کو ٹائی نے بند کر رکھا تھا۔ اس کا کلین شیو چہرہ سرخ مٹی کی طرح جھلسا ہوا لگتا تھا۔

"کیا آپ میں سے کوئی مائیک ہے؟" اس کی آواز گہری اور گونج دار تھی۔ اس نے اپنا بیج دکھایا۔

"جیک اول! میں وینٹورا کاؤنٹی شیرف کے محکمے میں ڈیٹکٹیو لیفٹیننٹ ہوں۔ تم ڈیرک بکس نام کے آدمی کو جانتے ہو۔" یہ سوال نہیں تھا، بیان تھا۔

"ہم آج ملے تھے۔ کیا وہ کسی مشکل میں ہے؟" مائیک آگے بڑھا۔

"تم نے اسے کب چھوڑا؟" اس نے اگلا سوال کیا۔

"شاید پانچ بجے کے کچھ بعد۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ....."

"کیا وہ زندہ تھا؟" ڈیٹکٹیو جیک نے پھر اُس کی بات کاٹی۔

ڈیٹکٹیو جیک نے کہا کہ پروفیسر کائل ہیڈ کا ان کے ساتھ جانا ضروری نہیں مگر جب اس نے اصرار کیا تو اس نے بحث نہیں کی۔

پروفیسر ایک جدید ماڈل مرکری کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور مائیک ڈرائیور کے ساتھ سامنے۔

ویسٹ ہالی ووڈ کی روشنیاں تیزی سے کھڑکیوں کے پار گزر رہی تھیں۔

''کوئی تم پر الزام نہیں لگا رہا۔'' جیک نے کہا۔ ''جہاں تک میں سمجھا ہوں، یہ ڈیرک ایک نشئی تھا۔ سادہ سی اوورڈوز کا معاملہ ہے۔ جب کیمرا کرین ہزارویں بار خراب ہوئی تو وہ اپنے ٹریلر میں واپس گیا اور جب اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے اسے بتایا کہ کرین ٹھیک ہوگئی ہے تو وہ جواب نہ دے سکا۔ ڈائریکٹر غصے میں آ گیا۔ لگتا ہے یہ پہلا موقع نہیں تھا جب اس کا اداکار تاخیر کی وجہ بنا ہو۔ اس نے ایک اسٹیج ہینڈ کو دروازہ توڑنے کو کہا اور انہیں ڈیرک فرش پر مردہ حالت میں پڑا ملا۔ جسم ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔''

''تو پھر اتنی تفتیش کیوں؟'' پروفیسر کائل نے کہا۔

''یہ تفتیش نہیں ہے اور ویسے بھی ''تفتیش'' جیسے لفظ کا استعمال پرانے زمانے میں ہوتا تھا۔'' ڈیٹکٹیو جیک کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔ وہ پہلے ہی پروفیسر کائل کے ساتھ جانے سے ناخوش تھا۔ ''ہمیں ٹریلر میں ایک چیک ملا ہے، مائیک کے دستخط کے ساتھ، آج کی تاریخ پر۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کہتا ہے کہ مرنے والا پندرہ منٹ تک کسی کے ساتھ اندر بند تھا۔ عملے میں سے کسی کو بھی اندر جانے کی اجازت نہ تھی اور نہ ہی وہ کسی کو اندر آنے دیتا تھا۔ یہ فطری ہے، ایک نشئی ہونے کے ناتے۔ شاید وہ چاہتا نہ ہو کہ کوئی اس کا ذخیرہ چھیڑے۔ ہم نے فینٹی نائل ایک موزے میں لپٹا ہوا پایا۔ چیک پر دستخط دیکھ کر نام کا پتا لگانا معمولی کام تھا۔'' اس نے مائیک کو بتایا۔

مائیک نے کہا۔ ''میں نے ہمارے درمیان ہوئی ساری بات چیت آپ کو بتا دی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتا کہ ہمیں آکسنارڈ واپس کیوں جانا ہے؟''

''یہ تو شہر کی سرحد پر نصب بورڈ کا نعرہ ہونا چاہیے۔'' پچھلی سیٹ پر بیٹھے پروفیسر نے لقمہ دیا۔

ڈیٹکٹیو نے تبصرہ نظر انداز کر دیا۔ ''تمہاری کہانی ایک حد تک درست لگتی ہے۔ وہ پوسٹر اور چیزیں بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں لیکن چونکہ تم پہلے شخص ہو جس نے اس جگہ کو دیکھا۔ شاید تم دیکھ کر بتا سکو کہ کچھ اور غائب تو نہیں۔''

''کچھ اور؟'' پروفیسر اور مائیک دونوں ایک ساتھ بول اٹھے۔

''میرے ساتھی اور میں نے ابتدائی تفتیش میں خاصی باریک بینی سے جائزہ لیا۔ ہمیں فلم کے کوئی ریلز نہیں ملے۔''

رات کے وقت تیز سفید روشنی میں نہایا ہوا سیٹ واقعی

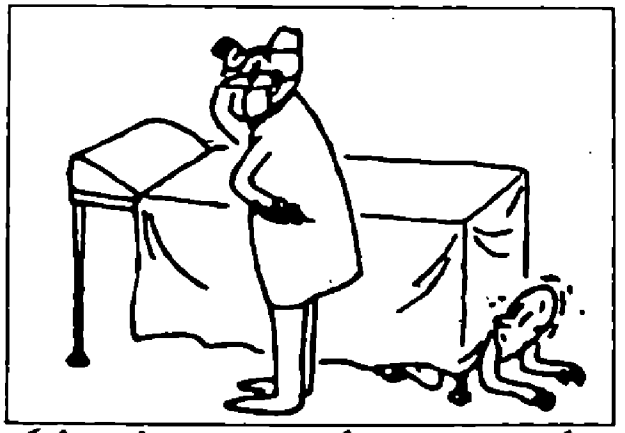

بہتر لگ رہا تھا۔ عملہ اِدھر اُدھر مصروف تھا، جوش و خروش کی فضا تھی اور سرکاری گاڑیوں کی سرخ نیلی بتیوں کی چمک دمک نے اسے کسی بڑی فلم کی لوکیشن جیسا بنا دیا تھا، نہ کہ کسی ناکام چقندر کے کھیت کو سیر ٹینگیٹی بنانے کی کوشش۔

ڈیٹکٹیو انہیں ایک نوجوان اور باوقار سیاہ فام عورت کے پاس لے گیا جو ٹریلر کے سامنے کھڑی ایک موٹے آدمی سے بات کر رہی تھی۔

''میری پارٹنر، سارجنٹ جین!'' جیک نے ان کا تعارف کروایا۔

''سارجنٹ کو چھوڑ دو، صرف جین کہو۔'' اس نے کہا اور سب سے ہاتھ ملایا، مضبوط اور دوستانہ انداز میں۔ اس کے دانت جیسے مسکرانے کے لیے بنے ہوں اور اس کے سرخی مائل بھورے بال ایک طرف سنہری کلپ سے سجے تھے تاکہ آنکھوں کے سامنے نہ آئیں۔

''جب یہ سارجنٹ کہتا ہے تو لوگ کسی مونچھوں والے ویٹ لفٹر کو تلاش کرنے لگتے ہیں۔'' وہ ہنسی۔

مائیک کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہ بھی یہی سمجھا تھا۔ اکثر خواتین ڈیٹکٹیو دیکھنے میں اتنی خوبصورت نہیں ہوتیں جتنی جین تھی۔

''لو پس پائلٹ۔'' اس کے ساتھ کھڑے موٹے آدمی نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ وہ چالیس برس کا بے ترتیب ڈاڑھی والا آدمی تھا جو ٹینک ٹاپ، کارگو شارٹس اور چکنی بیس بال ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ ''میں وہ مصنف و ہدایت کار ہوں جو اس سینما کے شاہکار کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہے۔''

جین چند قدم دور جا کر جیک کے ساتھ گفت و شنید میں مصروف ہوگئی جہاں ایک گنجا آدمی نوٹ بک میں کچھ لکھنے میں مگن تھا۔ اس کے پیچھے دو وردی پہنے عملے والے ایک اسٹریچر کو ایمبولینس میں لوڈ کر رہے تھے۔

اسی وقت ڈیٹکٹیو جیک نے مائیک کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

pklibrary.com

وہ دونوں اس طرف آئے جہاں وہ تینوں کھڑے تھے۔
''یہ ڈاکٹر برنز ہیں، ہمارے میڈیکل ایگزامنر!'' جیک نے اس گنجے آدمی کا تعارف کروایا۔ ''ڈاکٹر! انہیں وہ بتاؤ جو آپ نے ہمیں بتایا۔''
میڈیکل ایگزامنر نے اپنی نوٹ بک بند کی۔ ''حتمی بات تو آٹوپسی کے بعد ہی کہی جاسکتی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن ابتدائی مشاہدے سے مجھے شبہ ہے کہ موت دم گھٹنے سے ہوئی ہے۔''
''کس بنیاد پر؟'' پروفیسر کائل نے پوچھا۔
''یہ پروفیسر ہیں۔'' جیک نے برنز کو بتایا، جیسے بس یہی وضاحت کافی ہو۔
''ان کے ناخن نیلے ہو چکے ہیں، سب سے پہلی علامت یہی ہے۔''
''فینٹی نائل کا زہر بھی جلد کو نیلا کر دیتا ہے۔'' ڈیٹکٹیو نے کہا۔
''جی ہاں، جلد کو..... صرف ناخنوں تک محدود نہیں رہتا۔ دیگر علامات بھی ہیں مگر یہ سب سے واضح ہے۔''
مائیک نے کہا۔ ''تو وہ دم گھٹنے سے مرا..... کیسے؟''
برنز کے چہرے پر ناگواری ابھری۔ ''یہ تفتیش افسران کی ذمے داری ہے۔ میرا کام صرف موت کی وجہ معلوم کرنا ہے۔''
سارجنٹ جین نے پوچھا کہ آٹوپسی رپورٹ کب تک متوقع ہے۔
''جب مکمل ہو جائے۔'' مگر جب وہ حسین خاتون کے سوال کا سامنا کر رہا تھا تو اس کا غصہ ماند پڑ گیا۔ ''دیکھتا ہوں، اگر جلدی ہو جائے۔ یہ لاس اینجلس نہیں ہے۔ یہاں اتنے قتل نہیں ہوتے کہ ہم انہیں معمول سمجھیں۔''
جیک نے بھویں سکیڑیں۔ ''قتل.....؟ یہ نتیجہ تفتیش کاروں کا ہوتا ہے۔''
جین مسکرائی۔ ''شکریہ ڈاکٹر!''
اس نے سر ہلایا، زمین سے اپنا میڈیکل بیگ اٹھایا اور چلا گیا۔
''چلو، ٹریلر میں چلتے ہیں۔'' جیک نے کہا۔ ''کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا۔ فنگر پرنٹ کی ٹیم راستے میں ہے۔''
ٹریلر ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے اندر فٹ بال کھیلی ہو۔ پوسٹر ٹیڑھے لٹک رہے تھے، کتابیں اور جنگل سے متعلق یادگاریں فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ مائیک کے چہرے پر ردِعمل دیکھ کر جیک بولا۔
''وہ دروازے کے ساتھ پڑا ملا۔ ہمارے اندازے کے مطابق شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ دوا کا اثر کچھ زیادہ ہو رہا ہے۔ وہ بستر سے چھلانگ لگا کر مدد لینے گیا، دیواروں سے ٹکرا کر گرا اور نکلنے کی کوشش میں ہی دم توڑ گیا لیکن اگر برنز ٹھیک کہہ رہا ہے تو وہ تازہ ہوا کے لیے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔''
یہ اندازہ لگانا ناممکن نہیں تھا کہ مائیک کے دیکھے گئے سامان میں کچھ غائب ہے یا نہیں۔ اس نے اس دراز کی طرف اشارہ کیا جہاں فلم کی ریل ایک کینسٹر میں رکھی گئی تھی۔ جین تھورپ نے احتیاط سے دراز کھولی تاکہ انگلیوں کے نشانات محفوظ رہیں۔ اندر صرف بکس کا چمکتا ہوا ریوالور اور اسکرین پلے Tarzan vs. the Zulu Zombies پڑے تھے۔
''یہ گن نقلی ہے۔'' جیک نے کہا۔ ''شاید کسی پراپ ڈیپارٹمنٹ سے چرائی گئی ہو۔''
وہ دوبارہ باہر نکل آئے۔ دروازہ کھلا تھا، اس آلے کے زور سے جو اسٹیج ہینڈ نے توڑنے کے لیے استعمال کیا تھا، کچھ ٹیڑھا ہو چکا تھا۔ کائل ہیڈ نے بغیر چھوئے تالا دیکھا۔
''میں بھی ایک وقت میں ٹریلر میں رہا ہوں، یہ تو کسی عجائب گھر کی چیز لگتی ہے۔ لگتا ہے اسے باہر سے تالا لگایا گیا تھا۔''
تفتیش کاروں نے باری باری جا کر دیکھا۔
دھات کا کنڈا جو زبردستی توڑنے سے مڑ چکا تھا۔
جیک نے اسے ہاتھ کی پشت سے دھکیلنے کی کوشش کی۔ وہ نہیں ہلا۔
''ویسے تم ہو کس چیز کے پروفیسر؟'' جیک کی نظریں کائل ہیڈ پر جا ٹکیں جو اپنے پائپ میں تمباکو بھر رہا تھا۔
وہ کندھے اچکا کر بولا۔ ''قرونِ وسطیٰ کے ادب کا۔ بس یونہی فلموں کی طرف نکل آیا۔''
''شکریہ پروفیسر!'' جین تھورپ قدم بڑھا کر اپنے پارٹنر اور کائل ہیڈ کے درمیان آ کھڑی ہوئی اور دوبارہ مصافحہ کیا۔
''میں نے ڈیرک کو فلم کے لیے ایڈوانس دیا تھا۔'' مائیک نے جیک سے کہا۔ ''وہ فلم مل جائے تو مجھے اطلاع ضرور کرنا، میں شکرگزار ہوں گا۔''
اس سے پہلے کہ جیک کچھ جواب دیتا، ایک نوجوان، مضبوط جسم والا آدمی ان کے قریب آیا۔
''میرا نام کولن ہے، ڈیٹکٹیو! ہم پہلے بات کر چکے ہیں۔ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہوں۔'' اس کی آواز اس کے

pklibrary.com

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ''آفیشل پیج'' کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35895313

pklibrary.com

قد سے کہیں زیادہ بھاری تھی۔ اگرچہ جیک کی آواز جتنی گہری نہیں۔ ''لو پوچھ رہا ہے کہ ہم کب دوبارہ شوٹنگ شروع کر سکتے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ ڈیرک کے باقی مناظر کسی ہم شکل سے فلمائے جا سکتے ہیں۔''

''پروڈکشن اگلے حکم تک بند ہے۔'' جیک کا لہجہ غصے کی آخری حد کو چھو رہا تھا۔

''اوہ، کیا آپ خود یہ بات اُسے بتا سکتے ہیں؟ میں پہلے ہی اس کے نشانے پر ہوں۔ وہ کرین کے لیے مجھے قصوروار ٹھہراتا ہے جیسے میں نے خود اسے خراب کیا ہو۔'' کولن کے لہجے میں شکایت تھی۔

''میرے چہرے کو غور سے دیکھو کولن! تمہیں کیا میں بیوقوف لگتا ہوں؟''

اسسٹنٹ ڈائریکٹر شرمندہ سا ہو کر چلا گیا۔

جیک نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''یہ فلمی لوگ بھی نا!''

مائیک مسکرایا۔ ''ہالی وڈ کو الزام نہ دیں ڈیکٹیو۔ ڈائریکٹر ٹائروں کا بیوپاری ہے اور اس کا اسسٹنٹ ایک لائبریرین۔''

☆☆☆

وہ کیفے جو فلمی اسکالرز کا پسندیدہ تھا، بند تھا۔ وہ دی اوریکل جا پہنچے جہاں تھیٹر کی چھت سے پانی رسنے کے باعث کچھ نشستوں پر ترپال ڈال دی گئی تھی۔ وہ پروجیکشن بوتھ کے فریج پر ہاتھ صاف کر کے کینوس کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ یہ جگہ مائیک کے فلیٹ سے دگنی بڑی تھی۔

''میک اینڈ چیز!'' کائل ہیڈ نے زرد چیز میں جما ہوا چمچ گھمایا۔ ''مچھلی کے فنگس ختم ہو گئے؟''

مائیک نے اپنا پیالہ بغیر چکھے ایک طرف رکھ دیا۔ ''مجھے سمجھ نہیں آتی تم کھا کیسے لیتے ہو؟''

''یہ زندگی ہے میرے دوست! لوگ تو جنازوں پر بھی صرف کھانے کے لیے جاتے ہیں۔ ویسے بھی ڈیرک ہکس کا انجام طے تھا۔ وہ ایک ناکام اداکار تھا۔ فیٹی نائل اسے ویسے بھی مار ہی دیتا۔ اب یوں سمجھ لو کہ وہ ہالی وڈ کے حل نہ ہونے والے معماجات کی طویل فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔ وہ فہرست تو لاشوں کا ہال آف فیم ہے۔''

مائیک نے آہ بھری۔ ''امید ہے تمہاری بیوی جلد گھر آ جائے۔ اس کی غیر موجودگی میں تم وحشی بن جاتے ہو۔''

''ویسے جیک آکل سے دور رہو۔ وہ ایسے ہے جیسے کوئی اسکالر ہو جسے تیسرے درجے کی یونیورسٹی میں پڑھانے پر مجبور کر دیا گیا ہو۔'' پروفیسر کائل نے اس کے پیالے میں جھانک کر دیکھا۔ ''اور وہ جین تھورپ جو خود کو ''سارجنٹ'' کہنے سے منع کرتی ہے، کیا تم اسے ڈیٹ پر لے جانے والے ہو؟''

''میں چونتیس کا ہوں اور میری ایک گرل فرینڈ ہے۔ کیا تم بھول گئے پروفیسر؟'' مائیک نے اسے یاد دلایا۔

''جب میں چونتیس کا تھا تو میری شادی کو چودہ سال ہو چکے تھے پھر میں پچیس سال رنڈوا رہا اور اب دوبارہ شادی شدہ ہوں۔ اگر تم خود کچھ نہیں کرنا چاہتے تو کم از کم مجھے تمہارے ذریعے زندگی کا مزہ لینے دو۔''

مائیک نے موضوع بدل دیا۔ ''ڈیرک کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کوئی آدمی ہوا دار پرانے ٹریلر میں دم گھٹنے سے کیسے مر سکتا ہے؟''

اگلی صبح جب مائیک دفتر پہنچا تو روتھ کی نظریں لیزر کی طرح اس پر گڑ گئیں۔ اس کے سرخ نکیلے ناخن کمپیوٹر کے کی بورڈ پر تیزی سے چل رہے تھے۔

''اس بار تم نے کیا کر دیا ہے؟''

کائل ہیڈ اس سوال کو ایک ہلکے پھلکے ''گڈ مارننگ'' سے ٹال دیتا لیکن مائیک کے پاس نہ اس کا تجربہ تھا اور نہ ہی اس جیسا تدریسی تحفظ۔

سیکرٹری نے اس کرخت سیکریٹری کو عملاً تمام عملے پر ایک غیر رسمی اختیار دے رکھا تھا۔ مائیک نے نہ سمجھنے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

''تمہارے دفتر میں پولیس تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ تم انہیں ایسے کھینچتے ہو جیسے مقناطیس لوہے کو۔'' اس نے بتایا۔

جین تھورپ اس کے دفتر میں اس کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ واحد کرسی جو سامان رکھنے کے لیے استعمال نہیں ہو رہی تھی۔

''ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم ٹریلر سے لی گئی فلمی اشیا پر ایک نظر ڈالو اور ان کی قیمت کا اندازہ لگاؤ۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ میں اس معاملے میں کل کے مقابلے میں کچھ زیادہ مدد دے سکوں گا۔ جب میں ڈیرک سے ملا تھا تو میں نے ان چیزوں کو اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا۔''

''آپ نے یہی کہا تھا۔ مگر ایک عمومی اندازہ کہ وہاں کیا موجود ہے، ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے کہ جو چیز غائب ہے وہ کتنی قیمتی ہو سکتی ہے۔ اگر وہ کافی قیمتی ہے اور اگر قتل کی وجہ لالچ ہے تو ہم قاتل کے ممکنہ خریدار یا بیچنے والے تک پہنچ سکتے ہیں، یہ فرض کرتے ہوئے کہ وہ چیز واقعی

وجود رکھتی ہے۔ ایک کمزور سی امید ہے لیکن کچھ نہ ہونے سے بہتر ہے۔'' جین نے کہا۔

''دولت مند کلیکٹرز واقعی خاص ذوق رکھتے ہیں۔'' اس نے کچھ دیر سوچا۔ ''میں پوری کوشش کروں گا۔ کیا ہم پولیس ہیڈ کوارٹر جارہے ہیں؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''نہیں، ہمارے پراپرٹی روم میں گنجائش نہیں ہے۔ لوئس پائلٹ نے ہمیں چقندر کے کھیت پر ایک بیرونی گودام استعمال کرنے دیا ہے جہاں ملبوسات اور پروپس رکھے جاتے ہیں۔ وہاں کلیکشن کو پھیلانے کی جگہ ہے۔''

''کیا پروفیسر کائل ہیڈ بھی ساتھ جاسکتے ہیں؟ وہ ہالی ووڈ یادگاروں کی قدر و قیمت کا اندازہ اُس وقت سے لگا رہے ہیں جب میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔'' اس نے پوچھا۔

اس نے اپنی ٹھوڑی کو چھوا پھر مسکرائی۔ ''ضرور..... کیوں نہیں۔''

گاڑی وہی لگ رہی تھی جس میں کل وہ اور کائل ہیڈ بیٹھے تھے۔ راستے میں جین تھورپ نے تفتیش کی کچھ تفصیلات پر ان کی تجسس بھری نظریں مطمئن کیں۔

''جب آخری بار کیمرا کرین خراب ہوئی تو ڈیرک اپنے ٹریلر میں چلا گیا جو کہ شوٹنگ کے دائرے سے باہر اندھیرے میں کھڑا تھا۔ ایک گھنٹے بعد کرین ٹھیک ہوگئی اور ڈائریکٹر پائلٹ نے اپنے اسسٹنٹ کولن زووسکی کو بھیجا کہ وہ اسٹار کو بلا لائے اور پھر کیا ہوا، وہ آپ جانتے ہی ہیں۔'' جین نے کہا۔ ''دروازہ بند تھا لیکن اس وقت کسی نے دھیان نہیں دیا کہ وہ اندر سے بند تھا یا باہر سے۔ اس ماڈل میں ایک ڈیزائن کی خامی تھی۔ ہم نے ایک ماہر سے مشورہ کیا۔ اسے کھولنے کے لیے چابی چاہیے لیکن بند کرنا صرف ایک بٹن گھما کر ہوسکتا ہے۔ کوئی بھی مذاق کرنے والا صرف انگلیوں سے اندر موجود شخص کو بند کرسکتا ہے۔''

''تو آپ کا خیال ہے کہ کسی نے اسے اندر بند کیا اور پھر کاربن مونو آکسائیڈ اندر بھری؟'' مائیک سوال کرنے لگا۔

''چھت پر ایک وینٹ پائپ ہے۔ ہمارا ملزم وہاں اوپر چڑھ سکتا تھا۔ اگر وہ احتیاط سے چڑھا ہوتا کہ کوئی نشان نہ چھوڑے۔ ہمیں ابھی تک یہ یقین نہیں کہ زہریلا مواد کون سا تھا۔ اگر وہ مونو آکسائیڈ تھا تو کسی گاڑی کو ٹریلر کے قریب لاکر اس کا ایگزاسٹ پائپ ایک نلی کے ذریعے جوڑنا پڑتا..... اور کسی نے کوئی انجن چلنے کی آواز نہیں سنی۔''

ایک ہلکی سی جھرجھری نے مائیک کو پیچھے مڑنے پر مجبور کیا۔ کائل ہیڈ نے آہستگی سے لب ہلائے۔

''مقفل کمرے والے قتل کا معما۔''

یہ فلمی سیٹ ویسا بالکل نہیں لگ رہا تھا جہاں مائیک عام طور پر جایا کرتا تھا۔ یہاں زیادہ تر عملہ یا تو فارغ کردیا گیا تھا یا دوسرے منصوبوں پر بھیج دیا گیا تھا، ساز و سامان سمیت۔

یونیفارم میں ملبوس پولیس افسران بس جائے وقوعہ پر رسمی طور پر موجود تھے۔

ڈیٹیکٹو جیک نے مائیک کی طرف دیکھ کر سر ہلایا، پروفیسر ہیڈ کو نظر انداز کیا۔ جواباً پروفیسر نے بھی اسے نظر انداز کردیا، پھر جین سے مختصر بات کی اور سب کو ایک پرانے، موسم خوردہ گودام کی طرف لے گیا جس کی چھت خستہ حال تھی۔ ڈائریکٹر لوئس پائلٹ اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر کولن زووسکی بھی ساتھ ہولیے۔

اندر ڈیرک بکس کا ذخیرہ تختوں والے فرش پر پھیلا ہوا تھا۔

کلیگ لائٹس، مائیکرو فون بومز اور دیگر فلمی ساز و سامان کھاد، کیڑے مار دوا اور مختلف زرعی اشیا کے ڈرموں کے ساتھ رکھے گئے تھے۔

''یہ ٹارزن کی چیز نہیں ہے۔''

کائل ہیڈ ایک نیزہ نما چھڑی پر جھپٹا اور اسے اٹھالیا۔

''جون ہال نے اسے Arabian Nights میں ایک خلیفہ کے سر پر مارنے کے لیے استعمال کیا تھا۔''

پروفیسر کیلوں سے بھری الٹی پیٹی پر بیٹھ گیا، چھڑی کو فرش پر نیچے کی طرف ٹکا کر، بالکل کنگ نیپچون کی طرح۔

مائیک نے اپنے قدموں کے قریب رکھی اشیا کا جائزہ لیا۔ کچھ پر پروفیسر ہیڈ سے مشورہ کیا پھر تفتیش کاروں کی طرف مڑا۔

''کتابیں اور پوسٹرز عمدہ حالت میں نہیں ہیں۔ نیلامی میں یہ کل ملا کر چند ہزار ڈالرز لاسکتے ہیں، بس اتنا ہی۔ پروپس کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ظاہر ہے میں ان اشیا کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا جو شاید غائب ہوں لیکن چور کو ماہر کی نظر درکار ہوگی تاکہ اصلی اور فضول چیزوں میں فرق کرسکے۔''

''اندھیرے ٹریلر میں؟'' جیک کا انداز طنزیہ تھا۔

''زہر ڈالنے کا وقت نکال دو، بغیر چابی کے تالا بند کرکے دوبارہ کھولنا اور وہ سارا انتشار جو ڈیرک نے باہر نکلنے کی کوشش میں مچایا؟ میں نے کہا تھا یہ ایک لاحاصل کوشش ہے۔ وہ فلمی ریل دس ہزار ڈالرز کی ہے۔ قتل کے لیے یہی محرک کافی ہے۔''

''اس نے وہ تالا کیسے کھولا؟'' کائل ہیڈ نے پوچھا۔
جیک اس کی طرف مڑا مگر جین نے بات سنبھال لی۔
''ہم ابھی اس پر کام کر رہے ہیں۔''
کولن بول اٹھا۔
''اتنی پیچیدگی کیوں؟ یہ خودکشی تھی۔ زہر کی ساری بات جھوٹی ہے۔ وہ بندہ سٹھیا گیا تھا، اوورڈوز ہوا۔ بس بات ختم۔''
''تو فلم کہاں گئی؟'' جیک نے پوچھا۔
''مائیک نے کہانی گھڑی ہے۔ یہ کالج کے دانشور ہمیشہ چندے کے لیے کچھ نہ کچھ بناتے رہتے ہیں۔ کوئی امیر فارغ التحصیل خبروں میں کسی دفن خزانے کی بات سنتا ہے اور پرانے ادارے کو ڈونیشن دے دیتا ہے۔ تمہیں ڈیرک کا فیٹی نیل مل گیا پھر بحث کیوں؟'' اے ڈی کولن کا لہجہ تیز تھا۔
اوپر شہتیروں پر ایک چوہا دوڑا۔ اس کے پاؤں کی آواز خاموشی میں نمایاں ہوگئی۔
جین تھورپ نے خاموشی توڑی۔
''تمہیں کس نے بتایا کہ ہمیں فیٹی نیل ملا ہے؟''
نوجوان نے اپنے تنومند ننگے بازو پر ہاتھ پھیرا۔
''میں نے تمہیں بات کرتے سنا۔''
ڈیٹکٹو جیک، پروفیسر اور مائیک کو گھورنے لگا۔ ''تم میں سے کسی نے اسے بتایا؟''
مائیک نے سر ہلا کر انکار کیا۔
پروفیسر ہیڈ نے اپنی چھڑی کا سرا زور سے فرش پر مارا جیسے بات پر مہر لگا رہا ہو۔
''ہم ایسی باتیں وہاں نہیں کرتے جہاں گواہ سن سکیں۔'' جیک، کولن کی طرف مڑا۔ ''میں نے یہ بات صرف یونیورسٹی کے اِن ''دانشوروں'' کو بتائی تھی۔ یہاں کسی کو پتا نہیں تھا سوائے اس شخص کے جس نے خود فیٹی نیل وہاں رکھا اور اب مجھے لگنے لگا ہے کہ وہ شخص ڈیرک بکس نہیں تھا۔''
''یہ بکواس ہے۔'' اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی آواز کمزور مگر نظریں آہستہ آہستہ اس دیوار کی طرف کھسکنے لگیں جو ڈرموں کے ڈھیر میں چھپی ہوئی تھی۔
''ان ڈرمز کے پیچھے کیا ہے؟'' جین نے ڈائریکٹر لوئس سے پوچھا۔
''مجھے کیا پتا۔'' اس نے لاعلمی کے اظہار میں کندھے اُچکائے۔
''اس جگہ کے مالکوں نے کہا تھا کہ ان کے اسٹوریج کو ہاتھ نہ لگائیں۔ ہمارا سامان تو ہم نے باہر رکھا ہے تاکہ آسانی سے کام میں لاسکیں۔''
جیک دروازے کی طرف بڑھا تاکہ باہر سے پولیس اہلکاروں کو بلا کر وہ ڈرم ہٹائے جائیں اور اسی پل اسسٹنٹ ڈائریکٹر کولن زووسکی نے کھلے دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔
وہ پہنچ بھی جاتا اگر راستے میں ٹیٹی پر بیٹھے پروفیسر نے عربین ناٹس والی چھڑی اس کے پیروں میں پھنسائی نہ ہوتی۔ وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑا جبکہ پروفیسر بدستور کیلوں والی پٹی پر بیٹھا رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ بالکل ایک مینڈک کی طرح پُرسکون۔
جین تھورپ نے گھڑسوار جتنا قد رکھنے والے کولن زووسکی کو اٹھایا۔ دروازے سے آنے والے پہلے افسر نے اس کی مدد کی۔
افسر نے کولن کو دونوں بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا جبکہ باقی اہلکار ڈرموں کے ڈھیر ہٹانے میں مصروف ہوگئے۔
ایک افسر نے زور لگایا، فرش سے ایک سفید دھات کا سلنڈر اٹھایا اور چمڑے کی بیلٹ کے سہارے اسے باہر لے گیا۔ اس نے سلنڈر کو ڈیٹکٹو جیک کے قدموں میں رکھ دیا، دھات کی آواز کے ساتھ۔ یہ کسی پورٹیبل ائرکمپریسر جتنا تھا جس کے ایک سرے پر دو فٹ لمبی ربڑ کی نلی نوزل سے جڑی ہوئی تھی۔
''ہیلان۔'' جیک نے ٹینک پر لکھی عبارت بلند آواز میں پڑھتے ہوئے ''a'' کو لمبا کر دیا۔
''ہیلن۔'' پروفیسر کائل ہیڈ نے تصحیح کی۔ مختصر ''a'' کے ساتھ۔ یہی ہے تمہارے قتل کا ہتھیار، افسران! ایک بے بو، بے رنگ گیس جس کی خاصیت آکسیجن کو ختم کرنا ہے۔ ڈیرک کو پتا بھی نہ چلا جب تک اسے سانس لینے میں دشواری نہ ہوتی۔''
جیک نے اسے گھورا اور پوچھا کہ اسے اس گیس کے بارے میں اتنا کیسے معلوم؟ وہ گویا پروفیسر کو شریکِ جرم بنانے پر تُلا ہوا تھا حالانکہ یہ پروفیسر ہی تھا جس کی وجہ سے کولن قابو میں آسکا۔
''میں ایک کتابی کیڑا ہوں ڈیٹکٹو! میں نے اپنی زندگی کا آدھا حصہ لائبریریوں میں گزارا ہے۔ کچھ عرصے کے لیے یہ گیس فائر سسٹمز میں پانی کی جگہ استعمال ہونے لگی تاکہ کتابوں کو نقصان نہ پہنچے۔ آگ آکسیجن کے بغیر نہیں جلتی۔ بعد میں EPA نے اس پر پابندی لگا دی کیونکہ یہ اوزون تہ کو نقصان پہنچاتی تھی۔'' پروفیسر نے تفصیل دی۔
''لائبریریاں.....!'' جین تھورپ نے لفظ کو کھینچ کر ادا کیا۔
مائیک نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ڈیرک نے کہا تھا کہ یہ پوری فلم شوٹنگ ہی شوقیہ نوعیت کی تھی جیسے ایک ٹائر سیلز مین اور لائبریرین بنا رہے تھے۔ لگتا ہے کولن فلمی دنیا میں آنے سے پہلے ہی چور تھا۔''

''ہالی ووڈ میں ایسے ہی لوگ چلتے ہیں۔'' پروفیسر بڑبڑایا اور پھر پیٹی سے اٹھ کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔

''مجھے وہ گیس چرانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔'' کولن غصے سے بولا۔ ''انہیں تو خوشی تھی کہ اس سے جان چھوٹ گئی۔''

ایسا لگتا تھا وہ مزید کچھ کہنا چاہتا ہو مگر جیک نے اسے خاموش کروا دیا اور اس کے حقوق پڑھنے لگا۔ ایک اہلکار نے اس کی تلاشی لے کر اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے تھے۔

''یہ دیکھو۔'' پروفیسر نے پیٹی کا ڈھکن اٹھا لیا۔ وہ اندر ہاتھ ڈالنے ہی والا تھا کہ جین اسے ہٹاتے ہوئے آگے بڑھی اور رومال لپٹے ہاتھ سے ایک چپٹا سا دھات کا کینسٹر نکال لیا۔ اس کے اندر کچھ کھنکھنا رہا تھا۔

''تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟'' اب وہ حیرت سے پروفیسر کو دیکھ رہی تھی۔

اس نے اپنا پائپ نکالا۔ ''میں ایک مفلس استاد سہی لیکن میری چھٹی حس نے بتا دیا تھا کہ میں دس ہزار ڈالرز کے اوپر بیٹھا ہوں۔''

☆☆☆

''یونیورسٹی سے کال آئی؟'' مائیک دفتر میں آیا تو پروفیسر فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

''ابھی نہیں لیکن مجھے یقین ہے وہ تمہارا ساتھ دیں گے۔ مردہ اداکار کو اعزازی ڈگری دینا زیادہ آسان ہے بہ نسبت کسی ناکام اداکار کے۔ تمہارا قرض ختم ہوا۔''

''تو پھر فون کس نے کیا تھا؟'' مائیک نے بھویں اٹھائیں۔

''تمہاری گرل فرینڈ نے۔'' اس نے فون واپس دیا۔

''مجھے پتا تھا تم بُرا نہیں مانو گے اگر میں فون اٹھا لوں۔ کولن نے اعتراف کر لیا ہے۔ گیس بند کرنے کے بعد وہ باہر سے اسٹور یج کمپارٹمنٹ کے ذریعے ٹریلر میں گھسا جہاں کوئی تالا نہیں لگا تھا۔ اس کا جسم اتنا دُبلا تھا کہ وہ آرام سے سما گیا۔ اتنی آکسیجن دوبارہ آ چکی تھی کہ وہ محفوظ ہو جائے۔ اس نے فیٹی نیل وہاں رکھ کر اوور ڈوز کا ڈراما رچایا اور ریل ڈھونڈ نکالی۔ ڈیرک کو تمہاری بات ماننی چاہیے تھی۔ کولن نے ریل اور گیس کا ٹینک اس گودام میں چھپا دیا جہاں وہ پہلے سے گیس رکھتا آ رہا تھا۔ یہ سب کچھ اس نے آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں کر لیا جب وہ چھت پر چڑھا تھا۔ اس نے کیمرا کرین کو بھی جان بوجھ کر خراب کیا تاکہ اسے وقت مل سکے۔''

''اسے فلم کے بارے میں کیسے پتا چلا؟'' مائیک نے پوچھا۔

''اس نے ڈیرک کو تم سے یہ کہتے سن لیا تھا کہ وہ فلم دس ہزار سے ہزار گنا زیادہ قیمتی ہے۔''

''تم نے اسے جو رقم دی تھی، وہ سن چکا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ ٹریلر لیک ہو رہا تھا اور وہ عین باہر موجود تھا۔ یاد کرو، اسی کے فوراً بعد اس نے دروازہ کھٹکھٹایا اور ڈیرک کو بتایا کہ اسے دوبارہ سیٹ پر بلایا گیا ہے۔''

''لیکن اگر اس کے پاس پہلے ہی ہتھیار تھا.....''

''قاتل اکثر اناڑی ہوتے ہیں۔'' پروفیسر نے بات جاری رکھی۔ ''مگر چور، خاص طور پر اس جیسے ہوشیار لوگ پیشہ ور ہوتے ہیں۔ اسے مشرقی ساحل کی ایک لائبریری سے اس لیے نکالا گیا تھا کہ اس نے کمپیوٹر اور معمولی رقم چرائی تھی۔ ہیلن گیس کے غائب ہونے کی کوئی رپورٹ درج نہیں کی گئی۔ کولن نے اس بارے میں جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ تو خوش تھے کہ انہیں اسے ٹھکانے لگانے کا خرچ نہیں اٹھانا پڑا۔ اس کے اگلے ملازمت کے گودام میں وہ گیس چھپانے کے لیے موزوں جگہ تھی، جب تک اسے اس کا خریدار نہ مل جاتا۔ اس کی کل کمائی کبھی بھی دس ہزار ڈالرز سے زیادہ نہیں ہوئی۔ تو ایک ناکام اداکار کی زندگی کا اس کے لیے کیا مول ہوتا؟''

مائیک نے ایک گہری سانس لی۔ ''تم اور میں دونوں جانتے ہیں کہ اس کا حساب کتاب کس قدر غلط تھا۔''

''مانتا ہوں۔ ویسے سارجنٹ جین نے اصل میں تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ اس نایاب فلم ریل کو لیبارٹری میں محفوظ رکھنے کا بندوبست کر دیا ہے، جب تک کہ یہ کیس ختم نہیں ہو جاتا۔ ڈیٹیکٹو جیک تو چاہتا تھا کہ اسے شہر کے پرانے، گروزدہ شواہد کے کمرے میں رکھ دیا جائے مگر جیسا کہ تم نے خود دیکھا، یہ جین ہی وہ خوبصورت خاتون ہے جو تمہارے لیے رعایت کرنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ ویسے اس نے یہ تمہیں دینے کے لیے کہا تھا۔ میری بدخطی معاف کرنا۔'' اس نے ایک نیپکن میز پر سرکایا۔

مائیک نے فون نمبر نہیں پڑھا۔ اس نے نیپکن کے ٹکڑے کیے، انہیں مروڑ کر گیند سی بنائی اور کوڑے دان میں پھینک دیا۔

''کائل!'' اس نے کہا۔ ''تم شیطان ہو۔''

پروفیسر جواب میں ہنسنے لگا۔

✖✖✖

pklibrary.com

رمز شناس

نازیہ کامران کاشف

قسط نمبر 6

وہ صدیوں پر محیط ایک ایسا گہرا راز تھا جس کی جڑیں ہندوستان کی سرزمین سے لے کر مصر اور انگلستان تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان جڑوں میں علم کا ایسا خزانہ دفن تھا جسے صدیوں کوئی تلاش نہ کر سکا... مگر کوئی ایسا بھی تھا جسے اس خزانے کی تلاش تھی۔ یہ بھی کائنات کے پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھانے کی اس رمز شناس کی ایسی کوشش تھی جس نے ان سوئی ہوئی شیطانی قوتوں کو گہری نیند سے جگا دیا تھا، جن پر قابو پانا کسی عام انسان کے لیے ناممکن تھا مگر علم کی معراج پر پہنچ کر اس نے ان پُراسرار علوم کو عام کرنے کی ناقابلِ فراموش داستان رقم کر دی اور اس نے تاریخ کے اوراق پر انہیں عبرت کا نشان بنا دیا... صدیاں گزرتی رہیں اور ایک بار پھر اٹھارویں صدی کے اوائل میں ان قوتوں نے سر اٹھایا... مگر کیا مصر کے عیاد ایب، انگلستان کے آرتھر اور ہندوستان کے کاویہ سے... مقابلہ کرنا آسان تھا...؟ ہاں عشق اور فرض کے درمیان اسے ہی کامیابی حاصل ہوئی جو سارے بھید جان گیا تھا۔

خون میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے

ایک رمز شناس کی سنسنی خیز داستان

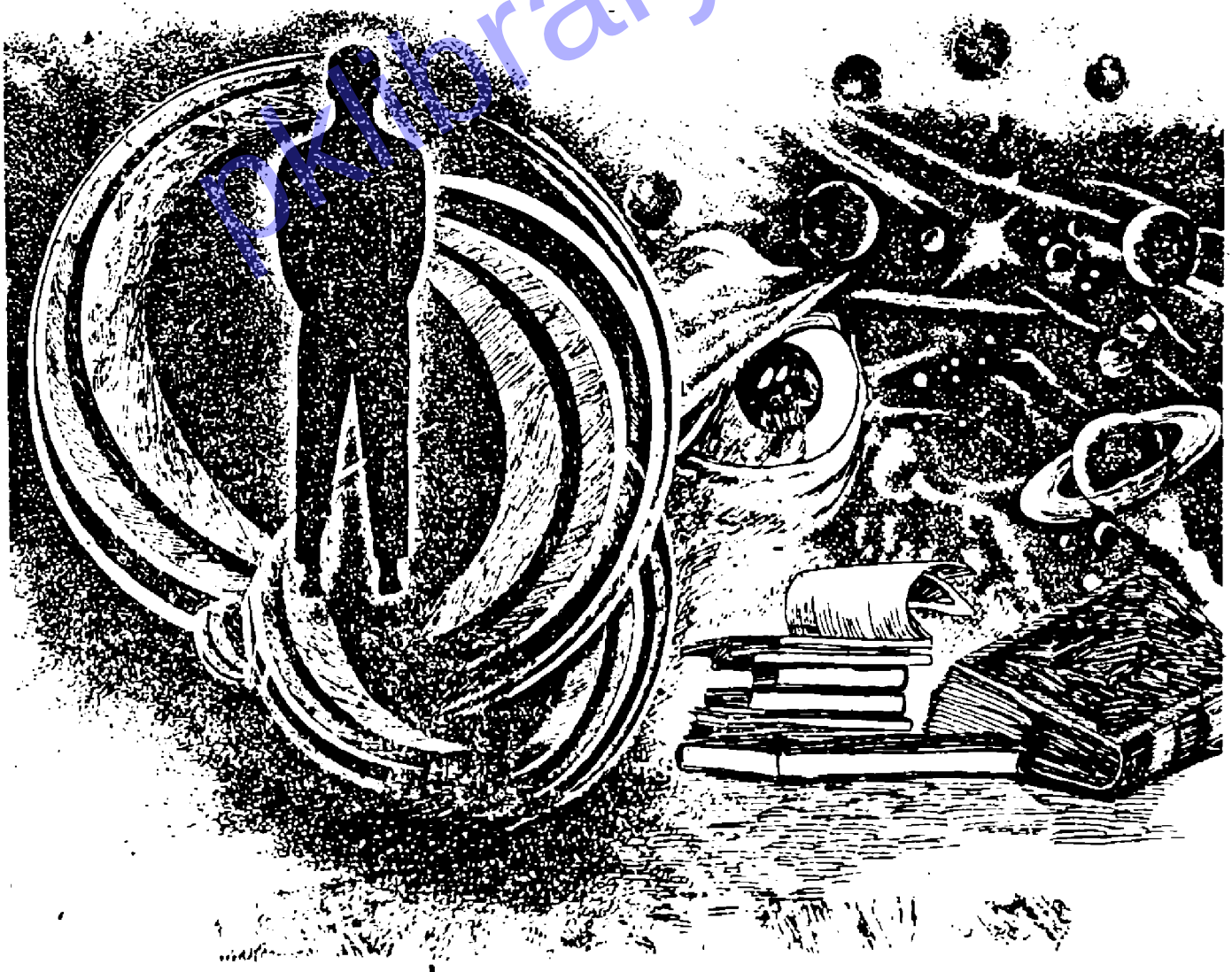

pklibrary.com

pklibrary.com

ایڈنبرا۔ اسکاٹ لینڈ
Year 1773

بگھی رچرڈ کے گھر کے سامنے رکی تو ایڈنبرا کو رات کا اندھیرا اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ تھامس، ولیم کے ہمراہ بگھی سے اتر آیا۔ سردی عروج پر تھی۔ تھامس نے دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر گرمائش محسوس کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ولیم اپنے مددگاروں کے ہمراہ بگھی سے سامان اتروا رہا تھا۔ تھامس نے وہیں کھڑے ہو کر آس پاس موجود گھروں کا تفصیلی جائزہ لیا۔ ایسا لگتا تھا کہ لوگ اپنے گھروں کی بند کھڑکیوں میں موجود جھریوں سے انہیں دیکھ رہے ہیں مگر کوئی بھی باہر نہیں نکلنا چاہتا تھا۔ تھامس کو اندازہ تھا کہ وہ علاقے جہاں ایسا واقعہ رونما ہوتا، خوف پھیلنا عام سی بات تھی۔ اسی اثنا میں رچرڈ کے گھر کا دروازہ کھلا اور ڈیوڈ باہر نکلا۔ وہ بگھی رکنے کی آواز سن کر باہر آیا تھا اور بگھی کے قریب کھڑے ولیم کو دیکھ کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔

''شکر ہے فادر، آپ آ گئے۔'' وہ ولیم سے مخاطب ہوا جو بگھی سے اپنا سامان اتروا کر فارغ ہو چکا تھا۔

''مجھے تو آنا ہی تھا۔ ان سے ملو، یہ فادر تھامس ہیں۔'' ولیم نے فادر تھامس کا تعارف کروایا۔

''شکریہ فادر آپ یہاں تشریف لائے۔'' ڈیوڈ بولا۔

''کیا آپ کی بیٹی کو شیطان نے اپنے قبضے میں کر رکھا ہے؟'' تھامس نے اوپر سے نیچے تک ڈیوڈ کا جائزہ لیا۔ انہیں اس کا وجود کسی بھی قسم کے منفی اثرات سے پاک نظر آیا تھا۔

''نہیں، نہیں۔ وہ رچرڈ کی بیٹی ہے۔ میں تو رچرڈ کا دوست ہوں۔ اس کی مدد کے لیے یہاں موجود ہوں۔'' ڈیوڈ بولا۔

''ڈیوڈ نے رچرڈ کا بہت ساتھ دیا ہے فادر! اگر یہ نہ ہوتا تو معاملات رچرڈ کے قابو سے باہر نکل چکے تھے۔ اب کیسی ہے ایلینا؟'' ولیم نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے سوال کیا۔

''ایلینا کی حالت بہت بگڑ چکی ہے۔ وہ زنجیروں سے بھی قابو نہیں آ رہی تھی۔ کئی بار ہم سب پر حملہ کر چکی ہے۔ اب بے ہوشی کے ٹیکے بھی اس پر اثر نہیں کر رہے۔ ہم نے بڑی مشکل سے اسے قابو کر کے گھر کے تہ خانے میں بند کر دیا ہے مگر وہ تہ خانہ بھی اسے زیادہ دیر تک روک نہیں پائے گا۔'' ڈیوڈ پریشانی سے بولا۔

''چلیں، اندر چلتے ہیں..... اور ڈیوڈ تم فوراً ایک بھیڑ کا انتظام کرو اور اسے اندر لے آنا۔'' تھامس، ڈیوڈ کی بات سن کر اس کو ہدایت دیتے ہوئے بولا۔ ڈیوڈ اثبات میں سر ہلا کر بھیڑ کا انتظام کرنے چل دیا۔ اسے تھامس کے آنے سے کافی حوصلہ ملا تھا۔

ولیم، تھامس اور اپنے دو مددگاروں کے ہمراہ رچرڈ کے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ رچرڈ اور اس کی بیوی اپنے بیٹے کے ہمراہ گھر کے داخلی کمرے میں ہی موجود تھے۔ تھامس کو اس کمرے میں قدم رکھتے ہی تیز بدبو کا احساس ہوا جبکہ وہاں موجود باقی نفوس ایسے کھڑے تھے جیسے وہاں کوئی بو نہ ہو۔

''شکر ہے فادر آپ آ گئے۔ ایلینا کو بچا لیں۔ میری بیٹی کو بچا لیں۔'' ایلینا کی ماں، ولیم کو دیکھتے ہی زار و قطار رونا شروع ہو گئی۔

''آپ بے فکر رہیں۔ یہ فادر تھامس ہیں۔ یہ سب ٹھیک کر دیں گے۔'' فادر ولیم نے ایوا اور رچرڈ دونوں کو تسلی دی۔

تھامس خاموشی سے ایلینا کے گھر والوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان سب کے اردگرد کالے اندھیرے کی چادر تنی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان تینوں کے پیچھے کالے سائے موجود ہوں۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ معاملہ گمبھیر ہے۔

''ایلینا کہاں ہے؟'' تھامس نے رچرڈ سے سوال کیا۔

''فادر! وہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ ہم نے اسے باندھ کر تہ خانے میں بند کر دیا تھا۔'' رچرڈ بولا۔

''اور میرا مددگار کہاں ہے جسے میں یہاں چھوڑ کر گیا تھا؟'' ولیم بولا۔

''فادر! وہ تہ خانے کے دروازے کا پہرا دے رہا ہے۔'' رچرڈ بولا۔

''فادر! میں یہ بھیڑ لے آیا ہوں۔'' ڈیوڈ بھی بھیڑ کی رسی تھامے کمرے میں داخل ہوا۔

''ٹھیک ہے۔ بھیڑ کی رسی ہمارے مددگار کے ہاتھ میں تھما دو اور ہمیں تہ خانے کا راستہ دکھاؤ اور ہاں، ایلینا کے گھر والے ہمارے ساتھ نہیں چلیں گے۔ وہ ان پر اپنا سایہ ڈال چکا ہے۔ ان کا وہاں موجود ہونا اس کی طاقت میں اضافہ کرے گا۔ اس شیطان سے نمٹنے کے بعد ان کو بھی پاک کرنا ہوگا۔ البتہ ڈیوڈ ہمارے ساتھ چل سکتا ہے۔'' تھامس بولا۔ ڈیوڈ یہ باتیں سن کر حیران ہو گیا۔ یقیناً تھامس کوئی عام آدمی نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے۔ تو پھر چلیں۔'' ولیم، رچرڈ اور اس کی بیوی کو وہیں رکنے کا اشارہ کر کے ڈیوڈ کے ہمراہ تہ خانے کی طرف بڑھ گئے۔

pklibrary.com

یہ تہ خانہ رچرڈ کے گھر کے گودام میں بنا ہوا تھا۔ گودام کا فرش جو کہ لکڑی کا بنا ہوا تھا، اسی کے بیچوں بیچ تہ خانے کا دروازہ موجود تھا۔ دروازے پر ایک زنگ آلود کنڈی لگی ہوئی تھی جس کے اردگرد لوہے کی زنجیریں لپیٹ کر اسے تالا لگایا گیا تھا۔ وہ کمرا تہ خانے سے سنائی دینے والی خوفناک غراہٹوں سے گونج رہا تھا۔ وہیں ولیم کا مددگار موجود تھا جو اس تالے پر مقدس پانی چھڑک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے۔ ولیم کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔

''شکر ہے فادر آپ لوٹ آئے۔ یہ شیطان میرے بس سے باہر ہو چکا ہے۔ اسے قابو کرنا مشکل ہے۔ یہ آنکھوں کو دھوکا دیتا ہے۔'' مددگار خوفزدہ لہجے میں بولا۔

''تم یہ تالا کھولو۔'' تھامس نے ڈیوڈ کو اشارہ کیا اور اس نے تیزی سے تالے کو کھولنا شروع کیا۔ تہ خانے میں خاموشی چھا گئی۔ ڈیوڈ نے تالا کھول کر زنجیر نکالی اور ایک طرف رکھ دی مگر دروازہ کھولنے سے پرہیز کیا۔

''اندر روشنی کا انتظام ہے؟'' تھامس نے سوال کیا۔

''جی فادر!'' ڈیوڈ بولا۔

''ساتھ مزید لالٹینیں اٹھالو اور دروازہ کھولو اور تم باہر ہی رکو گے۔ اس شیطان کا خوف تم پر غالب آچکا ہے۔ ایگزارسزم کے دوران تمہاری جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔'' تھامس نے ولیم کے مددگار کو بھی باہر رکنے کی ہدایت کی۔ وہ سکون کی سانس لے کر وہیں کھڑا ہو گیا۔ ڈیوڈ نے کمرے میں موجود جلتی لالٹینیں اٹھا کر مددگاروں کو تھمائیں اور ایک لالٹین خود بھی ہاتھ میں پکڑ لی۔ ولیم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی بدبو کا ایک تیز بھبکا باہر نکلا۔ ان سب کو ابکائی آئی مگر وہ برداشت کر گئے۔ بھیڑ نے چلانا شروع کر دیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی لکڑی کی بوسیدہ سیڑھیاں نظر آئیں جو نیچے کی طرف جا رہی تھیں۔ سیڑھیاں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

''بھیڑ کو یہیں چھوڑ دو اور جب میں اشارہ کروں تو ڈیوڈ تم اسے تہ خانے میں لے کر آؤ گے۔ پہلے میں نیچے جاؤں گا۔ لالٹین مجھے دو۔'' تھامس بولا۔ ڈیوڈ نے لالٹین اسے تھما دی۔ تھامس نے بائبل ہاتھ میں تھامی اور گلے میں پہن کر اسے چوم کر سیڑھیاں اترنا شروع ہو گیا۔ باقی سب نے بھی اس کی پیروی کی۔

اندر مکمل خاموشی اور اندھیرا تھا۔ تھامس لالٹین کی روشنی کی مدد سے راستہ دیکھتے ہوئے تہ خانے میں پہنچ گیا۔ بدبو مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ مسلسل بائبل کا ورد کر رہا تھا۔ اس نے لالٹین کی روشنی میں تہ خانے کا جائزہ لیا۔ وہاں جگہ جگہ اناج کی بوریاں موجود تھیں۔ کچھ پرانے زنگ آلود اوزار بھی پڑے تھے۔ چوہے اپنی مرضی سے اِدھر اُدھر آزاد گھوم رہے تھے اور جگہ جگہ مکڑی کے جالے تھے۔

تہ خانہ اتنا بڑا نہیں تھا۔ گھر کی بنیادیں تہ خانے کے ستونوں کا کام دے رہی تھیں اور اسی میں ایک ستون سے کسی کا وجود بندھا ہوا تھا۔ تھامس نے لالٹین اونچی کر کے اس وجود کو دیکھنا چاہا مگر وہ بھیانک چہرہ اچانک ہی اس کے بالکل قریب آکر غرایا۔ شاید زنجیریں ڈھیلی تھیں یا وہ ان سے آزاد ہو چکی تھی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور پیچھے آنے والے ڈیوڈ سے ٹکرایا۔

''آگئے تم تھامس؟'' وہ غرائی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ایک ساتھ چار لوگ بات کر رہے ہوں۔

تھامس نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر زنجیر پر نظر ڈالی۔ وہ ابھی تک زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی مگر زنجیر لمبی ہونے کی وجہ سے وہ اس کے بالکل قریب آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ پہلا تاثر اپنی اہمیت رکھتا ہے اور تھامس نے بھی اطمینان بھرے انداز کے ساتھ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''ہاں آگیا۔ کیوں تماشا لگا رکھا ہے یہاں؟'' وہ پُرسکون لہجے میں لالٹین ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔

ولیم اور اس کے مددگاروں نے اپنی اپنی جگہیں سنبھال لی تھیں اور اب وہ مقدس پانی کی بوتلیں اور بائبل تھامے ورد کرنے میں مصروف ہو چکے تھے۔ ڈیوڈ بھی لالٹین تھامے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

وہ اس کا لہجہ سن کر ستون سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

''مجھ سے تمیز سے بات کرو۔ تم جانتے نہیں ہو کہ میں کون ہوں؟'' وہ غرائی۔

''نہیں جانتا۔ تم خود اپنا تعارف کرواؤ۔'' وہ مزید اطمینان سے کھڑا ہو گیا۔

''مجھے تعارف کی ضرورت نہیں تھامس! مجھے صرف تمہارا انتظار تھا۔ سنا ہے تم میرے پیروکاروں کو سزا دینے لگے ہو۔ کیا تم جانتے نہیں کہ اس کا عذاب کیا ہے؟'' لیلیتا کا لہجہ یکسر تبدیل ہو چکا تھا اور اب وہ بہت بھاری آواز میں بات کر رہی تھی۔

''تم تو خود پیروکار ہو۔ تمہارے کون سے پیروکار؟'' تھامس استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

''اگر ایسی ہی بات ہے تو میرا مقابلہ کر کے دکھاؤ۔ تمہیں یہاں داخل ہوتے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کون ہوں پھر بھی تمہاری ہمت کی داد دینی پڑے گی کہ تم میرا سامنا کرنے کے لیے یہاں تک چلے آئے۔'' وہ تھامس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''میں خدا کی ذات کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ بہتر یہی ہوگا کہ تم ڈھونگ رچانے کے بجائے اپنا تعارف کروادو اور اس بچی کی جان چھوڑ دو۔'' تھامس کا لہجہ سخت ہو گیا۔

ایلینا نے قہقہے لگانے شروع کر دیے۔ اچانک اس نے منہ بھر کر ہرے رنگ کی قے تھامس پر الٹ دی مگر وہ اس بات کے لیے پہلے سے تیار تھا لہٰذا فوراً ہی اس کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔ ولیم اور اس کے مددگاروں نے بہ آوازِ بلند بائبل پڑھنا شروع کر دی۔

''تم بھول رہے ہو کہ مجھ پر یہ پینترے اثر نہیں کرتے۔ تمہیں تمہارے ساتھیوں نے آگاہ تو کر رکھا ہوگا۔'' تھامس مسکرایا۔

''میرا وقت ضائع مت کرو تھامس! مجھے وہ چابی چاہیے۔ تم جانتے ہو یہ زنجیریں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اگر اب تک یہ زنجیریں مجھے روک پائی ہیں تو اس کی وجہ صرف تم ہو..... مجھے صرف تمہارا انتظار تھا۔ چابی میرے حوالے کر دو اور ان سے کہو یہ بکواس بند کریں۔'' ایلینا کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ وہ حلق پھاڑ کر چلائی۔ ڈیوڈ کا دل دہل گیا۔

''اگر تم قلعے سے آزاد ہو چکے ہو تو تمہیں اس چابی کی کیا ضرورت ہے؟'' تھامس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ وہ قلعے کا شیطان نہیں تھا۔ اس نے ڈیوڈ کو بھیڑ لانے کا اشارہ کیا۔ ڈیوڈ لالٹین ایک طرف رکھ کر تیزی سے تہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔

''تم مجھے مجبور کر رہے ہو کہ میں تم سب کا خاتمہ کر دوں۔'' ایلینا غرائی۔ اچانک ہی وہاں موجود تمام لالٹینیں بجھ گئیں۔ ولیم اور مددگاروں نے اپنی آواز مزید بلند کر لی۔ تھامس نے جیب میں رکھی ماچس نکال کر اطمینان سے تیلی جلائی۔

ایلینا جس ستون سے بندھی تھی، وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ زنجیریں ایک طرف پڑی تھیں۔ وہ خود کو آزاد کرا چکا تھا۔ کھیل شروع ہو چکا تھا۔

عین اسی وقت ڈیوڈ بھیڑ کی رسی تھامے سیڑھیاں اترا۔

''کیا ہوا فادر؟ یہ لالٹینیں کیوں بجھ گئیں اور..... اور..... ایلینا کہاں ہے؟'' وہ پریشانی سے بولا۔

''میں یہاں ہوں۔'' اچانک ہی وہ چھت سے الٹی لٹکی اس کے منہ کے سامنے آ کر خباثت سے مسکرائی۔

وہ ڈر کر پیچھے ہٹا اور توازن برقرار نہیں رکھ پایا۔ اس کے نیچے گرتے ہی بھیڑ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چلاتے ہوئے تیزی سے تہ خانے میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگی۔

ایلینا نے تھامس کے ہاتھ میں پکڑی ماچس کی تیلی کو پھونک مار کر بجھا دیا۔ اسی لمحے تہ خانہ ڈیوڈ کی چیخوں سے گونج اٹھا۔

تھامس نے فوراً ہی دوسری تیلی جلائی۔ وہ ڈیوڈ کے اوپر سوار تھی۔ تھامس تیزی سے لالٹین کی طرف بڑھا اور اسے جلا دیا۔ ولیم جو یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا، ڈیوڈ کو بچانے کی کوشش کرنے لگا مگر ایلینا نے اسے بھی اٹھا کر پٹخ دیا۔

تھامس نے لالٹین ایک طرف رکھی اور خدا کو مدد کے لیے پکارنا شروع کر دیا۔ وہ حسب توقع ڈیوڈ کو چھوڑ کر غراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور اسے گردن سے پکڑ کر دبوچ لیا۔ تھامس نے خدا کو پکارنا جاری رکھا۔

ڈیوڈ اور ولیم جو اس اثنا میں سنبھل چکے تھے، موقع پاتے ہی اسے پکڑنے دوڑے۔ وہ تھامس کو پٹخ کر ان کی طرف پلٹی اور دونوں ہاتھوں سے ان دونوں کی گردن دبوچ کر انہیں دیوار سے دے مارا۔ جب تک وہ سنبھلتے یا تھامس سنبھلتا، اس نے ان دونوں مددگاروں سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔

وہ دونوں مددگار اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر خوفزدہ چہروں کے ساتھ اس پر مقدس پانی کا چھڑکاؤ کر رہے تھے۔ اس کے جسم پر جس جگہ بھی وہ پانی گرتا، وہاں سے دھواں اٹھنا شروع ہو جاتا جیسے اس کا جسم اس پانی سے جل رہا ہو مگر وہ بنا رُکے ان کی طرف بڑھی تھی اور ان کا حشر بھی ڈیوڈ اور ولیم جیسا ہی ہوا تھا۔ تھامس کے علاوہ باقی سب کراہ رہے تھے۔ صرف وہی تھا جو بائبل تھامے اب بھی بہ آوازِ بلند خدا کو یاد کر رہا تھا۔

اب تھامس کی باری تھی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی مگر وہ کراس تھام کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے الفاظ ایلینا کے جسم پر کوڑے کی طرح لگ رہے تھے۔

''بند کرو یہ بکواس ورنہ میں ان سب کو مار ڈالوں گا۔ چابی میرے حوالے کر دو تھامس!'' وہ چلائی۔

تھامس نے ان صفحات کو پڑھنا شروع کر دیا جن پر خدا کی بڑائی بیان کی گئی تھی۔ اس کی آواز مزید تیز ہو گئی۔ تہ خانے میں آندھی چلنا شروع ہو گئی تھی۔ ایلینا نے بغیر رکے چیخنا شروع کر دیا۔ بھیڑ بھی چلا چلا کر اپنا حلق خشک کر چکی

pklibrary.com

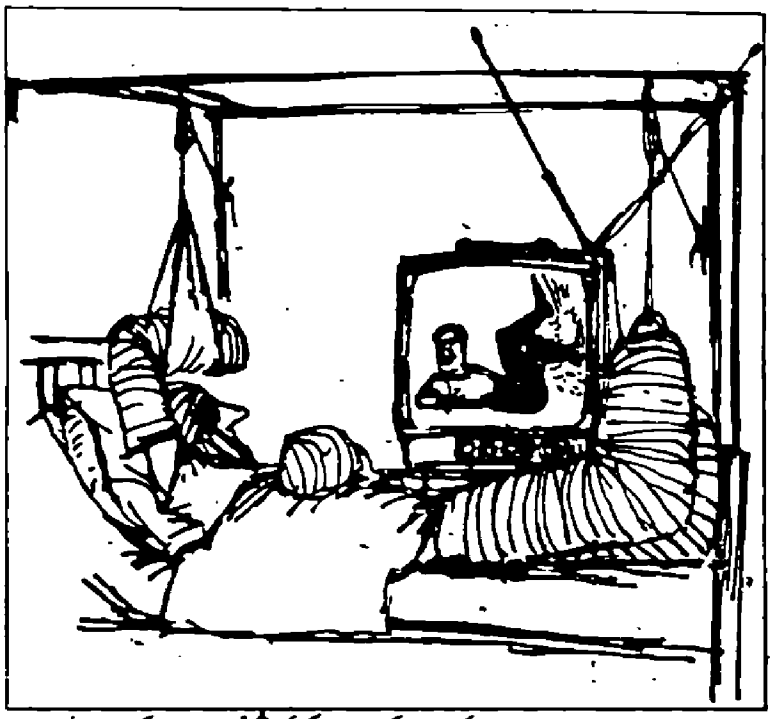

تھی۔ تھامس، ایلینا کو کمزور پڑتے دیکھ کر آہستہ آہستہ اس کے قریب آرہا تھا۔ ڈیوڈ، ولیم اور مددگار بھی آندھی سے سنبھلتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے مگر ایلینا کی چیخ ان کے کان کے پردے پھاڑ رہی تھی۔ ولیم بھی کراس تھام کر ایلینا کے پیچھے کھڑا ہوگیا اور اب وہ تھامس کے ساتھ ساتھ انہی صفحات کو دہرا رہا تھا۔

آندھی کی شدت میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے جسم سے کھال ہی اتر جائے گی۔ ایلینا ایک جگہ ساکت کھڑی چلا رہی تھی۔ مددگاروں نے بھی ہمت کی اور کراس تھام کر تھامس اور ولیم کا ساتھ دینے لگے مگر انہوں نے ایلینا کے قریب آنے سے گریز کیا۔ ڈیوڈ موقعے کا فائدہ اٹھا کر زنجیر اٹھا لایا اور ہمت کر کے ایلینا کی پشت سے اس کی گردن میں ڈال کر اسے جکڑ لیا۔ ایلینا نے خود کو چھڑانا شروع کردیا۔

''رکو۔ اس جسم کو نقصان پہنچایا تو اس لڑکی کی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ یہ زنجیر اس کے جسم سے لپیٹو۔ گردن سے نکال لو۔'' ولیم نے ڈیوڈ کو خبردار کیا۔

ڈیوڈ نے اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے ایلینا کو زنجیر سے لپیٹنا شروع کردیا۔ وہ شیطان شاید خدا کی بڑائی کے آگے بے بس ہو چکا تھا۔

تھامس نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ میں پکڑا کراس ایلینا کے ماتھے سے لگا دیا۔ ایلینا کے ماتھے سے دھواں نکلنا شروع ہوا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی جلد جل رہی ہو۔ اس کے حلق سے بہت ہی بھیانک چیخیں برآمد ہوئیں۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی مگر چاروں طرف سے آنے والی آوازوں نے اسے کمزور کردیا تھا۔

''ایلینا کے جسم کو چھوڑ دو عفریت۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔'' تھامس نے مکمل تحریر پڑھنے کے بعد ایلینا کو حکم دیا۔

''میں عفریت نہیں ہوں تھامس! میں قلعے کا شیطان ہوں۔ تم غلطی کر رہے ہو۔ مجھے چابی چاہیے ورنہ میں اس لڑکی کو مار ڈالوں گا اور تم سب بھی جان سے جاؤ گے۔'' ایلینا غرائی۔ اس کے جسم سے اٹھتی بدبو ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔

''مجھے مجبور مت کرو کہ میں تمہارا خاتمہ کردوں۔ بہتر یہی ہے کہ تم دوبارہ کبھی یہاں نہ آنے کی قسم کھا کر ایلینا کا جسم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دو۔'' تھامس غصے سے چلایا۔

''ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ تم سب مارے جاؤ گے۔'' اس نے دوبارہ خود کو آزاد کرانے کی کوشش شروع کردی۔ ایلینا کا جسم بری طرح اکڑنا شروع ہوا۔ اس کے جسم سے کئی ہڈیوں کے ایک ساتھ کڑکڑانے کی آوازیں آئیں۔

اس شیطان کے بھیانک قہقہے اچانک ایلینا کی دردناک چیخوں میں تبدیل ہوگئے۔ وہ ایلینا کو تکلیف دے رہا تھا۔ ڈیوڈ کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہوگئے۔ اس کی نظروں کے سامنے ایلینا کا معصوم سراپا گھوم گیا۔

تھامس نے ولیم کو اشارہ کیا اور وہ تہ خانے میں دوڑتی اور چلاتی بھیڑ کی رسی تھام کر تھامس کے قریب آکھڑا ہوا۔ شاید وقت آگیا تھا کہ اس عفریت کا خاتمہ کردیا جاتا اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب تھامس عفریت کا اصل نام جان جاتا۔

''میں تمہیں آخری بار حکم دیتا ہوں کہ ایلینا کا جسم چھوڑ دو ورنہ میں تمہارا خاتمہ کرنے پر مجبور ہوجاؤں گا۔'' تھامس کے لیے اسے خبردار کرنا ضروری تھا۔ یہ ناری مخلوق بھی خدا کی بنائی ہوئی تھی۔ ایگزارسسٹ کو اس کے خاتمے کی اسی صورت میں اجازت تھی جب وہ سرکش ہو کر کسی کی جان کے درپے ہوجاتے تھے۔ دوسری صورت میں بات کر کے اور ڈرا دھمکا کر اور تھوڑی تکلیف پہنچا کر بھگانے کا حکم تھا مگر یہاں شاید اس عفریت کی سرکشی کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہو پا رہا تھا۔

ایلینا کے ہاتھ پیر مڑنا شروع ہوئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ عفریت اس کی ہڈیاں توڑ دینا چاہتا ہو۔ اس کی روح فرسا چیخوں میں اب مدد کی پکار بھی شامل ہوچکی تھی۔

''میں بھی آخری بار کہہ رہا ہوں، چابی میرے حوالے کردو۔'' وہ شیطان ایک بار پھر غرایا مگر تھامس کے

کر اس کے آگے کسی حد تک بے بس تھا۔

''شروع کرتا ہوں خدا کے نام سے.....'' ابھی یہ الفاظ تھامس کے ہونٹوں سے برآمد ہی ہوئے تھے کہ ایلینا کی گردن مڑنا شروع ہوگئی۔ وہ خبیث ایلینا کی گردن توڑ کر اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ ایلینا کی دردناک چیخوں اور تیز ہوتی آندھی نے وہاں موجود نفوس کے لیے کھڑے رہنا مشکل کر دیا تھا۔

مگر ایک لمحے کی بھی غلطی یا ان کی کمزور گرفت ان سب کے لیے جان لیوا ثابت ہوسکتی تھی لہٰذا دونوں مددگار اور ڈیوڈ مضبوطی سے ان زنجیروں کو تھامے کھڑے تھے۔ تھامس کا کراس بھی ایلینا کے ماتھے پر تھا اور ولیم بھیڑ کی رسی تھامے اپنی جگہ جما تھا۔ بھیڑ کو قابو میں رکھنا بھی ضروری تھا۔

وقت آچکا تھا کہ ایلینا کو اس شیطان کی قید سے آزادی دلائی جاتی ورنہ اس کی جان بھی جاسکتی تھی۔

''میں تمہیں حکم دیتا ہوں ایزموڈیس Asmodeus کے چیلے! ایلینا کا جسم آزاد کر کے ہمیشہ کے لیے جہنم رسید ہوجاؤ۔'' تھامس نے بائبل کی تحریر مکمل کرنے کے بعد اس عفریت کو اس کے حوالے سے پکارا۔

''نہیں..... تھامس..... نہیں..... تم..... تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' وہ عفریت خوفناک آواز میں چلّایا۔ تھامس کا حوالہ درست تھا ورنہ عفریت کو اتنی تکلیف نہ ہوتی۔

''میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ ایلینا کے جسم کو آزاد کر کے ہمیشہ کے لیے جہنم رسید ہوجاؤ۔'' تھامس نے دوبارہ اپنی بات دہرائی۔ ساتھ ہی ایلینا کے سر پر مقدس پانی کی بوتل انڈیل کر دور ہٹ گیا۔

ایلینا کے حلق سے دردناک چیخیں بلند ہوئیں اور اچانک ہی وہ عفریت ایلینا کے جسم کو چھوڑنے کی کوشش میں تیزی سے باہر نکلا اور سامنے کھڑی بھیڑ کے اندر حلول کر گیا۔ بھیڑ نے اچھل اچھل کر عجیب سی آوازیں نکالنا شروع کیں جبکہ ایلینا ڈھے گئی تھی۔

تھامس نے بجلی کی تیزی سے مددگار کو اشارہ کیا اور وہ ایلینا کو چھوڑ کر بھیڑ کی طرف لپکا اور اپنے لباس میں چھپا تیز دھار آلہ نکال کر ایک ہی جھٹکے سے بھیڑ کی گردن الگ کر دی۔

بھیڑ تڑپے بغیر ہی ڈھیر ہوگئی۔ اس کی گردن سے اڑنے والے خون کے چھینٹے ان سب کے لباس پر لگے تھے مگر اس شیطان کا خاتمہ ہوچکا تھا۔

ایلینا آزاد ہوچکی تھی۔ اس کی جان بچ گئی تھی۔

''اس بچی کو اٹھا کر اوپر لے آؤ۔'' تھامس انہیں ہدایت دے کر اطمینان سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ ڈیوڈ نے حیرانی سے بھیڑ کی کٹی گردن اور ولیم کو دیکھا۔ اب سے لمحوں پہلے اس تہ خانے میں جو طوفان برپا تھا اس کا شائبہ تک نہ تھا۔

''تم دونوں یہ سب سمیٹ کر اوپر آجانا۔ چلو ڈیوڈ..... ایلینا کو اٹھانے میں میری مدد کرواؤ۔'' ولیم نے بالآخر وہاں پھیلے سناٹے کو توڑا اور دونوں مددگاروں کو ہدایت دے کر ایلینا کی طرف جھکا۔ ڈیوڈ نے اس کی مدد کی اور وہ ایلینا کو اٹھائے تہ خانے سے باہر نکل آئے۔ ایلینا کا جسم ہلکا پھلکا ہوچکا تھا مگر چہرے اور جسم پر زخموں کے علاوہ پیلاہٹ اب بھی برقرار تھی۔ اسے اس کے کمرے میں لٹا کر وہ دونوں باہری کمرے میں آگئے جہاں تھامس، ایلینا کے والدین اور بھائی کے ساتھ موجود تھا۔ وہ انہیں پاک کر رہا تھا۔ ان کے اوپر منڈلاتے کالے سائے جاچکے تھے اور اب وہ ان پر مقدس پانی کا چھڑکاؤ کر رہا تھا۔

''یہ کراس آپ نے داخلی دروازے پر لٹکانا ہے اور مقدس پانی کم سے کم دو ماہ تک گھر میں چھڑکیں اور ایلینا کو پلاتے رہیں۔ ہفتے میں ایک بار آپ کو ایلینا کو چرچ لے کر آنا ہے اور اس کے علاوہ اسے کہیں آنے جانے نہ دیں۔ یہ معمول بھی آپ نے دو ماہ تک برقرار رکھنا ہے۔ دو ماہ کے بعد آپ ایلینا کو مجھ سے ملوانے کے لیے لے کر آئیں گے اور میری اجازت کے بعد ہی اسے باہر نکلنے دیجیے گا۔'' تھامس سنجیدہ لہجے میں ایلینا کے والدین سے مخاطب تھا۔

''جی فادر! آپ جیسا چاہتے ہیں، ویسا ہی ہوگا۔ آپ بے فکر رہیں۔ کیا میری بچی اب خطرے سے باہر ہے؟ کیا وہ شیطان اس کا پیچھا چھوڑ چکا ہے؟'' ایوا پُرامید لہجے میں بولی۔

''ایلینا اب خطرے سے باہر ہے۔ وہ شیطانی طاقت اس کے جسم سے نکل چکی ہے اور اس کا خاتمہ بھی ہوچکا ہے۔ یہ احتیاط کرنے کے لیے میں آپ کو اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اگر ایک بار کوئی شیطانی طاقت کسی انسان کے جسم کو اپنا مسکن بنا لیتی ہے تو اس انسان کا جسم اس دنیا میں موجود باقی شیطانی قوتوں کے لیے بھی ایک آسان شکار بن جاتا ہے اور وہ آسانی سے اس پر اپنا قبضہ جما سکتے ہیں۔ دو مہینے کی یہ احتیاط ایلینا کو ہر آنے والے خطرے سے محفوظ کر دے گی۔'' تھامس نے انہیں معاملے کی سنگینی سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔

''جی فادر! آپ جیسا کہہ رہے ہیں ویسا ہی ہوگا۔ کیا

pklibrary.com

ہم ایلینا سے مل سکتے ہیں؟'' رچرڈ بولا۔

''جی ہاں، وہ اپنے کمرے میں موجود ہے۔ روحانی علاج کے علاوہ اسے طبی علاج کی بھی ضرورت پڑے گی۔ شاید اس کے جسم کی ایک دو ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے زخموں کے لیے مرہم کا انتظام اور اس عرصے میں اس شیطان نے اس کے جسم کا جو خون پیا ہے، اس کی کمی کو پورا کرنے کے لیے آپ کو اس کی خوراک کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔'' تھامس بولا۔

''جی ٹھیک ہے۔ ہم ایسا ہی کریں گے۔ بہت شکریہ فادر! میں تمام عمر آپ کی احسان مند رہوں گی۔'' ایوانیہ کہہ کر تیزی سے ایلینا کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ سب بھی اس کے پیچھے ہی ایلینا کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ اپنے بیڈ پر بے ہوش لیٹی تھی۔

گو کہ اس کے چہرے پر اب بھی وہ پیلاہٹ واضح تھی مگر اس کے چہرے کی رونق کسی حد تک لوٹ آئی تھی۔ کمرے میں پھیلی وہ بدبو غائب ہو چکی تھی۔

''ڈیوڈ! یہی نام ہے نا تمہارا؟ یہاں کوئی طبیب موجود ہے تو اس سے ایلینا کا فوری علاج کرواؤ۔ اور ہاں، اس کے ہوش میں آنے کے بعد کوئی بھی اس سے اس واقعے کے متعلق کوئی بات نہیں کرے گا۔ کوشش کریں کہ اس کی سہیلیاں وغیرہ بھی اس واقعے کا ذکر نہ چھیڑیں۔ جب تک یہ جسمانی طور پر پوری طرح ٹھیک نہیں ہو جاتی، اسے آرام اور سکون کی شدید ضرورت ہے۔'' تھامس یہ کہہ کر ایلینا کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

''ولیم! میرا کام یہاں اب ختم ہو چکا ہے لیکن پوپ کے حکم کے مطابق ہمیں قلعے جانا ہوگا۔'' تھامس اپنے پیچھے چلتے ولیم سے مخاطب ہوا۔

''میں لے چلتا ہوں آپ کو فادر!'' ڈیوڈ نے پیشکش کی۔

''تم کافی بہادر معلوم ہوتے ہو۔ عام طور پر میں اس طرح کے کیسز میں عام لوگوں کو شامل ہونے کی اجازت نہیں دیتا مگر تمہیں دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم اعصابی طور پر کافی مضبوط ہو۔'' تھامس اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''بہت شکریہ فادر! میں بس آپ کے کسی کام آنا چاہتا ہوں۔ آپ نے رچرڈ کی بہت بڑی مشکل حل کر دی ہے اور ایک طرح سے ایڈنبرا پر آپ کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ آپ نے اس بچی کی جان بچائی۔'' ڈیوڈ مشکور لہجے میں بولا۔

''میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ میں نے وہی کیا جو میں کرتا ہوں۔ بہرحال قلعے میں ساتھ چلنا خطرے سے خالی نہیں۔ وہاں کوئی عام جن بھوت قید نہیں ہے۔ تم نے یقیناً قلعے سے متعلق کافی باتیں سن رکھی ہوں گی اور میں بتاتا چلوں کہ وہ تمام باتیں حقیقت ہیں۔ فادر ولیم کی بات سن کر پوپ کافی پریشان ہو گئے تھے لہٰذا میں تسلی کر لینا چاہتا ہوں کہ آیا وہ شیطان اب تک وہاں قید ہے یا نہیں۔'' تھامس یہ باتیں کرتے ہوئے رچرڈ کے گھر سے باہر نکل آیا۔ ولیم اپنے مددگاروں اور ڈیوڈ سمیت تھامس کے پیچھے ہی چل رہا تھا۔

''فادر تھامس! آپ نے پہچانا کیسے کہ اس عفریت کا تعلق ایزموڈیس سے ہے؟'' ولیم پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''سالوں کا تجربہ ہے فادر! آہستہ آہستہ آپ کو بھی یہ چیزیں سمجھ آنے لگیں گی۔ مجھے اتنا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ قلعے کا شیطان نہیں ہو سکتا۔ تو بس جہنم کی ان سات نحوستوں میں سے ایک کا نام ہی بوجھنا تھا۔ عفریت کا نام اگلواتا تو دیر ہو جاتی اور ایلینا کی جان کو خطرہ بھی ہو سکتا تھا لہٰذا فوری طور پر مجھے یہی خیال آیا کہ اس کو اس کے حوالے سے پکارا جائے۔ جیسا کہ تم نے بتایا تھا کہ ایلینا قلعے میں اپنے دوست سے ملنے جا رہی تھی تو یقیناً ان پرہوس کے شیطان کے قبیلے سے کوئی سوار ہوا ہوگا اور وہ ایزموڈیس کا ہی قبیلہ ہے، تو اس کا نام لے لیا۔'' تھامس نے اپنی بات مکمل کر کے گہری سانس لی۔

''آپ کی ذہانت کی داد دینا پڑے گی۔ مجھے ابھی آپ سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔'' ولیم بولا۔

''شکریہ۔ میرے خیال سے اب ہمیں نکلنا چاہیے۔ ڈیوڈ! تم رچرڈ سے اجازت لے کر آجاؤ۔ میں یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔ مجھے صبح ہوتے ہی واپس نکلنا ہے۔'' تھامس بولا۔

ڈیوڈ، رچرڈ سے اجازت لے کر تھامس اور ولیم کو ان کے مددگاروں سمیت بگھی میں سوار کر کے قلعے کی طرف چل پڑا۔ ویسے تو قلعے کی طرف دن میں بھی جانے کی کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی مگر تھامس کی موجودگی نے اس کے دل کو تسلی بخشی تھی۔ وہ خود بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر قلعے میں ایسا کیا ہے جس کی وجہ سے سب اس قدر خوفزدہ رہتے ہیں۔ آخر ایلینا بھی تو وہیں سے یہ آسیب اپنے پیچھے لگا لائی تھی۔

رات کے آخری پہر اس کی بگھی قلعے کے سامنے رکی۔ وہاں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ قلعے کی زمین پر قدم رکھتے ہی اسے عجیب سی وحشت نے گھیرا تھا۔ وہاں بہت زیادہ بھاری پن تھا جو وہ محسوس کر سکتا تھا۔

تھامس ہاتھ میں بائبل اور کراس تھامے منہ ہی منہ

میں کچھ پڑھتا ہوا آہستگی سے آگے بڑھنے لگا۔ ولیم اور مددگار بھی اس کے پیچھے ہولیے لہٰذا ڈیوڈ کو بھی ان کی پیروی کرنا پڑی۔

قلعے کے جہازی دروازے کے قریب پہنچ کر تھامس نے ان سب کو وہاں رکنے کا اشارہ کیا اور خود آنکھیں بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ڈیوڈ نے دروازے کا جائزہ لیا۔ لوہے کا وہ عظیم دروازہ زنگ آلود اور کافی پرانا تھا۔ تھامس نے اپنی پڑھائی مکمل کر کے دروازے کو آہستہ سے دھکیلنا شروع کیا۔ دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلنا شروع ہوا۔ وہ سب بھی دروازہ کھولنے میں اس کی مدد کرنے لگے۔

دروازہ کھلتے ہی بدبو کا تیز بھبکا ان کی سانسوں سے ٹکرایا اور وہ سب اپنی ناک بند کرنے پر مجبور ہو چکے تھے۔ بدبو اتنی شدید تھی کہ ڈیوڈ کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

مددگاروں نے ہاتھ میں پکڑی مشعلیں جلا لیں۔ ان کے چہروں پر خوف پھیلا ہوا تھا۔ وہ ایگزارسزم کی تعلیم کے دوران اس قلعے کا ذکر بارہا سن چکے تھے۔ قلعے کے اندرونی در و دیوار کا درجۂ حرارت باہر موجود درجۂ حرارت سے کافی کم تھا۔ ان سب کو سردی محسوس ہو رہی تھی۔

قلعے کی دیواروں پر وحشت اور ویرانی کے ڈیرے تھے۔ گرد اور مکڑیوں نے قلعے کو اپنا مسکن بنا رکھا تھا۔ عام طور پر ایڈنبرا میں جب بہت عرصے تک کوئی مکان خالی رہتا تو وہاں چوہے اور چمگادڑ بس جاتے تھے مگر قلعے میں چلتے ہوئے ڈیوڈ کو اب تک ایک بھی چوہا یا چمگادڑ نظر نہیں آئی تھی۔ یہ اس کے لیے حیرت انگیز بات تھی۔ اسے چوہوں سے ڈر لگتا تھا مگر یہاں وہ جاندار ناپید تھا۔ وہ لوگ احتیاط سے مشعل کی روشنی میں آگے بڑھ رہے تھے۔

تھامس اور ولیم مسلسل کچھ پڑھنے میں مصروف تھے جبکہ دونوں مددگار چوکنے ہو کر مشعل کی روشنی سے انہیں راستہ دکھا رہے تھے۔ تھامس ایک جگہ رکا اور پھر بائیں جانب چلنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا۔

وہ سب صرف اس کی پیروی ہی کر سکتے تھے کیونکہ وہ کبھی قلعے میں داخل نہیں ہوئے تھے مگر تھامس کی حرکات و سکنات سے یہ لگتا تھا کہ وہ یہاں پہلے بھی کئی دفعہ آ چکا ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ قلعے کے درمیانی حصے میں پہنچ چکے تھے۔ یہاں پکی اینٹوں کا صحن بنا ہوا تھا اور صحن کے بیچوں بیچ ایک فوارہ بنا تھا جو شاید کب کا بند ہو چکا تھا۔ یہاں سے سر اٹھا کر دیکھنے پر کھلا آسمان نظر آتا تھا مگر قلعے کی بلند قامت چار دیواری کی وجہ سے اس کھلے صحن میں بھی گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔

"تم لوگوں کو ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ یاد رکھنا، خدا کی مدد ہمارے ساتھ ہے۔" تھامس نے نہ جانے انہیں کس خطرے سے خبردار کیا تھا۔ ڈیوڈ کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔

تھامس نے آگے بڑھ کر فوارے کی گولائی کی صورت میں تعمیر شدہ منڈیر کے اندر پاؤں رکھا اور باقی سب کو بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ فوارے کی بوسیدہ اینٹوں کے فرش کے اوپر لوہے کا ایک زنگ آلود ہک لگا ہوا تھا جو بہت غور سے دیکھنے پر ہی نظر آتا تھا۔ تھامس نے اس ہک کو پکڑ کر کھینچا تو فرش کا وہ حصہ ایک تہ خانے کی صورت کھل گیا۔ وہاں سے سیڑھیاں نیچے کی طرف جاتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ قدیم قلعوں میں اس طرح کے کئی تہ خانے موجود ہوتے تھے لہٰذا ان میں سے کسی کو بھی اس تہ خانے کی وہاں موجودگی پر حیرت نہیں ہوئی تھی۔

تھامس کے ہونٹ تیزی سے ہل رہے تھے۔ وہ احتیاط سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی ڈیوڈ کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے دل کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ اسے شدید قسم کی بے چینی نے گھیر لیا۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اس کا یہاں آنے کا فیصلہ غلط تھا مگر اسے خود کو مضبوط رکھنا تھا۔

تہ خانے کی سیڑھیاں ایک کشادہ کمرے میں جا کر کھلیں مگر بہت عرصہ بند رہنے کی وجہ سے یہاں بھی سیلن اور شدید بدبو تھی۔

تھامس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور ایک طرف رکھے لوہے کے بکسے کی طرف تیزی سے بڑھا۔ ڈیوڈ تہ خانے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ایک طویل ترین کمرا تھا اور مشعلوں سے نکلنے والی روشنی بھی اس کمرے کی آخری حد کا تعین کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

تھامس نے اس بکسے کے قریب کھڑے ہو کر ادب سے سر جھکایا اور کچھ جملے کہے جو انہیں سمجھ نہیں آئے اور بکسا کھول دیا۔ بکسے کے اندر ایک ڈھانچا موجود تھا جس کے جسم پر موجود بوسیدہ لباس اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ مرنے والا بھی چرچ کے اونچے عہدے داروں میں سے ایک تھا۔ اس ڈھانچے کے ہاتھوں کے نیچے بائبل اور کراس دبا نظر آ رہا تھا۔

وہ لوگ بکسے کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ تھامس نے احتیاط سے بائبل اٹھائی اور اس کے صفحات پلٹنے لگا۔

pklibrary.com

اچانک ہی ایک چاندی کی چابی صفحات کے بیچ سے نمودار ہوئی۔ اس کی چمک عام چابیوں سے مختلف تھی اور اس پر زنگ یا گرد کا ایک ذرہ تک نہ لگا تھا۔

وہ چابی دیکھ کر تھامس کے منہ سے گہری سانس نکلی۔ چابی وہاں ہونے کا مطلب یہی تھا کہ شیطان اب تک قلعے میں ہی قید ہے۔

''یہ کیا ہے فادر تھامس؟ کس چیز کی چابی ہے یہ اور یہ کون ہیں؟'' ولیم پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''یہ فادر پیٹر ہیں۔ انہیں پوپ نے صدیوں پہلے یہاں قلعے کی حفاظت کے لیے تعینات کیا تھا۔'' تھامس نے احتیاط سے چابی واپس رکھی اور کتاب اس ڈھانچے کے ہاتھوں میں تھما کر بکسے کو بند کر دیا۔

''کس چیز کی حفاظت؟'' ڈیوڈ حیرانی سے بولا۔ بھلا اس ویران قلعے میں ایسا کیا تھا جس کی حفاظت کے لیے یہاں فادر کی لاش موجود تھی۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' تھامس ان سب کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھنے لگا۔ اس نے ایک مددگار کے ہاتھ سے مشعل لے کر اپنے ہاتھ میں تھام لی۔ بالآخر کافی دیر چلنے کے بعد اسی کمرے کی حدود میں لوہے کی سلاخوں کی شبیہہ نمودار ہونا شروع ہوئی۔

تھامس کے بڑھتے قدم تھے۔ شدید سردی کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونا شروع ہو گئے۔

''بس، رک جاؤ۔ ہم یہاں سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔'' تھوڑی دیر توقف کرنے کے بعد وہ دوبارہ بولنا شروع ہوا۔

''صدیوں پہلے یہاں ایک شیطان کو قید کر دیا گیا تھا۔ وہ شیطان جو دوزخ کی تہ سے جگایا گیا تھا۔ اسے جگانے کا خمیازہ تمام انسانیت کو بھگتنا پڑا تھا۔ یہ کوئی عام بھوت پریت نہیں ہے۔ یہ ان کے سرداروں میں سے ہے۔ اس کے چیلے اسے آزاد کروانے یہاں آتے ہیں مگر فادر پیٹر کے پہرے پر ہونے کی وجہ سے وہ اس تک پہنچ نہیں سکتے۔

''اس دن جب ایلینا قلعے میں آئی ہو گی تو یقیناً اس شیطان کا کوئی چیلا یہاں آ پہنچا ہو گا اور ایلینا کو اکیلے دیکھ کر اس پر سوار ہو گیا۔ اسے قید سے آزاد کروانا اتنا آسان نہیں ہے اور یہ بھی یاد رکھو کہ اگر یہ آزاد ہو گیا تو بہت تباہی پھیلے گی جو کسی ایک انسان تک محدود نہیں رہے گی۔ یہ اپنے ساتھ وبا لے کر آئے گا، موت لے کر آئے گا، کالے سائے لے کر آئے گا۔'' تھامس نے یہ کہتے ہوئے آہستگی سے ان سلاخوں کی طرف بڑھنا شروع کیا۔

ڈیوڈ نے دیکھا وہ سلاخیں ایک طویل ترین جیل تھی جس کا آخری کونا نہ جانے کہاں جا کر ختم ہو رہا تھا مگر فادر تھامس کے ہاتھ میں جلتی مشعل کی ہلکی سی روشنی میں اسے وہاں ایک دیو قامت سراپا سوتا ہوا نظر آیا تھا۔ اسے لگا کہ شاید اسے دیکھنے میں غلطی ہوئی ہے لہٰذا اس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی اور اس کوشش نے اس کے جسم میں دوڑتے خون کو منجمد کر دیا۔

وہ غلط نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہاں یقیناً کوئی سو رہا تھا جو بہت طویل القامت اور لحیم شحیم تھا۔ اس کے وجود سے اٹھتی بدبو پورے قلعے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے جسم پر بہت زیادہ بال ہوں۔

یقیناً ایلینا کے جسم پر یہ طویل القامت دیو سوار نہیں ہو سکتا تھا ورنہ وہ بے چاری تو شاید بچ بھی نہ پاتی۔ ڈیوڈ کو یاد آیا کہ ایگزارسزم کے دوران اس شیطان نے تھامس سے بار بار کسی چابی کا ذکر کیا تھا۔ اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ یقیناً یہ وہی چابی تھی جو اب سے کچھ دیر پہلے فادر پیٹر کی بائبل سے برآمد ہوئی تھی۔

ڈیوڈ کے قدم من من بھر کے ہو گئے۔ اگر یہ مخلوق جاگ جاتی تو لمحوں میں ان کو مسل دیتی۔

تھامس نے وہیں کھڑے کھڑے سینے پر کراس بنایا اور پیچھے پلٹا۔ ولیم اور مددگاروں کے چہروں پر بھی خوف کے تاثرات تھے مگر ڈیوڈ کی حالت کافی خراب نظر آ رہی تھی۔

''یہاں سے باہر نکلتے ہیں۔ باقی باتیں باہر کریں گے۔'' تھامس ان سب کی حالت کو پیش نظر رکھ کر بولا اور وہ سب تیزی سے اس کے پیچھے چل دیے۔ تھوڑی دیر بعد وہ تہ خانے سے باہر نکل آئے۔ تھامس نے احتیاط سے اس تہ خانے کا دروازہ بند کیا اور وہاں کھڑے ہو کر کچھ دیر تک منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتا رہا۔

''اب ہمیں چلنا چاہیے۔ میری تسلی ہو چکی ہے۔'' وہ ولیم سے مخاطب تھا۔

''فادر! آپ کو نہیں لگتا کہ ہمیں اس چابی کی حفاظت کے لیے مزید انتظامات کرنے چاہئیں؟'' ولیم ہچکچاتے ہوئے بولا۔

جہاں تک اس کی اپنی بات تھی، وہ تو خدا کے سامنے قسم اٹھا چکا تھا مگر مددگاروں اور ڈیوڈ پر فی الحال اتنا بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔

pklibrary.com

اسے تھامس پر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ وہ نہ جانے کیوں ڈیوڈ کو یہاں تک اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

''فکر مت کرو۔ وہ چابی خدا کی حفاظت میں ہے۔ اول تو کوئی عام انسان یہاں تک پہنچ نہیں سکتا اور اگر پہنچ بھی گیا تو قلعے کی بھول بھلیوں میں گم ہو جائے گا۔ یہاں آنے والے عفریت بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ تہ خانے کا دروازہ اور فادر کا تابوت ہر کسی کو نظر نہیں آسکتا۔ ڈیوڈ کو ساتھ لانا اس لیے ضروری تھا کہ یہ اس قصبے کا محافظ ہے۔ اس کے اندر سے خاص روشنیاں پھوٹتی ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ خیانت نہیں کرسکتا۔ ایلینا پر جو شیطان سوار ہوا تھا، ہم اس کا خاتمہ کر چکے ہیں لہٰذا اب یہ ڈیوڈ کی ذمے داری ہے کہ وہ عام لوگوں کی یہاں تک رسائی ہمیشہ کے لیے بند کردے۔ جو میں دیکھ سکتا ہوں، وہ تم نہیں دیکھ سکتے۔ یہاں سے نکلنے کے بعد تمہارے مددگاروں کو کچھ یاد نہیں رہے گا۔'' وہ ولیم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مسکرایا تو ولیم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ تھامس سے علم میں کافی پیچھے تھا۔

''اب چلیں؟ مجھے صبح ہر حالت میں انسٹی ٹیوٹ پہنچنا ہے۔ کل میرا ایک بہت اہم لیکچر ہے۔'' تھامس مسکراتے ہوئے قلعے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''فادر! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس شیطان کو کس نے آزاد کیا تھا اور اس کا خاتمہ کرنے کے بجائے اسے یہاں قید کیوں کر دیا گیا؟'' ڈیوڈ نے بالآخر اپنے ذہن میں کلبلاتے سوال کو زبان دی۔

''یہ دنیا نیکی اور بدی کی طاقتوں سے آباد ہے۔ جیسے یہاں نیکی کو آباد ہونے کی اجازت دی گئی، ویسے ہی بدی کو بھی خدا ہی نے اجازت دی ہے۔ اس کے حکم کے بغیر تو یہ ممکن نہ تھا کہ شیطان اس دنیا میں اپنے چیلے چھوڑ دیتا۔ اسی طرح کچھ طاقتیں ایسی ہیں جن کا خاتمہ انسان کے بس کی بات نہیں۔ ہاں، خدا کی مدد سے انہیں روکا جاسکتا ہے، قید کیا جاسکتا ہے۔ تو بس یوں سمجھ لو کہ ایک انسان جس نے اپنی حدوں سے آگے نکلنے کی کوشش کی اور اس غلطی کا مرتکب ہوا مگر انسانیت کے لیے تباہ کن بن گیا۔ نیکی کی طاقتیں بھی اسی طرح حرکت میں آتی ہیں اور جتنا ممکن ہو، سدباب کرتی ہیں۔ یہ اسی سدباب کی ایک کڑی ہے۔ میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ اس بات کو زیادہ نہ کریدنا اور نہ کسی سے اس کا ذکر کرنا۔ جب تک فادر پیٹر یہاں موجود ہیں، ہم خدا کی مدد سے محفوظ ہیں۔ تم نے بس ایلینا کا مکمل خیال رکھنا ہے اور کوشش کرنا کہ وہ کبھی بھی اس طرف نہ آنے پائے۔ اس کا جسم ایک بار شیطان کو اپنا چکا ہے لہٰذا وہ بار بار یہی کوشش کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ جب ایلینا کے والدین دو ماہ بعد اسے لے کر اسکاٹ لینڈ انسٹی ٹیوٹ میں مجھ سے ملاقات کے لیے آئیں گے تو وہ بالکل ٹھیک ہو چکی ہوگی..... اور ہاں، تم بھی ان کے ساتھ ضرور آنا۔'' تھامس نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

''جی فادر! میں ضرور آؤں گا۔ میں آپ کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ آپ کے ہونے سے مجھے بہت تسلی ہے۔ میں ایلینا کا پورا خیال رکھوں گا اور آپ کی دی گئی تمام ہدایات پر عمل کروں گا۔'' ڈیوڈ تابعداری سے بولا۔

''ٹھیک ہے، تو پھر اب ہمیں چلنا چاہیے۔ یہاں زیادہ دیر رکنا بھی ٹھیک نہیں۔'' تھامس نے قلعے پر آخری نظر ڈالی اور بگھی میں سوار ہو گیا۔ بگھی ایڈنبرا کے چرچ کی طرف رواں دواں تھی۔ وہاں سے تھامس کو فوراً ہی اسکاٹ لینڈ انسٹی ٹیوٹ کے لیے روانہ ہو جانا تھا۔

چابی اور فادر پیٹر کا تابوت وہاں موجود ہونے کی وجہ سے اسے کافی حد تک تسلی ہو گئی تھی۔ دوسری طرف اسے یہ بھی خوشی تھی کہ ایلینا کی جان بچ گئی تھی مگر اس عفریت کو جہنم رسید کرنے پر بھی اسے ایک طویل بیان تیار کرنا تھا۔

''تم نے تہ خانے سے ساری چیزیں سمیٹ لی تھیں؟'' اس نے بگھی میں بیٹھے مددگار سے سوال کیا۔

''جی فادر! سب کچھ اس بکسے میں موجود ہے۔'' اس نے بگھی میں ایک طرف رکھے لکڑی کے بکسے کی طرف اشارہ کیا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے سر ہلا کر سیٹ کی پشت سے سر ٹکا لیا۔

ایک جنگ جو اس نے رچرڈ کے گھر کے تہ خانے میں لڑی تھی اور ایک وہ جنگ جو اس نے قلعے کے تہ خانے میں لڑی تھی، اس کے اعصاب شل کر چکی تھی۔ دیکھنے والے کہتے کہ شاید رچرڈ کے گھر کے تہ خانے میں لڑی جانے والی جنگ زیادہ اعصاب شکن تھی مگر وہی جانتا تھا کہ وہ کیسے اس قلعے سے ان سب کو صحیح سلامت لے کر باہر نکلا تھا۔ وہاں موجود وہ منفی توانائی کیسے اس کے اعصاب پر سوار ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

''فادر! ہم چرچ پہنچ چکے ہیں۔ آپ کی بگھی تیار کھڑی ہے۔ آپ فوراً روانہ ہوں گے یا کچھ دیر آرام کرنا چاہیں گے؟'' اچانک ہی ولیم نے اسے مخاطب کیا۔ اس کی سوچوں کا سلسلہ ٹوٹا۔

''نہیں، میں فوراً روانہ ہونا چاہوں گا۔ یہ بکسا اس

بگھی میں منتقل کروادو۔'' تھامس نے بگھی میں رکھے بکسے کی طرف اشارہ کیا۔

''میں رکھ دیتا ہوں۔'' ڈیوڈ جو کوچوان کی نشست پر بیٹھا تھا، اتر کر آیا اور مدد کی پیشکش کرنے لگا۔

''ٹھیک ہے۔'' ولیم نے اسے بکسا اٹھانے دیا۔ تھامس نے سب سے الوداعی کلمات کہے اور بگھی میں سوار ہوگیا۔

ڈیوڈ نے احتیاط سے وہ بکسا اٹھایا مگر جیسے ہی وہ اپنی بگھی سے نیچے اترنے لگا تو اسے جھٹکا لگا اور بکسے کا منہ کھل گیا۔ بکسے میں اس بھیڑ کا سر تھا جسے تہ خانے میں قربان کیا گیا تھا۔ اس بھیڑ کی آنکھیں کھلی تھیں اور ان آنکھوں میں اب تک اس شیطان کی شبیہہ قید تھی۔

ڈیوڈ کو جھرجھری آئی اور اس نے جلدی سے بکسے کا ڈھکن بند کر کے اسے فوراً ہی تھامس کی بگھی میں رکھ دیا۔

بگھی اس کے بکسار کھتے ہی روانہ ہوگئی۔ تھامس اس شیطان کا خاتمہ کر کے اسے ایڈنبرا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور لے جارہا تھا۔

☆☆☆

Year 1578

راج گڑھ۔ ہندوستان

راج گڑھ پر موت نے قبضہ کرلیا تھا۔ رہائشی علاقوں میں لاشوں کا ڈھیر لگ چکا تھا اور سپاہیوں نے اس طرف ایک آہنی باڑ کھڑی کر کے محل کی طرف آنے جانے پر پابندی لگائی ہوئی تھی۔ وہ وبا تقریباً سبھی افراد کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ راج کماروں اور شاہی خاندان کے دوسرے بچوں کو محل سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ بھاگوتی بہت پریشان تھیں۔ انہوں نے محل کی تمام کھڑکیاں بھی بند کروادی تھیں کہ نہ جانے کون سی ہوا اس وبا کو اپنے ساتھ محل کے اندر لے کر داخل ہوجائے۔

شاہی طبیب بھی محل میں ہی موجود تھے تاکہ کسی بھی ہنگامی صورتِ حال سے فوری طور پر نمٹا جاسکے۔ باڑ کے دوسری طرف آہ و بکا کا طوفان برپا تھا۔ ایک ایک کر کے پرجا مر رہی تھی اور بھگونت سنگھ کچھ نہیں کر پا رہے تھے۔

یہ آفت اتنی تیزی سے پھیلی تھی کہ انہیں اس کا... سدباب کرنے کا موقع بھی نہیں مل پایا تھا اور اب سب کو صرف اور صرف اپنی جان بچانے کی فکر لاحق تھی۔ اشوک کو خدشہ تھا کہ کہیں باڑ کی حفاظت پر مامور سپاہیوں کو وہ وبا اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔ کرشن خود بھی اس باڑ کی نگرانی پر موجود تھا مگر رہائشی علاقے کے اس قدر قریب ہونے سے انہیں اس وبا کے لگنے کا خطرہ بڑھ گیا تھا پھر بھی شاہی خاندان کی حفاظت ان کی پہلی ترجیح تھی۔

اس وقت بھی دربار وزیروں اور مشیروں سے بھرا ہوا تھا اور بھگونت اپنے تخت پر پریشان بیٹھے تھے۔

''کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ اچانک یہ وبا پھیلی کیسے؟ کوئی تو وجہ ہوگی، کوئی تو علاج ہوگا؟ اس طرح تو ایک ایک کر کے پرجا ختم ہوجائے گی اور میں یہاں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہوں گا۔'' بھگونت بولے۔

''حضور! میں نے کنوئیں کے پانی کے نمونوں کا جائزہ بھی لیا ہے۔ وہ ہر طرح کی بیماری سے پاک ہے۔'' شاہی طبیب ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

''مجھے نہیں لگتا کہ یہ بیماری کسی کھانے پینے کی چیز سے پھیلی ہے بلکہ مجھے تو یہ کوئی شراپ معلوم ہوتا ہے۔'' ایک وزیر بولا تو بھگونت کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

''شراپ؟ اشوک تم فوراً گرو جی کا پتا کرواؤ۔ بلکہ ایسا کرو کہ تم شاہی بگھی تیار کرواؤ، میں خود ان کی کٹیا تک جاتا ہوں۔'' بھگونت اپنے تخت سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔

اب وقت آگیا تھا کہ اشوک انہیں سچائی بتادیتا۔

''حضور! میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں.....'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا اور دربار میں موجود سبھی افراد اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اس کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی دیکھ کر بھگونت کو کسی انہونی کا احساس ہوا۔

''حضور! گرو جی کا دیہانت ہوچکا ہے۔'' اشوک نے بہ مشکل اپنی بات مکمل کی۔

''کیا..... کیا کہہ رہے ہو تم؟ ہوش میں تو ہو؟'' بھگونت چلائے۔

''حضور! میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' اور پھر اس نے ساری رام کتھا انہیں سنادی۔

''یہ تو بہت بڑا اپ شگون ہے۔ تمہیں مجھے اسی وقت بتانا چاہیے تھا۔ ہم گرو جی کی استھیاں گنگا میں بہاتے، ان کا کریا کرم کرتے۔ یقیناً یہ آفت ہم پر اسی لیے نازل ہوئی ہے۔'' ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اشوک کو جھنجوڑ کر رکھ دیں۔

''حضور! آپ پہلے ہی پریشان تھے۔ مجھے لگا کہ یہ بات سن کر کہیں آپ مزید پریشان نہ ہوجائیں۔'' اشوک ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

''اور اب جو پریشانی آئی ہے، اس کا کیا کروں؟ اس کا کوئی حل ہے تمہارے پاس؟ راج گرو کی اس طرح موت ہونا اور پھر ہم پر یہ شراپ..... یقیناً ان سب باتوں کی

کڑیاں کہیں نہ کہیں راج گرو کی مرتیو سے جا ملتی ہیں۔''
بھگونت سنگھ پریشان ہو کر دربار میں ٹہلنے لگے۔ وہ سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''حضور! راج گرو بہت پہنچے ہوئے تھے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ ہمیں کوئی شراپ دے سکتے ہیں۔ وہ تو لوگوں کی مدد کرتے تھے۔ بھگوان کی ان پر خاص کرپا تھی۔ ان کے من میں ایسا میل نہیں تھا کہ وہ معصوم پرجا کی موت کی پرارتھنا کرتے۔'' ایک اور وزیر بولا۔

اس کی بات میں دم تھا، بھگونت سوچ میں پڑ گئے۔

''میری بات غور سے سنو بھگونت! پہاڑ کے دائیں طرف تم جو چاہے تعمیر کرو مگر وہ درمیان والی پہاڑی پر اس تعمیر کا سایہ بھی نہ پڑنے دینا۔ میں جانتا ہوں یہ مشکل ہوگا مگر اس پہاڑ کو تم نے اپنے قلعے کے سائے سے بچانا ہے۔'' ان کے دماغ میں گرو جی کے کہے گئے یہ جملے گونجے اور وہ تیزی سے دربار سے باہر کی طرف دوڑے۔

''حضور..... حضور! رک جائیں..... باہر خطرہ ہے..... آپ اس طرح باہر نہ نکلیں۔'' اشوک ان کے پیچھے پیچھے دوڑا۔ ساتھ ہی محل کے سپاہی اور وزیر، مشیر بھی پیچھے دوڑ پڑے مگر وہ بغیر رکے آگے بڑھتے چلے گئے۔

اور اچانک ہی ان کے قدم تھمے۔ ان کا بدترین خدشہ سچ ثابت ہوا تھا۔ جس دیوار کو اونچا کرنے سے گرو جی نے منع کیا تھا، وہ فصیل اب بلندیوں کو چھو رہی تھی۔ نہ جانے کس مصروفیت کے تحت وہ اس طرف دھیان نہیں دے پائے تھے۔

''یہ..... یہ دیوار میرے منع کرنے کے باوجود کس نے اونچی کی ہے؟'' وہ پیچھے پلٹ کر اشوک پر حلق کے بل چلائے۔

''حضور..... حضور! آپ ہی کا حکم تھا کہ فصیلوں کو اونچا کر دیا جائے تاکہ کوئی جنگلی جانور محل کے اندر داخل نہ ہو سکے۔'' ایک طرف کھڑا ٹھیکیدار کانپتے ہوئے بولا۔

بھگونت قہر برساتا اشوک کی طرف پلٹا۔

''حضور! میں نے انہیں حکم دیا تھا مگر ان فصیلوں کو اونچا کرنے کا نہیں، رانی سا کے کمرے کے قریب موجود فصیلوں کی بات ہوئی تھی۔'' اشوک کانپنا شروع ہو گیا۔ غلطی تو اس سے ہی ہوئی تھی کہ وہ ان پر نظر نہیں رکھ پایا تھا۔

محل کے انتظامی امور کے جھمیلوں میں اسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ بھگونت سنگھ نے اس فصیل کو اونچا نہ کرانے کی خاص ہدایت کی تھی۔ اس نے ٹھیکیدار کو فصیل اونچا کرنے کا تو کہہ دیا تھا مگر یہ بتانا بھول گیا تھا کہ دیوار کے اس مخصوص حصے کو اونچا نہیں کرنا ہے۔

اب تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔ جو انہونی ہونی تھی، وہ ہو چکی تھی۔ راج گرو کے منع کرنے کے باوجود بھگونت سنگھ سے یہ غلطی سرزد ہو چکی تھی۔ اب غلطی کا پرائشچت کرنے کی ضرورت تھی۔

''فوراً تمام پنڈتوں کو لے کر دربار میں حاضر ہو۔'' وہ اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے اشوک سے مخاطب ہوا اور تیز تیز قدموں سے دربار کی طرف چل دیا۔ اشوک شرمندگی سے سر جھکائے راج مندر کی طرف بڑھ گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں تمام پنڈت دربار میں حاضر ہو چکے تھے۔ بھگونت سنگھ نے ان کے سامنے یہ سمسیا رکھی اور اب وہ سب ہی سر جوڑے آپس میں مشورہ کرنے میں مصروف تھے۔

''حضور! یہ شراپ تو راج گرو کے حکم کا پالن نہ کرنے کی وجہ سے مسلط ہوا ہے۔ اس کا اُپائے بھی انہی کے چرنوں میں حاضر ہو کر ملے گا۔'' بالآخر ایک پنڈت ہاتھ جوڑے بھگونت سے مخاطب تھا۔

''تو ٹھیک ہے پھر..... چلنے کی تیاری کرو..... فوراً بگھیاں تیار کرواؤ۔ میں خود جاؤں گا۔ آپ لوگ بھی میرے ساتھ چلیں۔'' بھگونت اٹھ کھڑا ہوا اور پنڈتوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

تھوڑی ہی دیر میں بگھیاں محل سے نکل کر گرو یا لوناتھ کی کٹیا کی طرف جانے والے راستے پر رواں دواں تھیں۔ آگے جا کر جنگل گھنا ہو جاتا تھا لہٰذا بگھیاں روک کر انہیں پیدل بھی چلنا پڑا مگر آج وہ ہر طرح کا کشٹ اٹھانے کے لیے تیار تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ گرو یا لوناتھ کی کٹیا کے سامنے موجود تھے۔ کٹیا کی ویرانی بتاتی تھی کہ یہاں گرو جی کے بعد اور کسی نے ڈیرا نہیں ڈالا ہے۔ کٹیا کے اندر گرو جی کی قبر بنی ہوئی تھی۔ وہ خاموشی سے اس قبر کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ اشوک بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔

''گرو جی! مجھ پر بڑی مصیبت آ پڑی ہے۔ آپ کے حکم کا پالن نہیں کر پایا۔ مجھے شما کر دیجیے۔ مجھے کوئی اُپائے بتائیں۔ میری پرجا مر رہی ہے۔ غلطی میری ہے، اس میں ان معصوم جانوں کا کوئی قصور نہیں۔ بھگوان کے لیے میری مدد کیجیے۔'' وہ گڑگڑا کر رونے لگے۔

مگر اس آہ و بکا کا گرو جی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ انہیں کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ وہ کافی دیر وہیں رک کر گرو جی سے

pklibrary.com

باتیں کرتے رہے۔ اشوک ساتھ ہی سر جھکائے کھڑا رہا۔ سورج ڈھلنے لگا تو اشوک نے انہیں واپس چلنے کا کہا۔ جنگل میں اتنی رات تک رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا اور قلعے میں بھی ان کی ضرورت تھی۔

بالآخر وہ محل لوٹ آئے اور محل لوٹ آنے پر مزید بُری خبریں ان کی منتظر تھیں۔ وہ بیماری رہائشی علاقے سے نکل کر اب آہستہ آہستہ سپاہیوں میں پھیل رہی تھی۔ اس بات کا مطلب تو یہی تھا کہ کسی بھی وقت وہ بیماری محل کے اندر داخل ہو کر ان سب کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی تھی۔

''حضور! میری بات مانیں تو آپ رانی سا اور راج کماروں کے ساتھ فوراً قلعے سے روانہ ہو جائیں۔ میں پچھلے محل میں تمام انتظامات مکمل کروا دیتا ہوں۔ آپ لوگوں کا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔'' جب کوئی حل نظر نہ آیا تو بالآخر اشوک نے ہی مشورہ دینے کا فیصلہ کیا ورنہ وہ کافی دیر سے سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔

''تم یہ چاہتے ہو کہ میں اپنی پرجا کو ان مشکل حالات میں چھوڑ کر یہاں سے چلا جاؤں؟'' بھگونت سنگھ ناراضی سے بولے۔ آج اشوک کا ہر مشورہ غلط ثابت ہو رہا تھا۔

''حضور! اشوک ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس بیماری پر تو ہم جیسے تیسے قابو پا لیں گے مگر آپ کی اور راج کماروں کی حفاظت سب سے اہم ہے۔'' کرشن نے بولنے کا فیصلہ کیا۔

''نہیں کرشن! یہ اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔ میں یہاں سے کسی صورت نہیں جاؤں گا۔'' وہ اٹل لہجے میں بولے۔

''ٹھیک ہے، تو پھر ہم کم از کم رانی سا اور راج کماروں کو یہاں سے دور لے جاتے ہیں۔ حضور! یہ بات مان لیجیے۔'' اشوک نے ہاتھ جوڑے۔

''ٹھیک ہے۔ سورج نکلنے کا انتظار کرو۔ رات کے اس پہر ان کو یہاں سے اس طرح لے جانا ٹھیک نہیں۔ جب تک اس کالے تیندوے کا شکار نہیں ہو جاتا، نکل میں رات کے سفر سے پرہیز کرو۔'' بھگونت سنگھ بولے اور اشوک سر ہلا کر محل کے رہائشی حصے کی طرف بڑھ گیا تاکہ رانی سا کو سفر کی تیاری کرنے کا پیغام دے سکے۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ بھگونت سنگھ نے اس کی کوئی بات تو مانی تھی۔

''حضور! آپ بھی آرام کریں۔ سارا دن اسی طرح گزر گیا ہے۔ امید ہے کل کا سورج اپنے ساتھ کوئی اچھی خبر ہی لائے گا۔ ہم سب بھی اس مشکل کا اُپائے تلاش کرنے کے لیے پوجا کر رہے ہیں۔'' راج مندر کا بڑا پنڈت بولا اور بھگونت نے اس کے کہنے پر دربار کو برخاست کر دیا۔

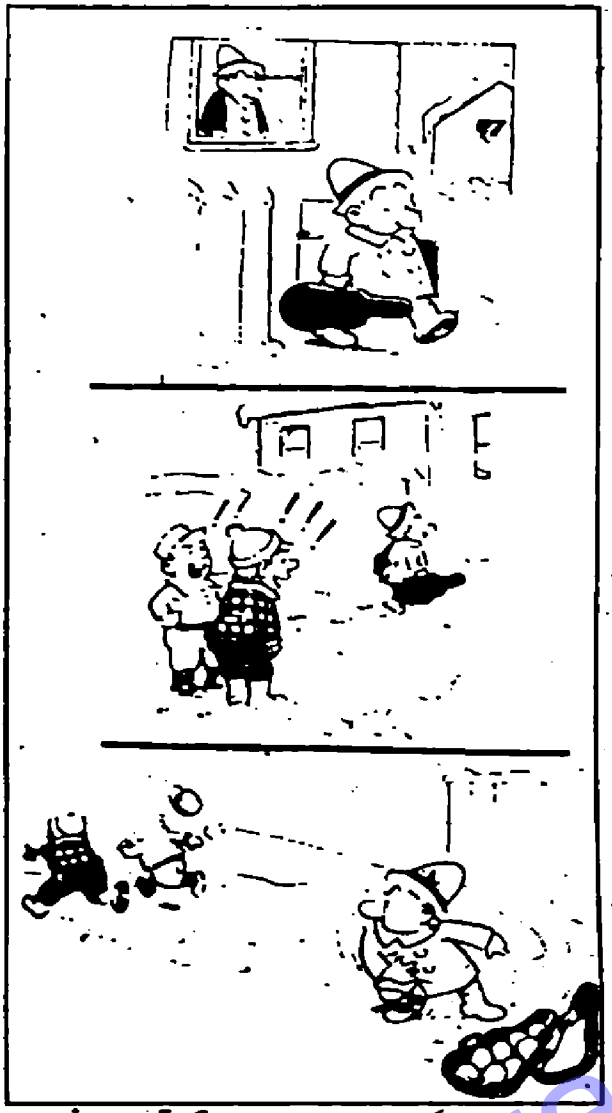

وہ اپنے کمرے میں آیا تو بھاگوتی پریشانی سے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔

''راج کمار سو گئے؟'' اس نے نرمی سے پوچھا۔

''ہاں، وہ تو سو گئے مگر آپ نے یہ کیا نیا حکم جاری کیا ہے؟ میں آپ کے بغیر یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔'' بھاگوتی پریشانی سے ان کی طرف بڑھیں۔

''دیکھو بھاگوتی! یہ وبا پھیل کر محل تک آ رہی ہے۔ اس وقت میرے لیے تمہاری اور راج کماروں کی زندگی بہت اہم ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم صبح ہوتے ہی یہاں سے چلی جاؤ۔ جیسے ہی اس پریشانی کا کوئی اُپائے ملے گا، میں بھی آ جاؤں گا۔'' وہ انہیں نرمی سے سمجھا رہے تھے۔

''ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کے بغیر کہیں نہیں جاؤں گی۔'' وہ ضد کر رہی تھیں۔

''بھاگوتی! ضد مت کرو۔ میں ویسے ہی بہت پریشان ہوں اور اب میں سونا چاہتا ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر اپنے بستر کی طرف بڑھ گئے۔

بھاگوتی کو ان کی پریشانی کا اچھی طرح اندازہ تھا۔

pklibrary.com

جب سے وہ اس محل میں آئے تھے، کچھ نہ کچھ ہو رہا تھا۔ یقیناً یہ جگہ منحوس تھی۔ وہ بھگونت کو یہاں اکیلے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھیں مگر جانتی تھیں کہ وہ کبھی بھی ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ ان کے لیے اپنی پرجا کی حفاظت سب سے ضروری تھی۔ وہ شاید سوچکے تھے۔ وہ بھی خاموشی سے ان کے ساتھ لیٹ گئیں مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

نیند تو بھگونت کو بھی نہیں آرہی تھی مگر دن بھر کے اعصاب شکن تجربات نے انہیں جسمانی طور پر بھی تھکا دیا تھا۔ ان کی آنکھ لگ گئی۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب ان کی آنکھ کھلی۔ کمرا اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا ورنہ عام طور پر ایک مشعل جلتی رہتی تھی۔

''بھاگوتی! کمرے میں اتنا اندھیرا کیوں ہے؟'' انہوں نے بھاگوتی کو پکارا مگر بھاگوتی کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر بھاگوتی کو ہلانے کی کوشش کی مگر وہ اپنے بستر پر موجود نہیں تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اتنی رات کو بھاگوتی کہاں جاسکتی ہے؟ وہ سوچنے لگے۔

''شنکر..... شنکر.....!'' انہوں نے کمرے کے دروازے پر کھڑے پہرے دار کو آواز دی مگر اس کی طرف سے بھی کوئی جواب موصول نہیں ہوا اور نہ وہ ایک ہی آواز پر اندر آجاتا تھا۔

وہ اپنے بستر سے اترے اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ محل کی راہداری سنسان پڑی تھی۔ وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔

یکا یک انہیں احساس ہوا کہ وہ خواب دیکھ رہے ہیں مگر یہ ایک ایسا خواب تھا جس میں انہیں یہ احساس تھا کہ جو وہ دیکھ رہے ہیں وہ حقیقت نہیں ہے۔ وہ خاموشی سے راہداری کا فاصلہ طے کرنے لگے۔ شاید قدرت انہیں خود ہی راستہ دکھا رہی تھی۔ راہداری ایک احاطے میں ختم ہوتی تھی جہاں سے محل کا باغ صاف نظر آتا تھا۔ وہ اس احاطے میں پہنچ کر رک گئے اور نیچے جھانک کر محل کے باغ کا جائزہ لینے لگے۔ یہ وہی باغ تھا جہاں حوض بنا ہوا تھا۔

اچانک انہیں حوض کے پاس کسی کا سایہ نظر آیا۔ وہ چونک پڑے۔

آخری دفعہ انہوں نے گرو بالوناتھ کو اسی حوض کے قریب خود سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ تیزی سے راہداری کی سیڑھیاں اتر کر باغ کی طرف بڑھ گئے۔ یقیناً گرو بالوناتھ خود اس کی مدد کو آپہنچے تھے۔

جیسے جیسے وہ حوض کے قریب پہنچ رہے تھے، ان کی سوچ سچ ثابت ہو رہی تھی۔ گرو بالوناتھ وہیں موجود تھے۔ وہ ان کے پیچھے جاکر کھڑے ہوگئے۔

''گرو جی! مجھے معاف کردیں۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں آپ کی آگیا کا پالن نہ کرپایا اور فصیل کی دیوار میری نادانی کی وجہ سے اونچی ہوگئی ہے۔ میں بنتی کرتا ہوں کہ آپ اپنا شراپ واپس لے لیں اور ہمیں اس وبا سے مکت کریں۔'' وہ ادب سے ہاتھ جوڑے گرو جی سے مخاطب تھے۔

''بھگونت! بات میرے شراپ سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ میں شراپ نہیں دیا کرتا۔ تمہیں یاد ہوگا، جب تم میری کٹیا میں آئے تھے تو میں تمہیں یہاں قلعہ تعمیر کرنے سے منع کر رہا تھا مگر تمہاری ضد کے ہاتھوں مجبور ہوکر میں نے تمہیں اجازت دے دی تھی اور چند شرائط رکھی تھیں۔ اگر تم ان شرائط پر سختی سے کاربند رہتے تو آج تمہیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔'' گرو جی بغیر ان کی طرف رخ کیے بولے۔

''گرو جی! آپ جو کہیں گے، میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔ کوئی تو اُپائے ہوگا؟ میری پرجا مر رہی ہے۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔'' وہ گڑگڑانے لگے۔

''بھگونت! کچھ معاملات میرے اور تمہارے بس میں نہیں ہیں۔ کچھ شکتیاں ایسی ہیں جن کا ہم کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہاں صدیوں سے ایک شیطان سو رہا تھا جو تمہاری اس غلطی سے جاگ چکا ہے۔ سورج دیوتا کی روشنی نے اسے قید کر رکھا تھا اور میں اس کے پہرے پر بیٹھا تھا مگر تمہارے فصیل کھڑا کرنے سے سورج دیوتا کی روشنی اس تک پہنچنا بند ہوگئی اور اب وہ جاگ چکا ہے۔ وہ اپنے ساتھ وبا بھی لائے گا اور موت بھی۔ بہتر یہی ہوگا کہ تم مزید نقصان اٹھانے سے پہلے اس قلعے کو خالی کردو۔'' وہ سنجیدگی سے بولے۔

''گرو جی! ایسی کون سی شکتی ہے جو آپ کے آگے سر اٹھا لے؟ میں جانتا ہوں آپ یہاں نہ ہوکر بھی یہیں پر موجود ہیں۔ میں کیسے اتنے بڑے قلعے کو خالی کرسکتا ہوں؟ میری پرجا یہاں بس گئی ہے۔ انہوں نے اپنے گھر بنا لیے ہیں۔ شاہی خزانے کا ایک بڑا حصہ اس قلعے کی تعمیر میں خرچ ہوا ہے۔ میں نے اس جگہ کو ہر طرح کی سہولتوں سے آراستہ کیا تاکہ میری پرجا خوشحال رہ سکے۔ آپ اس شکتی کو نشٹ کردیں گرو جی!'' بھگونت بولا۔

''ضد مت کرو بھگونت! اپنی پرجا کو لے کر یہاں سے کل صبح ہی روانہ ہوجاؤ ورنہ تم بہت نقصان اٹھاؤ گے اور

pklibrary.com

ہاں، جاتے جاتے اس فصیل کو گراتے جانا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ زمین اب اس شراپ سے مکت ہوگی بھی یا نہیں مگر جو تمہارے بس میں ہے، وہ کرتے جاؤ۔'' یہ کہہ کر گرو جی ہوا میں تحلیل ہو گئے۔

وہ کافی دیر وہاں کھڑے گرو جی کو آوازیں دیتے رہے مگر وہ واپس نہیں لوٹے اور پھر اچانک ہی ان کی آنکھ کھل گئی۔ بھاگوتی ان کے ساتھ ہی سو رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور گرو جی کی کہی ہوئی باتوں پر غور کرنے لگے۔

ایسے کیسے وہ ساری پرجا کو لے کر اچانک قلعہ خالی کر سکتے تھے؟ اس قلعے کو بسانے میں ان کی کئی سالوں کی محنت اور سرمایہ لگا تھا۔ تو کیا انہیں گرو جی کی اس نصیحت کو ایک خواب کی طرح بھلا دینا چاہیے؟ انہوں نے اشنان کیا اور دربار کی طرف چل پڑے۔ بہتر یہی تھا کہ وہ اپنے وزیروں اور مشیروں سے مشورہ کر لیتے مگر ایک خواب کی بنا پر وہ اتنا بڑا فیصلہ تو ہرگز نہیں لے سکتے تھے۔

دربار لگ چکا تھا اور ان کے تمام وزیر مشیر مع پنڈتوں کے دربار میں ہی موجود تھے۔

''پنڈت جی! کیا حل سوچا ہے آپ نے؟'' وہ وہاں بیٹھے راج پنڈت سے مخاطب ہوئے۔

اس سے پہلے کہ پنڈت اپنے منہ سے کوئی بات نکالتا، اچانک ہی کرشن دربار میں دوڑتا ہوا داخل ہوا۔

''حضور! اس گستاخی کے لیے شما چاہتا ہوں مگر انرتھ ہو گیا ہے۔'' وہ شدید بوکھلایا ہوا تھا۔

''کیا ہوا ہے؟ کھل کر بتاؤ۔'' وہ اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے کھڑے ہوتے ہی دربار کے تمام لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔

''حضور! رہائشی علاقوں کے تمام گھروں کی چھتیں اپنے آپ گر گئی ہیں۔ جو لوگ وبا سے بچے تھے، وہ ان چھتوں کے نیچے دب کر مر گئے ہیں۔'' کرشن نے جلدی سے اپنی بات مکمل کی۔

''کیا کہہ رہے ہو تم؟ اشوک پریشانی سے بولا۔ اچانک ہی دربار کی چھت میں دراڑ پڑنے کی آواز پیدا ہوئی۔ ان سب نے ایک ساتھ اوپر دیکھا مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ چھت زمیں بوس ہونے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ چکی تھی اور وہ سب اس کے نیچے دب کر ختم ہونے والے تھے۔

☆☆☆

Year 1226

قاہرہ۔ مصر

دو سال کا طویل المدت عرصہ گزر چکا تھا۔ ابو عباس البونی کے علم کی شہرت ہر طرف پھیل چکی تھی۔ اس دوران اس نے کئی تصانیف تخلیق کی تھیں جن میں علم الہدا، مواقف الغیات، ہدایت القاصدین، لطائف الاشارات، اسماء الحسنیٰ اور بے شمار عظیم کتابیں جو مصر کے مکاتب میں مقبول ترین تھیں۔

مگر شمس المعارف کی جو دھوم تھی، اس کا الگ ہی مقام تھا۔ وہ مابعد الطبیعیات سے لے کر علم کائنات کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ ایک ایسی کتاب جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کی معلومات، علم الاعداد سے لے کر جنات کو قابو کرنے کی معلومات، علم الحروف سے لے کر نقش واوفاق کی معلومات۔ جیسے کسی نے دنیائے علم کے سورج کو قید کر لیا ہو۔ لوگ دور دور سے اس کے بیان سننے آنے لگے تھے۔ خواہ وہ انسان ہوں یا جنات، سب ہی اس کے علم سے مستفید ہو رہے تھے مگر وہ اپنا کیا گیا وعدہ نہیں بھولا تھا۔

اس نے شمس المعارف کو عام نہیں کیا تھا۔ وہ علم کو درجوں کے حساب سے بانٹ رہا تھا۔ کئی حصے اب بھی پوشیدہ تھے جنہیں وہ صرف مخصوص لوگوں تک ہی پہنچنے دیتا تھا۔ کافی لوگوں نے اسے تنقید کا نشانہ بھی بنایا تھا مگر اس کی نیت صاف تھی۔ لہٰذا وہ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہا اور ان دو سالوں میں اسے کہیں سے بھی کوئی شکایت موصول نہیں ہوئی تھی کہ کسی نے شمس المعارف سے حاصل کی گئی معلومات کی وجہ سے کسی دوسرے انسان یا جنات کو نقصان پہنچایا ہو۔

وہ اپنا الگ مکتب قائم کر چکا تھا۔ ابن العربی اب مسلسل سفر میں رہتے تھے لہٰذا ان کا مکتب اب صرف بطور کتب خانہ استعمال ہونے لگا تھا اور اسے درس و تدریس جاری رکھنے کے لیے الگ سے ایک جگہ کی ضرورت تھی۔ ان دو سالوں میں وہ کافی پیسے بھی جوڑ چکا تھا جو ذاتی مکتب کی تشکیل کے لیے کافی تھے۔ اس کا الگ مکتب قائم ہوا تو طالب علم کثیر تعداد میں اس کے مکتب کا رخ کرنے لگے۔ وہ مختلف مضامین کی تعلیم دیتا اور کچھ عرصے پر محیط مختلف جماعتیں تشکیل دے دیتا۔ آج بھی ایک نئی تشکیل شدہ جماعت کے بیان کا پہلا دن تھا۔ یہ طالب علم شمس المعارف کے بیانات سننے اور سمجھنے کے لیے حاضر ہوئے تھے۔

انہی میں سے ایک سعد بن زید بھی تھا۔ وہ عرب کا مشہور تاجر تھا۔ شمس المعارف کی شہرت سن کر اس نے مصر کی

pklibrary.com

طرف سفر باندھنے کا ارادہ کیا تھا۔ مصر پہنچا تو یہاں ابوعباس البونی کے نام کا ڈنکا بجا دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ مصر کا بچہ بچہ وہ کچھ جانتا تھا جو اس کی سات نسلیں بھی تمام عمر پڑھنے کے باوجود نہیں جان سکتی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ سب ابوعباس البونی کی وجہ سے ممکن ہو پایا ہے۔ گویا شمس المعارف ہی معلومات کا وہ خزانہ تھا جس کی اسے تلاش تھی۔ تاجر کا دماغ تھا۔ علم حاصل کرنے کی چاہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے اور مال بنانے کی سوچ نے ذہن پر قبضہ جما لیا تھا۔ اگر وہ شمس المعارف کی نقل کروا کر دنیا بھر میں فروخت کرتا تو اس کو کتنا فائدہ ہوتا۔ یہی سوچ اسے ابوعباس البونی کے مکتب تک لے آئی تھی۔

آج شمس المعارف کے حوالے سے ابوعباس البونی کا پہلا بیان تھا اور بیان سننے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ ابو عباس کے پاس معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ گو کہ اس نے بہت ساری باتیں اپنے بیان کے دوران مخفی رکھی تھیں مگر جتنی بھی معلومات وہ ان طالب علموں تک پہنچاتا تھا، وہ بہت قیمتی تھیں۔ بیان کے دوران ایک طالب علم کے سوال کے جواب میں اس نے بتایا تھا کہ وہ انہیں شمس المعارف کی تعلیم کے دوران سرسری سی معلومات فراہم کرے گا مگر شمس المعارف کے خاص حصے صرف اور صرف ان خاص ذہنوں تک پہنچائے گا جو اسے سنبھالنے کے قابل ہوں گے۔ یہ بات سعد بن زید کے لیے حیرت انگیز تھی۔ جن معلومات کو ابو عباس سرسری سی معلومات کہہ رہا تھا، اس میں علم الاعداد اور علم الحروف سے لے کر نقش بنانے کی تفاصیل بھی موجود تھیں۔ یعنی آنے والے وقت کی معلومات، حساب کتاب اور اپنا علاج تو انسان انہی سرسری سی معلومات سے بہ آسانی کر سکتا تھا، تو نہ جانے اس کے مطابق جنہیں وہ خاص معلومات سمجھتا تھا، وہ علم کی کون سی معراج ہوگی؟

اس کا دل اس خاص معلومات کو حاصل کرنے کے لیے مچل اٹھا مگر اس کے لیے پہلے اسے خود کو ثابت کرنا تھا یعنی کہ شمس المعارف کے لیے تشکیل دی گئی اس جماعت کے امتحان کو کامیابی سے پار کرنا۔ ظاہر ہے اس کے لیے اسے مصر میں قیام کرنا پڑتا۔ چونکہ پیشے کے لحاظ سے وہ تاجر تھا تو اس کے کاروبار کو بھی نقصان پہنچ سکتا تھا مگر جو معلومات اسے یہاں مل رہی تھیں آگے چل کر اسے بہت فائدہ دے سکتی تھیں۔ لہٰذا اس نے مصر میں قیام کا ارادہ کر لیا اور باقاعدگی سے ان بیانات میں شرکت کرنے لگا۔

مگر ظاہر ہے کہ اس کا کاروباری ذہن علم کو اس طرح جذب نہیں کر پاتا تھا جس طرح سے باقی طالب علم کرتے تھے۔ ابوعباس کے لیے تو تمام طالب علم ایک جیسے تھے۔ لہٰذا وہ بغیر کسی تفریق کے سب سے مساوی سلوک برتتا تھا۔ طویل عرصے سے درس و تدریس کے شعبے سے منسلک رہنے کے بعد اسے خود بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ کون سا طالب علم آگے چل کر علم کے اس بوجھ کو سہار سکے گا اور کس کو وہ سند دے کر روانہ کر دے گا۔ سعد بن زید بھی ایسے ہی طالب علموں میں سے تھا۔

اکثر بیان کے دوران وہ غائب دماغی سے بیٹھا دیواروں کو تکتا رہتا۔ اگر اس سے کوئی سوال کیا جاتا تو وہ ٹال مٹول سے کام لیتا یا بغیر سر پیر کا جواب دینے لگتا۔ اس کے زیادہ تر سوال غیبی علوم سے متعلق ہوتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ جلد از جلد علم الغیب پر دسترس حاصل کرنا چاہتا ہے۔

چونکہ وہ معاوضہ ادا کر چکا تھا لہٰذا ابوعباس پر فرض تھا کہ وہ جتنا ممکن ہو، اس کی مدد کرے مگر وہ تو جیسے عجلت میں تھا۔

بالآخر وہ دن بھی آ پہنچا جب جماعت کے بیان کا آخری دن تھا۔ ابوعباس نے تمام طالب علموں کو اعزازی سند سے نوازا تھا۔ بدقسمتی سے پوری جماعت میں سے کوئی ایک بھی ایسا طالب علم نہیں تھا جو اگلے پڑاؤ تک پہنچ پاتا۔ لہٰذا نئی جماعت کی تشکیل کی تاریخ کا اعلان کیا گیا اور اس کے بعد محفل برخاست کر دی گئی۔

سعد بن زید کو بہت مایوسی ہوئی۔ وہ پچھلے چھ ماہ سے اپنا تمام کاروبار اور تجارت چھوڑ کر مصر کی گلیوں کی خاک چھان رہا تھا مگر اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ یہاں تک کہ جو کچھ ابوعباس نے طالب علموں کو جماعت میں سکھایا تھا، وہ اس پر بھی پوری طرح عبور حاصل نہیں کر پایا تھا۔ اس نے تو سوچا تھا کہ وہ یہاں سے شمس المعارف کے خاص حصوں کی تعلیم حاصل کر کے ہی لوٹے گا مگر اب تو یہ ناممکن نظر آ رہا تھا۔

دوسرے طالب علم خوش تھے۔ انہوں نے جتنا سیکھا تھا، ان کے لیے کافی تھا مگر وہ خوش نہیں تھا۔ وہ خالی ہاتھ واپس لوٹنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا دو دن غور و فکر کرنے کے بعد اس نے خود ہی ابوعباس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

صبح فجر کے بعد وہ مکتب میں اکثر اکیلے بیٹھے نظر آتے تھے لہٰذا دوسری صبح وہ جلدی اٹھا اور مکتب چلا آیا۔ وہ حسب معمول اکیلے بیٹھے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اس وقت مکتب میں اکا دکا طالب علم بھی موجود تھے۔ وہ سیدھا ان کے پاس چلا آیا۔

pklibrary.com

''السلام علیکم استادِ محترم! کیسے ہیں آپ؟'' اس نے خوشگوار لہجے میں انہیں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ سعد بن زید! میں الحمدللہ ٹھیک ہوں۔ تم اپنا حال سناؤ۔ تم اب تک روانہ نہیں ہوئے؟'' ابوعباس جانتے تھے کہ وہ عرب سے یہاں آیا ہے اور مضمون مکمل کرتے ہی یہاں سے چلا جائے گا مگر جماعت ختم ہونے کے دو دن بعد بھی اسے مصر میں موجود دیکھ کر انہیں حیرانی ہوئی تھی کیونکہ وہ بارہا جماعت کے دوران یہی تذکرہ کرتا تھا کہ وہ جلد از جلد یہ مضمون مکمل کر کے یہاں سے واپس جانا چاہتا ہے۔

''استادِ محترم! میں آپ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا تھا۔ بس اسی لیے یہاں رکا ہوا ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''بیٹھو، کہو کیا مسئلہ درپیش ہے؟ میں سن رہا ہوں۔'' انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''استادِ محترم! میں چھ ماہ اپنا کاروبار اور تجارت چھوڑ کر مصر صرف اور صرف شمس المعارف کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آیا تھا لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ چھ ماہ بعد بھی میں خالی ہاتھ ہی ہوں۔'' سعد بن زید نے اپنی بات شروع کی۔

''مگر میں نے تو ایمانداری سے تمام طالب علموں پر بھرپور توجہ دی ہے اور آپ سب کے تمام سوالوں کے جوابات بھی دیتا رہا ہوں۔ اگر آپ کو کوئی بات سمجھ نہیں آئی ہے تو آپ پوچھ سکتے ہیں۔'' ابوعباس نرم لہجے میں اس سے مخاطب ہوئے۔

''نہیں استادِ محترم! یہ بات نہیں ہے۔ آپ نے تو بہت اچھے طریقے سے مضمون سمجھایا بلکہ انفرادی طور پر سب پر بھرپور توجہ دی مگر میں ذرا کند ذہن واقع ہوا ہوں۔ مجھے بچپن سے ہی علم سے اتنا شغف نہیں رہا ہے اور مجھے ہر بات کافی دیر بعد سمجھ آتی ہے مگر میں تجارتی اور کاروباری معاملات میں کافی تیز ہوں۔ یا یوں سمجھ لیں کہ حساب کتاب کا مضمون ہو تو میرا دماغ کافی تیز چلتا ہے۔'' سعد بن زید مسکرایا۔

''بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر طالب علم ہر مضمون پر عبور حاصل کر لے۔ آپ کا جس مضمون میں دل لگتا ہے، آپ اس کی تعلیم حاصل کریں۔'' ابوعباس نے اسے مشورہ دیا۔

''جی، آپ بالکل صحیح فرما رہے ہیں مگر چونکہ میرا وقت اور پیسا دونوں اس مضمون کی تعلیم پر لگا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ یہاں سے کچھ لے کر ہی واپس جاؤں۔'' سعد بن زید بولا۔

''میں آپ کی بات سمجھا نہیں؟ آپ کھل کر کہیں کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' ابوعباس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''دراصل میں آپ سے شمس المعارف کا یہ مسودہ خریدنا چاہتا ہوں اور آپ کو منہ مانگی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' سعد بن زید بولا۔

''شمس المعارف تو مصر کے ہر مدرسے اور مکتب میں دستیاب ہے۔ آپ کہیں سے بھی اس کا مسودہ حاصل کر سکتے ہیں۔'' ابوعباس مسکرائے۔

''نہیں، میں اس عام مسودے کی بات نہیں کر رہا..... بلکہ میں اس خاص مسودے کی بات کر رہا ہوں جو آپ نے صرف اپنی ذات تک محدود رکھا ہے یا چند ہی لوگوں کو اس تک رسائی حاصل ہے۔'' بالآخر سعد بن زید نے اپنے دل کی بات کھل کر بیان کر ہی دی۔

''علم خریدا نہیں جا سکتا اور شمس المعارف کے وہ حصے صرف اور صرف خاص لوگوں کے لیے مختص ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔'' ابوعباس نے صاف انکار کر دیا۔

''میں آپ کو منہ مانگی قیمت ادا کروں گا۔ بلکہ آپ یہ سوچیں کہ علم کا یہ خزانہ جو آپ نے ایک کتاب میں جمع کر رکھا ہے، اگر ہم اس کی نقل کروا کر دنیا بھر میں تقسیم کریں تو آپ کو ہر مسودے پر مناسب معاوضہ ادا کیا جائے گا۔ میرے خیال سے یہ سودا برا نہیں۔ ایک مدرس کے طور پر آپ اتنا نہیں کما سکتے ہیں جتنا آپ کی یہ کتاب آپ کو دے سکتی ہے۔'' وہ تاجر تھا لہٰذا تاجر کی زبان میں ہی بات کر رہا تھا۔

''ہرگز نہیں۔ میں نے علم کو بیچنے کے لیے حاصل نہیں کیا بلکہ میں اسے بانٹنے پر یقین رکھتا ہوں۔ اللہ نے جتنا مجھے عطا کیا ہے، میرے لیے کافی ہے۔ مجھے زیادہ کی لالچ نہیں۔ آپ جا سکتے ہیں۔'' ابوعباس کو اس کی باتیں شدید ناگوار گزریں۔

''آپ ایک بار پھر سوچ لیں۔ میں دو دن تک مصر میں ہی ہوں۔ دو دن بعد پھر حاضر ہوں گا۔ آپ کو دو ہزار سکے اور ایک قیمتی نسل کا گھوڑا بیچانے کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں آپ کو پچھتاوا ہو کہ آپ نے یہ سودا کیوں طے نہیں کیا تھا۔'' وہ یہ کہہ کر وہاں سے چلا آیا۔

ابوعباس کو اس کا لب ولہجہ سخت ناگوار گزرا تھا۔ ان کا علم خریدا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ تو وہ عطا تھی جو انہیں رب کی طرف سے ملی تھی۔ اگر اس کتاب کے وہ حصے عام لوگوں تک پہنچ جاتے تو دنیا میں سب ہی ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے۔ چاہے سعد بن زید دو دن بعد آتا

pklibrary.com

یا چار دن بعد، ان کا فیصلہ اٹل تھا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ دو دن بعد وہ دوبارہ سے مکتب میں آ کر ان کے سامنے کھڑا کتاب کے ان حصوں کو خریدنے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ انہوں نے سختی سے اسے وہاں سے جانے کا کہا اور صاف انکار کر دیا۔

وہ واپس چلا آیا مگر ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس کے خبیث دماغ نے ایک مکروہ منصوبہ تیار کیا۔ وہ شمس المعارف کا اصل و مکمل مسودہ چرانے والا تھا۔ پہلے تو اس نے پیشہ ور چوروں کی خدمات حاصل کرنے کا سوچا مگر بعد میں یہ ارادہ ملتوی کر کے خود ہی اس منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ جانتا تھا کہ ابو عباس جلدی سونے کے عادی تھے۔ لہٰذا وہ عشا کے بعد ان کے مکتب میں داخل ہوا۔ مکتب آہستہ آہستہ خالی ہو رہا تھا اور ابو عباس اپنے حجرے میں آرام کرنے کے لیے جا چکے تھے۔ اس نے خاموشی سے سب کے جانے کا انتظار کیا اور چراغ گل کرنے والے کے آنے سے پہلے کتابوں کی الماری کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔

مکتب خالی ہوا تو چراغ گل کرنے والا آیا اور مکتب کا سرسری سا جائزہ لے کر چراغ گل کر کے باہر نکل گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مکتب میں بھی کوئی چوری کی نیت سے داخل ہو سکتا ہے۔ عام سا مکتب تھا۔ دن میں کئی طالب علم یہاں علم حاصل کرنے کی نیت سے آتے تھے اور بھلا کتابیں کون چوری کر سکتا تھا۔

اس شخص کے جاتے ہی سعد بن زید الماری کے پیچھے سے باہر نکل آیا۔ اب وہ دبے قدموں ابو عباس کے حجرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ احتیاط ضروری تھی۔ حجرے کے قریب پہنچ کر وہ تھوڑی دیر رکا اور دروازے سے کان لگا کر آہٹ پانے کی کوشش کرنے لگا۔ اندر سے کوئی آہٹ سنائی نہیں دی تھی مگر وہ پھر بھی کچھ دیر رک کر انتظار کرتا رہا۔

جب اسے اچھی طرح تسلی ہو گئی کہ ابو عباس سو چکے ہیں تو اس نے اپنے لباس کی جیب سے ایک شیشی نکال لی۔ اس شیشی میں نیلے رنگ کا محلول بھرا ہوا تھا۔ اس نے احتیاط سے اس شیشی کا ڈھکن کھولا اور جلدی سے دروازے کی چوکھٹ پر موجود جھری سے اسے کمرے کے اندر دھکیل دیا اور ناک پر رومال رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ نیلے رنگ کا محلول ایک دھوئیں میں تبدیل ہو کر کمرے میں پھیلنا شروع ہو گیا۔ اس دھوئیں کی کوئی بو نہیں تھی۔ وہ بے ہوش کرنے کی دوا تھی۔ سعد بن زید کے لیے اس دوا کو حاصل کرنا اتنا مشکل کام نہیں تھا۔ دھواں پھیلنے کے بعد آہستہ آہستہ بیٹھ رہا تھا۔ سعد بن زید نے اس دوران کمرے میں داخل ہونے سے پرہیز کیا۔ وہ جھری سے جھانک کر دھواں ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

جیسے ہی دھواں ختم ہوا، وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں اب بھی ہلکا سا دھواں تھا مگر دوا کا اثر بہت حد تک زائل ہو چکا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا مگر روشن دان سے اندر داخل ہونے والی چاند کی روشنی میں وہ کسی حد تک دیکھنے کے قابل ہوا تھا۔ ایک طرف بستر لگا تھا جہاں ابو عباس سو رہے تھے بلکہ اب تک تو بے ہوش ہو چکے تھے۔ ایک طرف ایک میز اور کرسی رکھی تھی۔ میز پر چراغ رکھا تھا۔ ابو عباس نے آگے بڑھ کر چراغ جلایا اور اسے ہاتھ میں پکڑ کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

کمرے میں تین الماریاں تھیں جن میں مختلف کاغذات اور کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ کچھ کاغذات میز پر بھی پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے سب سے پہلے میز پر پھیلے کاغذات کا جائزہ لیا اور پھر میز کی درازیں کھنگالنے لگا۔ وہاں سے مایوس ہو کر اب وہ الماریوں کی طرف بڑھ گیا مگر وہاں بھی اسے اپنے مطلب کی چیز نہیں ملی۔

"آخر کہاں جا سکتا ہے وہ مسودہ؟" وہ خود کلامی کرنے لگا۔ اگر آج وہ ناکام لوٹتا تو اس کی ساری محنت ضائع ہو جاتی کیونکہ اس نے بحری جہاز کے ذریعے آج رات ہی نکل جانا تھا۔ وہ سارا انتظام مکمل کر کے آیا تھا۔

وہ بے چینی سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اچانک اس کی نظر ابو عباس کے بستر پر پڑی۔ وہ بستر لکڑی کے تخت پر لگا ہوا تھا مگر اس تخت کی شکل ایک بڑے لکڑی کے بکسے جیسی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھا اور احتیاط سے ابو عباس کو بستر سے اٹھا کر نیچے لٹا دیا۔ وہ پوری طرح بے ہوش تھے۔ سعد بن زید نے اس تخت پر موجود بستر کو ہٹایا اور اس کی توقع کے عین مطابق اس کے سامنے لکڑی کا ایک بڑا سا بکسا موجود تھا۔

اس نے احتیاط سے لکڑی کا وہ بکسا کھولا۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہاں ابو عباس کی تمام کتابوں کے اصل مسودے موجود تھے۔ بلکہ ایک نہیں، مسودوں کی کئی نقول موجود تھیں۔ اس نے جلدی سے شمس المعارف کی ایک نقل اٹھائی اور اس کے صفحے پلٹ کر کتاب کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس کے ہاتھ تو خزانہ

pklibrary.com

لگ گیا تھا۔ وہ راتوں رات امیر ہونے والا تھا۔ نہ صرف امیر بلکہ اب تو وہ بہت ساری غیبی طاقتوں کو اپنے قبضے میں کرکے ان سے بہت سا فائدہ حاصل کرسکتا تھا۔ اس نے شمس المعارف کی دو نقول اٹھائیں اور انہیں احتیاط سے اپنے لباس میں چھپا کر مکتب سے باہر نکل آیا۔ اس رات وہ بحری جہاز کے ذریعے شمس المعارف کو لے کر مصر کی حدود سے باہر نکل چکا تھا۔ شمس المعارف نے دنیا کی سب سے خطرناک کتاب ثابت ہونے کا سفر شروع کردیا تھا۔

☆☆☆

Year 1773

قاہرہ۔ مصر

نیل کا قبیلہ آج ابو ہریرہ کے پاس حاضر ہوا تھا۔ صاحبِ علم کا اس سرزمین پر موجود ہونا اور عروخ کا ان سے مستفید نہ ہونا یقیناً ان کی بدقسمتی ہی ثابت ہوتا۔ ابو ہریرہ چاہ کر بھی انکار نہیں کرپایا تھا۔ رات گہری ہوتے ہی وہ اس کے گھر چلے آئے تھے۔ وہ عشا پڑھ کر فارغ ہوا تو ان سب کو وہاں دیکھ کر مسکرا اٹھا۔

"کیسے آنا ہوا عروخ؟" وہ قبیلے کے سردار سے سوال کررہا تھا۔

"آپ یہاں نہ جانے کتنے عرصے سے موجود ہیں اور ہماری بدقسمتی کہ ہم آپ کی موجودگی سے بے خبر رہے۔ اب جبکہ ہمیں معلوم ہو ہی چکا ہے تو ہم نے سوچا کہ کیوں نہ آپ کی باتوں سے مستفید ہولیں۔" عروخ بولا۔

"میں اپنی شہرت کی چاہ نہیں رکھتا۔ تم لوگوں کا اس طرح حاضر ہونا آس پاس کے علاقوں کے قبائل کو میری موجودگی سے خبردار کرسکتا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"آپ بے فکر رہیں۔ ہمارے یہاں آنے کی کسی کو بھی خبر نہیں اور نہ ہی ہم اس بات کو حدود سے باہر نکلنے دیں گے۔" عروخ ادب سے بولا۔

"ٹھیک ہے۔ کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟" وہ جاء نماز سمیٹتے ہوئے بولا۔

"ہم جانتے ہیں کہ آپ کو یہاں کس مقصد کے لیے بھیجا گیا ہے۔ بس ہم یہی کہنا چاہتے ہیں کہ جس مقصد کے لیے آپ اس سرزمین پر موجود ہیں، ہم بھی اسی مقصد کے لیے یہاں موجود ہیں۔ اگر آپ کو ہماری مدد کی ضرورت پڑے تو ہم حاضر ہیں۔" عروخ بولا۔

ابو ہریرہ نے ایک گہری سانس لی۔ وہ اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا تھا مگر جب مقصد ایک ہو تو پھر کوئی

کیا آپ

لبوب مُقوّی اعصاب

کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے، اعصابی کمزوری دور کرنے، تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مقوی اعصاب ٹیلیفون پر باقاعدہ حکیم صاحب سے گفتگو کرکے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں۔ اپنے دوستوں کو بھی ہماری دوائی کا بتائیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

فون دوپہر 2 بجے تا رات 10 بجے تک کریں۔

0301-6690383

0300-6526061

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

pklibrary.com

بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

"مختصر الفارا فرا کی پہرے داری مجھے سونپی گئی ہے۔" ابوہریرہ مختصر خاموشی کے بعد بولا۔

"جی، ہم جان گئے ہیں کیونکہ یہ کسی عام شخص کے بس کی بات نہیں۔" عروخ بولا۔

"جب کوئی قدرت کے قانون کے خلاف قدم اٹھاتا ہے تو ایسے ہی حادثے جنم لیتے ہیں۔ جب بدی کی طاقتیں زور پکڑنے لگیں تو نیکی کی قوتیں بھی حرکت میں آجاتی ہیں۔" ابوہریرہ بولا۔

"درست فرمایا آپ نے۔ کیا آپ کو اس کے جاگنے کا خطرہ لاحق ہے؟" عروخ نے اپنے خدشے کی تصدیق کرنا چاہی۔

"تب تک تو نہیں، جب تک کوئی اسے جگانے کی کوشش نہ کرے۔ جب تک میری زندگی ہے میں اس حفاظت پر مامور رہوں گا۔ میرے بعد کوئی اور آجائے گا جیسے مجھ سے پہلے کوئی اور تھا۔ جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ذمے داری مل جاتی ہے پھر اسے پوری کرنا ہی پڑتی ہے۔" ابوہریرہ بولا۔

"جی، درست فرمایا آپ نے۔ کیا ہم میں سے کوئی وہاں پہرا دے؟" عروخ ہی کلام کررہا تھا باقی سب سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔

"نہیں، میں نہیں چاہتا کہ وہ جگہ کسی کی نظروں میں آئے۔ جب تک وہ اوجھل ہے، اسے اوجھل رہنے دو ورنہ جو قوتیں اسے ڈھونڈ رہی ہیں وہ تم لوگوں کی وہاں موجودگی سے شک میں پڑسکتی ہیں۔ بلکہ میں یہی کہنا چاہوں گا کہ تم آئندہ یہاں بھی مت آنا۔ ہم اپنے فرائض اپنے علاقوں میں رہ کر بھی سرانجام دے سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم معاملے کی نزاکت کو بہ خوبی سمجھتے ہوگے۔" ابوہریرہ نے سنجیدہ لہجے میں عروخ کو مخاطب کیا۔

"جی میں سمجھ سکتا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں۔ آپ کو ہماری وجہ سے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ جیسے آپ کا حکم۔" یہ کہہ کر وہ اپنے قبیلے سمیت ہوا میں تحلیل ہوگیا۔

ابوہریرہ بھی آرام کرنے کی غرض سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جب تک اس کی سانسیں چل رہی تھیں، وہ اس نگرانی پر مامور تھا۔

☆☆☆

Year 1773

قاہرہ۔ مصر

حلیمہ نے بھی المیرا کے ساتھ ہی عیاد کے مکتب میں جانا شروع کردیا تھا۔ وہ ایک بہترین استاد تھا۔ ابھی انہیں مکتب جاتے ہوئے ایک ہفتہ ہی گزرا تھا مگر اس دوران وہ کافی کچھ سیکھ چکی تھیں۔ وہ اپنے تمام طالب علموں پر خصوصی توجہ دیتا تھا۔ ان سب کو سنجیدگی سے سمجھاتا۔ اگر کوئی بات کسی کو مشکل لگ رہی ہوتی تو اسے الگ سے سمجھانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ حلیمہ اس سے شدید متاثر تھی مگر وہ ہمیشہ نظریں جھکائے اپنا بیان مکمل کرتا، سوالوں کے جواب دیتا اور اپنے کاغذات سمیٹ کر وہاں سے چلا جاتا تھا۔

المیرا کے ہوتے ہوئے حلیمہ کو اتنا وقت نہیں ملتا تھا کہ وہ الگ سے عیاد سے کوئی سوال جواب کرسکے اور ایک فطری جھجک بھی تھی جو اسے ایسا کرنے سے روکتی تھی۔ وہ اکثر اپنی سوچوں میں گم رہنے لگی تھی۔

اس دن بھی وہ مکتب جانے کے لیے نکل رہی تھیں جب المیرا نے اسے پکارا۔

"کہاں گم رہنے لگی ہو؟ میں تم سے بات کررہی ہوں۔" المیرا اپنے بالوں کو سمیٹتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی۔

"جی.....؟ نہیں، کچھ نہیں..... بس وہ کل استادِ محترم نے کہا تھا کہ وہ علم الاعداد کے حوالے سے ہم سے تجربہ کروائیں گے تو بس اسی کے متعلق سوچ رہی تھی۔" وہ اس اچانک سوال پر سٹپٹا گئی۔

"ارے ہاں، میں تو بھول ہی گئی تھی مگر انہوں نے اتنی اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ ہمیں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔" المیرا نے اپنا نقاب پہن کر اسے درست کیا۔

"جی، آپ صحیح فرمارہی ہیں مگر آپ تو شروع سے ہی ذہین ہیں۔ میں ٹھہری تھوڑی کند ذہن..... تو میں سوچ رہی ہوں کہ آج ان کے بیان کے بعد کچھ دیر ان کے ساتھ بیٹھ کر اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوالوں کے جواب حاصل کرلوں۔" حلیمہ بولی۔

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ تم مجھ سے بھی پوچھ سکتی ہو۔" المیرا تیاری مکمل کرچکی تھی۔

"نہیں..... مجھے ایسا لگتا ہے کہ استادِ محترم ہی میرے ان سوالات کا جواب دے سکیں گے۔" حلیمہ جلدی سے بولی۔

"ٹھیک ہے، تو آج بیان کے بعد ہم انہیں روک لیں گے اور اب جلدی چلو، دیر ہورہی ہے۔" المیرا یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ حلیمہ کی تو گویا دل کی مراد بر آئی تھی۔ آج اسے عیاد کے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملنے والا تھا۔

اس دن بھی وہ حسبِ معمول اپنا بیان مکمل کرکے وہاں سے اٹھنے ہی لگا تھا کہ حلیمہ نے اسے پکار لیا تھا۔

pklibrary.com

''استادِ محترم! میرے ذہن میں کچھ سوالات ہیں جن کے جوابات میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔'' وہ جلدی سے بولی کہ کہیں وہ نکل کر چلا ہی نہ جائے۔

عیاد کے آگے بڑھتے قدم تھے۔ حلیمہ کی نظروں میں چھپا پیغام اس سے پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آخری صفوں میں بیٹھنے والی اس لڑکی کی دلچسپی اس مضمون میں کم اور اس کی شخصیت میں زیادہ ہے مگر بحیثیت استاد اس کا فرض تھا کہ وہ اس کے سوالوں کے جواب دے۔

''جی فرمایئے، کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ؟'' وہ رک گیا۔

طالب علم ایک ایک کر کے کمرے سے باہر نکل رہے تھے۔ حلیمہ سب کے جانے کا انتظار کرنے لگی۔

اب کمرے میں صرف حلیمہ، المیرا اور عیاد ہی موجود تھے۔ اچانک نیل کمرے میں داخل ہوا مگر ظاہر ہے کہ وہ دونوں اس کی موجودگی سے بے خبر تھیں۔

عیاد نے آنکھوں ہی آنکھوں میں نیل کو خاموش رہنے کی تنبیہ کی۔ وہ دونوں اس کے قریب چلی آئیں۔

''آپ نے کل علم الاعداد کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ہمیں بتایا تھا کہ ہم علم الاعداد کے ذریعے آنے والے وقت کے حوالے سے بھی پیش گوئیاں کر سکتے ہیں مگر مجھے اس عمل میں مسلسل ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ میں کہاں غلطی کر رہی ہوں؟'' حلیمہ بولی تو نیل کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اس کے دل میں ابھرنے والے سوال کو جان چکا تھا۔

''تشریف رکھیے۔ مجھے دکھائیں آپ کس زائچے پر کام کر رہی ہیں؟ میں آپ کی مشکل ابھی حل کر دیتا ہوں۔'' وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ حلیمہ اور المیرا بھی اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔ عیاد کے لباس سے اٹھتی خوشبو نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ ان دونوں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

وہ عام طور پر سنجیدہ رہتا تھا اور آخری صفوں میں بیٹھنے کی وجہ سے اس کی شخصیت کا یہ رعب اور بردباری ان پر اتنا اثر انداز نہیں ہوتی تھی جتنا آج ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے وجود سے روشنیاں پھوٹتی ہوں۔

''یہ رہا زائچہ..... مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں کہیں غلطی کر رہی ہوں۔'' حلیمہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑا کاغذ اس کے سامنے کر دیا۔

عیاد اس کاغذ پر نظر ڈالتے ہی چونک پڑا۔ حلیمہ اپنے نکاح اور اپنی زندگی میں آنے والے شخص کے حوالے سے زائچہ بنا رہی تھی مگر ظاہر تھا کہ اس میں کافی غلطیاں موجود تھیں۔ وہ دونوں عیاد کا جائزہ لینے میں مصروف ہو چکی تھیں۔ نیل شرارت سے مسکرایا۔

''مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ نے میری سمجھائی ہوئی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیا ورنہ آپ سے یہ غلطیاں نہ ہوتیں۔'' وہ اعداد کی غلطیوں کو درست کرنے لگا۔

المیرا اس کی مہارت سے چلتی انگلیوں کو دیکھنے لگی۔ اس کے ہاتھ بھی بہت روشن اور خوبصورت تھے۔ ماحول پر عجیب سا سحر طاری ہو رہا تھا۔

اس کاغذ پر نظر پڑتے ہی المیرا کو بھی سمجھ آ گیا تھا کہ حلیمہ اپنے مستقبل کے حوالے سے کیا معلوم کرنا چاہتی ہے مگر ظاہر ہے کہ وہ بھی اس مضمون میں اتنی طاق نہیں ہوئی تھی کہ ان سوالوں کے جواب حاصل کر سکے لیکن وہاں بیٹھے ہوئے اس کے ذہن میں بھی یہی خیال ابھرا کہ وہ عیاد سے یہ زائچہ بنوا سکتی ہے۔

اچانک عیاد کے تیزی سے کام کرتے ہاتھ رکے۔ اس خاتون کے زائچے میں نکاح کا عدد نہیں تھا بلکہ وہ تو کوئی اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔ عیاد کی پشت پر کھڑے نیل سے بھی وہ زائچہ چھپا نہ رہ سکا۔ عیاد نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ اب وہ اس خاتون کو کیا جواب دیتا۔

''کیا ہوا استادِ محترم؟'' حلیمہ اس کے چہرے کی بے چینی دیکھ کر سوال کر بیٹھی۔ المیرا بھی چونکی۔

''کچھ نہیں۔ اگر آپ نے دست شناسی کا مضمون پڑھا ہے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ کچھ لکیریں وقت اور عمر کے ساتھ ہمارے ہاتھوں پر نمودار ہوتی ہیں۔ یعنی یوں سمجھ لیں کہ صحیح وقت پر نمودار ہونا شروع ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی زائچوں میں بھی کچھ اعداد ایسے ہوتے ہیں جو وقت کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ فی الحال یہ عدد آپ کے زائچے میں موجود نہیں۔'' وہ اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا مگر حقیقت چھپانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ حلیمہ کو شاید اس کی بات سمجھ نہیں آئی تھی۔ اس نے خاموشی سے عیاد کے ہاتھ سے وہ پرچہ لے کر تھام لیا۔

''کیا آپ کو دست شناسی بھی آتی ہے؟'' اچانک ہی المیرا بولی اور وہ جو اپنی ساری توجہ حلیمہ پر مرکوز کیے بیٹھا تھا، اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ سیاہ نقاب کے پیچھے سے جھانکتی وہ شہد رنگ آنکھیں جن میں نفاست سے کاجل لگایا جاتا تھا۔ مضمون پڑھاتے ہوئے کئی دفعہ اس کی نظر ان آنکھوں پر ٹھہرتی تھی مگر وہ فوراً ہی خود کو سرزنش کر کے اپنی نظروں کا زاویہ بدل لیتا تھا۔

''جی، یہ بھی مخفی علوم کی ایک قسم ہے۔'' وہ نظریں

جھکاتے ہوئے بولا۔

''کیا آپ میرا ہاتھ دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ میری آنے والی زندگی کیسی ہے؟'' وہ دلچسپی سے بولی۔

عیاد نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ وہ تو اسے کافی سنجیدہ مزاج لگتی تھی مگر اس کا چہکتا ہوا لہجہ کوئی اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔

عام طور پر وہ اس طرح دست شناسی سے پرہیز کرتا تھا مگر نہ جانے کیوں اس وقت اس نے اپنی گردن اثبات میں ہلا دی۔ المیرا نے فوراً ہی اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کھول کر اس کے سامنے کر دی۔

عیاد نے ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور اس کی ہتھیلی پر اپنی نظریں جما دیں مگر اس کا وہ ایک لمحے کے لیے دیکھنا المیرا کے دل کی دنیا میں ہلچل مچا گیا تھا۔ وہ اس کی شخصیت سے بحیثیت استاد متاثر ضرور ہوئی تھی مگر یہ پسندیدگی صرف استاد اور طالب علم کے رشتے تک ہی محدود رہی تھی لیکن آج ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بہت ہی خاص ہو۔

عیاد کے ساتھ ہی نیل بھی المیرا کی ہتھیلی پر جھکا۔ اچانک عیاد نے سر اٹھا کر نیل کو دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی دھواں دھواں تھا۔

''معاف کیجیے گا..... مجھے نماز کے لیے دیر ہو رہی ہے۔ میں پھر کسی دن دیکھ لوں گا۔'' عیاد تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جو اس کی شخصیت کے سحر میں آہستہ آہستہ کھو رہی تھی، اچانک چونک پڑی۔

''جی، کوئی بات نہیں۔'' وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

وہ تیزی سے اس کمرے سے باہر نکل گیا مگر نیل وہیں کھڑا رہا۔

''انہیں کیا ہوا؟'' حلیمہ بولی۔

''پتا نہیں۔ شاید واقعی جلدی ہو۔ یا شاید وہ دست شناسی کرنا نہ چاہتے ہوں۔'' المیرا نے اپنی طرف سے اندازہ لگایا۔

''چلیں آج نہیں تو کل وہ آپ کا ہاتھ پڑھ ہی لیں گے۔ مجھے تو اس بات کی پریشانی لاحق ہو چکی ہے کہ میرے زائچے میں نکاح کا عدد ہی موجود نہیں ہے۔'' حلیمہ پریشانی سے بولی تو المیرا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''تمہیں اتنی جلدی ہے نکاح کی۔'' وہ اس کی باتوں پر ہنستے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

اچانک عیاد دوبارہ کمرے میں داخل ہوا اور وہاں پھیلے کاغذات سمیٹنے لگا جو وہ ان لڑکیوں کی موجودگی میں سمیٹ نہیں پایا تھا۔

''عیاد! تمہیں نہیں لگتا کہ تمہیں اس لڑکی کو خبردار کرنا چاہیے؟'' نیل سنجیدگی سے بولا۔

''مجھے نہیں لگتا کہ مجھے اپنی حد سے آگے نکلنا چاہیے۔'' وہ کاغذ سمیٹتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولا۔

''جب تم میری سوچ پڑھ سکتے ہو تو ان لڑکیوں کی سوچ بھی پڑھ سکتے ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ دونوں تم میں دلچسپی لینے لگی ہیں۔ تمہیں اس لڑکی کی مدد کرنا چاہیے۔'' نیل بے چینی سے بولا۔

''تمہاری سوچ میں اس لیے پڑھتا ہوں تاکہ تمہیں شرارت سے روک سکوں مگر انسانوں کی سوچ پڑھنے کے معاملے میں، میں نے خود پر ایک حد قائم کر رکھی ہے اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ حد بہت ضروری ہے۔ مجھے قطعی اندازہ نہیں کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہیں اور نہ ہی میں اس معاملے میں کوئی دلچسپی رکھتا ہوں۔'' وہ سنجیدہ تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم حدود کا خیال رکھتے ہو مگر کسی کی مدد کرنا تو بُری بات نہیں اور اب جب کہ اس نے خود اپنی لکیریں تم سے پڑھوالی ہیں تو تمہیں اس کی مدد ضرور کرنا چاہیے عیاد!'' نیل کو عیاد کے اس رویے پر حیرانی ہو رہی تھی۔

''یہ تم کس سے باتیں کر رہے ہو؟'' اچانک عیاد کو اپنی پشت سے یوسف کی آواز سنائی دی۔ وہ نہ جانے کس وقت کمرے میں داخل ہوا تھا اور عیاد کو خود سے باتیں کرتے دیکھ کر حیران کھڑا رہ گیا تھا۔

''کسی سے نہیں۔ خود کلامی کر رہا تھا۔'' عیاد کو افسوس ہوا۔ وہ نیل کے معاملے میں کافی احتیاط سے کام لیتا تھا مگر اس وقت وہ بھول چکا تھا کہ کتب میں یوسف بھی موجود ہے۔

''نہیں، میں نے ابھی دیکھا کہ تم کسی سے بات کر رہے تھے۔'' یوسف ماننے کو تیار نہیں تھا کہ وہ خود کلامی کر رہا ہے۔

''مجھ سے بات کر رہا تھا۔'' اچانک نیل مسکراتے ہوئے یوسف کے سامنے ظاہر ہوا۔

''تم..... تم کون ہو؟'' یوسف کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ عیاد نے ناراضگی سے نیل کی طرف دیکھا مگر اس سے پہلے کہ وہ بات سنبھالتا، یوسف کے گرنے کی آواز نے ان دونوں کو متوجہ کیا۔ وہ فرش پر ڈھیر ہو چکا تھا۔

خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے ایک رمز شناس کی سنسنی خیز داستان کے باقی واقعات آئندہ ماہ

بھیدی

جاوید بسام

کبھی کبھی ہمیں اپنے جھوٹ کا بھرم رکھنے کے لیے دوسروں کے سچ کو نہ صرف جھٹلانا پڑتا ہے بلکہ انہیں بُری طرح ذلیل بھی کرنا پڑتا ہے تب کہیں جاکر جھوٹا نام ونمود اور بے بنیاد ہمدردیاں ہمارے حصے میں آتی ہیں مگر... بہت جلد سمندر کے جھاگ کی طرح ہوا میں اڑ بھی جاتی ہیں... بالکل اسی طرح اس مکار حسینہ کے ساتھ بھی ہوا... جب خود اس عذاب کا شکار ہوئی جسے جھوٹ سمجھ کر اس نے رد کر دیا تھا تو جسم کی لرزشوں نے قوتِ گویائی بھی چھین لی... پھر کیسی ہمدردیاں اور کیسا بھرم... کچھ بھی تو پاس نہ رہا۔

نادیدہ طاقتوں کو جھٹلانے والی ایک صنفِ نازک کی فریب کاریاں

چوہے جال کو نہیں پہچانتے۔ اگر وہ جال میں پھنس جائیں تو بے چینی سے چیختے ہوئے اپنی نیلی ناک جھیریوں پر لگاتے، نکلنے کی کوشش میں بنا آرام کیے پلٹتے، جھولتے راستہ تلاش کرتے رہتے ہیں۔ وہ آدمی جو قانون کا سہارا لیتا ہے وہ جانتا ہے کہ وہ ایک جال میں پھنس رہا ہے۔ چوہا، چوہے دان میں جدوجہد کرتا ہے جبکہ آدمی ساکت رہتا ہے۔ وہ دنیا کے سامنے بظاہر ایک خوشگوار چہرہ پیش کرتا ہے لیکن باطنی طور پر وہ بھی پریشان ہوتا ہے۔

یہی کچھ اگست کی صبح وکیل زدمو کی انتظار گاہ میں بیٹھے مؤکلوں نے محسوس کیا۔ وہ سب سخت گرمی میں پسینے میں شرابور، کوفت میں مبتلا، بے صبری سے وکیل کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ نہ صرف اپنے پراگندہ خیالات سے پریشان تھے بلکہ بھنبھناتی اور کاٹتی مکھیوں سے بھی بیزار تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا رہا وہ مزید غضب ناک ہوتے گئے۔ وہ گاہے بگاہے ایک دوسرے کی طرف تیز نظروں سے دیکھ بھی رہے تھے۔

ہر ایک اپنے قضیے کے لیے وکیل کی بھرپور توجہ چاہتا تھا لیکن اسے خدشہ تھا کہ مؤخرالذکر صبح دم اتنے لوگوں کو دیکھ کر چڑ جائے گا اور بہت کم وقت ساعت کے لیے دے پائے گا۔ چالیس ڈگری درجۂ حرارت میں الجھے بیانات اور ان کی تحقیق سے شاید وہ جلد بیزار ہو جائے اور ان کے معاملے پر سرسری سی توجہ بھی نہ دے سکے۔

انتظار گاہ میں موجود کلرک تمام وقت اپنے کالر کے بٹن کھولے اور ٹھوڑی کے نیچے رومال رکھے بڑی عجلت میں یادداشتیں نقل کر رہا تھا۔ وہ بار بار اپنی نظریں پرانے گھڑیال کی طرف اٹھا کر وقت دیکھتا۔ دو تین لوگ کھنکھار رہے تھے اور کچھ بار بار اپنی کرسیوں پر پہلو بدل رہے تھے جس کے باعث کرسیاں کڑکڑا اٹھتی تھیں۔ باقی لوگ جو پہلے ہی گرمی اور طویل انتظار سے تھک چکے تھے، کاغذوں سے بھری اونچی خاک آلود الماری پر نظریں جمائے ہوئے تھے جہاں قدیم قانونی چارہ جوئیوں اور کارروائیوں کے پلندے اور بہت سے خوشحال خاندانوں کی تباہی اور بربادی کے مسودے دھرے تھے جبکہ کچھ لوگ گہری سانس لیتے ہوئے اپنی توجہ ہٹانے کی امید میں سبز چٹائیوں کو اوپر کر کے کھڑکیوں سے باہر گلی میں جھانک رہے تھے جہاں سے شور سنائی دے رہا تھا۔ اگست کی اس بے خطا شاگرمی میں مکھیاں عدالتی جھگڑوں کے عذاب میں مبتلا پسینے میں شرابور لوگوں کے ماتھوں اور ہاتھ پاؤں پر کاٹ رہی تھیں۔

اس صبح انتظار گاہ میں مکھیوں سے زیادہ پریشان کن اور بھی کوئی تھا۔ وکیل کا ایک بچہ، تقریباً دس سال کا ایک کم رو لڑکا جو دفتر سے منسلک گھر سے اپنی قمیص میں گندے چہرے کے ساتھ بغیر جرابوں کے چوری چھپے بھاگ کر والد کے گاہکوں کو خوش کرنے کے لیے وہاں آ گیا تھا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟''

''ونسنٹ؟ اوہ کتنا گندا نام ہے۔''

''اور یہ لاکٹ کیا سونے کا ہے؟''

''کیا یہ کھلتا ہے؟''

''یہ کیسے کھلتا ہے اور اندر کیا ہے؟''

''اوہ، دیکھو..... بال..... یہ کس کا ہے؟''

''تم اس میں کیوں رکھتے ہو؟''

لوگ وقت گزاری کے لیے اس سے سوال جواب کر رہے تھے۔

پھر جوں ہی اس نے دفتر کے دروازے کے پیچھے پاپا کے قدموں کی آہٹ سنی تو وہ کلرک کی ٹانگوں کے درمیان میز کے نیچے چھپ گیا۔ وکیل کمرے میں داخل ہوا۔ انتظار گاہ میں موجود ہر شخص بے صبری سے کھڑا ہو کر وکیل کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھنے لگا مگر اس نے دفتر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''تھوڑا صبر حضرات! ایک وقت میں ایک۔''

وہ خوش نصیب جس کی باری تھی، اس کے پیچھے بھاگا اور دفتر میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ باقی لوگوں کے لیے صبر آزما انتظار پھر شروع ہوا۔

☆☆☆

اس صبح وہاں صرف تین افراد ایسے تھے جنہوں نے اندر جانے کے لیے کسی بے صبری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ وہ بظاہر شوہر، بیوی اور بیٹی دکھائی دیتے تھے۔

آدمی ساٹھ کے پیٹے میں چل چلاؤ کی حالت میں تھا۔ وہ اپنے سر سے چپٹے کناروں والی پرانی ٹوپی کو شاید اپنے گنج کو چھپانے یا بھاری، قدیم فراک کوٹ کے وقار میں کمی آنے کے باعث ہٹانا نہیں چاہتا تھا۔ اس سوٹ سے کافوری گولیوں کی تیز بو آ رہی تھی۔ غالباً اس نے یہ لباس اس لیے پہنا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ کسی وکیل سے ملنے کے لیے عمدہ لباس ضروری ہے لیکن اسے پسینا نہیں آ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی رگوں میں خون نہیں ہے۔ اس کی جلد زردی مائل تھی اور اس کے گال اور ٹھوڑی خاکستری لگ رہی تھی، جس کے نیچے چھدرے بھورے بال تھے جو ڈاڑھی کی طرح بڑھ رہے تھے۔ بڑے جوتے جیسی ناک کے قریب صاف شفاف آنکھیں تھیں۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا، جیسے ناقابلِ برداشت وزن سے کچلا جا رہا ہو اور اس کے دبلے پتلے ہاتھ چھڑی پر ٹکے تھے۔ ساتھ ہی اس کی بیوی جو ظاہری صورت میں احمق دکھتی تھی، بہت تکبرانہ انداز اپنائے ہوئے براجمان تھی۔ وہ بہت خوبصورت اور گداز بدن عورت تھی جس کے لبوں پر ہلکا سا رواں اور کچھ اوپر کشادہ کالی آنکھیں تھیں جو بار بار چھت کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔

دوسری طرف بیٹی تھی۔ اپنے باپ کی طرح اسی

pklibrary.com

شرمناک بدحواسی میں مبتلا۔ بہت پتلی دبلی اور زرد۔ اس کی آنکھیں بھی چھوٹی تھیں۔ وہ کسی کبڑے کی طرح بیٹھی تھی۔ باپ اور بیٹی دونوں ابھی تک زمین پر اس لیے نہیں گرے تھے کیونکہ درمیان میں ایک مضبوط عورت براجمان تھی جس نے کسی نہ کسی طرح ان کو سہارا دے رکھا تھا۔

ان تینوں کو دوسرے موکلوں نے شدید تجسس کے ساتھ دیکھا جس میں ایک قسم کا حسد بھی شامل تھا۔ حالانکہ وہ غریب لوگ انہیں پہلے ہی تین بار اندر جانے کا اشارہ دے چکے تھے مگر وہ آگے نہیں بڑھے تھے جس سے یہ واضح ہوتا تھا کہ انہوں نے وکیل سے طویل بات چیت کرنا ہے۔ لوگ سوچ رہے تھے کہ ان پر کیا مصیبت آئی ہے؟ کون ان پر ظلم کر رہا ہے؟ قتل کی دھمکی، انتقام کی پکار یا غربت کا خطرہ؟

غربت یقینی طور پر نہیں تھی۔ عورت سونے سے لدی ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں بڑی بڑی بالیاں لٹکی تھیں۔ ایک دہرا ہار اس کے گلے میں پڑا ہوا تھا، ساتھ ہی آنسو کے قطرے کی شکل کا ایک بڑا بروچ اس کے سینے پر دھونکنی کی طرح اوپر نیچے حرکت کر رہا تھا اور ایک لمبی زنجیر نے اس کی انگوٹھیوں کو باہم جکڑ رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ ہاتھ استعمال کے قابل نہیں رہا تھا۔

اب کسی نے ان سے پہلے جانے کی اجازت نہیں مانگی۔ یہ بات پہلے ہی سمجھ لی گئی تھی کہ وہ سب کے بعد داخل ہوں گے۔ وہ بہت صبر کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔ اپنی سوچوں میں مگن یا کسی انجانی فکر میں مبتلا۔ بس کبھی کبھی عورت اپنے آپ کو تھوڑا سا پنکھا جھلنے لگتی پھر اکتا کر ہاتھ روک لیتی اور آدمی اپنی بیٹی کی طرف جھک کر سرگوشی کرتا۔

''ٹینا! انگوٹھی کو یاد رکھنا۔''

کئی موکلوں نے وکیل کے شرارتی لڑکے کو تینوں کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی لیکن وہ لڑکا اس قبر میں پاؤں لٹکائے آدمی سے ڈر کر ناک سکیڑے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ پینڈولم گھڑی میں بارہ بج چکے تھے جب باقی تمام لوگ کم وبیش مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔ آخر کلرک نے انہیں مجسموں کی طرح ساکت بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔

''آپ اندر کیوں نہیں جا رہے؟''

''آہ، کیا ہم اندر جا سکتے ہیں؟'' آدمی نے دونوں عورتوں کے درمیان کھڑے ہو کر پوچھا۔

''یقیناً آپ جا سکتے ہیں۔'' کلرک نے بھویں اچکا کر کہا۔ ''آپ پہلے بھی جا سکتے تھے۔ جلدی کریں، وکیل صاحب کو لنچ کے لیے جانا ہے لیکن معاف کیجیے گا..... آپ کا نام؟''

بالآخر اس شخص نے اپنی ٹوپی اتاری اور اچانک اپنا گنجا سر ظاہر کرتے ہوئے اس خوفناک فراک کوٹ کی وجہ سے ہونے والی اذیت کو بھی محسوس کیا۔ اس کی دودھیا گلابی کھوپڑی سے پسینے کی لاتعداد نہریں بہہ رہی تھیں اور بے خون چہرے نے ایک خوفناک شکل اختیار کر لی تھی۔ اس نے جھک کر اپنا نام بتایا۔

''پکیر یلی سرافینو!''

☆☆☆

وکیل زدمو اپنے چیمبر میں سوچ رہا تھا کہ اس نے آج کا کام ختم کر لیا ہے۔ وہ رخصت ہونے کے لیے میز پر سے کاغذات سمیٹنے لگا تھا کہ اپنے سامنے ان تین نئے موکلوں کو دیکھا۔

''جی فرمایئے؟'' اس نے بے رخی سے پوچھا۔

''پکیر یلی سرافینو!''

چل چلاؤ والے آدمی نے دہرایا اور انتہائی احترام سے اس کے آگے جھک گیا پھر ہٹتے ہوئے اپنی بیوی اور بیٹی کو اشارہ کیا۔ وہ سرعت سے آگے آئیں اور انہوں نے بھی یہ عمل تربیت یافتہ بندروں کی طرح اپنے جسموں کو لچکاتے ہوئے انجام دیا۔

''بیٹھیں، بیٹھیں۔ دیر ہو چکی ہے، مجھے جانا ہے۔'' وکیل زدمو نے کہا۔ اس تمسخرانہ تماشے پر اس کی آنکھیں

pklibrary.com

حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

تینوں گھبرا کر فوراً میز کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پکیریلی کے زرد چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ کی اینٹھن خوفناک تھی۔ یہ دل مسوس کر دینے والا منظر تھا۔ کون جانتا تھا کہ اس بیچارے کو ہنسے کتنے دن ہو گئے ہیں۔

''جناب وکیل صاحب! ہم آئے ہیں۔'' بیٹی نے فوراً مبہم انداز سے بات شروع کی جبکہ ماں چھت پر آنکھیں گھماتے ہوئے بڑبڑائی۔

''دوسری دنیا کے لوگ۔''

''ٹھیک ہے، واضح اور مختصر بات کریں۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' زومو نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

''جناب وکیل صاحب! ہمیں ایک سمن موصول ہوا ہے۔'' پکیریلی نے تھوک نگلتے ہوئے بات شروع کی۔

''قتل!''

''ارے نہیں جناب!'' بیوی پھر پھٹ پڑی۔

''مام!'' بیٹی نے ڈرتے ڈرتے اسے خاموش رہنے یا سکون سے بات کرنے کی ترغیب دی۔

پکیریلی نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور کنبے کے سربراہ کو حاصل ہونے والے اختیار کے ساتھ کہا۔ ''مار ارو! براہِ کرم، میں بول رہا ہوں۔ جناب وکیل صاحب! ایک سمن، ہمیں وہ گھر چھوڑنا پڑا ہے جس میں ہم رہتے تھے کیونکہ.....''

''میں سمجھ گیا۔ آپ کو بے دخل کر دیا گیا ہے۔'' زومو نے بات کو مختصر کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں جناب!'' پکیریلی نے عاجزی سے جواب دیا۔ ''ہم نے کرایہ ہمیشہ وقت پر اور پیشگی ادا کیا ہے۔ دراصل ہم نے اچانک گھر چھوڑ دیا ہے۔ اب مکان مالکن ہمیں معاہدے کی پابندی کے لیے بلا رہی ہے۔ اس کے علاوہ ہرجانے اور نقصان کا ذمے دار ٹھہراتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہم نے اس کے گھر کو بدنام کر دیا ہے۔''

''کیسے..... کیسے؟'' زومو نے اس بار اس کی بیوی کی طرف دیکھ کر بھویں اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ گھر چھوڑ گئے..... آپ نے اس گھر اور مالکن کو بدنام کیا..... میں نہیں سمجھا۔ واضح کریں حضرات! وکیل ایک اعتراف کرنے والے کی طرح ہوتا ہے۔ کیا کوئی غیر قانونی تجارت؟''

''نہیں جناب!'' پکیریلی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر فوراً جواب دیا۔ ''بالکل نہیں۔ ہم تاجر نہیں ہیں۔ صرف میری بیوی ہی کچھ چیزیں دیتی ہے..... قرض پر لیکن سود کے ساتھ۔''

''ایمانداری سے، میں سمجھتا ہوں۔''

''میرا یقین کریں جناب! اس کی ہولی چرچ نے اجازت دی ہے لیکن اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ گھر کی مالکن گریٹیلا کہتی ہیں کہ ہم نے اس کے گھر کو بدنام کر دیا ہے کیونکہ تین ماہ میں اس لعنتی گھر میں ہم نے کئی عجیب وغریب چیزیں دیکھی ہیں۔ وکیل صاحب! میں اس کے بارے میں سوچ کر ہی کانپ جاتا ہوں۔''

''اے خدا! ہمیں اس سے بچا اور زمین کی تمام گندی مخلوقات سے نجات دے۔'' اس کی بیوی آہ بھر کر چلائی پھر وہ کھڑی ہوئی، بازو اٹھائے اور انگوٹھیوں سے بھرے ہاتھ سے صلیب کا نشان بنایا۔

بیٹی نے سر نیچے اور ہونٹ کاٹتے ہوئے مزید کہا۔

''آہ ظلم..... بیٹھو..... مام!''

''جناب! ہمیں تنگ کیا گیا ہے۔'' عورت چلائی۔

''بیٹھ جاؤ مار ارو! تنگ کرنا چھوٹا لفظ ہے۔ درحقیقت ہمیں اس گھر میں تین ماہ تک تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔'' باپ نے پُرزور لہجے میں کہا۔

''آخر کس طرح؟'' زومو چلایا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

پکیریلی آہستہ سے میز کی طرف جھکا۔ ایک ہاتھ اپنے منہ کے پاس رکھا جبکہ دوسرے سے دونوں خواتین کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''جناب وکیل صاحب! بھ..... بھ..... بھوت۔''

''کس نے؟'' زومو نے یہ سوچتے ہوئے کہ اس نے غلط سنا ہے، کہا۔

''بھوتوں نے..... ہاں جناب!'' بیوی نے زور سے ہاتھ لہراتے ہوئے تصدیق کی۔

زومو غصے سے اچھل پڑا۔ ''جائیں، مجھ سے مذاق مت کریں۔ مجھے لنچ کے لیے دیر ہو رہی ہے۔ اونہہ بھوت۔'' پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

یہ دیکھ کر کہ وہ ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے، تینوں نے اسے گھیر لیا اور مل کر التجا کرنے لگے۔ ''جناب، ارے جناب! کیا آپ کو یقین نہیں آتا؟ ہماری بات سنیں..... بھوت، جہنم کی روحیں۔ ہم نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور سنا ہے۔ انہوں نے ہمیں تین ماہ تک تنگ کیا ہے۔''

زومو غصے سے کپکپاتے ہوئے بولا۔ ''چلے جائیں، میں کہہ رہا ہوں، یہ پاگل پن ہے۔ آپ میرے پاس کیوں آئے ہیں؟ پاگل خانے جائیں، پاگل خانے۔''

''کیا کہہ رہے ہیں جناب؟'' بیوی نے مداخلت

pklibrary.com

کرتے ہوئے سب کو ایک طرف دھکیل دیا۔ ''کیا آپ اپنے موکلوں کی مدد اس طرح کرتے ہیں؟ اے خداوند! کیا زمانہ آگیا ہے۔ وکیل صاحب! وہ موجود ہیں۔ مجھ پر یقین کریں، روحیں موجود ہیں۔ ہمیں پختہ یقین ہے۔''

''کیا آپ نے انہیں دیکھا ہے؟'' زومو نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس سے پوچھا۔

''جی ہاں جناب! اپنی آنکھوں سے۔'' پکیریلی نے فوراً تصدیق کی۔

''میں نے بھی.....!'' بیٹی نے اسی طرح جواب دیا۔

''لیکن شاید آپ نے نہیں؟'' وکیل بولا۔ اس کی شہادت کی انگلی عورت کی بھینگی آنکھوں کی طرف اشارہ کررہی تھی۔

عورت نے چیخ ماری اور اچھل کر کھڑی ہوگئی پھر اس نے غصے سے سینے پر ہاتھ مارا اور اپنی کشادہ آنکھیں پوری کھول کر چلائی۔ ''جناب وکیل صاحب! میری آنکھیں خدا کے فضل سے بالکل ٹھیک ہیں۔ میں نے انہیں اسی طرح دیکھا جیسے اب آپ کو دیکھ رہی ہوں۔''

''اوہ اچھا!'' زومو نے وکیلوں کے انداز میں کہا۔

''جناب! آپ اس پر یقین نہیں کررہے لیکن ہمارے پاس بہت سے گواہ ہیں۔ ہمارے تمام پڑوسی گواہی دینے آسکتے ہیں۔''

''پڑوسیوں نے بھی انہیں دیکھا ہے؟'' زومو چلایا۔

''جی جناب! دیکھا اور سنا بھی۔''

''مثال کے طور پر کیا دیکھا ہے؟'' زومو نے غصے سے پوچھا۔

''مثال کے طور پر کرسیاں..... بغیر کسی کے چھوئے حرکت کرتی ہیں۔''

''کرسیاں؟'' زومو چلایا۔

''جی جناب! ابھی کرسی ساکت رکھی ہے، ابھی کمرے میں چاروں طرف قلابازیاں کھارہی ہے جیسے شریر لڑکے گلی میں کرتے ہیں اور مثال کے طور پر..... بس میں کیا بتاؤں؟ ایک پن کشن مخمل کا نارنگی کی شکل میں جو میری بیٹی ٹینا نے بنایا تھا، الماری کی دراز سے میرے غریب شوہر کے چہرے پر اڑتا ہوا آیا۔ اس طرح جیسے..... جیسے کسی غیر مرئی ہاتھ نے پھینکا ہو۔ شیشے کی الماری ہر طرف سے یوں ہل رہی ہے جیسے اس پر کپکپی طاری ہو اور اندر سے..... الماری کے اندر، وکیل صاحب..... میرا دل اس کے بارے میں سوچ کر ہی ڈوبنے لگتا ہے..... ہنسی کی آواز!''

''ہاں، ہنسی!'' بیٹی نے مزید کہا۔

''ہاں، ہنسی!'' باپ نے دہرایا۔

اور بیوی نے وقت ضائع کیے بغیر بات جاری رکھی۔

''یہ سب چیزیں وکیل صاحب ہمارے پڑوسیوں نے بھی دیکھی اور سنی ہیں۔ وہ گواہی دینے کے لیے بھی تیار ہیں۔''

''ٹینا انگوٹھی.....!'' اس موقع پر والد نے لقمہ دیا۔

''آہ۔'' بیٹی نے آہ بھرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''میرے پاس چاندی کی ایک انگوٹھی تھی، میری دادی کی نشانی۔ میں اسے ہمیشہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ ایک دن وہ غائب ہوگئی۔ میں نے اسے پورے گھر میں ڈھونڈا مگر وہ نہیں ملی۔ میں تین دن تک پاگلوں کی طرح اسے تلاش کرتی رہی۔ ایک رات جب میں بستر پر مچھر دانی کے نیچے لیٹی تھی.....''

''وکیل صاحب! اس گھر میں مچھر بھی ہیں۔'' ماں نے توجہ دلائی۔

''جی ہاں، مچھر بھی۔'' باپ نے آنکھیں سکیڑ کر سر ہلایا۔

''میں نے آہٹ سنی۔ ایسا لگا جیسے مچھر دانی کے اوپر کوئی کود رہا ہے۔'' بیٹی نے بات جاری رکھی۔

اس موقعے پر باپ نے ہاتھ ہلا کر ڈرامائی انداز میں اسے خاموش کرادیا اور بولا۔ ''کیا آپ جانتے ہیں وکیل صاحب! جس طرح آپ ربڑ کی گیند کو دور پھینکتے ہیں اور وہ کسی چیز سے ٹکرا کر آپ کے ہاتھ میں واپس آجاتی ہے۔''

پھر بیٹی نے بات جاری رکھی۔ ''جیسے کوئی چیز زور سے پھینکی گئی۔ میری انگوٹھی مچھر دانی کے اوپر چھت سے ٹکرائی اور فرش پر گر کر ٹوٹ گئی۔''

''ظلم..... یہ ظلم ہے۔'' ماں اور باپ نے باری باری دہرایا۔

''میں بستر سے کانپتی ہوئی اٹھی اور اسے اٹھانے کے لیے نیچے جھکی تو ہمیشہ کی طرح چھت سے..... کھی..... کھی..... ہنسی.....!''

وکیل زومو سر جھکا کر سوچتا رہا پھر اٹھا اور ہاتھ اپنی پیٹھ کے پیچھے رکھے تینوں موکلوں کی آنکھوں میں دیکھا۔ آخر انگلی سے سر کھجا کر بولا۔ ''مذاق کرنے والے بھوت! بولتے رہیں..... مجھے مزہ آرہا ہے۔''

''جناب عالی! مذاق کرنے والے نہیں، جہنم کے بھوت۔ جن کا کام بستر الٹ پلٹ کردینا، رات کو ہمارے پیٹ پر بیٹھنا، ہمیں پیچھے سے مارنا، ہمیں بازوؤں سے پکڑنا اور پھر سارے فرنیچر کو ہلاتے ہوئے گھنٹیاں بجانا۔ گویا خدا نہ کرے زلزلہ آگیا ہو۔ ہمارے کھانے میں زہر ملانا، برتنوں

میں راکھ پھینکنا..... کیا آپ انہیں مذاق کہتے ہیں؟ پادری اور نہ ہی مقدس پانی انہیں روک سکا تو ہم نے گرینیلا سے اس بارے میں بات کی۔ اس سے درخواست کی کہ وہ معاہدے کو ختم کردے کیونکہ ہم وہاں خوف اور دہشت سے مرنا نہیں چاہتے تھے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ اس قاتلہ نے ہمیں کیا جواب دیا؟ کہانیاں..... اس نے ہمیں جواب دیا۔ بھوت؟ وہ کہتی ہے اچھے اسٹیکس کھائیں اور اپنے اعصاب کا خیال رکھیں۔ ہم نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے کی دعوت دی مگر نہیں..... اس نے ہمیں دھمکی دی..... محتاط رہو، اس کے بارے میں کوئی ہنگامہ نہ کرو ورنہ میں تمہیں بجلی کا کرنٹ لگادوں گی۔'' عورت نے کہا۔

''اور اس نے ہمیں کرنٹ لگادیا۔'' شوہر نے تلخی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب وکیل صاحب! ہم نے اپنا معاملہ آپ کے حوالے کردیا ہے۔ ہم آپ پر بھروسا کرسکتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ اپنا فرض ذمے داری سے ادا کرتے ہیں۔''

وکیل زومو نے ہمیشہ کی طرح یہ آخری الفاظ نہ سننے کا بہانہ کیا۔ اس نے کچھ دیر ایک مونچھ مروڑی پھر دوسری، پھر اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ تقریباً ایک بج گیا تھا۔ گھر والے کھانے کے لیے ایک گھنٹے سے اس کا انتظار کررہے تھے۔

''حضرات! آپ اچھی طرح سمجھ لیجیے، میں آپ کے بھوتوں پر یقین نہیں کرسکتا۔ یہ فریب نظری اور بیکار قصے کہانیوں سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں آپ کے کیس کو قانونی پہلو سے دیکھتا ہوں۔ آپ کہتے ہیں کہ آپ نے بھوتوں کو دیکھا ہے..... آپ کہتے ہیں کہ آپ کے پاس گواہ ہیں..... ٹھیک ہے، آپ کہتے ہیں کہ اس ماحول میں اس گھر میں رہنا ناقابلِ برداشت ہوگیا ہے۔ عجیب بات ہے، یہ کیس نیا اور بہت خاص ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ مجھے چیلنج دے رہا ہے لیکن ہمیں قانونی ضابطوں سے مدد تلاش کرنا پڑے گی۔ کیا آپ سمجھ رہے ہیں؟ کیس کی قانونی بنیاد۔ اسے لینے سے پہلے مجھے اچھی طرح دیکھنے دیں، مطالعہ کرنے دیں۔ اب دیر ہوچکی ہے۔ آپ کل آئیں، میں آپ کو جواب دے سکوں گا۔ ٹھیک ہے؟''

☆☆☆

فوراً ہی اس عجیب وغریب مقدمے کا خیال وکیل زومو کے دماغ میں چکی کے پہیے کی طرح گھومنے لگا۔ وہ کھانے کی میز پر اپنے خیالات میں اتنا ڈوبا ہوا تھا کہ خالی پیٹ اٹھا۔ کھانے کے بعد وہ گرمیوں میں عموماً کچھ دیر قیلولہ کرتا تھا لیکن اس دن وہ جاگتا رہا۔

''بھوت!'' وہ وقتاً فوقتاً دہراتا اور اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل جاتی جبکہ آنکھوں کے سامنے ان تین نئے موکلوں کی مضحکہ خیز صورتیں نمودار ہوجاتیں جو بار بار قسمیں کھاتے تھے کہ انہوں نے بھوتوں کو دیکھا ہے۔

کئی بار اس نے بھی بھوتوں کے بارے میں سنا تھا۔ کچھ نوکروں کی کہانیوں کے مطابق وہ بھی لڑکپن میں ان سے بہت ڈرتا تھا۔ اسے وہ اذیت اب بھی یاد تھی جب ایک دفعہ دوراتوں کی بے خوابی کے دوران خوف نے اس کے ننھے سینے کو جکڑ لیا تھا۔

''بھوت..... روحیں۔'' اس نے ایک آہ بھری۔ اپنے بازو مچھر دانی کے اوپری حصے کی طرف پھیلائے اور پھر انہیں بستر پر گرادیا۔ لافانی روح..... ہاں، روحوں کو تسلیم کرنے کے لیے روح کی لافانیت کا اندازہ لگانا ضروری ہے۔ کہنے کو بہت کم ہے، روح کی لافانیت..... کیا میں اس پر یقین رکھتا ہوں یا میں اسے نہیں مانتا؟ مجھے اب کم از کم اپنے پچھلے تمام دعووں کے خلاف شک کو تسلیم کرنا چاہیے۔ آیئے تھوڑا دیکھتے ہیں۔ ہم اکثر دوسروں کی طرح اپنے ساتھ دکھاوا کرتے ہیں۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں بہت گھبرا جاتا ہوں اور کبھی کبھی خود کو اکیلا پاکر ڈر جاتا ہوں۔ کس چیز کا ڈر؟ میں نہیں جانتا۔ ہمم..... ٹھیک ہے، ہم اپنے باطن کی چھان بین سے ڈرتے ہیں۔ میں نے ان چیزوں کے بارے میں کبھی سنجیدگی سے نہیں سوچا۔ زندگی ہمیں پریشان کرتی ہے۔ ایک دوست مرجاتا ہے، ہم اس کے جنازے میں ہچکچاتے ہوئے شریک ہوتے ہیں اور فوراً ہی اپنے خیالات کو اس کی سابقہ زندگی کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ کچھ ماضی کے واقعات یاد کرتے ہیں، اپنے دماغ کو اس نکتے سے آگے جانے سے روکنے کے لیے، جس کا اختتام موت ہے۔ سب تعزیت کرتے ہیں۔ آخر شب خیر کہتے سب اپنے اپنے گھروں کا رخ کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے، میں ایک وکیل ہوں لیکن یہاں لافانی روحیں، نرم روحیں بھی موجود ہیں۔ وہ کیا کرتی ہیں؟ انہوں نے میرے دفتر کے دروازے پر دستک دی۔ ''ارے مسٹر وکیل! ہم بھی یہاں ہیں۔ آپ کو معلوم ہے؟ ہم آپ کے سول کوڈ میں دخل درمعقولات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ معقول لوگ ہیں۔ کیا آپ ہمارا خیال نہیں کریں گے؟ کیا آپ کو موت کی فکر نہیں ہے؟ ہم موت کی بادشاہی سے، خوش دلی سے جینے والوں کے دروازے پر دستک دیتے ہیں۔ الماریوں میں ہنسی،

pklibrary.com

آنکھوں کے سامنے کرسیاں لڑھکنا، گویا وہ بہت سے بدمعاش ہیں جو غریبوں کو ڈرانا اور شرمندہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ ایک اچھے وکیل ہیں جو اپنے پیشے میں ایک ماہر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ چند دن بعد عدالت ہمیں سزا سنانے کے لیے بلائی گئی ہے۔''

وکیل زومو نے بڑے جوش کے عالم میں بستر چھوڑا اور قانونی ضابطوں کی کھوج کرنے دفتر میں واپس آ گیا۔

اس نے دیکھا کہ صرف دو شقیں اس تنازع کی بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ آرٹیکل 1575 اور 1577۔

پہلی شق کے مطابق:

کرائے دار کو معاہدے کی نوعیت کے مطابق اور خصوصی شرط کے بغیر ضروری ہے کہ:

1۔ جائداد کرائے دار کے حوالے کی جائے۔

2۔ اسے ایسی حالت میں رکھنا جو اسے اس استعمال کے لیے موزوں بنا دے جس کے لیے یہ کرائے پر لی گئی ہے۔

3۔ کرائے دار کو معاہدے کی پوری مدت کے دوران جائداد کے پُرامن اور پُرلطف استعمال کی ضمانت دینا۔

دوسری شق کے مطابق:

1۔ کرائے دار کو کرائے پر دی گئی جائداد کے ان تمام نقائص کی ضمانت ہونی چاہیے جو اس کے استعمال کو روکتی ہیں۔ چاہے وہ معاہدے کے وقت اسے معلوم نہ ہوں۔ اگر کرائے دار کو ان نقائص سے کوئی نقصان ہوتا ہے تو مالکِ جائداد پر لازم ہے کہ وہ اس کی تلافی کرے۔ الّا یہ کہ وہ ثابت کر دے کہ وہ ان سے بے خبر تھا۔

سوائے ان دو نکات پر اعتراض کے روحوں کے حقیقی وجود کو ثابت کرنے کے لیے کوئی درمیانی بنیاد نہیں تھی۔ حقائق تھے اور ثبوت بھی تھے لیکن وہ کتنے قابلِ اعتماد تھے اور سائنس ان حقائق کی کیا وضاحت دے سکتی تھی؟

زومو نے ایک بار پھر پکیر یلی سے تفصیل سے سوالات کیے۔ اس نے شہادتیں جمع کیں جو اس کی طرف اشارہ کرتی تھیں اور اس معاملے کو قبول کرنے کے بعد جوش سے اس کا مطالعہ شروع کیا۔

اس نے سب سے پہلے روحانیت کی مختصر تاریخ پڑھی۔ افسانوں کی ابتدا سے لے کر آج تک اور جیکولیو کی کتاب فقیریت کے عجائبات۔ پھر وہ سب کچھ جو سب سے زیادہ نامور اور قابلِ اعتماد تجزیہ کاروں نے شائع کیا۔ کروکس سے لے کر ویگنر اور اکساکوف تک..... اور وہ یہ جان کر بہت حیران ہوا کہ نام نہاد روحانی مظاہر اب تک سب سے زیادہ شکی اور سب سے زیادہ مثبت سائنس دانوں کے واضح اعلانات کے مطابق ناقابلِ تردید تھے۔ زومو نے چیخ کر کہا۔ ''یہاں تو پہلے ہی سب روشن اور متحرک ہے۔ یہاں چیزیں اپنی ہیئت بدلتی ہیں۔''

جب ان واقعات کی اطلاع پکیر یلی اور اس کے پڑوسیوں نے دی تو اس نے ان کا مذاق اڑایا تھا کیونکہ وہ ایک سنجیدہ، ماڈرن اور مہذب آدمی تھا۔ جدید تعلیم اور سائنسی بنیادوں میں پروان چڑھا ہوا انسان تھا۔ اس نے انہیں یکسر مسترد کر دیا تھا۔ کیا وہ انہیں قبول کر سکتا تھا؟ یہاں تک کہ اگر وہ انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتا تب بھی وہ یہی سمجھتا کہ وہ فریبِ نظر کا شکار ہے لیکن اب وہ جانتا تھا کہ انہیں لومبروسو جیسے سائنس دانوں کی حمایت حاصل ہے جیسے رچیٹ۔ اوہ خدا! چیزوں کی ظاہری شکل اور حالات بدل گئے ہیں۔ زومو نے اس بارے میں مزید نہیں سوچا اور بڑھتے ہوئے یقین اور جوش کے ساتھ آہستہ آہستہ اپنی نئی تحقیق میں ڈوب گیا۔

ایک طویل عرصے سے اسے قانون کی پریکٹس میں کوئی خاص جگہ نہیں ملی تھی جس سے اسے کچھ اطمینان اور اچھی آمدنی ہوئی ہو۔ نہ اسے اس صوبائی قصبے کی مختصر زندگی میں کوئی فکری چراگاہ ملی تھی، نہ ہی اتنے بے ہنگم لوگوں میں کوئی راستہ۔ وہ توانائیاں جو اس نے اپنے اندر محسوس کیں اور جن کی شدت کو اس نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا، انہیں اس قصبے کی پستی کے درمیان وہ تقریباً ضائع کر چکا تھا۔ وہ کافی دیر تک اپنے آپ سے، ہر چیز سے اور ہر ایک سے بے حال اور نامطمئن تھا اور اب وہ کتابیں پڑھ رہا تھا..... میرے خدا! موت کا مسئلہ، ہیملیٹ کا ہونا یا نہ ہونا؟ خوفناک سوال، اس طرح حل ہو گیا تھا؟ کیا میت کی روح ایک لمحے کے لیے ''مادیت'' کی طرف لوٹ سکتی ہے اور ہاتھ ملانے کے لیے آ سکتی ہے؟ ہاں، اس سے ہاتھ ملائیں زومو، بے اعتماد، کل تک اندھا، اسے کہو۔ ''زومو! فکر نہ کرو، اپنی اس دکھی دنیاوی زندگی کے بارے میں پریشان نہ ہو اور بھی بہت کچھ ہے، تم جانتے ہو؟ ایک دن تم بالکل مختلف زندگی گزارو گے۔ ہمت کرو، آگے بڑھو۔''

لیکن پکیر یلی تقریباً روزانہ کبھی اپنی بیٹی اور کبھی اپنی بیوی کے ساتھ اس کے پاس آ رہا تھا۔ وہ اس سے کام کو تیز کرنے کی درخواست کرتا۔

''مطالعہ..... مطالعہ!'' زومو غصے سے انہیں جواب دیتا۔ ''خدا کی قسم مجھے تنگ نہ کریں۔ میں نے یقین دہانی کرائی

pklibrary.com

تھی۔ میں آپ کے معاملے پر ہی سوچ بچار کر رہا ہوں۔"

تاہم اب وہ کسی کے بارے میں نہیں سوچتا تھا۔ اس نے تمام مقدمے ملتوی اور مؤکلوں سے ملاقاتیں ترک کردی تھیں۔ تاہم غریب پکیریلی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جس نے نادانستہ طور پر اس کی روح کے لیے روشنی کا راستہ کھول دیا تھا۔ اس نے آخر کار مقدمے کا بغور جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔

اس تحقیق کے دوران ایک سنگین سوال پیدا ہوا جس سے وہ تھوڑا سا پریشان ہوگیا۔ پکیریلی کے مطابق تمام تجربات میں مظاہر کا ظہور تینوں افراد کے ساتھ وقتاً فوقتاً ہوتا رہا۔ تینوں کئی بار اس کا شکار ہوئے۔ وکیل نے سوچا کہ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس معاملے میں قصور گرینیلا ہاؤس کا نہ ہو بلکہ کرائے داروں کا ہو؟ ان کے ساتھ یہ مسئلہ پہلے بھی اور دوسرے گھروں میں رہا ہو اور اب موجودہ گھر میں بھی ہو رہا ہو مگر پکیریلی نے اسے یقین دلایا کہ وہ ہمیشہ پُرسکون رہے ہیں۔ وکیل نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا۔ اس نے سوچا کہ سچائی کا پتا لگانا ضروری ہے۔ لہٰذا اپنے مؤکل کے گھر پر کچھ تجربات کرنے چاہئیں۔ اس نے اس بارے میں پکیریلی سے بات کی لیکن انہوں نے خوفزدہ ہوکر انکار کردیا۔ اس کے بعد وہ پریشان ہوگیا اور انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ تجربہ مسئلے کے حل کے لیے بہت ضروری ہے۔ آخر وہ مان گئے۔ پہلے سیشن میں ٹینا پکیریلی نے خود کو بطور آلہ پیش کیا۔ یہ سچ ہے کہ یہ معاملہ فیل ہوگیا تھا لیکن وہ ہر سیشن کے اختتام پر اپنے مؤکلوں کو پکارتا تھا۔ "اس سے آپ کو کیا فرق پڑتا ہے حضرات! جاری رکھیں، جاری رکھیں..... مصائب۔ بکواس! یہاں خدا کی قسم ہمارے پاس لافانی روح کا نزول ہوگا۔"

لیکن کیا وہ غریب پکیریلی اپنے وکیل کی اس جوشیلی کارروائی میں شریک ہوسکتے تھے؟ ان کا خیال تھا کہ وہ پاگل ہوگیا ہے۔ گرینیلا کے گھر سے بھاگ کر انہیں یقین تھا کہ انہوں نے اپنے آپ کو خوفناک ماحول سے آزاد کرلیا ہے مگر اب نئے گھر میں پھر سے بدروحوں کا چرچا شروع ہوگیا تھا۔ انہوں نے آنسو بھری آواز میں وکیل سے التجا کی کہ خدا کے لیے ان سیشنز کے بارے میں کوئی بات باہر نہ جائے۔

"ٹھیک ہے، تم مجھے کیا سمجھتے ہو، کیا میں بچہ ہوں؟ میں یہاں اپنے طور پر تجربہ کروں گا تاکہ معلوم ہو کہ عدالت میں اپنا فرض کیسے ادا کرنا ہے۔ ہم گھر کی خرابی کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شک نہ کریں۔" وکیل نے غصے سے کہا۔

☆☆☆

مقدمے کا آغاز ہوا تو اس نے ججوں، ان کے ساتھیوں اور کمرائے عدالت میں موجود عوام کو ایک غیر متوقع، تصوراتی اور ایمان کے پُرجوش جذبے کے ساتھ حیران کردیا۔ اس نے ایلن کارڈیچ کے بارے میں ایک نئے مسیحا کے طور پر بات کی۔ اس نے روحانیت کو انسانیت کا نیا مذہب قرار دیا۔ اس نے کہا کہ سائنس اپنے ٹھوس لیکن پرانے نظریات اور حد سے زیادہ سخت ضابطوں کے ساتھ فطرت کو دبا رہی ہے لیکن اب اسرار نے اپنے تاریک دروازے کھولنا شروع کردیے ہیں۔ عجیب روشنیاں، عجیب نشانیاں..... اور یہاں وکیل زومو نے ڈرامائی فصاحت کے ساتھ انتہائی حیرت انگیز روحانی مظاہر کے بارے میں بات کرنا شروع کی جنہیں سائنس کے عظیم ترین ماہرین طبیعیات، کیمیا دان، ماہر بشریات اور ماہر نفسیات نے ثابت اور منظور کیا تھا۔ اس نے اپنی باتوں سے سامعین کے دل موہ لیے اور انہیں حیرت زدہ کردیا۔ انہوں نے پریشان کن مفروضے کے ساتھ فیصلہ دیا کہ نظریات جو ابھی تک غیر یقینی ہیں، نام نہاد روحانی مظاہر سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ان کو جدید اور نمایاں طور پر مثبت سائنس نے ابھی تک تسلیم نہیں کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس عمل پر مزید باریک بینی سے غور کرتے ہوئے اگر آرٹیکل 1575 کرائے پر دی گئی جائداد کے پُرامن لطف اندوزی کی ضمانت لیتا ہے تو مالک اپنے گھر کو روحوں سے کیسے ضمانت دے سکتا ہے جو آوارہ اور غیر محسوس سائے ہیں۔ سائے کو کیسے بھگایا جاسکتا ہے؟ اور دوسری طرف آرٹیکل 1577 کے حوالے سے۔ کیا روحیں ان خفیہ برائیوں میں سے ایک ہوسکتی ہیں جو گھر کے استعمال کو روکتی ہیں؟ کیا وہ ٹھوس وجود رکھتی ہیں اور مالکِ مکان ان کے خلاف کیا طریقۂ علاج استعمال کرسکتا تھا؟ اس لیے بغیر کسی شک و شبہے کے مدعا علیہان کے اعتراضات کو رد کردیا گیا۔ عوام نے جو وکیل زومو کے انکشافات سے گہرے متاثر ہوئے تھے، متفقہ طور پر اس سزا کو مسترد کردیا جو کہ تنگ نظری اور تکبر کے ساتھ ایک مذاق کی طرح لگتی تھی۔ زومو نے عدالت کے خلاف اس قدر برہمی سے احتجاج کیا کہ اسے تقریباً گرفتار کرلیا گیا۔

دریں اثنا گھر کی مالکن گرینیلا بدنیتی اور خوشی سے جھوم رہی تھی۔ وہ تقریباً پچاس سال کی ایک بھاری بھرکم عورت تھی۔ وہ اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، تن کر کھڑی ہوئی اور زور سے چیخی۔ "ہر وہ شخص جس کے کانوں تک میری آواز

pklibrary.com

پہنچ رہی ہے، سن لے، آج رات میں اپنے اس روحانی گھر میں اکیلی سوؤں گی..... ہاں! اکیلی۔"

کیونکہ وہ بوڑھا نوکر جو اتنے سالوں سے اس کے ساتھ رہ رہا تھا، پکیر یلی کے ہاتھوں گھر کی بدنامی کے باعث اس کی خدمت سے دستبردار ہو کر ملازمت چھوڑ گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ سوائے اس خوفناک گھر کے کہیں بھی رہ لے گا..... اور گرینیلا کو پورے قصبے میں کوئی اور نوکر یا نوکرانی نہیں ملی تھی جو اس کے ساتھ وہاں رہنے کی ہمت رکھتی ہو۔ گرینیلا کے بقول یہ وہ عظیم خدمت تھی جو ان جلسازوں نے اس کے گھر کو بدنام کر کے انجام دی تھی۔ وہ اب ایک بے آباد گویا اجڑا ہوا گھر تھا لیکن اب وہ پورے ملک پر ثابت کرنا چاہتی تھی کہ عدالت نے ان احمقوں کو کرایہ اور ہرجانہ ادا کرنے کی سزا سنا کر اس کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ اب وہ وہاں اکیلی رہنا اور ان نام نہاد بھوتوں کا سامنا کرنا چاہتی تھی۔ وہ بار بار قہقہے لگا رہی تھی۔

☆☆☆

گرینیلا کا گھر شہر کے سب سے اونچے حصے میں ایک پہاڑی کی چوٹی پر واقع تھا جہاں شہر کا ایک قدیم دروازہ بھی تھا جس کا عربی نام کثرتِ استعمال سے بگڑ کر بہت عجیب ہو گیا تھا..... بیبیر یا..... جس کا مطلب تھا ہوا کا دروازہ۔ اس دروازے کے ساتھ ہی ایک بڑا کوڑا گھر تھا اور کچھ پہلے گرینیلا کا گھر اکیلا کھڑا تھا۔ اس کے سامنے صرف ایک خالی گودام تھا جس کا بوسیدہ دروازہ اب ٹھیک طرح بند نہیں ہوتا تھا اور جہاں اکثر ایک گاڑی بان اپنی گاڑی اور خچر کی حفاظت کے لیے رات گزارنے کی ہمت کرتا تھا۔

اماوس کی راتوں میں تیل کا ایک لیمپ ٹمٹماتے ہوئے بمشکل اس گندے علاقے کا اندھیرا دور کرنے کی کوشش کرتا لیکن دروازے سے صرف دو قدم کے فاصلے پر ایک کثیر آبادی والا محلہ بھی آباد تھا جہاں درحقیقت بہت سے مکانات تھے۔

گرینیلا کا گھر کشادہ، ہوادار اور خوب روشن تھا جسے دیکھ کر آس پاس کے لوگ رشک کا شکار ہو جاتے تھے۔ کیونکہ ان کے گھر چھوٹے اور قریب قریب تھے۔ وہ ایک گنجان آباد علاقے میں رہتے تھے۔ پہلے گرینیلا کا گھر دن میں اداسی میں ڈوبا رہتا اور اب رات کو خوفناک بھی لگنے لگا تھا۔ گرینیلا نے پکیر یلی کے جانے کے بعد گھر کی مکمل تزئین و آرائش کروائی تھی۔ نئے وال پیپرز، والینز اینٹوں میں نئی منزلیں، چھت کی دوبارہ پینٹ کے ذریعے آرائش اور دروازوں،

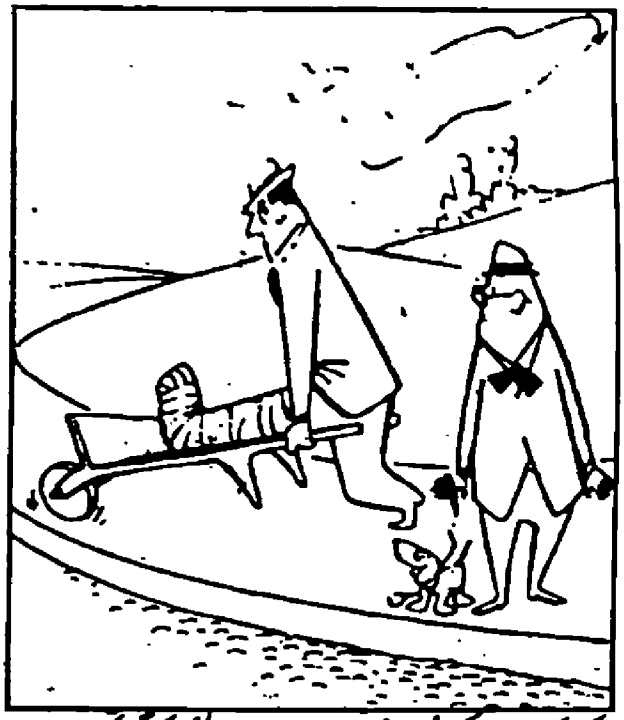

کھڑکیوں، بالکونی اور شٹروں پر دوبارہ پالش کی گئی تھی۔ بہت سے لوگ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے دیکھنے آئے مگر کوئی بھی اسے کرائے پر لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ گرینیلا اسے اتنا صاف ستھرا، اتنا ہوادار اور روشنی سے بھرا ہوا دیکھ کر خوش ہو جاتی تھی لیکن جب اس پر ہونے والے اخراجات کا خیال آتا تو غصے اور اداسی سے آہ بھر کر رہ جاتی۔

آخر اس نے خود اس گھر میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ وہ لوگوں کو یہ دکھانا چاہتی تھی کہ وہاں کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ اس نے کچھ فرنیچر جس میں ایک بستر، لکڑی کا ایک صندوق، واش اسٹینڈ اور چند کرسیاں شامل تھیں، گھر بھجوائیں اور خود وہاں منتقل ہو گئی۔ اس نے کئی خالی کمروں میں سے ایک میں انہیں رکھا تھا اور جب شام ہوئی تو وہ محلے کی سیر کے لیے نکلی تاکہ سب کو دکھایا جا سکے کہ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے۔ محلے کے لوگوں نے دیکھا کہ اس نے خود کو دو پستولوں سے مسلح کر رکھا ہے۔ آخر کیوں؟ اگر گھر میں چوروں کا خطرہ ہوتا تو شاید وہ ہتھیار اس کے کام آ جاتے اور وہ کہہ سکتی تھی کہ انہیں اپنی حفاظت کے لیے لے رکھا ہے لیکن بھوتوں کے خلاف وہ اسے کیا فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ وہ عدالت میں اتنا ہنسی تھی کہ اس کے خون رنگ سرخ چہرے پر ان قہقہوں کے نقوش اب تک نمایاں تھے۔ جب تمام محلے داروں نے اسے دیکھ لیا تو وہ اپنے بدقسمت گھر میں اکیلی سونے چلی گئی۔

وہ بہادر بن کر گھر میں آ تو گئی تھی تاہم اندر ہی اندر اس نے اپنے دل میں خوف کی لہریں اٹھتی محسوس کیں۔ اسے وکیل زوموکی وہ باتیں یاد آنے لگیں جو اس نے عدالت میں

کی تھیں۔

آہ، کتنے ہی اچھے اور سمجھدار لوگ تھے جو اس کے روبرو کئی بار اعلان کر چکے تھے کہ وہ ایسی بکواس پر یقین نہیں رکھتے مگر جب وکیل زومو نے ایمان کی پختگی، دستاویزی ثبوتوں اور تصدیق شدہ حوالوں کے ساتھ بات کی تو کئی لوگ اس کی باتوں کے قائل ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ججوں میں سے ایک نے سزا سنانے کے بعد عدالت سے باہر نکلتے ہوئے وکیل زومو سے رابطہ کیا جو ابھی تک غصے کا شکار تھا۔ جج نے یہ تسلیم کیا کہ مشہور سائنس دانوں کی غیر مشتبہ شہادتوں کی مدد سے بعض اخبارات میں شائع ہونے والے چند حقائق نے اسے ہلا کر رکھ دیا ہے اور اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کی ایک بہن جو روم میں شادی شدہ زندگی گزار رہی ہے، جب وہ لڑکی تھی تو سال میں ایک یا دو بار دن کی روشنی میں جب وہ اکیلی ہوتی تو ایک پراسرار سا سرخ آدمی اچانک کہیں سے اس کے پاس ظاہر ہو جاتا تھا۔ وہ اس کے لیے حیرت انگیز تحفے بھی لاتا تھا۔ ذرا تصور کریں، جج کے اس جملے کے بعد زومو کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ وہ حیرت سے جج کو تکنے لگا۔ آخر جج نے کندھے اچکا کر کہا۔ ''لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں پیارے وکیل! ہم کچھ نادیدہ دھاگوں سے بندھے ہوتے ہیں۔''

مختصر یہ کہ زومو کے بیانات اور انکشافات سے پورا شہر متاثر ہوا تھا اور اب گرینیلا شدت سے خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی، تنہا اور پریشان، جیسے سب نے اسے چھوڑ دیا ہو۔

ویران اونچی پہاڑی سے پورے شہر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا جہاں سے ایک کچی سڑک شہر کی وسیع وادی کی طرف جاتی تھی۔ اس سڑک پر لکڑی کے ایک کھمبے پر ایک لالٹین لٹکی تھی جس کا شعلہ وادی سے اٹھنے والے گھنے اندھیرے سے خوفزدہ ہو کر لرز رہا تھا۔ وہ یقیناً کسی آدمی کو خوش کرنے کے لیے روشن نہیں تھی۔ وہ بس سلگ رہی تھی، جل رہی تھی جیسے کوئی بجھانے کے لیے اس پر پھونک مار رہا ہو۔ گرینیلا نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ گھوڑے کی طرح اتنا ہانپ رہی ہے کہ اس کی پھونکوں سے موم بتی پھڑ پھڑا کر بجھنے لگی ہے۔ جب وہ گھر کا جائزہ لیتی خالی اور ویران کمروں میں سے گزر رہی تھی تو اس نے اپنی نگاہیں ٹمٹماتے شعلے پر جمائے رکھیں اور ایک ہاتھ سے موم بتی کے شعلے کو ڈھانپ لیا تاکہ اسے اپنے جسم کا سایہ نظر نہ آئے جو خوفناک حد تک بڑا ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ دیواروں اور فرش پر دوڑ رہا تھا۔ اس نئے تجدید شدہ کمرے میں بستر، کرسیاں، لکڑی کا صندوق اور واش اسٹینڈ اسے اجنبی سے لگ رہے تھے۔ اس نے موم بتی صندوق پر رکھی اور اپنی نگاہوں کو دروازے کی طرف دیکھنے سے باز رکھا جس سے پرے دوسرے کمرے اندھیرے میں ڈوبے نظر آ رہے تھے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور وہ پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔ اب کیا کروں؟ سب سے پہلے اس دروازے کو بند کر دوں اور کنڈی لگا لوں۔ ہاں، کیونکہ اس کی ہمیشہ سے عادت تھی کہ سونے سے پہلے خود کو کمرے میں بند کر لیتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ وہاں کوئی نہیں تھا لیکن..... عادت بس اور اس دوران اس نے دوبارہ موم بتی اٹھائی اور کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ کیا ابھی بالکونی کو تھوڑا سا کھولنا اچھا نہیں ہوگا؟ اف! یہاں بہت گرمی ہے اور پھر تازہ رنگ کی بو بھی آ رہی ہے..... ہاں، تھوڑی دیر بالکونی میں..... اور جب کمرے میں کچھ ہوا آئی تو اس نے سوچا کیوں نہ اپنے ساتھ لائی ہوئی چادروں سے بستر تیار کر لوں۔ اس نے ایسا ہی کیا لیکن جیسے ہی اس نے گدے پر پہلی چادر ڈالی، اسے لگا کہ دروازے پر دستک ہوئی ہے۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور جسم میں کپکپاہٹ دوڑ گئی جیسے کسی تیز دھار استرے نے کاٹا ہو۔ شاید دروازے کی کنڈی ہوا سے ہل گئی ہو؟ وہ کچھ دیر انتظار کرتی رہی، اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ خاموشی چھائی ہوئی تھی لیکن وہ پراسرار طور پر متحرک لگ رہی تھی۔ گرینیلا نے اپنی ساری طاقت اکٹھی کی، کانپتے ہوئے اپنی بیلٹ سے پستول نکالا پھر موم بتی واپس اپنے ہاتھ میں لے کر دروازہ کھولا اور لرزتی ہوئی آواز میں چلائی۔

''کون ہے.....؟''

خالی کمروں میں گرینیلا کی گہری آواز گونج اٹھی اور اس کی بازگشت نے گرینیلا کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا لیکن وہ جلد ہی سنبھل گئی۔ اس نے پاؤں بھینچے اور پستول ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔ کچھ دیر انتظار کیا پھر دہلیز سے ہوتی ہوئی اگلے کمرے کا معائنہ کرنے کے لیے اندر داخل ہوئی۔ اس کمرے میں صرف ایک سیڑھی مخالف دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ وہ مزدوروں نے کمروں کی قلعی وغیرہ کے لیے استعمال کی تھی۔ وہاں اور کچھ نہیں تھا۔

''ہاں..... اس میں کوئی شک نہیں دروازے کی کنڈی دیوار سے ٹکرا گئی تھی۔'' وہ بڑبڑائی۔

گرینیلا اپنے کمرے میں چلی آئی لیکن اسے اپنے بازو اور ٹانگیں اچانک ڈھیلے اور پھر اتنے بھاری محسوس ہوئے کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی بستر پر نہیں جا سکی۔ وہ

کرسی لے کر ٹھنڈی ہوا میں بالکونی میں بیٹھ گئی۔

''زررری.....!'' اچانک فضا میں ایک آواز ابھری۔

''چمگادڑ پر لعنت!'' وہ بڑبڑائی۔ اس نے فوراً پہچان لیا تھا کہ یہ چمگادڑ کی چیخ ہے جو کمرے میں جلتی ہوئی موم بتی کی روشنی سے متوجہ ہوئی تھی۔ گرینیلا اپنی حماقت پر ہنس پڑی۔ ڈر کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے اندھیرے میں منڈلاتی چمگادڑوں کو دیکھنے کے لیے آنکھیں اٹھائیں۔

اسی لمحے دوسرے کمرے سے سرسراتی ہوئی ایک آواز اس کے کانوں تک پہنچی لیکن اس نے فوراً پہچان لیا کہ یہ سرسراہٹ دیواروں پر لگے تازہ وال پیپر کی ہے۔ آہا، اچھا وقت گزر رہا ہے، بھوت بہت مضحکہ خیز ہیں..... سوائے اس کے جب اس نے خود اعتمادی سے مسکراتے ہوئے کمرے کا رخ کیا تو دیکھا پہلے تو اسے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ وہ حیرت سے اچھل پڑی۔ اس نے پیچھے ہٹ کر بالکونی کی ریلنگ پکڑ لی۔ دروازے سے دوسرے کمرے تک جو کھلا رہ گیا تھا، ایک بڑی سی سفید زبان فرش پر خاموشی سے پھیلی ہوئی تھی۔

''شرم، شرم.....!'' وہ بڑبڑائی۔ وال پیپر کا ایک رول..... جسے شاید مزدور وہاں سیڑھی کے اوپر چھوڑ گئے تھے..... لیکن اسے کس نے گرایا اور وہ دو کمروں کا فرش پار کر کے دروازے سے کیسے آن ٹکرایا؟

گرینیلا مزید برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کرسی لے کر واپس اندر چلی گئی۔ اس نے جلدی سے بالکونی بند کی، اپنی ٹوپی اور موم بتی اٹھائی اور سیڑھیوں سے نیچے بھاگی۔ پھر اس نے آہستگی سے بیرونی دروازہ کھولا اور باہر سڑک پر جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے دروازہ اپنی طرف کھینچا اور گھر کی دیوار کے ساتھ اندھیرے راستے پر تیز قدم اٹھاتی چل دی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ میں گھر کی خاطر اپنی سلامتی خطرے میں کیوں ڈالوں۔ ایک تخیلاتی کہانی بس، ہاں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس مہم جوئی کے بعد اس گرمی میں کھلی فضا میں رات گزارنا اچھا لگے گا۔ مختصر سی رات رہ گئی ہے، صبح کے وقت گھر لوٹوں گی۔ دن کے وقت تمام کھڑکیاں کھلی رہیں گی پھر یقینی طور پر یہ احمقانہ خوف نہیں ہوگا اور جب دوبارہ شام ہوگی تو گھر مانوس لگے گا، وہ پُرسکون ہوگا، اس میں کوئی شک نہیں۔ لعنت، اس نے گزشتہ رات وہاں سونے کا غلط فیصلہ کیا تھا۔

گرینیلا کا خیال تھا کہ کسی نے بھی اس کے فرار کو نہیں دیکھا لیکن گھر کے بالمقابل گودام میں اس شام گاڑی بان آرام کر رہا تھا جس نے اسے اتنا خوفزدہ اور اتنی احتیاط کے ساتھ باہر جاتے اور پھر صبح کے وقت لوٹتے دیکھا تھا۔ اس خفیہ سرگرمی اور پراسرار فرار سے متاثر ہو کر اس نے محلے کے کچھ لوگوں سے بات کی جو ایک دن پہلے پکیریلی کے حق میں گواہی دینے گئے تھے۔ پھر یہ گواہ بہت خاموشی سے وکیل زومو کے پاس گئے اور اسے خوف سے کانپتی گرینیلا کے فرار کی کہانی سنائی۔ زومو نے خوشی سے اس خبر اور ان کا استقبال کیا۔

''میں نے پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا۔'' وہ ان کی بات سن کر چلایا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ''حضرات! میں قسم کھاتا ہوں۔ مجھے پہلے ہی اس بات کا اندازہ بلکہ یقین تھا۔ میں پکیریلی کو بلاتا ہوں۔ میں گرینیلا کی اس حرکت سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ اب ہماری باری ہے۔ اوہ، حضرات! آپ سب متفق ہیں نا؟''

اس نے فوراً اسی رات گھات لگانے کا منصوبہ بنایا۔

''گرینیلا کی نظروں سے پوشیدہ رہتے ہوئے..... گودام میں پانچ یا چھ لوگ..... زیادہ نہیں..... اور خدا کے واسطے منہ بند رکھنا ہے۔ کسی سے ایک لفظ بھی نہیں کہنا۔ قسم کھائیں۔''

''ہم قسم کھاتے ہیں۔'' سب چلائے۔

ایک وکیل کے طور پر اس کے پیشے نے اسے کبھی زیادہ اطمینان نہیں دیا تھا۔ اس رات گیارہ بجے کے بعد زومو نے گرینیلا کو گھر کے بیرونی دروازے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ ننگے پاؤں آدھی آستینوں کی قمیص میں، ایک ہاتھ میں جوتے اور جیکٹ لیے جبکہ دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنی پتلون کو پکڑ رکھا تھا جس کا بٹن وہ جلدی میں لگا نہیں پائی تھی۔

زومو اندھیرے سائے سے چھلانگ لگا کر باہر آیا اور شیر کی طرح چلایا۔ ''گرینیلا! ہیوآ گڈواک!''

ساتھ ہی رات کی تاریکی گودام میں چھپے ہوئے محلے داروں کے قہقہوں سے گونج اٹھی۔ گرینیلا اتنا گھبرائی کہ جوتے ہاتھ سے گر گئے، پہلے ایک پھر دوسرا۔ آخر وہ شرم سے نظریں جھکائے دیوار سے جا لگی اور حیرت سے دنگ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

''احمق! کیا تم اب بھی بھوتوں پر یقین نہیں رکھتیں؟'' زومو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چیختے ہوئے کہا۔ ''اندھے انصاف نے تمہارے مؤقف کو درست مانا لیکن اب تمہاری آنکھیں کھل گئی ہوں گی، بتاؤ کیا دیکھا؟'' زومو پھر چلایا۔

لیکن بے چاری گرینیلا اپنے پورے وجود کے ساتھ کانپتے ہوئے رو رہی تھی اور بولنے سے قاصر تھی۔

✖✖✖

pklibrary.com

مآل کار

مرزا امجد بیگ

اکثر نادان لوگ سمجھتے ہیں کہ جو جعلسازی ہمارا دماغ کرتا ہے... اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ قدرت کے پاس ہر جعلسازی کا توڑ موجود ہے۔ کیونکہ یہ دنیا دار العمل ہے یہاں اپنی کرنی کا پھل سب کو کاٹنا پڑتا ہے... اس کا خیال تھا کہ محبت اور خون کے رشتوں میں دراڑ ڈال کر وہ سُکھ کی بانسری بجائے گی لیکن اسے کیا خبر تھی کی اکثر اپنی عیاریاں بھی گلے کا سانپ بن جاتی ہیں۔ کیونکہ چوری کا مال تو موری میں جاتا ہے۔ وہ جو حقداروں کے ہاتھ خالی کرکے اپنا دامن بھرنے میں مشغول تھی' بیگ صاحب نے جلد ہی اس کے سارے شغل میلوں کو آگ لگا دی کیونکہ اس نے تو دوسروں کو خاکستر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر بیگ صاحب کی دلیلوں نے اسے ذلیل و خوار جو کر ڈالا تھا۔

اپنوں کو اپنے گھر سے بے گھر کرنے والے..... اور وکیلوں سے لڑنے والے عقلمندوں کی مندی عقل کا عجیب قصہ

منظر کورٹ روم کا تھا اور ملزموں والے کٹہرے میں میرا مؤکل اور اس کیس کا ملزم انیق احمد سر جھکائے کھڑا تھا۔ انیق کی عمر چالیس کے اریب قریب تھی۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ایک مکینکل انجینئر تھا اور حال ہی میں وہ کویت سے بے سروسامانی کی حالت میں لوٹا تھا۔ انیق پر بڑے بھائی عتیق احمد کے قتل کا الزام عائد کیا گیا تھا۔

''جنابِ عالی!'' میں نے مؤکل کی ضمانت کے حق میں اپنے دلائل کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا مؤکل ایک امن پسند اور قانون کا احترام کرنے والا شریف شہری ہے۔ اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت قتل کے اس جھوٹے مقدمے میں پھنسایا گیا ہے۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ ملزم کی درخواستِ ضمانت کو منظور کرتے ہوئے اسے رہا کرنے کے احکامات صادر کیے جائیں۔''

''یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میرے فاضل دوست نے ملزم کے لیے ''شریف شہری'' اور زیرِ سماعت کیس کے حوالے سے ''جھوٹے مقدمے'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ میں ان سے پوچھنا چاہوں گا کہ ان کا مؤکل کس ملک کا شہری ہے اور کیس شروع ہونے سے پہلے ہی انہوں نے اس کے جھوٹے ہونے کا اندازہ کس بنیاد پر قائم کیا ہے؟''

''یور آنر! میں وکیلِ سرکار کے دوسرے سوال کا جواب پہلے دینا چاہوں گا۔'' میں نے جج کو مخاطب کرتے

pklibrary.com

ہوئے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ ''میرے مؤکل کو اپنے بڑے بھائی کے قتل کے الزام میں یہاں تک پہنچایا گیا ہے۔ قتل کوئی معمولی جرم نہیں ہے جناب عالی! اس گناہ کا شکار کبائر میں ہوتا ہے۔ اس گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرنے کے لیے ملزم کے پاس کوئی نہ کوئی محرک تو ہونا چاہیے نا۔ کوئی انسان اپنے بڑے بھائی کو خوامخواہ تو موت کے گھاٹ نہیں اتار دیتا۔ اس مقدمے میں ایسے کسی محرک کا نام و نشان دکھائی نہیں دیتا اسی لیے میں نے زیرِ سماعت کیس کے لیے ''جھوٹے مقدمے'' کی ترکیب استعمال کی تھی اور وقت آنے پر میں اسے ثابت بھی کردوں گا۔ اب میں آتا ہوں پراسیکیوشن کے پہلے سوال کی جانب۔''

لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنے جواب کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے فاضل دوست نے پوچھا کہ ملزم کس ملک کا شہری ہے؟ تو اس سلسلے میں، میں عرض کرنا چاہوں گا کہ شاید وکیل موصوف نے ٹھیک سے کیس فائل کا مطالعہ نہیں کیا۔ مذکورہ فائل میں میرے مؤکل کے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کی فوٹو کاپی لگی ہوئی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ملزم پاکستان کا شہری ہے اور ملزم کو یہ شہریت میں نے نہیں بلکہ حکومتِ پاکستان نے دی ہے۔ جناب عالی! کوئی پاکستانی اگر معاش کی تلاش میں کسی دوسرے ملک چلا جائے تو وہ وہاں کا شہری نہیں ہوجاتا۔ معزز عدالت اچھی طرح یہ بات جانتی ہے کہ ملزم کا تعلق معاشرے کی اس اونچی کلاس سے نہیں ہے جن کے لیے دہری اور تہری شہریت کا حصول اتنا ہی آسان ہے جیسے ہم اور آپ کسی مال میں جاکر اپنے لیے کوئی سوٹ خریدتے ہیں۔''

''یور آنر! لچھے دار باتوں سے کسی مجرم کے جرم کی حیثیت میں کمی واقع نہیں ہوجاتی۔'' وکیل استغاثہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''استغاثہ کے پاس ایسے شواہد.....!''

''آبجیکشن یور آنر!'' میں نے وکیلِ مخالف کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بہ آوازِ بلند کہا۔ ''پراسیکیوشن میرے مؤکل کے ساتھ کھلی زیادتی کا ارتکاب کررہا ہے اور وہ بھی معزز عدالت کے روبرو۔''

جج نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ کا اشارہ کس زیادتی کی طرف ہے؟''

''جناب عالی! ابھی اس کیس کی باقاعدہ کارروائی بھی شروع نہیں ہوئی اور پراسیکیوشن نے میرے مؤکل کو باقاعدہ ''مجرم'' بھی نامزد کردیا ہے۔'' میں نے خفگی بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''میرے ملزم پر اپنے بڑے بھائی کو قتل کرنے کا الزام ہے اور یہ الزام ابھی ثابت نہیں ہوا لہٰذا اس کے لیے ''مجرم'' کا لفظ استعمال کرنا قانوناً درست نہیں ہے۔ میں نے اپنے مؤکل کے ساتھ ہونے والی اسی زیادتی کی جانب اشارہ کیا ہے سر!''

''آبجیکشن سسٹینڈ!'' جج نے دوٹوک انداز میں کہا پھر وکیل استغاثہ کو ہدایت کی۔ ''آپ ملزم کو ملزم ہی گردانتے ہوئے اپنی بات جاری رکھیں وکیل صاحب!''

''جناب عالی! اگر ملزم کی درخواستِ ضمانت منظور کرلی گئی تو یہ انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔'' وکیل استغاثہ نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مثلاً؟'' جج نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''عدالت کے اس اقدام میں ناانصافی کا کون سا پہلو چھپا ہوا ہے؟''

وکیل استغاثہ پہلے ہی بوکھلایا ہوا تھا۔ جج کے استفسار نے اسے مزید نروس کردیا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''اگر ملزم کو ضمانت پر رہا کردیا گیا تو باہر جاکر یہ استغاثہ کے گواہوں پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔''

''ڈیفنس!'' جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟''

''یور آنر! کوئی شخص، کسی دوسرے شخص پر اس وقت اثر انداز ہوتا ہے جب وہ خود بااثر شخصیت کا حامل ہو۔'' میں نے جج کے سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا مؤکل پچھلے بارہ سال سے کویت میں مقیم تھا اور یہ چند ماہ پہلے ہی واپس اپنے وطن آیا ہے لیکن یہاں پر میں معزز عدالت کے ریکارڈ پر ایک اہم بات لانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا مؤکل کویت سے واپسی پر دیناروں سے بھرے ہوئے بیگ لے کر نہیں آیا۔ عدالت جانتی ہے کہ حال ہی میں عراق نے کویت پر جو چڑھائی کی ہے، اس کے نتیجے میں کویت میں رہنے والے انسانوں خصوصاً پاکستان، بنگلادیش اور بھارت سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ میں یہاں پر دوسرے ملکوں کا ذکر کرکے عدالت کا قیمتی وقت برباد نہیں کروں گا۔ اس وقت میرا فوکس اپنے مؤکل اور اس کیس کے ملزم انیق احمد پر ہے۔ اس بے چارے کے ہاتھ میں جو کیش اور اس کی بیوی کے پاس جو طلائی زیورات تھے، وہ سب کچھ ایک ابن الوقت ایجنٹ کی جیب میں ڈال کر تین افراد کی یہ مختصر سی فیملی صرف تن کے کپڑوں کے ساتھ جان بچا کر یہاں پہنچے ہیں۔ اس وقت میرے مؤکل کے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانا ہے اور نہ ہی

pklibrary.com

باقاعدہ آمدنی کا کوئی ذریعہ۔ ایسے نامساعد بلکہ ناگفتہ بہ حالات میں اگر میرے فاضل دوست کو یہ لگتا ہے کہ میرا مؤکل ضمانت پر رہا ہوجانے کے بعد استغاثہ کی اینٹ سے اینٹ بجادے گا تو میں اپنے دوست کی ایسی بچکانہ بلکہ احمقانہ سوچ پر اظہارِ افسوس ہی کرسکتا ہوں جناب عالی!''

پھر میں نے روئے سخن وکیل استغاثہ کی جانب موڑا اور مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔

''اگر آپ کویت کے تازہ ترین حالات جاننے میں ذرا سی بھی دلچسپی رکھتے ہیں تو ''ائرلفٹ'' نامی مووی ضرور دیکھیے گا۔ آپ کو بخوبی اندازہ ہوجائے گا کہ کویت سے لٹ پٹ کر اپنے وطن واپس آنے والے لوگ کتنے ''بااثر'' ہیں۔''

''میں مووی نہیں دیکھتا۔'' اس نے خشک لہجے میں کہا۔

''فائن!'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا اور جج کو مخاطب کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''جناب عالی! میرے مؤکل کی مالی حالت اتنی پتلی ہے کہ یہ ضمانت کے لیے ذاتی مچلکے خریدنے کی بھی استطاعت نہیں رکھتا اسی لیے میں نے اس کے لیے شخصی ضمانت کا انتظام کیا ہے۔ ضمانتی کے پیپرز درخواستِ ضمانت کے ساتھ ہی منسلک ہیں..... دیٹس آل یور آنر!''

جج نے مذکورہ ''پیپرز'' کا جائزہ لیا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''نیورو سرجن عدیل عمران جو ڈاکٹر ع ع کے نام سے مشہور ہیں۔''

''یس سر! ان کا بیٹا عامر عدیل بھی ڈاکٹر بن چکا ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اور اتفاق سے لوگ اسے بھی ''ڈاکٹر ع ع'' ہی کہتے ہیں۔ بس باپ بیٹے کو الگ شناخت کرنے کے لیے عامر عدیل کے نام کے بعد ''جونیئر'' لگادیا گیا ہے۔''

''یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے میرے مؤکل کی ضمانت رکوانے کے لیے آخری زور مارتے ہوئے کہا۔ ''استغاثہ کے پاس ایسے ٹھوس ثبوت اور عینی شاہد موجود ہیں جو یہ ثابت کردیں گے کہ عتیق احمد کے قتل میں ملزم ہی کا ہاتھ ہے لہٰذا عدالت سے میری درخواست ہے کہ ملزم کی ضمانت کے پیپرز کو رد کرتے ہوئے اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا جائے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے وکیل صاحب کہ آپ کے پاس ملزم کے خلاف بہت کچھ ہے۔'' جج نے عینک کے اوپر سے وکیل استغاثہ کو گھورتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''یہ عدالت آپ کو پورا موقع دے گی کہ آپ عینی گواہوں اور ان ٹھوس ثبوتوں کو یہاں لائیں۔''

اس کے بعد جج نے ملزم کی درخواستِ ضمانت کو منظور کرتے ہوئے میرے مؤکل کو اس شرط پر رہا کردیا کہ جب تک اس کیس کا فیصلہ نہیں ہوجاتا، وہ کراچی سے باہر قدم نہیں نکالے گا۔ کسی ہنگامی ضرورت کے پیشِ نظر اسے متعلقہ تھانے کو مطلع کرنے کے بعد شہر سے باہر جانے کی اجازت ہوگی اور یہ اجازت اتنی مدت کے لیے ہوگی کہ اس سے کسی عدالتی پیشی پر برا اثر نہ پڑے..... وغیرہا!

ڈاکٹر ع ع کی شخصی ضمانت نے انیق احمد کو عارضی رہائی دلادی تھی اور اس میں میرا کوئی کمال نہیں تھا۔ میں نے تو صرف ایک رابطہ کار کا کردار ادا کیا تھا۔ کسی زمانے میں انیق احمد نے عامر عدیل کو ٹیوشن پڑھائی تھی۔ وہی عامر عدیل جو اب ''ڈاکٹر ع ع جونیئر'' کہلاتا تھا۔ انیق نے مجھے اس ڈاکٹر قبیلی کے بارے میں بتایا تو میں نے ڈاکٹر ع ع سینئر (عدیل عمران) سے رابطہ کرکے اسے انیق کی مشکل کے بارے میں بتادیا۔ وہ فوراً سے پیشتر انیق کا ضمانتی بننے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔

سیانے سچ کہتے ہیں کہ نیکی اور بھلائی کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔ ''شجرکاری'' کی یہ ''مہم'' ایک دن ضرور بارآور ہوتی ہے اور اس کا پھل کبھی نہ کبھی اس کے حقدار تک پہنچ کر ہی رہتا ہے کیونکہ یہ کام صدقۂ جاریہ ہے جو کسی بازگشت کے مانند لوٹ کر آتا ہے مگر کئی گنا زیادہ اثرات، ثمرات اور افادات کے ساتھ۔

☆☆☆

شفیق احمد کے پاس واجبی سی تعلیم تھی۔ وہ اچھے وقتوں میں کسی مہربان کی کوشش سے محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوگیا تھا اور ایمانداری سے کام کرتے ہوئے وہ یو ڈی سی (اپر ڈویژن کلرک) کے عہدے تک پہنچنے کے بعد ریٹائر ہوگیا تھا اور اب اسے اس دنیا سے رخصت ہوئے کم و بیش آٹھ سال ہوگئے تھے۔

شفیق کی صرف دو ہی اولادیں تھیں۔ عتیق اور انیق۔ اس نے اپنے بیوی بچوں کو رزقِ حلال کھلانے کی حتی المقدور کوشش کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ تینتالیس سال کی سروس کے بعد بھی وہ ایک کلرک ہی ریٹائر ہوا تھا اور اس کے پاس مال و جائداد کے نام پر بھی کچھ خاص نہیں تھا۔ اس نے کئی سال کی اقساط ادا کرنے کے بعد گلشن اقبال کے علاقے میں ایک سو بیس گز (چار مرلے) کا ایک پلاٹ خرید لیا تھا جس پر مکان

کی تعمیر کی نوبت اس وقت آئی جب ریٹائرمنٹ کے بعد فنڈز اس کے ہاتھ لگے تھے۔ بہت سے ایسے افراد جن کا اپائنٹمنٹ شفیق احمد کے ساتھ ہوا تھا، وہ اس سے کہیں بڑے عہدوں پر ریٹائر ہوئے تھے مگر وہ رشوت اور ناجائز سفارش کے چونکہ خلاف تھا اس لیے اس کی ترقی نے جوں کی رفتار کو بھی مات دے دی تھی۔

اس کی ساری توجہ اپنے بیٹوں کی تعلیم پر مرکوز تھی۔ وہ تعلیم کی اہمیت کو اچھے سے سمجھ گیا تھا۔ عتیق نے بی کام کرنے کے بعد ایک بینک میں ملازمت کرلی تھی اور انیق نے مکینیکل انجینئر کی ڈگری حاصل کی تھی۔ دونوں بھائیوں کی عمروں میں تین سال کا فرق تھا۔ انیق کو پاکستان میں جو جابز مل رہی تھیں وہ ان سے مطمئن نہیں تھا اس لیے وہ بیرونِ ملک جانے کے لیے پر تولنے لگا۔ انسان کی نیت صاف اور مقصد نیک ہو تو قدرت کی مہربانی سے منزل خود چل کر اس کے سامنے آجاتی ہے۔ انیق کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

آج (یعنی جس دور کا یہ واقعہ ہے) سے بارہ سال پہلے کویت کی ایک آئل کمپنی کو مکینیکل انجینئرز اور دوسرے ٹیکنیکل اسٹاف کی ضرورت تھی۔ اس نے قسمت آزمائی اور صد فیصد کامیاب رہا۔ اس طرح وہ کویت پہنچ گیا تھا۔ ایک سال بعد اسے پاکستان آنا پڑا کیونکہ اس کی والدہ رخسانہ بیگم کا انتقال ہوگیا تھا۔ دو سال کے بعد جب وہ ایک ماہ کی چھٹی پر پاکستان آیا تو شفیق نے اس کی شادی کرادی۔ عتیق کی شادی انیق کے کویت جانے سے ایک سال پہلے ہوگئی تھی۔ شادی کے ایک سال بعد انیق کو ایک مرتبہ پھر ہنگامی حالات میں پاکستان آنا پڑا تھا۔ اس بار شفیق احمد اپنے خالقِ حقیقی سے جاملا تھا۔

ان چار سالوں میں انیق نے کویت میں اچھی طرح اپنے قدم جما لیے تھے۔ سو والد کے چہلم کے بعد وہ اپنی بیوی شائلہ کو بھی ساتھ کویت لے گیا تھا۔ آئندہ سال اللہ نے اسے بیٹی ایسی عظیم نعمت سے نوازا۔ گویا اس کی فیملی مکمل ہوگئی تھی۔ کویت میں ان لوگوں کو رہنے سہنے اور کھانے پینے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ چونکہ اچھا کمارہا تھا اس لیے رادی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ وہ لوگ کویت میں اس قدر خوشحال زندگی بسر کررہے تھے کہ ایک روز اس نے فون پر عتیق سے کہہ دیا۔

''بھائی! میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے اس لیے مجھے آبائی مکان سے کچھ نہیں چاہیے۔ والدین کا چھوڑا ہوا وہ گھر آپ کا ہے۔ میں یہاں خوش ہوں، آپ وہاں خوش رہیں۔''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے انیق!'' عتیق نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ ''اس مکان پر ہم دونوں بھائیوں کا برابر کا حق ہے۔ تمہیں کویت میں جب تک رہنا ہے رہو۔ جب تم واپس پاکستان آؤ گے تو ہم ایک ساتھ مل کر رہیں گے۔ اگر تمہارا ساتھ رہنے کا موڈ نہ ہو تو ہم اس مکان کو فروخت کرکے اس سے حاصل ہونے والی رقم کو برابر بانٹ لیں گے۔''

''بھائی! آپ بہت دور کی سوچ رہے ہیں۔'' انیق نے سرسری انداز میں کہا۔ ''جب ایسا وقت آئے گا تب اس بارے میں سوچیں گے۔ فی الحال تو میرا پاکستان آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اب میں نے مستقل یہیں رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ جاب کے ساتھ ساتھ میں نے گولڈ کے بزنس میں بھی کچھ انویسٹمنٹ کی ہے جس میں بہت اچھا پرافٹ مل رہا ہے۔''

''اللہ تمہیں اور ترقی دے میرے بھائی!'' عتیق نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

انیق نے چونکہ کویت میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اس لیے پیسا خرچ کرکے وہ ویزا بھی حاصل کرلیا جس کی رو سے وہ نہ صرف وہاں جب تک چاہے رہ سکتا تھا بلکہ اسے وہاں اپنا بزنس کرنے کی بھی اجازت مل گئی تھی۔ ان آٹھ سالوں میں اس نے پاکستان کا ایک چکر بھی نہیں لگایا تھا۔ بس عید، بقرعید فون پر عتیق سے بات ہوجاتی تھی۔ اسے کیا معلوم کہ اس کے منصوبہ جات پر تقدیر معنی خیز انداز میں مسکرارہی تھی۔

وہ بے خبری اور بے فکری میں یکایک ''تدبیر کنند بندہ، تقدیر کنند خندہ'' کی لپیٹ میں آگیا تھا۔

عراق نے کویت پر حملہ کیا تو مشرقِ وسطیٰ کی فضا میں بدامنی اور بے چینی بھر گئی۔ اس شورش کی روک تھام اور سرکوبی کے لیے نیٹو کی افواج تو بعد میں اتریں، اس سے پہلے عراق کی وحشیانہ اور بہیمانہ یلغار کے نتیجے میں کویت کے باسیوں نے جو دیکھا اور بھگتا، وہ لرزہ خیز مناظر بیان سے باہر ہیں۔ انیق تو ایک معمولی سا غیر ملکی باشندہ تھا۔ کویت کے نسل در نسل کروڑ اور ارب پتی رہائشی بھی موت کے روبرو کھڑے تھے۔ بہرکیف انیق احمد کا سب کچھ کویت میں رہ گیا اور وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو بچا کر پاکستان لانے میں کامیاب تو ہوگیا تھا لیکن یہاں پہنچ کر اسے جن حالات کا سامنا کرنا پڑا، وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

وہ اپنے آبائی گھر واقع گلشن اقبال پہنچا تو مکان کی

pklibrary.com

بدلی ہوئی حالت کو دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی۔ ایک سو بیس گز قطعۂ اراضی پر بنا ہوا وہ مکان اب دو منزلہ گھر کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور اس کی ''چمک دمک'' میں بھی کئی گنا اضافہ نظر آرہا تھا۔ عتیق نے یہ تعمیراتی کام کب کروایا تھا، اس کی انیق کو مطلق خبر نہیں تھی۔ عتیق نے فون پر کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔

وہ مکان کی انقلابی تبدیلی پر پوری طرح حیران بھی نہیں ہو پایا تھا کہ اس پر ایک ایٹم بم گرا۔ اس نے گیٹ کے پہلو میں نصب اطلاعی گھنٹی بجائی تو ایک اجنبی چہرہ اندر سے نمودار ہوا۔ وہ توقع کر رہا تھا کہ گیٹ عتیق یا اس کی بیوی ثوبیہ کھولے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ گیٹ میں کھڑے ایک ادھیڑ عمر شخص نے سوالیہ نظر سے ان کی طرف دیکھا اور معتدل انداز میں کہا۔

''جی..... آپ کون؟''

''میرا نام انیق ہے۔ میں کویت سے آیا ہوں۔'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''یہ تو ہمارا گھر ہے۔ آپ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

اس شخص نے ٹٹولنے والی نظر سے انیق کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''کہیں آپ عتیق کے چھوٹے بھائی تو نہیں ہیں؟''

''آپ صحیح پہچانے۔'' انیق نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''میں آٹھ سال کے بعد پاکستان آیا ہوں۔ یہ میری بیوی شائلہ اور یہ ہماری بیٹی نادیہ ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''مگر آپ نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کرایا؟''

''میرا نام لطیف شیخ ہے اور میں اس دو منزلہ گھر کا مالک ہوں۔'' اس شخص نے فخریہ انداز میں بتایا۔ ''دو سال پہلے میں نے آپ کے بڑے بھائی عتیق احمد سے یہ مکان خرید لیا تھا، پورے چار لاکھ روپے میں۔ اس وقت یہ سنگل اسٹوری گھر تھا۔ بالائی منزل میں نے خود تعمیر کرائی ہے اور اب میں اپنے دو بیٹوں اور ان کے بیوی بچوں کے ساتھ اس دو منزلہ گھر میں رہتا ہوں۔''

لطیف شیخ نامی اس شخص کے وضاحتی جواب نے انیق کے پاؤں کے نیچے سے زمین کو کھینچ لیا تھا۔ وہ لوگ کویت کو جن حالات میں چھوڑ کر آئے تھے، وہی کچھ کم اذیت رساں نہیں تھے اور یہاں پر ایک نئی مصیبت ان کی منتظر تھی۔ انیق کی معلومات کے مطابق وہ مکان ابھی تک ان کے مرحوم والد شفیق احمد کے نام تھا اور اس مکان کو فروخت کرنے کے لیے ضروری تھا کہ پہلے وہ ان دونوں بھائیوں کے نام ٹرانسفر ہو، اس کے بعد ہی وہ اسے بیچنے کا اختیار رکھتے تھے لیکن لطیف شیخ جو انوکھی کہانی سنا رہا تھا وہ انیق کی سمجھ سے باہر تھی کیونکہ عتیق نے کبھی اس حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

''شیخ صاحب!'' انیق نے محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے اس مکان کے نئے مالک سے پوچھا۔ ''یہ گھر خریدنے سے پہلے آپ نے کاغذات وغیرہ تو اچھی طرح چیک کر لیے تھے نا؟''

''آپ بھی عجیب بات کر رہے ہیں انیق میاں!'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''میں ایک ایڈووکیٹ ہوں۔ کاغذات کی چھان بین کے بغیر میں بھلا سامنے والی پارٹی کو چار لاکھ اٹھا کر کیسے دے سکتا تھا؟ میں نے ایک ایک کاغذ کو بغور جانچا تھا۔ شفیق احمد کا مکان پہلے اس کے دو بیٹوں عتیق اور انیق کے نام ٹرانسفر ہوا تھا اس کے بعد انیق اپنا حصہ (دو لاکھ کیش کی صورت) لے کر عتیق کے حق میں دستبردار ہو گیا تھا۔'' وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر کریدنے والے انداز میں دریافت کیا۔

''آپ نے مکان کے کاغذات کے بارے میں کیوں پوچھا ہے، کیا کوئی گڑبڑ ہے؟''

انیق اپنے بڑے بھائی کی بدنیتی اور جعلسازی کو تو اچھی طرح سمجھ گیا تھا لیکن وہ اپنی اس ''سمجھ'' کو لطیف شیخ پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے جلدی سے بولا۔

''نہیں شیخ صاحب! کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ میں نے تو بس ایسے ہی پوچھ لیا اور یہ تو عین اصول کی بات ہے کہ کوئی بھی شے خریدنے سے پہلے اس کے پیپرز ضرور چیک کر لینا چاہئیں۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

''میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔'' لطیف شیخ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

معاملے کی نزاکت بلکہ سنگینی انیق پر کھل چکی تھی لہٰذا اس نے صورت حال کو سنبھالا دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''بات دراصل یہ ہے کہ کچھ عرصے سے عتیق بھائی مجھ سے ناراض ہیں۔ پچھلے ڈیڑھ سال سے ہم رابطے میں نہیں ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ آج کل وہ کراچی کے کس علاقے میں رہ رہے ہیں۔ کیا آپ اس سلسلے میں میری کوئی مدد کر سکتے ہیں؟''

''ہاں، کیوں نہیں۔'' وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا۔ ''مجھے ان کا فلیٹ نمبر تو یاد نہیں البتہ میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ لوگ گارڈن ویسٹ میں واقع ''الفاطمہ'' اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوئے تھے۔''

''بس اتنا کافی ہے۔'' انیق نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں ایک آدھ روز میں انہیں منانے وہاں جاؤں گا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ شیخ صاحب!''

''اب کیا ارادہ ہے؟'' واپسی کے سفر میں شائلہ نے انیق سے پوچھا۔

''ہم سیدھے الفاطمہ اپارٹمنٹس جارہے ہیں۔'' انیق نے خفگی بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن ہم عتیق بھائی کو یہ نہیں بتائیں گے کہ لطیف شیخ سے ہماری ملاقات ہوچکی ہے۔ پہلے ہم ان کی کہانی سنیں گے اس کے بعد اصل موضوع پر بات ہوگی۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے نفی میں گردن جھٹکی پھر کڑوے لہجے میں کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا کہ عتیق بھائی ایسا بھی کرسکتے ہیں۔''

''میں نے تم سے کہا نہیں لیکن مجھے اسی وقت شک ہوگیا تھا جب عتیق بھائی نے اپنا فون نمبر بدلا تھا۔ اس بہانے کے ساتھ پرانے نمبر میں کوئی ایسی ٹیکنیکل خرابی پیدا ہوگئی ہے جسے ٹھیک کرنا ممکن نہیں۔'' شائلہ نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''اگر واقعی ایسی کوئی بات ہوتی تو انہیں نیا نمبر بھی گلشن اقبال ایکسچینج ہی کا ملنا چاہیے تھا مگر ان کا نیا نمبر تو گارڈن ایکسچینج کا تھا۔''

''میں نے اس طرف دھیان نہیں دیا تھا کیونکہ میں عتیق بھائی پر اندھا اعتماد کرتا ہوں۔''

''دھوکا بھی وہیں ہوتا ہے جہاں اندھا اعتماد ہو۔'' شائلہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایک بات تو پکی ہے کہ عتیق بھائی نے تمہارے ساتھ بڑا منظم فراڈ کیا ہے۔''

''حالانکہ انہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔'' انیق نے گھائل لہجے میں کہا۔ ''میں نے تو واضح الفاظ میں ان سے کہہ دیا تھا کہ مجھے اس مکان میں سے کچھ بھی نہیں چاہیے۔ اگر وہ یہ سب مجھے بتا کر کرتے تو میں اس پر کوئی اعتراض نہ کرتا۔''

''عتیق بھائی کے دل میں کھوٹ تھی اس لیے انہوں نے یہ کام چھپا کر کیا ہے۔'' شائلہ نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''ہر کوئی تمہاری طرح صاف نیت نہیں ہوتا انیق!''

ننھی نادیہ اپنے والدین کے درمیان ہونے والی عجیب وغریب گفتگو کو سن تو رہی تھی مگر وہ ٹھیک سے سمجھ نہیں پارہی تھی کہ وہ لوگ کس گمبھیر مسئلے پر بات چیت کررہے تھے۔ نادیہ بہت ہی ذہین اور تمیزدار بچی تھی۔ اس نے ایک بار بھی ان سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

''شائلہ! تمہارا کیا خیال ہے۔'' جب ان کی ٹیکسی گارڈن ویسٹ کے علاقے میں داخل ہوئی تو انیق نے اپنی بیوی سے پوچھا۔ ''کہیں ٹیکسی رکوا کر میں کسی ''پی سی او'' سے عتیق بھائی کو کال کرتا ہوں کہ میں ان سے ملنے آرہا ہوں۔''

''یہ انتہائی نامناسب بلکہ ایک بلنڈر ہوگا انیق!'' شائلہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس طرح وہ لوگ محتاط ہوجائیں گے اور کوئی بہانہ کرکے وہ ہم سے ملنے سے انکار بھی کرسکتے ہیں۔''

''تو پھر کیا کریں؟'' انیق نے سوالیہ نظر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

''ہمیں بغیر اطلاع کے ڈائریکٹ چھاپا مارنا چاہیے۔'' شائلہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تاکہ ان چوروں کے پاس فرار کا کوئی راستہ باقی نہ رہے۔''

انیق نے اثبات میں گردن ہلا کر شائلہ کی تجویز پر صاد کیا۔

☆☆☆

عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحتِ جرم سے انکار کردیا۔

اس کے بعد ملزم کا بیانِ حلفی ریکارڈ کیا گیا۔ انیق احمد نے میری ہدایات کی روشنی میں ایک نپا تلا بیان دیا تھا۔ میں اس کی کویتی اور پاکستانی دونوں پتاؤں سے اچھی طرح واقف ہوچکا تھا۔ اس کیس کا ''عراق، کویت وار'' سے کوئی تعلق نہیں تھا لہٰذا ہم نے اس موضوع کو ضمناً ٹچ کیا تھا۔ انیق اور اس کی فیملی کو پاکستان آنے کے بعد جن ناقابلِ یقین اور نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس کے بھی دو پہلو تھے۔ نمبر ایک..... آبائی مکان کی فروخت کے حوالے سے عتیق احمد کا فراڈ۔ نمبر دو..... یہاں آتے ہی قتل کے مقدمے میں پھنس جانا..... وغیرہا۔

میں نے انیق اور اس کی بیوی شائلہ پر یہ واضح کردیا تھا کہ سردست میں انیق کو قتل کے الزام سے بری کراؤں گا۔ مکان والے معاملے کو بعد میں دیکھا جائے گا اور وہ بھی اگر ان کی خواہش ہوئی تو کیونکہ اگر میں ان دونوں کیسز کو ایک ساتھ لے کر چلتا تو انیق کو بے گناہ ثابت کرنے والا معاملہ تعطل کا شکار ہوسکتا تھا اور یہ کیس کو کمزور کرنے کے مترادف ہوتا۔ آپ چونکہ مکان کی فروخت کے سلسلے میں کی جانے والی عتیق اور اس کی بیوی ثوبیہ کی جعلسازی سے واقف نہیں ہیں لہٰذا میں عدالتی کارروائی کے دوران میں اس کا اشارتاً اور ضرورتاً مختصر ذکر کرتا رہوں گا تاکہ آپ کا ذہن کسی مشکل یا الجھن کا شکار نہ ہو۔

ملزم کے بیان کے بعد وکیل استغاثہ جرح کے لیے اکیوزڈ باکس کے نزدیک چلا گیا اور میرے مؤکل کے چہرے پر نگاہ جما کر سوال کیا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ پاکستان آنے کے بعد تم مقتول سے ملنے اس کے فلیٹ واقع الفاطمہ اپارٹمنٹس گئے تھے؟''

ملزم نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''تم نے مقتول سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ تمہیں آبائی مکان کا حصہ دے حالانکہ تم اپنے حصے کی رقم دو سال پہلے وصول کر چکے تھے۔ میرا اشارہ دو لاکھ روپے کی جانب ہے۔''

میرے رٹائے ہوئے سبق کی روشنی میں ملزم نے جواب میں بڑے احترام سے کہا۔ ''وکیل صاحب! جب آپ دعوے سے کہہ رہے ہیں کہ دو سال پہلے میں نے اپنے بڑے بھائی عتیق احمد سے مبلغ دو لاکھ روپے مکان کی فروخت کی مد میں اپنے حصے کے طور پر وصول کیے تھے تو پھر آپ کو یقیناً یہ بھی معلوم ہوگا کہ میں نے مذکورہ رقم کس طرح وصول کی تھی۔ کیا عتیق نے وہ پیسے میرے کویت والے بینک اکاؤنٹ میں بھیجے تھے یا وہ رقم دینے خود میرے پاس کویت آیا تھا اور یا پھر میں نے پاکستان آکر وہ رقم وصول کی تھی؟''

چند لمحات کے تذبذب کے بعد وکیل استغاثہ نے جواب دیا۔ ''تم اپنا حصہ لینے کے لیے خود پاکستان آئے تھے کیونکہ کئی ایک قانونی کاغذات پر تمہیں دستخط بھی کرنا تھے۔''

''یہ ساری باتیں آپ کو کس نے بتائی ہیں؟''

''مقتول کی بیوی ثوبیہ نے۔''

''شکریہ وکیل صاحب!'' ملزم نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ یہ نہ کہیں کہ تمام تر معلومات آپ کو مقتول عتیق احمد نے فراہم کی تھیں۔''

ملزم کے طنز پر وکیل استغاثہ برا سا منہ بنا کر رہ گیا اور جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''اور جب مقتول نے تمہیں مزید کوئی رقم دینے سے انکار کر دیا تو تم نے اسے خطرناک نتائج کی دھمکی دی اور اس کے گھر سے نکل گئے..... ایسا ہی ہوا تھا نا؟''

''بالکل نہیں۔'' ملزم نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

''تم منصوبہ بندی میں لگ گئے۔'' وکیل استغاثہ نے ملزم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ''اور پھر وقوعہ کی صبح جب مقتول کی بیوی گھر پر موجود نہیں تھی تو تم وہاں پہنچے اور تم نے مقتول کے گلے میں رسی کا پھندا لگا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

''یہ جھوٹ ہے۔'' ملزم نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

''تمہارے کہہ دینے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔'' وکیل استغاثہ نے جارحانہ انداز میں کہا۔ ''ہمارے پاس ایسے گواہ موجود ہیں جنہوں نے تمہیں وقوعہ کے روز مقتول کے گھر جاتے دیکھا تھا۔''

''آبجیکشن یور آنر!'' میں نے بہ آواز بلند کہا۔

جج نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

''ڈیفنس کو کس چیز پر اعتراض ہے؟''

''جناب عالی! اس وقت ''عتیق مرڈر کیس'' عدالت میں زیر سماعت ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اور میں نے سوچا تھا کہ اسی مقدمے تک محدود رہوں گا کیونکہ میں نے اپنے مؤکل کے آبائی مکان کی جعلی فروخت کے ذیل میں ایک الگ مقدمہ دائر کرنے کا منصوبہ بنا رکھا ہے لیکن میرے فاضل دوست نے اس معاملے کو موجودہ کیس کے ساتھ نتھی کر ہی دیا ہے تو مجھے بھی اس سلسلے میں لب کشائی کی اجازت ہونا چاہیے۔ یہ عین انصاف کے اصولوں کی ترجمانی ہوگی۔''

''''پرمیشن گرانٹڈ!'' جج نے سپاٹ آواز میں کہا۔

''یور آنر! وکیل استغاثہ نے مقتول کی بیوہ میڈم ثوبیہ کی مدعیت میں ان کا نام لے کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ ملزم دو سال پہلے مکان کی فروخت کے حوالے سے مختلف پیپرز پر دستخط کرنے اور اپنا حصہ مبلغ دو لاکھ روپے سکہ رائج الوقت پاکستان وصول کرنے کی غرض سے پاکستان آیا تھا۔'' میں نے دبنگ انداز میں بولنا شروع کیا۔ ''ہم اس وقت دو ہزار سال پہلے والے معاشرے میں سانس نہیں لے رہے جناب عالی کہ جس کا جدھر منہ اٹھے، چلا جائے اور اسے ادھر جانے بھی دیا جائے..... سچ تو یہ ہے کہ اب ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنے کے لیے ہمیں پاسپورٹ اور ویزا کی ضرورت پیش آتی ہے۔ میں لیگل ٹریولنگ کی بات کر رہا ہوں ورنہ غیر قانونی طور پر تو لوگ پتا نہیں کون کون سا جان لیوا ذریعہ اختیار کر رہے ہیں۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنے دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں معزز عدالت کی خدمت میں تین پاسپورٹ پیش کر رہا ہوں۔ نمبر ایک، ملزم کا پاسپورٹ۔ نمبر دو، اس کی بیوی شائلہ کا پاسپورٹ اور نمبر تین، ان کی بیٹی نادیہ کا پاسپورٹ۔ معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ وہ ان تینوں پاسپورٹ کی ٹریول ہسٹری کا معائنہ کرے۔''

pklibrary.com

بات ختم کرتے ہی میں نے اپنے بریف کیس میں سے وہ تینوں پاسپورٹ نکال کر جج کے سامنے رکھ دیے۔ یہ کیس اپنے ہاتھ میں لیتے وقت میں نے اپنے مؤکل انیق احمد سے وہ تمام قانونی دستاویزات لے لی تھیں جو کسی بھی مرحلے پر اس کے حق میں استعمال کی جاسکتی تھیں۔

جج نے مذکورہ پاسپورٹ کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ان میں سے ایک پاسپورٹ پر تو صرف ایک بار ہی کویت سے کراچی تک کا سفر کیا گیا ہے اور اس سفر کی تاریخ نو ماہ پہلے کی ہے۔ یعنی سات سالہ بچی نادیہ کا پاسپورٹ۔ باقی ملزم اور اس کی بیوی کے پاسپورٹ سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس سے پہلے انہوں نے کم و بیش آٹھ سال قبل کویت سے پاکستان تک کا سفر کیا تھا۔''

''ہیئر از پوائنٹ یور آنر!'' میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے تیز آواز میں کہا۔ ''جب میرا مؤکل دو سال پہلے پاکستان آیا ہی نہیں تو پھر..... کیا دو لاکھ روپے کی وصولی اور کون سے قانونی کاغذات پر اس کے دستخط.....؟''

''پراسیکیوشن!'' جج نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس حوالے سے کچھ کہنا چاہیں گے؟''

''یور آنر! یہ ایک نیا پہلو سامنے آیا ہے۔'' وکیل استغاثہ نے خجالت آمیز انداز میں کہا۔ ''اس کی تحقیق کے لیے استغاثہ کو تھوڑا وقت چاہیے۔''

''مثلاً کتنا وقت؟'' جج نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اور وہ وقت آئندہ پیشی سے پہلے کا ہونا چاہیے۔''

''یس یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! میں یہاں پر اس کیس کے ایک اہم پہلو کی جانب معزز عدالت کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اب یہ پہلو بھی زیر سماعت کیس کی ضرورت بن گیا ہے۔''

''کون سا پہلو وکیل صاحب؟'' جج نے مجھ سے پوچھا۔

''جناب عالی! میں یہاں پر پراسیکیوشن کی تھوڑی مدد کرنا چاہوں گا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا اور تپانے والی نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد میں دوبارہ جج کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ''رجسٹری آفس کے ریکارڈ کے مطابق دو سال پہلے مقتول نے وہ آبائی مکان لطیف شیخ نامی ایک شخص کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ شیخ صاحب پیشے کے اعتبار سے ایک وکیل ہیں۔ انہوں نے مذکورہ مکان کے کاغذات کو اچھی طرح چیک کرنے کے بعد مبلغ چار لاکھ روپے میں وہ مکان خریدا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مقتول نے وہ مکان فروخت کرنے سے پہلے ہی اس کے ''نقل بمطابق اصل'' ڈاکیومنٹس تیار کروالیے تھے یعنی اس کی نیت کا فتور کوئی ڈھکی چھپی کہانی نہیں ہے۔ ''جعلی دستاویزات'' پر میں اس لیے زور دے رہا ہوں کہ اصلی دستاویزات اس وقت تک تیار نہیں کی جاسکتیں جب تک انیق احمد کی رجسٹرار کے سامنے حاضری نہ ہوجائے اور واقعہ یہ ہے کہ میرا مؤکل اور اس کیس کا ملزم انیق احمد پچھلے آٹھ سال میں ایک بار بھی پاکستان نہیں آیا۔ نہ مکان کی فروخت کے وقت، دو سال پہلے اور نہ ہی اس سے قبل یا اس کے بعد۔ تو کیوں نہ.....!'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''کیوں نہ لطیف شیخ کو بھی کسی پیشی پر معزز عدالت میں حاضری کی دعوت دی جائے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کیا جاسکے۔ عین ممکن ہے کہ جعلی دستاویزات کی تیاری مقتول اور شیخ صاحب کی ملی بھگت ہو۔''

''ڈیفنس کی تجویز میں منطق اور معقولیت پائی جاتی ہے۔'' جج نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''پراسیکیوشن کو اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟''

''کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' وکیل استغاثہ نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ''لیکن میں یہاں پر عدالت کے علم میں ایک ٹھوس حقیقت کو لانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو۔''

''اجازت ہے۔'' جج نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''یور آنر! میں لطیف شیخ نامی اس بندے کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔'' وکیل استغاثہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا وکالت کے شعبے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک اسٹیٹ ایجنٹ ہے۔ وہ اپنے مختلف قسم کے کاموں کے لیے عدالت آتا جاتا رہتا ہے۔ اسی دوران میں وہ کئی ایک وکلاء کے لیے کمیشن پر کام بھی کرتا ہے یعنی جن فارغ وکلاء کے پاس کیسز نہیں ہوتے، وہ انہیں مرغے گھیر کر دیتا ہے اور اپنا کمیشن کھرا کرلیتا ہے۔ اس جاب کو کامیابی سے نبھانے کے لیے وہ بعض مرغوں کو یہ یقین بھی دلاتا ہے کہ وہ بھی ایک وکیل ہے لیکن اس کی حقیقت صرف اتنی سی ہے کہ وہ محض ایک کمیشن ایجنٹ ہے۔''

''میرے فاضل دوست نے لطیف شیخ کی اصلیت کو عدالت کے سامنے لاکر ڈیفنس پر بہت بڑا احسان کیا ہے جناب عالی!'' وکیل استغاثہ کی بات مکمل ہونے پر میں نے

بہ آوازِ بلند کہا۔ ''اب اس گتھی کو بہ آسانی سلجھایا جاسکتا ہے کہ میرے مؤکل کی عدم موجودگی میں مقتول نے وہ آبائی گھر کیونکر فروخت کیا تھا۔''

''لیکن اس وقت عدالت میں ''عتیق مرڈر'' کیس کی سنوائی ہورہی ہے، کسی فراڈ پراپرٹی ڈیل کی نہیں۔'' وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''لطیف شیخ زیرِ سماعت کیس میں کہیں فٹ نہیں بیٹھتا۔ وہ ایک غیر متعلق شخص ہے۔''

''اس غیر متعلق شخص کو اس کیس کے اندر آپ لے کر آئے ہیں میرے فاضل دوست!'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''اب اس بندے کو موجودہ مقدمے میں فٹ بٹھانا ہر صورت میں ناگزیر ہوچکا ہے۔ آپ کے منہ کھولنے سے پہلے تو میں صرف ''عتیق مرڈر'' کیس پر ہی فوکس کیے ہوئے تھا، بات نکلی ہے تو اسے دور تک جانے کا راستہ بھی ہموار ملنا چاہیے نا۔''

وکیل استغاثہ معاندانہ نظر سے مجھے گھورنے لگا۔ میں نے کندھے اچکانے پر اکتفا کیا۔

جج نے ایک ماہ بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ!''

☆☆☆

لطیف شیخ کی زبانی دماغ کی چولیں ہلا دینے والی کہانی سن کر وہ لوگ سیدھے الفاطمہ اپارٹمنٹس پہنچ گئے تھے۔ اس وقت تک سورج غروب ہوچکا تھا اور دھیرے دھیرے تاریکی نے پھیلنا شروع کردیا تھا۔ عتیق احمد کسی بینک میں جاب کرتا تھا اور انیق احمد کی معلومات کے مطابق وہ مغرب کی نماز سے پہلے گھر آجایا کرتا تھا۔ گویا اس وقت اسے اپنے فلیٹ ہی میں ہونا چاہیے تھا۔

''الفاطمہ اپارٹمنٹس'' پینسٹھ فلیٹس پر مشتمل ایک گنجان آباد رہائشی منصوبہ تھا جس کے دو بلاکس تھے، اے اور بی۔ بلاک اے میں پینتیس اور بلاک بی میں تیس فلیٹس تھے جن کی تین کیٹگریز تھیں یعنی ہر فلور پر ایک ڈیڑھیا، تین فلیٹس دو کمروں والے اور دو فلیٹس تین کمروں والے۔ اس طرح ہر فلور پر کُل چھ فلیٹس تھے۔

انیق احمد، عتیق احمد کے فلیٹ کا نمبر نہیں جانتا تھا لیکن چوکیدار سے استفسار کے بعد اسے معلوم ہوگیا کہ اس کا بڑا بھائی بلاک اے کے فلیٹ نمبر تین سو دو میں رہتا تھا۔ مذکورہ فلیٹ ''ڈیڑھیا'' کیٹگری میں آتا تھا۔

چھوٹے بھائی کو فیملی سمیت اپنے سامنے دیکھ کر عتیق اور اس کی بیوی ثوبیہ پر جیسے آسمانی بجلی گر گئی تھی۔ چند منٹ تک تو انہیں یقین ہی نہیں آیا۔ وہ آنکھوں دیکھی حقیقت کو ہضم نہیں کرپا رہے تھے۔

''میں گلشن اقبال والے گھر گیا تھا بھائی!'' انیق کی خفگی بھری آواز نے انہیں چونکنے پر مجبور کردیا۔ وہ عتیق سے مخاطب تھا۔ ''لطیف شیخ نے مجھے بتایا ہے کہ دو سال پہلے آپ نے وہ گھر فروخت کردیا تھا اور..... آپ کو کیا ہوا ہے؟ آپ وہیل چیئر پر کیوں ہیں؟''

تمام تر ناراضی کے باوجود بھی عتیق احمد کو وہیل چیئر پر دیکھ کر انیق کا دل پگھل گیا تھا۔ اس ایک کمرے کے فلیٹ میں فرنیچر کے نام پر ایک بیڈ اور دو کرسیوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا یا پھر ایک وہیل چیئر تھی جس پر اس وقت عتیق نظر آرہا تھا۔

''آبائی مکان کو بیچنے اور میرے وہیل چیئر پر آنے کی کہانی بہت طویل اور دردناک ہے انیق!'' عتیق نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کبھی فرصت ملی تو تمہیں ضرور سناؤں گا۔ تم بتاؤ، اچانک پاکستان کیسے آگئے اور وہ بھی بغیر کسی اطلاع کے؟''

''ہمارے پاکستان آنے کی داستان آپ کی کہانی سے کہیں زیادہ دلخراش اور رونگٹے کھڑے کردینے والی ہے بھائی۔'' انیق نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اگرچہ میں نے ابھی تک آپ کی پوری کہانی نہیں سنی ہے لیکن میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میری مصیبت آپ کے مسائل سے یقیناً بہت زیادہ بڑی ہے۔''

''تو پھر پہلے تم اپنی سناؤ۔'' عتیق نے کہا پھر اپنی بیوی سے مخاطب ہوتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ''ثوبیہ! تم ان لوگوں کے لیے چائے ناشتے کا بندوبست کرو۔ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔''

ثوبیہ ''جی'' کہتے ہوئے کچن کی جانب بڑھ گئی۔

وہ کُل ستائیس گز (کم وبیش ایک مرلہ) پر بنا ہوا ایک ننھا منا فلیٹ تھا جس میں دس بائی گیارہ فٹ کے ایک کمرے کے علاوہ ایک منی کچن اور ویسا ہی ایک تنگ سا کامن واش روم تھا۔ گویا فلیٹ کے داخلی دروازے سے اندر آتے ہی دو قدم چلنے کے بعد وہ فلیٹ ختم ہوجاتا تھا..... اللہ اللہ، خیر سلا!

شائلہ اور نادیہ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے جبکہ انیق، عتیق کی وہیل چیئر کے سامنے بیڈ کے کونے پر ٹک گیا تھا۔ عتیق نے نادیہ عرف نادی کو اپنے پاس بلا کر پیار کیا پھر انیق کی طرف دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

''ہاں..... تو تم مجھے اپنی افسوسناک کتھا سنانے والے تھے؟''

آئندہ دس منٹ میں انیق نے مختصر مگر جامع الفاظ میں عتیق کو کویت کے تازہ ترین حالات اور اپنے وہاں سے جان بچا کر نکل آنے کی روداد سنادی۔ عتیق نے پوری توجہ سے اپنے چھوٹے بھائی کا دکھڑا سنا اور انیق کے خاموش ہونے پر کہا۔

''انیق! یہ سب سن کر بہت افسوس ہوا۔ ٹی وی پر عراق اور کویت کی جنگ کے حوالے سے خبریں تو آتی رہتی ہیں لیکن وہاں کے حالات اس قدر خراب ہو چکے ہیں، اس بات کا مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا۔''

''ہم تو پھر بھی جان بچا کر کسی نہ کسی طرح اس جہنم سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔'' انیق نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''آپ ان مقامی اور غیر مقامی افراد کے بھیانک انجام کا تصور کریں جو روزانہ کی بنیاد پر اس دوزخ کا ایندھن بن رہے ہیں۔''

''تم لوگ تو اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ آئے ہو۔'' ثوبیہ نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''اب یہاں کیا کرو گے؟ نہ تمہارے پاس کوئی روزگار ہے اور نہ ہی رہنے کی جگہ۔ ہم اس ڈیڑھیا فلیٹ میں جس طرح گزارہ کر رہے ہیں، وہ تمہارے سامنے ہے۔ یہ تو اچھا ہے کہ ہمارے بچے نہیں ہیں ورنہ.....!'' ثوبیہ نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''بھابی! آپ کو ہماری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' شائلہ نے منہ توڑ جواب دینے والے انداز میں کہا۔ ''خداداد کالونی میں میری سگی خالہ رہتی ہیں۔ ہم عارضی طور پر ان کے ہاں ٹھہر جائیں گے اور باقی جہاں تک روزی روٹی کی بات ہے تو.....!'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر سرسراتی ہوئی آواز میں اضافہ کر دیا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ ہم کویت سے لٹ پٹ کر آئے ہیں۔ ہم نے اپنی جان کی سلامتی کے صدقے کے طور پر لاکھوں دینار کے کاروبار اور جائداد کو چھوڑا ہے لیکن میرے اور انیق کے ہاتھ پاؤں اور دماغ سلامت ہے۔ ہم زیرو سے شروع کریں گے اور آپ دیکھ لینا چند سالوں میں ہم اپنی پہلے والی معاشرتی اور معاشی پوزیشن حاصل کر لیں گے۔''

شائلہ کے میکے میں خداداد کالونی والی اس خالہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ جذبات میں اگرچہ بہت کچھ بول گئی تھی لیکن یہ اس کے دل کی آواز تھی اور دل سے اٹھنے والی صدا کبھی غلط نہیں ہوتی۔

چند لمحات بوجھل خاموشی میں گزر گئے پھر انیق نے عتیق سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''بھائی! اگر مناسب سمجھیں تو اپنی دکھ بھری کہانی سنا دیں۔ اس کے بعد ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔''

''بات مناسب سمجھنے کی نہیں ہے انیق بلکہ تمہارا اس حقیقت سے واقف ہونا بہت ضروری ہے جس نے مجھے وہ آبائی مکان بیچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگر تم حقائق سے واقفیت حاصل نہیں کرو گے تو میری طرف سے تمہارا دل کبھی صاف نہیں ہوگا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''ٹھیک ہے بھائی!'' انیق نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں سن رہا ہوں۔ آپ اپنی کہانی شروع کر دیں۔''

آنے والے پندرہ منٹ میں عتیق احمد نے اپنے چھوٹے بھائی کو جن نامساعد حالات کی تفصیلات سے آگاہ کیا، اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

شفیق احمد کے چہلم کے بعد انیق احمد اپنی بیوی کو بھی کویت ساتھ لے گیا تھا۔ اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد عتیق کو پتا چلا کہ ان کا باپ اپنے پیچھے ایک بڑا قرضہ چھوڑ گیا تھا۔ جب قرض خواہوں نے گھر کا دروازہ بجانا شروع کیا تو عتیق وہ آبائی مکان فروخت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے چار لاکھ روپے میں سے اپنے مرحوم باپ کا سارا قرض اتارا اور باقی جو ایک سو ایک لاکھ روپے بچے، اس رقم سے عتیق نے الفاطمہ اپارٹمنٹس والا وہ ڈیڑھیا فلیٹ خرید لیا تھا..... وغیرہم!

یہ عتیق احمد کی سنائی ہوئی کہانی تھی جس پر شائلہ کو تو بالکل یقین نہیں آیا۔ مطمئن تو انیق بھی نہیں ہوا تھا اسی لیے اس نے اہم سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

''ابا جی نے کبھی اپنے قرض کا ذکر نہیں کیا تھا بھائی!'' اس نے عتیق کی طرف دیکھتے ہوئے بے یقینی سے کہا اور پوچھا۔ ''ان پر لگ بھگ کتنا قرضہ تھا؟''

''کم و بیش ڈھائی لاکھ روپے۔'' عتیق نے جواب دیا۔ ''مجھے بھی اس بات پر حیرت تھی کہ انہوں نے ہمیں اپنے قرضے کے بارے میں بتایا کیوں نہیں تھا لیکن جب میں نے قرض خواہوں کے پاس پختہ تحریری ثبوت دیکھے جن پر والد صاحب کے دستخط بھی موجود تھے تو میں بے بس ہو گیا۔ اس آبائی مکان کی فروخت کے سوا میرے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں رہا تھا۔''

''ان بدترین حالات کے بارے میں آپ نے مجھے

کیوں نہیں بتایا تھا؟'' انیق نے احتجاجی لہجے میں سوال کیا۔
''ڈھائی لاکھ روپے میرے لیے کوئی بڑی رقم نہیں تھی۔ یہ پیسے میں آپ کو بھجوا دیتا۔ کم از کم ہمارا آبائی گھر تو محفوظ رہتا۔''
''تم اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ پردیس میں تھے انیق!'' عتیق نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم سے جب بھی فون پر بات ہوتی، تم مجھے بہت خوش لگتے تھے۔ میں نے تمہاری خوشیوں کو خراب کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اس لیے یہاں جو بھی ہوا، اسے میں نے خود ہی بھگت لیا ہے۔''
''آبائی گھر کو فروخت کرنے کا کلی اختیار آپ کے پاس نہیں تھا بھائی!'' انیق نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے میرے علم میں لائے بغیر آپ نے یقیناً کوئی غیر قانونی راستہ اپنایا ہوگا۔ میرا مطلب ہے نقلی دستاویزات کی تیاری تاکہ مکان کو بیچنے کے لیے آپ کو میری ضرورت نہ رہے..... ہیں نا؟''
اگرچہ انیق کا یہ سوال زہر میں بجھا ہوا تھا لیکن عتیق نے اطمینان بھرے لہجے میں جواب دیا۔
''تمہارا اندازہ درست ہے انیق! اور ایسا کرنے کے لیے تم نے ہی مجھے اجازت دے رکھی تھی۔''
شائلہ نے شاکی نظر سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔
''میں نے اجازت دے رکھی تھی.....؟'' انیق نے الجھن زدہ لہجے میں بڑے بھائی سے پوچھا۔ ''میں نے کب آپ سے کہا تھا کہ آبائی مکان کے حوالے سے آپ بے ایمانی اور جعلسازی کرنے کے لیے آزاد ہیں؟''
''اگرچہ تمہارے الفاظ یہ نہیں تھے لیکن تم نے کئی بار مجھ سے جو کہا، اس کے یہی معنی نکلتے ہیں۔'' عتیق نے کمال بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھہرو، میں تمہیں یاد دلاتا ہوں۔'' وہ لمحے بھر کے لیے رکا، ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
''کیا تم نے مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ بھائی! میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے اس لیے مجھے آبائی مکان سے کچھ نہیں چاہیے۔ والدین کا چھوڑا ہوا وہ گھر صرف اور صرف آپ کا ہے۔ میں کویت میں بہت اچھا کما رہا ہوں، میری زندگی میں کوئی کمی نہیں ہے۔ میں یہاں خوش ہوں، آپ وہاں خوش رہیں۔''
''ہاں، میں نے ایسا کہا تھا اور یہ سب آپ کے احترام اور بھلائی کے لیے تھا۔'' انیق نے ترش لہجے میں کہا۔ ''میرے اخلاص اور محبت کا آپ نے بہت غلط مطلب نکالا بھائی۔ میں نے کبھی یہ چاہا تھا اور نہ ہی سوچا تھا کہ آپ اپنے تھوڑے سے فائدے کے لیے جرم کی راہ پر چل نکلیں گے، خیر.....!'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر سرسری انداز میں کہا۔
''آپ مجھے اپنی مفروری کے بارے میں کچھ بتائیں۔ اس کے بعد ہم یہاں سے چلے جائیں گے کیونکہ ثوبیہ بھابی کی بات سے ہم پر واضح ہو گیا ہے کہ آپ کے دلوں میں ہمارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ڈیڑھ فلیٹ کو تو انہوں نے محض ایک استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔''
عتیق کے چہرے پر خجالت بلکہ ندامت کے آثار نمودار تو ہوئے تاہم اس نے ڈھٹائی کو اپنا شعار بنائے رکھا اور انتہائی ہٹ دھرمی سے جواب دیا۔
''ایک سال پہلے مجھ پر فالج کا اٹیک ہوا تھا جس کے بعد میرے جسم کا زیریں حصہ بے جان ہو گیا جو اب تک حرکت کے قابل نہیں ہو سکا حالانکہ علاج معالجہ مسلسل جاری ہے۔ نوکری پرائیویٹ بینک کی تھی، اسے جانے میں دیر نہیں لگی۔ ثوبیہ نے ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچنگ شروع کر رکھی ہے۔ میں گھر سے نکل کر کچھ کرنے کے قابل نہیں رہا۔ بس، ثوبیہ کی تنخواہ پر جیسے تیسے گزارہ ہو رہا ہے۔''
اس کے بعد کچھ کہنے سننے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ انیق، شائلہ اور نادیہ وہاں سے اٹھے، باہر نکل کر نشتر روڈ سے رکشا پکڑا اور خداداد کالونی کی جانب روانہ ہو گئے۔ خالہ نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ لوگ عارضی طور پر وہاں مقیم ہو گئے۔
''عتیق بھائی نے ہمیں ایک جھوٹی کہانی سنائی ہے۔'' اگلی صبح شائلہ نے اپنے شوہر سے کہا۔ ''ابو (شفیق احمد) ایسے انسان نہیں تھے کہ اپنے پیچھے لاکھوں کا قرضہ چھوڑ جائیں۔ ان کی طرف اگر کسی کا ایک روپیہ بھی آتا تھا تو وہ سکون سے سو نہیں پاتے تھے۔ اس بات کی تو میں عینی شاہد ہوں کہ اگر کبھی وہ سودا لینے باہر جائیں اور سبزی، پھل یا گروسری والا انہیں حساب سے چند روپے زیادہ دے دے تو سودا گھر میں رکھ کر وہ اضافی رقم لوٹانے اس دکاندار کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ میں نے جتنا بھی عرصہ ان کے ساتھ گزارا تھا، میں نے انہیں انتہائی ایماندار اور اصول پرست انسان پایا تھا۔''
''ہاں، میں اس ٹھوس حقیقت سے واقف ہوں۔'' انیق نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''عتیق بھائی کی سنائی ہوئی کہانی پر مجھے بھی یقین نہیں آیا مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کریں تو کریں کیا۔''
''عتیق بھائی نے ہمارے ساتھ جتنا بڑا دھوکا کیا ہے، میں فی الحال اس کی وجہ تو نہیں بتا سکتی لیکن مجھے اس بات کا پکا

pklibrary.com

یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بداعمالیوں کی سزا کے طور پر انہیں ایک معذور، مفلوج اور لاچار انسان بنا دیا ہے۔ باقی جہاں تک ہمارے کچھ کرنے کا سوال ہے تو.....!'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھمی پھر بڑے اعتماد سے کہا۔ ''آبائی مکان کی فروخت کے پیچھے جو بھی راز چھپا ہوا ہے، ہم اس کی تہ میں اترنے کی کوشش کریں گے اور یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔''

''ہاں واقعی، یہ کام کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔'' انیق نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''ہمارے گلشن اقبال والے محلے دار، الفاطمہ اپارٹمنٹس کے چوکیدار اور عتیق کا آس پڑوس یا پھر عتیق کے بینک کے ساتھیوں میں سے کوئی ایک تو یہ جانتا ہوگا کہ عتیق بھائی نے وہ آبائی مکان کیوں فروخت کیا تھا؟ اور اس سے حاصل ہونے والی رقم انہوں نے کیا کیا؟''

آئندہ چند ماہ میں انہوں نے کڑی محنت اور بھاگ دوڑ سے گوہر مقصود پالیا۔ اس جاں فشانی کے دوران میں ان پر جو انکشافات ہوئے، وہ ہوش اڑا دینے والے تھے۔ جب یہ کیس میں نے اپنے ہاتھ میں لیا تو انیق اور اس کی بیوی شائلہ نے مجھے تمام حقائق سے نہ صرف آگاہ کر دیا تھا بلکہ اس ذیل میں انہوں نے جو ثبوت اکٹھا کیے تھے، وہ بھی میرے حوالے کر دیے تھے۔ وقوعہ کے روز میرا مؤکل الفاطمہ اپارٹمنٹس کیا لینے گیا تھا، میں اس بارے میں بھی اچھی طرح جانتا تھا۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد آپ کے ذہن میں یقیناً پراسرار حقائق تک رسائی حاصل کرنے کی خواہش مچل رہی ہوگی۔ تو ٹھیک ہے..... اگلی پیشی پر ملتے ہیں۔

☆☆☆

اس پیشی پر استغاثہ کی جانب سے تین گواہ پیش کیے گئے لیکن میں یہاں پر الفاطمہ اپارٹمنٹس کے چوکیدار داؤد کی گواہی کا ہی ذکر کروں گا کیونکہ باقی دو گواہوں کے بیانات اور ان پر ہونے والی جرح میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جس کا تذکرہ ضروری ہو۔

داؤد کی عمر چالیس کے اریب قریب تھی۔ وہ درمیانے قد کاٹھ کا مالک ایک مضبوط البدن انسان تھا۔ داؤد نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا تو جج نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پراسیکیوشن! عدالتی کارروائی شروع کی جائے۔''

وکیل استغاثہ وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا اور اپنے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''داؤد احمد! تم کتنے عرصے سے الفاطمہ اپارٹمنٹس میں چوکیداری کر رہے ہو؟''

''لگ بھگ دس سال سے۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''اس بندے کو کب سے جانتے ہو؟'' وکیل استغاثہ نے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اور یہ بھی بتاؤ کہ اس کے بارے میں تمہیں کیا معلوم ہے؟''

''کچھ زیادہ نہیں وکیل صاحب!'' گواہ نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں نے اسے چھ سات ماہ پہلے ہی دیکھا تھا۔ میرا مطلب ہے جب یہ پہلی بار مجھے نظر آیا۔ اس کے بارے میں، میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ ''302'' میں رہنے والے عتیق صاحب کا چھوٹا بھائی ہے جو پہلے کسی عرب ملک میں رہتا تھا۔ یہ ہماری بلڈنگ میں بس دو تین مرتبہ ہی آیا ہے۔''

''ذرا اپنے دماغ پر دباؤ ڈالو۔'' وکیل استغاثہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اور مجھے بتاؤ کہ ملزم آخری بار کب الفاطمہ اپارٹمنٹس آیا تھا؟''

''اسی دن جب عتیق صاحب کو قتل کیا گیا۔'' چوکیدار نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''میرا مطلب ہے چار اگست کی صبح۔''

''تمہاری ڈیوٹی کا ٹائم کیا ہے؟''

''صبح آٹھ سے رات آٹھ بجے تک۔''

''چار اگست کی صبح یعنی وقوعہ کے روز ملزم کتنے بجے الفاطمہ اپارٹمنٹس آیا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے استفسار کیا۔

''کم و بیش دس بجے۔''

''اس کا مطلب ہے، ملزم کی آمد کے وقت تم ڈیوٹی پر موجود تھے؟''

گواہ نے اثبات میں جواب دیا۔ ''جی وکیل صاحب!''

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''اور اس کی واپسی کب ہوئی تھی؟''

''بیس پچیس منٹ کے بعد۔''

''یعنی زیادہ سے زیادہ ساڑھے دس بجے؟''

''جی ہاں، بالکل۔'' گواہ نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے بہ آواز بلند کہا۔ ''پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول عتیق احمد کی موت چار اگست کی صبح دس سے گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور اس وقت مقتول کی بیوی اپنے اسکول گئی ہوئی تھی یعنی مقتول اپنے فلیٹ میں اکیلا تھا۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی

پھر میری طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔
''یور کوئسچن پلیز!''

کئی ایک ایسے سوالات جو میں استغاثہ کے گواہ چوکیدار داؤد احمد سے پوچھنا چاہتا تھا، ان کے جوابات وکیل استغاثہ کی جرح کے نتیجے میں مجھے مل گئے تھے لہٰذا مزید معلومات کی غرض سے میں نے ذرا مختلف انداز میں اپنا کام شروع کردیا۔

''داؤد احمد!'' میں نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔ ''ابھی تم نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ تمہاری ڈیوٹی صبح آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے تک کی ہے۔ اس کا مطلب ہے رات میں کوئی اور چوکیدار ڈیوٹی پر ہوتا ہے؟''

''جی ہاں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''رات آٹھ بجے سے صبح آٹھ بجے تک ظہیر علی ڈیوٹی دیتا ہے۔''

''تمہیں الفاطمہ اپارٹمنٹس میں نوکری کرتے ہوئے دس سال ہوگئے ہیں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''کیا ظہیر علی تم سے زیادہ پرانا ہے؟''

''جی، وہ پچھلے پندرہ سال سے الفاطمہ میں نوکری کررہا ہے۔''

''چند روز پہلے میں نے ظہیر علی سے ایک تفصیلی ملاقات کی تھی۔'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ظہیر نے مجھے جو معلومات فراہم کی ہیں، ان کی تصدیق کے لیے میں تم سے چند سوالات کروں گا۔ تم نے میرے ہر سوال کا جواب مختصر الفاظ میں دینا ہے۔ میری بات سمجھ میں آرہی ہے نا؟''

وکیل استغاثہ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ظہیر سے میری خفیہ ملاقات کے ذکر نے اسے یکا یک بے چین کردیا تھا۔ میں اس کی بے قراری کو نظر انداز کرتے ہوئے داؤد احمد کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''جی، میں سمجھ رہا ہوں۔'' گواہ نے سر کی اثباتی جنبش کے ساتھ جواب دیا۔ ''آپ پوچھیں، جو بھی پوچھنا چاہتے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''مقتول کب سے الفاطمہ اپارٹمنٹس میں رہ رہا تھا؟''

''کم و بیش دو سال سے۔''

''مقتول عتیق احمد نے وہ ڈیڑھ یا فلیٹ خریدا تھا یا پھر وہ 302 میں کرائے دار کی حیثیت سے رہ رہا تھا؟''

''فلیٹ نمبر 302 مقتول کی ذاتی رہائش گاہ تھی۔'' گواہ نے بتایا۔ ''یعنی وہ وہاں کرائے پر نہیں رہ رہا تھا۔''

''دس سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا داؤد!'' میں نے بدستور گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''الفاطمہ اپارٹمنٹس میں رہنے والے ہر شخص کو تم اچھی طرح جانتے ہوگے۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں نا؟''

''جی بالکل۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میں اس بلڈنگ کے ایک ایک رہائشی کو بخوبی جانتا ہوں، چاہے وہ فلیٹ کا مالک ہو یا پھر کوئی کرائے دار۔''

''بہت خوب۔'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''بلاک اے کے فلیٹ نمبر 304 یعنی دو کمروں والے ''A-304'' میں کون رہتا ہے؟''

''حاجی عدیل صاحب!'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''حاجی صاحب کی بیوی کا نام نورین ہے اور ان کا ایک آٹھ سال کا بیٹا بھی ہے جس کا نام نبیل ہے۔ نبیل کنگ گارڈن اسکول میں پڑھتا ہے۔''

''کنگ گارڈن اسکول سے مجھے یاد آیا کہ.....!'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''یہ وہی اسکول ہے نا جہاں مقتول کی بیوی ٹوبیہ ٹیچنگ کرتی ہیں؟''

''جی، جی۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''کنگ گارڈن اسکول ہماری گلی کے شروع ہی میں ہے۔''

''ہاں، میں جانتا ہوں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''جب میں ظہیر سے ملنے آیا تھا تو میں نے اس اسکول کا بورڈ دیکھا تھا۔'' لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں گواہ سے سوال کیا۔

''A-304 حاجی عدیل صاحب کا ذاتی فلیٹ ہے یا وہ وہاں ایک کرائے دار کی حیثیت سے رہتے ہیں؟''

''وہ کرائے دار ہیں۔'' گواہ نے بتایا۔

''تمہارے خیال میں فلیٹ نمبر A-304 کا کرایہ کتنا ہوگا؟''

''ڈیڑھ ہزار روپے۔''

''حاجی عدیل صاحب کام کیا کرتے ہیں؟''

''وہ کسی پرائیویٹ کمپنی میں ملازم ہیں۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے بیزار کن لہجے میں نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ ''اس وقت عدالت میں ''عتیق مرڈر کیس'' زیر سماعت ہے اور میرے فاضل دوست ایک

غیر متعلق شخص حاجی عدیل پر اپنا تھیسس مکمل کرنے کی کوشش میں معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کررہے ہیں۔''

''ڈیفنس!'' جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا حاجی عدیل صاحب کا زیرِ سماعت کیس سے کوئی تعلق، واسطہ ہے؟''

''یس یور آنر!'' میں نے ٹھوس انداز میں جواب دیا۔ ''لیکن سرِدست میں اس پوائنٹ پر کھل کر بات نہیں کرسکتا۔ مناسب موقعے پر میں حاجی عدیل صاحب کے معاملے کی وضاحت کردوں گا۔''

''آبجیکشن سسٹینڈ!'' جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو برقرار رکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''وکیل صاحب! آپ فی الحال حاجی عدیل صاحب کے ذکر کو بعد کے لیے محفوظ رکھتے ہوئے اپنی جرح کو آگے بڑھائیں۔''

''تھینک یو، یور آنر!'' میں نے فرمانبرداری سے کہا پھر استغاثہ کے گواہ داؤد احمد کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ''داؤد احمد!'' میں نے الفاطمہ کے دن والے چوکیدار کو مخاطب کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ''تھوڑی دیر پہلے تم نے اپنے وکیل کے ایک سوال کے جواب میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز یعنی چار اگست کی صبح دس بجے ملزم انیق احمد تمہارے سامنے بلڈنگ میں داخل ہوا تھا اور لگ بھگ ساڑھے دس بجے وہ وہاں سے رخصت ہوگیا تھا اور تم نے اسے آتے اور جاتے، دونوں مرتبہ دیکھا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب! بلڈنگ میں داخل ہونے اور نکلنے والے ہر شخص پر میری گہری نظر ہوتی ہے۔''

''بہت خوب۔'' میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا اس میں الفاطمہ اپارٹمنٹس کے رہائشی بھی شامل ہیں؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''رہائشی، ملاقاتی، ماسیاں اور سوئپر وغیرہ سب کے سب۔''

''مقتول عتیق احمد کی اہلیہ محترمہ ثوبیہ کنگ گارڈن جانے کے لیے کتنے بجے بلڈنگ سے نکلتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نو بجے سے چند منٹ پہلے۔'' گواہ نے بتایا۔ ''کنگ گارڈن اسکول صبح نو بجے سے دوپہر دو بجے تک کا ہے۔''

''کیا وقوعہ کی صبح بھی تم نے میڈم ثوبیہ کو نو بجے کے آس پاس ہی بلڈنگ سے نکلتے دیکھا تھا؟''

گواہ نے اثبات میں جواب دیا۔

''اور میڈم کی واپسی کتنے بجے ہوئی تھی؟''

''دو، سوا دو بجے۔''

''ملزم نے وقوعہ کے روز کس قسم کا لباس پہن رکھا تھا؟''

''نیلی جینز اور دھاری دار شرٹ۔'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''اس کی شرٹ میں سیاہ دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔''

''ملزم کی بلڈنگ میں آمد اور واپسی کے دوران میں میڈم ثوبیہ فلیٹ نمبر 302 میں موجود نہیں تھیں۔'' میں نے داؤد احمد کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کریدنے والے انداز میں استفسار کیا۔ ''اپنے شوہر کے قتل کے وقت وہ کنگ گارڈن اسکول میں بچوں کو پڑھا رہی تھیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''جی۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!'' میں نے روئے سخن جج کی جانب پھیرتے ہوئے کہا پھر وکیل استغاثہ کی طرف مڑ کر سوال کیا۔

''میرے فاضل دوست! پچھلی پیشی پر معزز عدالت نے لطیف شیخ نامی اس شخص کو یہاں لانے کا حکم دیا تھا جس نے دو سال پہلے مقتول سے اس کا آبائی مکان چار لاکھ روپے میں خریدا تھا۔ اس سلسلے میں آپ نے کیا سرگرمی دکھائی ہے؟ مجھے نہیں لگتا کہ آج آپ اسے گواہی کے لیے عدالت میں پیش کرسکیں گے کیونکہ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں بہ مشکل بیس منٹ باقی ہیں۔''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اور ہوسکتا ہے کہ آئندہ پیشی پر بھی اس کی حاضری کو ممکن نہ بنایا جاسکے۔''

''اس کا کوئی خاص سبب؟'' میں نے ٹٹولنے والے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا وہ کسی لام میں شامل ہوکر عراق سے لڑنے کویت یا سعودی عرب چلا گیا ہے؟''

وکیل استغاثہ نے الجھن زدہ انداز میں مجھے گھورا اور پوچھا۔ ''کس میں شامل ہوکر؟''

مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ ''لام'' کا لفظ اس کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر جواب دیا۔

''لام کا مطلب ہے، بریگیڈ..... یعنی فوج کا دستہ۔''

''اوہ نہیں۔'' وہ خجالت آمیز انداز میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''لطیف شیخ کسی محاذ پر جنگ لڑنے نہیں بلکہ اپنی فیملی کے ساتھ دو ماہ کے لیے اسلام آباد، ایبٹ آباد اور مری وغیرہ کی سیر کو چلا گیا ہے۔'' پھر وہ جج کی جانب مڑا اور ان

pklibrary.com

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

ایک ادارہ، چار ماہانہ مطبوعات

دنیا بھر میں

خدمات

اور مصنوعات

کی منفرد تشہیر کے لیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

عالمی ادب سے شاہکار کہانیوں، افسانوں اور معلومات کے خزانوں کا انتخاب

جنہیں ہر عمر کے لاکھوں قارئین ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں

جہاں جہاں اردو پڑھی اور سمجھی جاتی ہے وہاں یہ رسائل باقاعدگی سے پہنچتے ہیں

C-63 فیز ٹو ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

فون نمبر: 35804200, 35802552 (92-21) فیکس: 35802551 (92-21) ای میل: group@hotmail.com

pklibrary.com

ساجت آمیز الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''یور آنر! جیسا کہ میں نے پچھلی پیشی پر بھی عرض کیا تھا کہ اس عدالت میں عتیق مرڈر کیس زیر سماعت ہے تو کیوں نہ ہم سب اسی پر فوکس کریں۔ اگر میرے فاضل دوست کو یہ لگتا ہے کہ مقتول نے کسی جعلسازی کے ذریعے اپنا آبائی مکان لطیف شیخ کو فروخت کیا تھا تو اس معاملے کی چھان بین کے لیے وہ الگ سے مقدمہ دائر کر سکتے ہیں اور.....!''

''چھان بین کس کے خلاف.....؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے جارحانہ انداز میں وکیل استغاثہ سے سوال کیا۔ ''جعلسازی کا مرتکب شخص یعنی مقتول عتیق احمد تو منوں مٹی اوڑھ کر سو چکا ہے۔''

''میرا مطلب تھا.....!'' وکیل استغاثہ نے اضطراری لہجے میں جواب دیا۔ ''ان ڈاکیومنٹس کی جانچ پڑتال جو لطیف شیخ کے پاس ہیں۔''

''میرے فاضل دوست! آپ بھی کیا یاد کریں گے کہ کس سختی سے پالا پڑا تھا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں وکیل استغاثہ سے کہا پھر جج کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

''جناب عالی! زیر سماعت کیس کے فیصلے تک میں لطیف شیخ کا نام اپنی زبان پر نہیں لاؤں گا اور ایسی ہی توقع میں مخالف پارٹی سے بھی کروں گا۔''

''پراسیکیوشن! آپ ڈیفنس کی اس تجویز سے متفق ہیں؟'' جج نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔

''یس سر!'' اس نے توانا لہجے میں جواب دیا۔

''جناب عالی!'' میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہوں گا تاکہ عدالت کے آج کے باقی ماندہ وقت کو کسی مفید مقصد کی نذر کیا جا سکے۔''

''پرمیشن گرانٹڈ!'' جج کی مخصوص رعب دار آواز کورٹ روم میں گونجی۔

کسی بھی کیس میں تفتیشی افسر کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے اور ہر پیشی پر اسے عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ جج کا حکم سنتے ہی آئی او (انویسٹی گیشن آفیسر) وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر پہلے اسی کٹہرے میں استغاثہ کا گواہ اور الفاطمہ اپارٹمنٹس کا چوکیدار داؤد احمد کھڑا تھا۔

''آئی او صاحب!'' میں نے سب انسپکٹر ساجد علی کو مخاطب کرتے ہوئے معتدل انداز میں سوال کیا۔ ''کیا آج سے پہلے میں نے کبھی آپ سے کسی فون نمبر کے بارے استفسار کیا ہے؟''

اس نے نفی میں جواب دیا۔ ''نہیں۔''

''آج پہلی اور آخری مرتبہ میں آپ سے نمبر کے حوالے سے پوچھ رہا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اپنے بیگ میں سے ایک کاغذ برآمد کیا جس پر بولڈ جلی حروف میں ایک لینڈ لائن نمبر لکھا ہوا تھا۔ مذکورہ کاغذ آئی او کی جانب بڑھاتے ہوئے دریا

''اس نمبر کو دیکھ کر آپ کو کیا یاد آ رہا ہے؟''

واضح رہے کہ اس زمانے میں آج کل کے لائن فون ہی کا راج ہوا کرتا تھا۔ سیل فون کا استعمال ہوا تھا اور جس کسی کے پاس سیل فون ہوتا تھا، اسے نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

''جی ہاں، مجھے یاد آ گیا۔'' چند لمحات کے غو بعد تفتیشی افسر نے اثبات میں جواب دیا۔ ''اسی ہمیں مقتول کو پیش آنے والے جان لیوا واقعے دی گئی تھی۔''

میں نے فون نمبر والا کاغذ جج کے سامنے میز ہوئے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''جناب عالی! یہ کنگ گارڈ کا نمبر ہے جو اسکول کے بورڈ پر بھی لکھا ہوا ہے۔ معز سے میری درخواست ہے کہ اس پیپر کو کیس فائل کے جائے تاکہ یہ محفوظ رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔''

میری اس بے ضرر اور معصوم سی فرمائش کو پیشتر پورا کر دیا گیا۔ میں دوبارہ آئی او کی جانب م اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''اس اندوہناک واقعے کی اطلاع کب او آپ کو دی تھی سب انسپکٹر ساجد علی صاحب؟''

''ہمارے روزنامچے کے مطابق اس و اطلاع چار اگست کی دوپہر..... بلکہ سہ پہر تین ب تھی۔'' آئی او نے جواب دیا۔ ''اور یہ فون مقتو ثوبیہ صاحبہ نے ہمارے تھانے کیا تھا۔''

''آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟

''لگ بھگ ساڑھے تین یا پونے چار بجے۔

''ملزم کو آپ نے کب اور کہاں سے گرفتار ک

''شام چھ بجے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کے علاقے میں واقع ایک کوچنگ سینٹر سے ہم گرفتار کیا تھا۔ یہ بندہ مذکورہ سینٹر پر ٹیوشن پڑھاتا تو

''مقتول عتیق احمد کی موت کے ذیل میں

چھوٹے بھائی ملزم انیق احمد کو گرفتار کرنے کا سبب کیا تھا؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''کیا جائے وقوعہ سے آپ کو کچھ ایسے شواہد یا اشارے ملے تھے جن کی روشنی میں آپ نے ملزم کے کوچنگ سینٹر کا رخ کیا تھا؟''

''جی، بالکل ایسی ہی بات ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مقتول کے کمرے میں کئی ایک مقامات پر ہمیں ملزم کی انگلیوں کے نشانات ملے تھے۔''

''جائے وقوعہ سے آپ کو ملزم کے فنگر پرنٹس ملے اور آپ نے جا کر فوراً ٹیوشن سینٹر سے اسے گرفتار کرلیا۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''بغیر میچنگ کے آپ کو یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ جائے واردات پر پائے جانے والے انگلیوں کے نشانات میرے مؤکل ہی کے ہیں؟''

''شاید آپ میری بات کو سمجھ نہیں پائے۔'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''ہم نے جائے وقوعہ سے مقتول اور اس کی بیوہ کے علاوہ جس انسان کے فنگر پرنٹس اٹھائے تھے، ان کی میچنگ گرفتاری کے بعد ملزم کی انگلیوں کے نشانات سے کی گئی تھی۔ باقی جہاں تک ملزم کے ٹیوشن سینٹر جانے کی بات ہے تو.....'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''مقتول کی بیوہ کی زبانی ہمیں دونوں بھائیوں کے بیچ ہونے والی بدمزگی کا پتا چل گیا تھا اسی لیے ہم نے موقع واردات کی کارروائی نمٹانے کے بعد خداداد کالونی کا رخ کیا تھا جہاں ملزم عارضی طور پر اپنی خالہ ساس کے گھر میں رہ رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ ملزم اس وقت گرومندر والے کوچنگ سینٹر میں موجود ہوگا۔ اس کے بعد ہی ہم مذکورہ کوچنگ سینٹر پہنچے تھے۔''

''گویا آپ کو ملزم تک پہنچانے میں مقتول کی بیوہ محترمہ ثوبیہ نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''جس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس کیس کی کنجی بھی ثوبیہ صاحبہ ہی کے پاس ہے..... ہیں نا؟''

میرے آخری الفاظ نے تفتیشی افسر کو قدرے بے چین کردیا تھا۔ وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''میں بھلا اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں وکیل صاحب!''

''آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم کسی اور کے بارے میں بات کرلیتے ہیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''کیا آپ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے اتفاق کرتے ہیں؟''

''جی، مکمل اتفاق۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''مقتول عتیق احمد کی موت چار اگست کی صبح دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ ایک مضبوط نائیلون کی رسی کی مدد سے اس کی گردن میں گرہ نما پھندا لگا کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔''

''اس نوعیت کی اذیت ناک موت کے دوران میں ''شکار'' اپنی جان بچانے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔'' میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ ڈیڑھ سال پہلے مقتول کے جسم کا زیریں حصہ مفلوج ہوگیا تھا جس کے بعد وہ وہیل چیئر کا محتاج ہوکر رہ گیا تھا لیکن اس کے دست و بازو پوری طرح فعال تھے۔ جب اس کی گردن کو پھندا لگا کر دبایا جارہا تھا تو اس نے اپنی بقا کے لیے تگ و دو کیوں نہیں کی تھی؟ وہ اپنے ہاتھوں کی مزاحمت سے بہت کچھ اِدھر اُدھر کرسکتا تھا مگر جائے وقوعہ پر اس کی ''کوشش'' کے نتیجے میں نمودار ہونے والی کوئی ابتری نہیں دیکھنے کو ملی۔ کیا مقتول نے کسی ''پس و پیش'' کے بغیر چپ چاپ موت کو گلے لگالیا تھا یا آپ مقتول کی اس ''جدوجہد'' کو اپنی رپورٹ کا حصہ بنانا بھول گئے تھے؟''

''وکیل صاحب! آپ نے معذور مقتول عتیق احمد کے حوالے سے جس ''جدوجہد، کوشش اور تگ و دو'' کا ذکر کیا ہے، ایسے کوئی آثار واقعتاً ہمیں جائے وقوعہ پر کہیں دکھائی نہیں دیے۔'' آئی او نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ اپنی وہیل چیئر پر بالکل ایسے بیٹھا ہوا ملا تھا جیسے بیٹھے بیٹھے وہ گہری نیند سو گیا ہو اور اس کی ایسی حالت کا بھی ایک خاص سبب ہے۔''

''گڈ!'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''عدالت اس خاص سبب سے آگاہی حاصل کرنے میں گہری دلچسپی رکھتی ہے آئی او صاحب!''

''جی ضرور۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ ہی کیمیکل ایگزامنر کی لیبارٹری رپورٹ بھی آئی تھی جس میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے کہ مقتول کے معدے میں خواب آور ادویہ کی بھاری مقدار پائی گئی تھی۔ اس امر کا امکان ظاہر کیا گیا ہے کہ مقتول کی گہری بے ہوشی کے دوران میں اس کے گلے میں گرہ نما پھندا لگا کر اسے فنا کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ ایسی بے خبری کی حالت میں وہ بیچارہ کوئی مزاحمت کرنے کے قابل ہی کہاں تھا۔''

''سب انسپکٹر صاحب!'' میں نے آئی او کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر سوال کیا۔ ''تو آپ معزز عدالت کو یہ باور کرانے کی کوشش کررہے ہیں کہ ملزم نے پہلے مقتول کو کوئی نشیلی شے کھلائی تھی۔ جب مقتول بے حس و حرکت ہوگیا تو

ملزم نے اس کی گردن میں نائیلون کی رسی کا پھندا لگا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا؟''

''میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔'' وہ محتاط انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تو کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ پر روشنی ڈالتے ہوئے معزز عدالت کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جائے وقوعہ پر کسی افراتفری اور ابتری کے آثار اس لیے نہیں ملے کہ اپنی موت کے وقت مقتول گہری نیند میں تھا اور.....!'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اور اس بے ہوشی کا سبب وہ میڈیسنز بھی ہو سکتی ہیں جو وہ اپنی معذوری سے نجات حاصل کرنے کے لیے روزانہ باقاعدگی سے لے رہا تھا۔ عین ممکن ہے کسی سکون بخش دوا کی خوراک اوور ہو گئی ہو۔''

''اوور ڈوز!'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگرچہ یہ ممکن نظر نہیں آتا لیکن آپ نے اس امکان کا ذکر کر کے میری سوچ میں ایک نئی کھڑکی کھول دی ہے اور میں اس دریچے سے وہ کچھ دیکھ پا رہا ہوں جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے آئی او صاحب!''

وہ حد درجہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے اس کی الجھن اور حیرانی کو نظر انداز کرتے ہوئے تیز آواز میں استفسار کیا۔

''آئی او صاحب! جب آپ نے گرومندر والے کوچنگ سینٹر سے ملزم کو گرفتار کیا تو وہ کس قسم کا لباس پہنے ہوئے تھا؟''

وہ داؤد احمد کے جواب کو دہراتے ہوئے بولا۔ ''بلیو جینز اور کالی دھاریوں والی شرٹ۔''

''بہت خوب۔'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''یعنی وقوعہ کی صبح جب ملزم اپنے بڑے بھائی سے ملنے اس کے فلیٹ پر پہنچا تو اس نے جو لباس زیب تن کر رکھا تھا، پورا دن وہ انہی کپڑوں میں ملبوس رہا۔''

میری یہ انوکھی اور طنزیہ منطق آئی او کے پلے پڑی اور نہ ہی وکیل استغاثہ کی کھوپڑی میں جگہ بنا سکی اور میں نے انہیں سمجھانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے ٹیبل کیلنڈر پر نگاہ دوڑائی اور تین ہفتے بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ!''

☆☆☆

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے دو گواہ پیش کیے گئے جن میں سے ایک غیر اہم اور دوسرا انتہائی اہم گواہ تھا۔ میں مقتول کی بیوہ ثوبیہ کی بات کر رہا ہوں۔ اس دن کی کارروائی کے لیے میں نے بھی ایک تگڑے صفائی کے گواہ کا بندوبست کر رکھا تھا۔ وہ باوقار شخص کورٹ روم کے باہر اپنے بلائے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ غیر اہم گواہ کو نظر انداز کرتے ہوئے میں سیدھا مقتول کی بیوہ کی طرف آتا ہوں۔

ثوبیہ کی عمر پینتالیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ ایک گوری چٹی اور متناسب البدن خوبصورت عورت تھی۔ ثوبیہ نے خاصا شوخ لباس زیب تن کر رکھا تھا اور اس کا چہرہ بھی میک اپ کی زد میں تھا حالانکہ اس کے قدرتی حسن کو ایسی بیساکھیوں کی ضرورت نہیں تھی۔

ثوبیہ نے اپنا بیان حلفی ریکارڈ کرا دیا تو وکیل استغاثہ جج کی اجازت سے وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔ مناسب الفاظ میں اظہار ہمدردی کرنے کے بعد اس نے اپنے گواہ سے مختصر سی جرح کی۔

''میڈم! وقوعہ کے روز اسکول جانے کے لیے آپ کتنے بجے گھر سے نکلی تھیں؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

''پونے نو بجے۔'' گواہ نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

''اور آپ کی واپسی کب ہوئی تھی؟''

''کم و بیش دو، سوا دو بجے دوپہر۔''

''اس دوران میں آپ تمام وقت اسکول میں رہی تھیں؟''

''جی وکیل صاحب!''

''جب آپ گھر سے روانہ ہوئیں تو مقتول ٹھیک ٹھاک اور بقید حیات تھا؟'' وکیل استغاثہ نے استفسار کیا۔

''جی، بالکل۔'' گواہ نے اثبات میں جواب دیا۔

''اور جب آپ واپس آئیں تو مقتول کی زندگی کا چراغ گل ہو چکا تھا۔'' وکیل استغاثہ نے معتدل انداز میں کہا۔ ''آپ کی غیر موجودگی میں کسی شقی القلب شخص نے آپ کے شوہر کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔''

''کسی نے نہیں، اس بے رحم اور سفاک انسان نے۔'' ثوبیہ نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم انیق احمد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔ ''میری غیر موجودگی میں صرف یہی منحوس شخص ہمارے فلیٹ میں داخل ہوا تھا۔ اس کی آمد عتیق کی موت کے وقت سے گہری مطابقت رکھتی ہے۔''

''دیٹس آل یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے اپنی جرح ختم کرنے کا اعلان کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''یور ٹرنس پلیز!''

اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا اور گواہ کی طرف دیکھتے ہوئے پُرخلوص لہجے میں کہا۔ ''میڈم! مجھے آپ کے نقصان کا بہت دکھ ہے۔''

''وکیل صاحب!'' وہ جلے بھنے انداز میں بولی۔ ''اگر آپ کو عتیق کی موت کا واقعی دکھ ہوتا تو آپ اس کے قاتل کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش نہ کرتے۔''

''میں تو صرف انصاف کا پرچم بلند کرنے کی سعی کر رہا ہوں میڈم!'' میں نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ ''کون گناہ گار ہے اور کون بے گناہ، اس بات کا فیصلہ میں نے نہیں بلکہ اس عدالت نے کرنا ہے جہاں ہم سب اپنا اپنا موقف بیان کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔''

''آپ مجھ سے جھوٹی ہمدردی جتانے کے بجائے اپنا کام کریں۔'' وہ روکھے لہجے میں بولی۔ ''عدالت کا وقت بہت قیمتی ہے وکیل صاحب!''

''آپ کے اس زریں مشورے کا بہت شکریہ ثوبیہ جی!'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور اس کی صلاح کو مقدم جانتے ہوئے اپنا کام شروع کر دیا۔ ''میڈم! ابھی آپ نے میرے مؤکل کی جانب انگلی اٹھا کر بڑے وثوق سے کہا ہے کہ اس بے رحم اور سفاک شخص نے آپ کے غیاب میں فلیٹ نمبر 302 کے اندر گھس کر آپ کے شوہر کو قتل کیا تھا۔ آپ نے یہی کہا ہے نا یا میری سماعت کو دھوکا ہوا ہے؟''

''آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

''کیا یہ سچ ہے کہ وقوعہ کے روز صبح نو بجے سے دوپہر دو بجے تک آپ کنگ گارڈن اسکول میں تھیں؟'' میں نے اپنی جرح میں طراری بھرتے ہوئے سوال کیا۔

''جی ہاں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

''آپ کے اس بیان کے تناظر میں آپ کا یہ دعویٰ باطل ہو جاتا ہے کہ آپ کے شوہر کو میرے مؤکل نے موت کے گھاٹ اتارا تھا کیونکہ اس دوران میں تو آپ جائے وقوعہ پر موجود ہی نہیں تھیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''جب آپ نے اپنی آنکھوں کے سامنے مقتول کو قتل ہوتے نہیں دیکھا تو پھر آپ کا بیان اس اہمیت کا حامل نہیں رہ جاتا جو کسی عینی شاہد کے لیے مخصوص ہے۔ میری بات سمجھ میں آ رہی ہے نا؟''

میرے کڑے استفسار پر وہ تذبذب کا شکار نظر آئی۔ قبل اس کے کہ مقتول کی بیوہ کوئی بے ڈھنگا جواب دیتی، وکیل استغاثہ اس کی مدد کو لپکا۔

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' وہ جج کو مخاطب کرتے ہوئے برہمی سے بولا۔ ''پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول کی موت کا وقت دس اور گیارہ بجے کے درمیان بتایا گیا ہے اور چوکیدار داؤد احمد کے بیان کے مطابق اس ایک گھنٹے کے عرصے میں صرف ملزم ہی مقتول کے فلیٹ میں داخل ہوا تھا لہٰذا ملزم کے سوا اور کوئی شخص قاتل ہو ہی نہیں سکتا۔''

''ڈیفنس!'' جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''یور آنر! استغاثہ کے گواہ داؤد نے معزز عدالت کو بتایا تھا کہ اس نے وقوعہ کی صبح دس بجے میرے مؤکل کو الفاطمہ اپارٹمنٹس میں داخل ہوتے دیکھا تھا اور بیس پچیس منٹ کے بعد ملزم مذکورہ بلڈنگ سے باہر نکل گیا تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''گواہ نے ملزم کو نہ تو مقتول کے فلیٹ کے اندر جاتے اور نہ ہی وہاں سے باہر نکلتے دیکھا تھا۔ الفاطمہ اپارٹمنٹس میں ان آؤٹ ہونے سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوگا کہ ملزم فلیٹ نمبر 302 کے اندر بھی گیا تھا۔''

''لیکن مذکورہ فلیٹ کے مختلف مقامات پر ملزم کے فنگر پرنٹس بھی ملے ہیں۔'' وکیل استغاثہ نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔ ''جب ملزم، مقتول کے فلیٹ میں داخل نہیں ہوا تو پھر وہاں اس کی انگلیوں کے نشانات کیوں پائے گئے ہیں؟''

''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ میرا مؤکل وقوعہ کی صبح دس بجے اپنے بڑے بھائی سے ملنے اس کے فلیٹ پر نہیں گیا تھا۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''میں تو معزز عدالت کو صرف یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ وہ وہاں مقتول سے ملاقات کرنے گیا تھا، اس کی جان لینے نہیں۔''

''اس کا کیا مطلب ہوا؟'' جج نے الجھن زدہ لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

''جناب عالی! میں اسی پوائنٹ کی طرف آ رہا تھا کہ میرے فاضل دوست نے اعتراض جڑ کر جرح کا مزہ کرکرا کر دیا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ مقتول کی بیوہ پر مجھے جرح مکمل کرنے کا موقع دیا جائے۔''

''آبجیکشن اوور رولڈ!'' جج نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''ڈیفنس! پلیز پروسیڈ فردر!''

وکیل استغاثہ معاندانہ نظر سے مجھے گھورنے لگا۔ میں نے کھسیانے بلے کو کھمبا نوچنے کا پورا موقع فراہم کیا اور گواہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے معتدل انداز میں پوچھا۔

''میڈم! کیا آپ کو وقوعہ سے ایک روز پہلے کی دوپہر

یاد ہے یعنی اسکول کی چھٹی کے آس پاس کا وقت؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''جی، یاد ہے۔''

''پھر تو آپ کو یہ بھی اچھی طرح یاد ہوگا کہ اس روز آپ نے کنگ گارڈن اسکول کے نمبر سے ملزم کی خالہ ساس کے گھر فون کیا تھا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

''اس روز ملزم سے آپ کی بات ہوئی تھی۔ آپ نے اس سے کہا تھا کہ وہ آئندہ روز یعنی وقوعہ کی صبح ٹھیک دس بجے اپنے بڑے بھائی سے آکر ملے۔ مقتول آبائی گھر کی فروخت کے ذیل میں اس سے کوئی اہم بات کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وقوعہ کے روز میرا موکل، مقتول سے ملاقات کرنے جائے واردات پر گیا تھا اور وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ.....!''

''یہ جھوٹ ہے..... آپ بکواس کر رہے ہیں.....!'' وہ پھٹ پڑی۔ ''میں نے..... کبھی بھی..... ملزم کو فون..... نہیں کیا۔ مجھے بھلا اس کی..... کیا ضرورت تھی۔''

ثوبیہ کی حالت دیدنی تھی۔ وہ اپنے حواس میں نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے اس کی دکھتی رگ پر گویا انگلی رکھ دی تھی۔ میں نے مقتول کی بیوہ کو اس کے حال پر چھوڑا اور اپنے بیگ میں سے ایک کاغذ نکال کر جج کے سامنے رکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

''یہ شائلہ کی سگی خالہ یعنی ملزم کی خالہ ساس کے فون کا کالز ریکارڈ ہے۔ میں نے تین اگست کی دوپہر کنگ گارڈن اسکول کے نمبر سے خداداد کالونی والے نمبر پر کی جانے والی کال پر مارکر سے دائرہ لگا دیا ہے۔ کنگ گارڈن اسکول کا نمبر میں نے پچھلی پیشی پر اس کیس کی فائل میں لگوا دیا تھا۔''

''ہمارے اسکول میں..... پندرہ سے زیادہ لوگ..... کام کرتے ہیں۔'' میری بات پوری ہوتے ہی ثوبیہ نے چیخ کر کہا۔ ''ان میں ٹیچرز کے علاوہ کلرک، چوکیدار، ماسی اور سوئپر وغیرہ شامل ہیں۔ اگر اسکول کے نمبر سے کسی نے خداداد کالونی فون کیا تھا تو اس کال کا مجھ سے کیا لینا دینا۔ میں نے سب کا ٹھیکا تھوڑی لے رکھا ہے نا۔''

''آپ نے کم از کم اپنا ٹھیکا تو لے رکھا ہے نا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''وقوعہ کے روز لگ بھگ ساڑھے نو بجے آپ اپنی پرنسپل فریدہ لودھی سے یہ کہہ کر گھر چلی گئی تھیں کہ کوئی اہم فائل آپ ساتھ لانا بھول گئی ہیں۔ جب میرا موکل آپ کے فلیٹ پر پہنچا تو آپ وہاں موجود تھیں اور مقتول اپنی وہیل چیئر پر گہری نیند سو رہا تھا۔ آپ نے میرے موکل سے کہا کہ مقتول کو نیند سے جگانا ٹھیک نہیں لہٰذا وہ کل ملنے آجائے۔''

گواہ کا چہرہ متغیر ہوگیا تاہم اس نے ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنی ہٹ دھرمی کو دوام بخشنے کی کوشش کی۔ ''یہ وقوعہ ہے..... ایک روز پہلے یعنی تین اگست..... کا واقعہ ہے کہ میں اپنی پرنسپل ہے..... چند منٹ کی چھٹی لے کر..... گھر گئی تھی..... اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں تو..... آپ پرنسپل صاحبہ سے پوچھ سکتے ہیں۔''

''یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک سمجھا ہے کہ مجھے آپ کی بات کا یقین نہیں ہے اور میں کنگ گارڈن اسکول کی پرنسپل فریدہ لودھی کو گواہی کے لیے یہاں بلائے بغیر بھی آپ کے جھوٹ کا ''پوسٹ ماٹم'' کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔'' میں نے مقتول کی بیوہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے خاصے خطرناک لہجے میں کہا۔ ''میرے توسط سے معزز عدالت یہ جاننے کے لیے بے تاب ہے کہ جب آپ صبح اسکول جانے کے لیے فلیٹ سے نکلتی ہیں تو گھر کا داخلی دروازہ کھلا چھوڑ دیتی ہیں یا.....؟''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ ترنت بول پڑی۔ ''فلیٹ کے داخلی دروازے کو کھلا چھوڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے مذکورہ دروازے کے درمیانی حصے میں ایک سادہ سی چٹخنی لگوا رکھی ہے۔ عتیق اپنی وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے اِدھر اُدھر بہ آسانی چلا جاتا تھا۔ جب میں اسکول کے لیے فلیٹ سے نکلتی تھی تو عتیق اندر سے کنڈی لگا دیا کرتا تھا اور جب میں واپس آتی تھی تو وہ کنڈی ہٹا کر دروازہ کھول دیتا تھا لیکن وقوعہ کے روز جب میں اسکول سے آئی تو دروازہ کھلا ہوا تھا..... یعنی اسے اندر سے کنڈی نہیں لگائی گئی تھی جبکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ صبح جب میں فلیٹ سے نکلی تھی تو عتیق نے باقاعدہ کنڈی لگائی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ.....!'' وہ سانس لینے کے لیے رکی پھر ان الفاظ میں بات مکمل کردی۔

''عتیق نے ملزم کے لیے دروازہ کھولا ہوگا اور..... یہ کمبخت اسے قتل کرکے چپ چاپ فلیٹ سے نکل گیا۔ اس شیطان نے فلیٹ کا دروازہ تو بھیڑ دیا مگر اندر سے کنڈی نہ لگ سکی..... کیونکہ..... کنڈی لگانے والا تو..... موت کی آغوش میں جاچکا تھا۔''

''آپ نے میرا کام بہت آسان کردیا ہے یعنی آپ کا جھوٹ معزز عدالت کے سامنے عیاں ہوچکا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''جناب عالی! کیمیکل ایگزامنر کی لیبارٹری رپورٹ نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ مقتول کو حالتِ بے ہوشی میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ مقتول کے معدے سے حاصل کیے گئے مواد میں خواب آور ادویہ کی بھاری مقدار پائی گئی ہے اور میں یہ ثابت کرسکتا ہوں کہ مقتول کی وہ نیند کسی اوور ڈوز کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ایک منظم سازش کے تحت اسے نیند کی اتنی زیادہ دوائی کھلادی گئی تھی کہ جب اس کی گردن میں پھندا کس کر اسے موت کی نیند سلایا جائے تو وہ ایک ذرا سی مزاحمت بھی نہ کرسکے۔ ثوبیہ کی طویل ترین وضاحت کو اس لیے بھی لائقِ توجہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ گہری نیند میں پہنچا ہوا مقتول اپنی وہیل چیئر کو حرکت دے کر ملزم کے لیے فلیٹ کا دروازہ نہیں کھول سکتا تھا۔''

''آپ کیسے ثابت کریں گے کہ مقتول کی وہ گہری نیند کسی اوور ڈوز کا نتیجہ نہیں تھی؟'' وکیل استغاثہ نے براہِ راست مجھ سے سوال کیا۔ ''عتیق کافی عرصے سے میڈیکیشن پر تھا۔ اس کے ساتھ کوئی بھی اپ سیٹ ہوسکتا تھا۔''

''جناب عالی!'' میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس وقت میں اپنی جرح کے ایسے مقام سے گزر رہا ہوں کہ وہ وقت دور نہیں جب میں بھری عدالت میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرکے دکھاسکتا ہوں۔ ایسے نازک موقع پر پراسیکیوشن کی مداخلت بیجا مجھے شاق گزر رہی ہے۔ بہرکیف، میں ان کے موجودہ سوال کا جواب دے رہا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی فاضل دوست سے میری التجا ہے کہ جب تک میں مقتول کی بیوہ پر یہ اہم جرح مکمل نہ کرلوں، استغاثہ اپنی زبان کو دانتوں تلے دبا کر رکھے تو بڑی نوازش ہوگی۔''

میرے ان سلگا دینے والے الفاظ نے وکیل استغاثہ کی طبیعت صاف کردی۔ قبل اس کے کہ جواب میں وہ بھی کوئی سخت بات کرتا، جج نے مجھ سے کہا۔

''بیگ صاحب! آپ اپنی جرح جاری رکھیں۔''

''میرے فاضل دوست!'' میں نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''جب کسی شخص کے بدن کے کسی حصے پر فالج گرتا ہے تو میڈیکل کی زبان میں اسے نیوروز (اعصابی خلیہ جات) کی بے بسی اور ناکامیابی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نیوران دراصل وہ سیلز ہوتے ہیں جو دماغ کے مرکز سے جسم کے مختلف حصوں تک مخصوص پیغامات لے کر جاتے ہیں۔ بدن کے جس بھی مقام کو تحریک دینے والے یہ پیغام رساں سیلز اپنی فطری کارکردگی کھو بیٹھتے ہیں، جسم کا وہ حصہ مفلوج ہوجاتا ہے یعنی اس حصے میں نہ تو کسی قسم کی حرکت باقی رہتی ہے اور نہ ہی کوئی احساس بیدار ہوتا ہے۔ مذکورہ حصے کو مردہ یا بے جان کہا جاتا ہے اور اس کے علاج کے لیے مریض کو ہمیشہ ایسی ادویہ کھلائی جاتی ہیں جو ان ناکارہ نیوروز میں زندگی کی لہر دوڑا کر ''نیوروٹرانسمیشن'' کے عمل کو جاری کرسکیں اور ان ادویہ میں کوئی بھی نیند آور گولی شامل نہیں ہوتی۔ ویسے بھی کسی فالج زدہ شخص کو ایک عام انسان کی بہ نسبت زیادہ نیند آتی ہے۔''

لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی وضاحت کو مکمل کرتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا۔

''اس میڈیکل پس منظر میں یہ تو ثابت ہوجاتا ہے کہ مقتول کی معمول کی میڈیکیشن میں ایسی کوئی دوا شامل نہیں تھی جس کی اوور ڈوز سے وہ غفلت کی ایسی گہری نیند میں چلا گیا تھا کہ جب اس کی گردن کے گرد موت کا پھندا کسا گیا تو وہ اپنے بچاؤ کے لیے ایک ذرا سی مزاحمت بھی نہیں کرسکا تھا۔''

''نیند کی دوا اسی کمینے نے میرے شوہر کو کھلائی ہوگی۔'' ثوبیہ ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ ''تاکہ اس کا کام آسان ہوجائے۔ جب عتیق بے ہوش ہوگیا تو اس ظالم انسان نے نائیلون کی مضبوطی سے اس کا گلا دبادیا۔''

''منہ کے راستے لی گئی نیند کی کوئی بھی دوا فوری طور پر اثر نہیں کرتی میڈم!'' میں نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جما کر طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اس ذریعے سے نیند طاری ہونے میں کم از کم چالیس منٹ یا اس سے بھی زیادہ وقت لگ سکتا ہے جبکہ حالات و واقعات کے مطابق میرا مؤکل جائے وقوعہ پر بہ مشکل بیس سے پچیس منٹ رہا تھا۔ یہ بھی فرض نہیں کیا جاسکتا کہ ملزم نے مقتول کو بے ہوشی کا انجکشن دیا تھا جس کے نتیجے میں وہ فی الفور اثاغفیل ہوگیا تھا۔ مقتول کے معدے سے ملنے والی خواب آور دوا کی بھاری مقدار اسی جانب اشارہ کرتی ہے کہ قاتل نے اسے موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے بے ہوشی طاری کرنے والی گولیاں کھلائی تھیں اور سب سے اہم بات یہ کہ.....!'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کرکے ایک طویل اور گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''میڈم! وقوعہ کی صبح آپ کے بیان کے مطابق..... جب نو بجے اسکول جانے کے لیے آپ گھر سے نکلیں تو مقتول زندہ سلامت اور بہ قائمی ہوش و حواس تھا اور اس نے خود داخلی دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی تھی۔ ایک گھنٹے

بعد ملزم آپ کے فلیٹ پر پہنچتا ہے تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس کے لیے دروازے کی کنڈی کس نے کھولی تھی کیونکہ پوسٹ مارٹم اور کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ کے مطابق وقوعہ کے روز صبح دس بجے مقتول گہری نیند میں تھا اور اسی نیند میں اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا گیا تھا؟''

میں نے استغاثہ کی گواہ اور مقتول کی بیوہ ثوبیہ کے گرد اپنی جرح کا شکنجہ ایسی مہارت سے کسا تھا کہ اس کے فرار کی تمام راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ اس نے اضطراری انداز میں امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔

''میڈم! ادھر..... میری طرف.....!'' ثوبیہ کی مکاری اور چرب زبانی نے مجھے ''آپ'' سے ''تم'' پر آنے کے لیے مجبور کر دیا۔ میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''تمہاری مدد کے لیے اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا اس لیے میری بات کو توجہ سے سنو اور اس کا بالکل درست جواب دو۔''

وہ میکانکی انداز میں سر ہلا کر رہ گئی۔

''کنگ گارڈن اسکول سے تمہیں کتنی تنخواہ ملتی ہے؟'' میں نے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔

اس نے جواب دیا۔ ''دو ہزار روپے۔''

''کیا ساڑھے تین ہزار روپے میں تمہارا گزارہ ہو جاتا تھا؟''

''میں نے اپنی تنخواہ دو ہزار روپے بتائی ہے۔''

''اور میں نے ان دو ہزار میں ڈیڑھ ہزار وہ بھی شامل کر لیے ہیں جو فلیٹ نمبر A-304 سے کرائے کی مد میں ہر ماہ آتے ہیں۔''

ثوبیہ کی رنگت اڑ گئی۔ یکا یک وہ صدیوں کی بیمار نظر آنے لگی۔ بے ساختہ جج نے مجھ سے پوچھا۔

''بیگ صاحب! کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مذکورہ فلیٹ ثوبیہ کی ملکیت ہے جو ڈیڑھ ہزار ماہانہ کرائے پر اٹھا ہوا ہے؟''

''یس یور آنر! میں یہی کہنا چاہ رہا ہوں اور وہ بھی ٹھوس ثبوت کے ساتھ۔'' میں نے توانا لہجے میں جواب دیا اور اپنے بیگ سے چند قانونی دستاویزات کی فوٹو کاپیاں نکال کر جج کی میز پر رکھتے ہوئے کراری آواز میں کہا۔

''جناب عالی! ان کاغذات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فلیٹ نمبر 302 اور 304 ثوبیہ عتیق کی ملکیت ہیں جن میں سے چھوٹے فلیٹ یعنی 302 میں یہ لوگ خود رہتے تھے اور دوسرا بڑا فلیٹ حاجی عدیل نامی ایک شخص کو کرائے پر دے رکھا ہے۔ یہ دونوں فلیٹ انہی چار لاکھ روپے سے خریدے گئے تھے جو مقتول نے اپنا آبائی مکان جعلسازی سے فروخت کر کے لطیف شیخ سے حاصل کیے تھے۔ مرحوم شفیق احمد کا ڈھائی لاکھ کا قرض اتارنا ایک بہانہ تھا۔ یہ گھناؤنا کھیل مقتول اور اس کی بیوی کی بدنیتی کا شاخسانہ ہے۔ حاجی عدیل اس وقت عدالت کے باہر موجود ہے۔ اسے اندر بلا کر اس معاملے کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔'' ثوبیہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''میں ان معاملات کو سیٹل کرنے کے لیے ڈیڑھ یا فلیٹ ملزم کو دینے کے لیے تیار ہوں۔''

قانون کی زبان میں ثوبیہ نے ''اقبالِ جرم'' کر لیا تھا لیکن میں اسے اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر سخت لہجے میں کہا۔

''میڈم! میکنے کی قربانی دینے سے بات نہیں بنے گی۔ میکنے (302) کے ساتھ ہی اس کی ماں (304) کو بھی بلی چڑھانا پڑے گا۔ یہ دونوں فلیٹس جائیں گے میرے مؤکل کی کسٹڈی میں اور تمہارا مستقل ٹھکانا بنے گی جیل..... اپنے شوہر کے قتل کے جرم میں اگر تمہیں پھانسی نہیں بھی ہوئی تو عمر قید کی سزا ضرور ہو گی۔'' میں لمحے بھر کے لیے تھما پھر سرسراتی ہوئی آواز میں اضافہ کر دیا۔

''اس کو کہتے ہیں..... مال کار..... یعنی کرنی کا پھل اور تم نے یہ تو سنا ہی ہو گا کہ..... جیسی کرنی، ویسی بھرنی!''

یہ کہانی یہیں پر ختم ہو جاتی ہے لیکن ثوبیہ نے اپنے شوہر کو موت کے گھاٹ اتارنے کے حوالے سے عدالت میں جو لمبا چوڑا بیان دیا، میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

عتیق احمد نے جعلسازی سے آبائی مکان فروخت کر کے اپنی بیوی کے نام یہ دو فلیٹس تو خرید لیے تھے لیکن انیق احمد جب کویت سے لٹ پٹ کر یہاں آیا تو چھوٹے بھائی کے لیے اس کے دل میں ایک نرم گوشہ وا ہو گیا تھا۔ وہ ان میں سے ایک فلیٹ انیق کو دینے کا فیصلہ کر چکا تھا اور اسی حوالے سے بات کرنے کے لیے اس نے وقوعہ کی صبح انیق کو اپنے پاس بلایا تھا مگر ثوبیہ کچھ اور ہی سوچے بیٹھی تھی۔ اس عیار عورت نے ایسی چال چلی کہ معذور شوہر سے بھی جان چھوٹ جائے اور انیق کی صورت میں سر پر منڈلانے والا خطرہ بھی ہمیشہ کے لیے ٹل جائے لیکن وہی بات کہ یہ دنیا دارالعمل ہے۔ یہاں پر اپنی کرنی کی فصل سب کو کاٹنا پڑتی ہے۔

(تحریر: حسام بٹ)

pklibrary.com

جشنِ آزادی کے موقع پر محبِ وطن کے لیے ایک خوبصورت تحفہ

عشاقِ وطن

عیوق بخاری

محبت کسی بھی روپ میں ہو جذبوں کی سچائی اور خوابوں کی قربانی مانگتی ہے... محبت ثابت کرنے کے لیے اپنی ذات کو بُھلانا پڑتا ہے... جنہوں نے بُھلادیا انہوں نے پالیا... اور جو پایا اس سے نسلیں فائدہ اٹھانے والی ہیں لیکن اس فائدے کو پانے والوں کو اپنے پیاروں کی قربانیوں اور وفاؤں کو بھی یاد رکھنا چاہیے تھا... اور یاد رکھنے کا خوبصورت طریقہ تھا کہ اس کی اس طرح حفاظت کی جاتی جیسے اس کا تقاضا تھا۔

pklibrary.com

"تُو میرا دلبر جان..... تُو میرا پاکستان۔" وطن کی محبت میں گندھی آواز گاڑی میں گونج رہی تھی اور سجاد حسین ان بولوں کی شیرینی کو محسوس کر رہے تھے۔ ان لفظوں کے پیچھے جذبات کو سمجھتے ہوئے اطمینان و خوشی سے مسکرا رہے تھے۔ گاڑی میں چلتا نغمہ اور باہر جگہ جگہ لگی جھنڈیاں، لہراتے سبز پرچم ان کے دل کی کیفیت کو عجیب گدازیت دے رہے تھے۔ سجاد حسین خوش تھے، بے حد خوش..... ان کو گویا قرار آ گیا تھا۔

☆☆☆

سجاد حسین ایک ریٹائرڈ، ایماندار سرکاری ملازم

تھے۔ ساری زندگی شرافت اور اچھائی و سادگی سے گزاری۔ پابند صوم وصلوٰۃ، پاکستان و نظریۂ پاکستان سے دل و جان سے جڑے ہوئے اس شخص نے اپنی اولاد کی تربیت حلال کمائی اور اپنے اصولوں کے مطابق کی۔ بیوی زرین بیگم جو ریٹائرڈ ٹیچر تھیں، انہوں نے بھی شوہر کا بھرپور ساتھ دیا، فرمانبردار بیوی بن کر۔ کم لیکن حلال میں گزارہ کیا اور تین بچوں کامران سجاد، ارسلان سجاد اور علوینہ سجاد کو اچھے انداز میں تربیت دی۔

علوینہ لیکچرار بن گئی اور اپنے گھر کی ہوگئی تھی۔ بیٹوں نے سجاد حسین کو ملنے والی پنشن کی رقم اور خاندانی جو تھوڑی سی زمین تھی، فروخت کرکے اپنا بزنس شروع کیا جو جلد ہی کامیاب ہوگیا۔ نیک والدین کی دعاؤں کی برکت سے کاروبار دن دُگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ بیٹوں کی بھی شادیاں ہوگئیں۔ نواسے، نواسیاں، پوتے پوتیاں سجاد حسین اور زرین بیگم کی زندگی میں ایک اور بہار لے آئے۔ سجاد حسین تو پہلے بھی قناعت پسند تھے، اب تو ضرورتوں سے زیادہ اور توقع سے زیادہ بڑھ کے خوشیاں مل گئی تھیں تو ہر وقت رب کا شکرانہ ادا کرتے۔ زندگی اچھی بھلی گزر رہی تھی لیکن..... یہ ہوا کہ... سجاد حسین اچانک ہی ایک بات کی وجہ سے بے چین سے رہنے لگے۔ ان کو یہ بے چینی ایک جشنِ آزادی پر ہوئی اور پھر ہر برس وہ مزید بے چین ہوتے گئے۔ انہیں قوم سے شکوہ سا ہونے لگا تھا۔

''آپ تقریب میں گئے تھے، کیسی رہی؟ تھکے تھکے سے لگ رہے ہیں۔'' 14 اگست کی شام تھی۔ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے ہوئے سجاد حسین سے زرین بیگم نے سوال کیا۔ وہ ان کے لیے چائے کا کپ لے کر آئی تھیں۔ زرین بیگم کا معمول تھا کہ شام کی چائے شوہر کے لیے خود ہی بناتی تھیں۔ بہوؤں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود انہوں نے اس معمول کو نہیں چھوڑا تھا۔

''شادی کے بعد یہ کام شروع کیا۔ بچوں کے بڑے ہونے، شادیاں کرنے تک چائے بنائی۔ اب تو یہ کام زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ میں یہ معمول نہیں چھوڑ سکتی۔'' زرین بیگم نے بہوؤں کو بتایا تو سجاد حسین مسکرا کر بولے۔

''ہاں بھئی، واقعی ان کی چائے بڑی کڑک ہوتی ہے اور مجھے بھی اس کی عادت ہوگئی ہے اور سچ کہوں، اس کپ کی وجہ سے ہی میں نے تمہاری ساس کو گھر میں رہنے کی اجازت دی ہے۔'' سجاد حسین نے جملے کا پہلا حصہ عام انداز اور اونچی آواز میں جبکہ اگلا حصہ سرگوشی کے انداز میں ذرا آہستہ کہا لیکن آواز اتنی ضرور رکھی گئی کہ زرین بیگم کانوں تک پہنچ جائے۔

''لو بیٹا! سن لیا؟ خود سوچو کیسے نہ روز چائے بناؤ اس وجہ سے تو میرا گھر بسا ہوا ہے۔'' زرین بیگم شوہر کی بن کر مصنوعی خفگی اور دکھ سے بولیں اور ساری محفل میں گونج اٹھے اور پھر بہوؤں نے ''بیچاری'' ساس کے ''بسے'' رہنے کی خاطر چائے بنانے کی اجازت دے دی۔

آج جب زرین چائے کا کپ تھما رہی تھیں تو انہوں نے نوٹ کیا کہ سجاد حسین کی نظریں ٹی وی پر ضرور ہیں سوچ کچھ اور ہی رہے ہیں۔

''تھکا ہوا تو نہیں لیکن ایک کسلمندی سی ہو رہی ہے۔'' سجاد حسین نے کپ تھامتے ہوئے کہا۔

''کیوں خیریت، طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' زرین تشویش سے بولیں۔

''ارے گھبرانے کی بات نہیں، طبیعت ٹھیک ہے۔ بس آج میں نے کچھ ایسا محسوس کیا ہے جو مجھے چبھ دے رہا ہے۔ میں جس تقریب میں گیا تھا نا، اس مختلف اسکولز کے بچے موجود تھے۔ تقریری اور ڈرا کے مقابلے تھے۔ سب بڑا اچھا ہوا۔ نتائج کا اعلان پہلی، دوسری، تیسری پوزیشنز والوں کو انعامات دیے۔ اسی دوران میں نے ایک لڑکے کو یہ کہتے سنا کہ ''ہماری اچھی تھی لیکن پہلا انعام دوسرے اسکول کو مل گیا۔ مجھے پر بہت غصہ آرہا ہے۔'' اس پر دوسرا بولا۔ ''اگلی پا پروگرام ہوا تو ہم مقابلہ جیتنے کی پوری کوشش کریں۔ اس اسکول کو تو کوئی بھی پوزیشن نہیں لینے دیں گے۔'' طرح کی بات کرتے رہے اور میں سنتا ہوا کچھ سے کچھ چلا گیا۔'' سجاد حسین نے چائے کے سپ لیتے ہوئے آہستہ بات بتائی۔

''کیا سوچا آپ نے، یہ تو بتائیں؟'' زرین بیگ ٹی وی کی آواز بند کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے وہی سوچا جو نظر آرہا تھا۔ آزاد تقریب، یوم آزادی کی خوشی، قربانیاں یاد کرنے کا دا اور ادھر دیکھیں ذرا مقابلے کیے جارہے ہیں، فتا شکایتیں ہو رہی ہیں۔ کسی کو خیال ہی نہیں کہ آج صرف پرستی دکھانے کا دن ہے۔ مقابلوں سے بھلا محبت آسکتی ہے؟ مقابلہ کرکے جیتنے، ہارنے والے اپنے جذبات میں ہیں۔ پاکستان کیسے بنا، کیا قربانیاں دی کیا تکالیف پیش آئیں؟ یہ سب سوچنا بھول جاتے

سفید سوٹ، سبز کیپ اور دوپٹا، بیج..... یہ سب لگا کر بس فوٹو سیشن کروایا جاتا ہے۔ وطن سے تو کوئی عشق کرنا دور کی بات، محبت تک نہیں کر رہا۔ جذبات تو رہے نہیں..... ہونہہ..... مقابلہ، پوزیشن، ناراض ہونا..... یہ ہے 14 اگست۔'' سجاد حسین بولنے پر آئے تو پھٹ پڑنے کے انداز میں بولے۔

''سجاد! آپ خوامخواہ ٹینشن لے رہے ہیں۔ آپ نے تقاریر سنی ہوں گی جن میں بچے بچیوں نے شہداء اور بزرگوں کی قربانیوں، ہجرت کا ذکر کیا ہوگا پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ کسی کو کچھ یاد نہیں؟'' زرین بیگم نے شوہر کو تسلی دی۔

''نہیں زرین بیگم! نہیں..... میں خوامخواہ ٹینشن میں نہیں ہوں۔ میں نے دیکھا ہے، محسوس کیا ہے لوگ وطن سے پیار نہیں کرتے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بس فوٹیج کے لیے سب کیا جاتا ہے۔ وطن سے عشق کسی کو رہا ہی نہیں۔'' سجاد حسین نے شکوہ بھرے انداز میں کہا۔ ایک اسٹوڈنٹ کی کہی گئی بات نے انہیں بہت ناراض کر دیا تھا۔

''یوم آزادی جذبے اور عشق سے ہم منایا کرتے تھے۔ اسکول گھر سے بہت دور تھا، پیدل آیا جایا کرتے تھے۔ 13 اگست کو سب طلباء مل کر کمرے جماعت صاف کرتے، اپنی اپنی جماعت کا کمرا صاف کرنے کے بعد صحن میں صفائی کرتے۔ ہر کلاس کا ہر لڑکا اس کام میں سبقت لے جانے میں کوشاں ہوتا۔ ان دنوں یہ منحوس موبائل نہیں تھا کہ کوئی اپنے ہی تعلیمی ادارے، اپنی مادرِ علمی کی خدمت کرتے ہوئے بچوں کی ویڈیو بنا کر سوشل میڈیا پر ڈال دے اور معلم کو طعنے دلوائے کہ بچے کیوں صفائی کر رہے ہیں۔'' سجاد حسین نے بچپن کی یادیں کریدتے ہوئے موجودہ دور کا ایک اور شکوہ کر ڈالا۔

زرین بیگم ہمہ تن گوش بیٹھی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کے شوہر خوب سارا بول لیں تاکہ رات کے کھانے سے پہلے اعصابی تناؤ دور یا کم از کم کچھ تھوڑا ہو جائے۔ سجاد حسین اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھے۔

''پانی کا چھڑکاؤ کر کے اگلے دن کی تقریب کے لیے فرنیچر ترتیب سے رکھتے، جھنڈیاں لگائی جاتیں، سفید چونے سے روشیں سجائی جاتیں اور پھر چوکیدار کو رات کے وقت اچھی طرح خیال رکھنے کی تاکید کر کے ہم دن ڈھلنے کے بھی کافی دیر بعد پیدل چلتے ہوئے گھر آتے تو گرد آلود کپڑوں، چہرے کو دیکھ کر اماں جان ہنس کر کہتیں۔ ''لگتا ہے میرے بیٹے نے یوم آزادی کے لیے سب سے زیادہ کام کیا ہے۔''

ان کے لہجے میں فخر و خوشی ہوتی جیسے بیٹا کوئی جہاد یا قومی سلامتی کا اہم کام سرانجام دے آیا ہے۔ 14 اگست کا سارا دن وطن کی محبت کی تقریروں اور نغموں میں گزرتا۔ استاد محترم سعید الدین صدیقی صاحب قیام پاکستان، ہجرت اور آزادی کی اہمیت پر جذباتی تقریر کرتے اور ہم چھٹی کے بعد ان کی باتوں کو دہراتے ہوئے گھر واپس آتے۔ ابا جان ہر یوم آزادی پر گڑ کے چاول پکواتے تھے۔ ان چاولوں میں گڑ کے علاوہ میووں کا بھرپور استعمال کیا جاتا۔ اماں جان بہت بڑے دیگچے میں یہ چاول پکاتیں اور پورے محلے میں اور جہاں جہاں ہمارے دوست اور واقف کار رہتے تھے، وہاں تقسیم کیے جاتے۔ یہ میٹھا پکوان وطن حاصل کرنے کی خوشی میں پکایا اور بانٹا جاتا تھا۔ ابا سفید کلف والا سوٹ اور پگڑی پہن کر صحن میں شیشم کے درخت کے نیچے پڑے موڑھے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھے ہوتے اور اماں کو پلیٹوں میں چاول ڈالتے۔ ہمیں تقسیم کرتے دیکھتے ہوئے چھوٹی چھوٹی باتیں بتاتے جو تحریکِ آزادی سے ہجرت تک کی ہوتیں۔ بڑا مزیدار جذباتی سا ماحول ہوتا۔ جب گڑ کے چاول تقسیم کر کے اتنے بچتے کہ بس گھر والوں کے لیے کافی ہوں تو ہم دوپہر کا کھانا کھانے بیٹھتے۔ اماں جان اپنے جہیز کی چینی کی پلیٹیں خاص اس دن کے لیے نکالتیں۔ سفید پلیٹیں جن میں زرد اور سبز چھوٹے چھوٹے پھول بنے ہوئے تھے۔ بڑے سے برآمدے میں چٹائی اور سفید چادر بچھا کر ان پلیٹوں میں اہل خانہ کے لیے میووں بھرے گڑ کے چاول ڈالے جاتے اور اس کے ساتھ دیسی مرغی کا مزیدار شوربے والا سالن اور گھر کے تنور پر لگی ہوئی سوندھی خوشبو والی روٹیاں ہوتیں۔ گڑ کے چاول اور سالن اماں جان بناتی تھیں اور روٹیاں ہماری خاندانی ملازمہ صابرہ خالہ کے ہاتھ کی ہوتیں۔ سارا دن اسکول میں گزارنے، گھر گھر چاول بانٹنے کے بعد خوب بھوک لگی ہوتی۔ مٹی کے گھڑے سے ٹھنڈا پانی جگ بھر کر پاس رکھا جاتا اور پاکستان کی سالگرہ کا کھانا بڑے مزے سے کھایا جاتا۔ ابا بیچ بیچ میں کوئی نہ کوئی قصہ سناتے رہتے اور ہم روٹی کھا کر سفید پلیٹیں ہاتھ میں تھامے گڑ کے چاول کھاتے ہوئے بڑی توجہ سے سب سنتے۔ ہر سال پاکستان سے متعلق علم میں اضافہ ہوتا۔ ہر سال خاص انداز میں کھانا تقسیم کرنے اور کھانے سے پتا چلتا کہ آج خاص دن ہے۔ بغیر ائرکولر اور اے سی کے 14 اگست خوب حب الوطنی کے جذبات کے ساتھ منایا جاتا۔ کوئی تصویر نہیں بنتی تھی، کوئی سوشل میڈیا نہیں تھا۔ کسی کو

pklibrary.com

تصویریں دکھانے، شومارنے کے لیے نہیں بلکہ صرف اور صرف اپنے لیے اپنے وطن کی آزادی کا دن منایا جاتا تھا۔'' سجاد حسین بچپن کی یادوں میں کھو کر بول رہے تھے۔ بولتے ہوئے لبوں پر دھیمی سی مسکان بتا رہی تھی کہ زمانۂ طالب علمی کے 14 اگست کی یادیں ان کے دل و دماغ کو تر و تازہ کر رہی ہیں۔

''اور آج یہ حال ہے کہ پوزیشن لیتے، تصویریں بناتے، بنواتے اور متوقع نتائج نہ ملنے پر بولتے ہوئے جشنِ آزادی منایا جاتا ہے۔'' یکدم لہجہ بدل کر وہ پھر بولے۔ وہ حسین ماضی سے اس حال میں واپس آچکے تھے جس میں وہ کچھ لوگوں سے ناراض و نالاں تھے۔

☆☆☆

''ابا جی! ''بنیان مرصوص'' کی فتح کے بعد آنے والا یوم آزادی مبارک ہو۔'' بڑی بہو رضوانہ نے خوشدلی سے مسکراتے ہوئے سسر کو مبارک باد دی۔ صبح کا وقت تھا، نماز پڑھ کر اور واک کر کے سجاد حسین گیٹ سے اندر داخل ہوئے تھے۔

''خیر مبارک بیٹا! تمہیں بھی مبارک ہو۔ خدا ہماری قوم کے جذبے اور آرمی کی طاقت کو سلامت رکھے۔ شکر ہے کہ ہم فاتح بنے اور ایک پُرامن، مضبوط، ناقابلِ تسخیر وطن کا یومِ آزادی منا رہے ہیں۔'' سجاد حسین نے رک کر بہو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''مبارک تو انہیں دے دی ہے، اب تھوڑا سا یہ بھی بتا دو کہ خدا کے لیے جس تقریب میں جائیں، انجوائے کریں۔ آکر شکوے، شکایتیں کرتے ہوئے اپنے ہی انداز کا فلسفہ نہ جھاڑنے بیٹھ جائیں۔'' پودوں پر پائپ سے پانی کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے زرین بیگم ہنسیں۔

''اوہ ہاں، یاد آیا۔ مجھے تو جلدی نکلنا ہے۔ گراؤنڈ میں تقریب منعقد ہے اور مجھے مدعو کیا گیا ہے۔ بیٹا جلدی سے ہلکا سا ناشتا دے دو۔'' بیوی کی بات سن کر سجاد حسین تیزی سے بولتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب بڑھے اور الماری کھول کر سفید سوٹ نکالنے لگے جو اس دن کے لیے سلوایا گیا تھا۔

☆☆☆

''مختلف اسکولز کے طلبا و طالبات کے درمیان تقریروں کا صحت مندانہ مقابلہ شروع ہونے والا ہے۔ اس مقابلے کا سب سے اہم مقصد طلبہ کو موقع فراہم کرنا ہے کہ وہ وطن سے محبت کا اظہار کریں اور اس کے ساتھ ہی اعتماد، لفاظی، اردو پر عبور کے فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ میں سب سے پہلے اسٹیج پر بلانا چاہوں گا.....''

کمپیئر نے بولنا شروع کیا تو سجاد حسین کو وہ تقریری مقابلہ یاد آگیا جب چند طلبہ تو ناراض ہوئے ہی تھے، سجاد حسین بھی دکھی ہوئے تھے۔ یہ یاد آتے ہی وہ فوراً اٹھے اور خاموشی سے تقریب چھوڑ کر باہر نکل آئے۔

'بچے لگے رہیں اپنے شوق میں..... اچھی بات ہے لیکن مجھ سے اب یہاں نہیں بیٹھا جائے گا۔' سوچتے ہوئے وہ گاڑی تک آئے اور پھر اسٹارٹ کر کے گھر کے بجائے ادھر اُدھر گھومنے لگے۔ دو چار بازاروں کی سجاوٹ دیکھتے ہوئے وہ مارکیٹ کے دوسری جانب نکل آئے اور شہر سے باہر جانے والی سڑک پر ڈرائیو کرنے لگے۔ نارمل سی اسپیڈ کے ساتھ وہ شہر کی پُررونق و پُرشور فضا سے دور ہوتے ہوئے سکون سا محسوس کر رہے تھے۔ کچھ کلومیٹر کے بعد ان کا واپسی کا ارادہ تھا لیکن درختوں کا سلسلہ شروع ہوتے ہی جونہی انہوں نے کار کے شیشے نیچے کیے، اندر داخل ہونے والی تازہ ہوا نے ان کے دل و دماغ کو تر و تازہ کرتے ہوئے آگے بڑھنے پر مجبور کیا اور وہ بلا ارادہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ اسی دوران ایک موڑ مڑے تو ٹیوب ویل پر نظر پڑی۔ اس کے صاف و شفاف تیزی سے بہتے پانی کو دیکھ کر سجاد حسین نے گاڑی روکی اور باہر نکل آئے۔ گھنے درخت، ہلکی ہلکی چلتی ہوا، ہرا بھرا کھیت، ٹیوب ویل کے چلنے کی مسحور کن آواز اور ڈھیر سارا سکون۔ سجاد حسین کھو سے گئے۔ انہیں ایک بار پھر بچپن کی یادوں نے گھیر لیا۔ وہ ان دنوں کے بارے میں سوچنے لگے جب وہ بھی ایسے ہی گاؤں کے رہائشی تھے۔ صبح صبح تازہ مکھن، دیسی انڈے کا ناشتا کر کے شبنم میں نہائے کھیتوں کی پگڈنڈیوں سے گزر کر اسکول جاتے، شام کو کھلے میدان میں خوب کھیلا جاتا۔ رات کو دلچسپ کہانیاں سن کر، موبائل و ٹی وی اسکرین کی تھکن سے کوسوں دور پُرسکون نیند سوتے، چھٹی کا دن ٹیوب ویل میں نہاتے، گنے، بھٹے، تازہ مولی، گاجر کھاتے اور کھیلتے کودتے گزرتا۔

'سب کتنا تازہ، کتنا پُرسکون، کتنا اچھا تھا۔ بناوٹ و مصنوعی چیزوں سے پاک۔ اب تو کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا۔' پرانی یادیں دہراتے دہراتے سجاد حسین نے سوچا اور گاڑی کا دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ان کی نظر اپنے سے ذرا فاصلے پر ایک منظر پر پڑی۔ وہ حیران سے ہوئے اور اسے دیکھتے ہوئے جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور بڑی تیزی سے وہاں جا پہنچے جہاں انہیں حیران کن منظر نظر آیا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی کھوکھا دکان تھی جس میں

تھوڑی سی اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ کھوکھے کے قریب موجود گھنے درخت کے نیچے پنکچر لگانے کا بھی سامان پڑا تھا۔ سجاد حسین کو چیز خریدنا تھی نہ پنکچر کا کام تھا۔ وہ تو کچھ اور ہی دیکھ کر ادھر آئے تھے اور اب گاڑی سے اتر کر اسے قریب سے دیکھ رہے تھے۔

درخت اور کھوکھے کے درمیان کافی ساری ٹہنیاں تھیں۔ ان ٹہنیوں پر بڑی خوبصورتی سے جھنڈیاں لٹکائی گئی تھیں۔ یہ بہت کم تعداد میں تھیں یعنی کسی ہال، گراؤنڈ یا گھر کے صحن میں سجائی گئی جھنڈیوں سے کہیں کم۔ ان جھنڈیوں سے سجی ہوئی ٹہنیوں سے چھوٹی سی چھت سی بن گئی تھی جو کھوکھے پر سایہ کر رہی تھی۔ کھوکھے کے اوپر سبز ہلالی پرچم پوری آب و تاب سے لہرا رہا تھا اور زمین پر بیٹھا ایک جوان نظر آنے والا شخص سر جھکائے اپنے کسی کام میں مگن تھا۔ اس کے قریب پڑے سیل فون پر ''یہ وطن تمہارا ہے، تم ہو پاسباں اس کے'' چل رہا تھا۔ سجاد حسین نے چند ہی سیکنڈ میں سارا جائزہ لے لیا۔ وہ سڑک سے اتر کر اس کھوکھے والے کی جانب بڑھے تو اس نے قدموں کی آہٹ پر سر اٹھایا۔ وہ نغمہ سننے میں اتنا محو تھا کہ اسے کچھ فاصلے پر گاڑی رکنے کا بھی احساس نہ ہوا تھا۔

''السلام علیکم!'' سجاد حسین نے قریب جا کر ہاتھ بڑھایا۔ دکان والے نے تیزی سے اٹھ کر گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے سلام کا جواب دیا۔ اس نے گاڑی اور سجاد حسین کے حلیے سے ان کے معزز ہونے کا اندازہ لگا لیا تھا۔

''کیا کام ہے صاحب؟ اوہ رکیں، میں ذرا کرسی اٹھا لاؤں۔'' کہتے ہوئے وہ کھوکھے کی دوسری جانب پڑی کرسی اٹھانے کے لیے جانے ہی والا تھا کہ سجاد حسین نے روک دیا۔

''نہیں نہیں کرسی نہ لانا۔ میں یہاں بیٹھوں گا۔'' کہتے ہوئے سجاد حسین قریب ہی ایک درخت کے کٹے تنے پر بڑے اطمینان سے بیٹھ گئے۔

''صاحب..... آپ یہاں..... میں کرسی لاتا ہوں۔'' وہ کھوکھے والا بوکھلا گیا کہ اتنا امیر نظر آنے والا شخص کیسی جگہ پر بیٹھ گیا ہے۔

''ارے سب چھوڑو اور مجھے یہ بتاؤ کہ یہ سجاوٹ تم نے کی ہے..... یعنی اتنی سنسان جگہ پر یہ جھنڈیاں، پرچم..... یہ سب کچھ تم نے کیا ہے؟'' سجاد حسین نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''بس صاحب جی! خرچہ تو کوئی خاص نہیں کیا، نہ اتنی زیادہ کوئی سجاوٹ ہے لیکن اس تھوڑی سی تیاری میں میرے

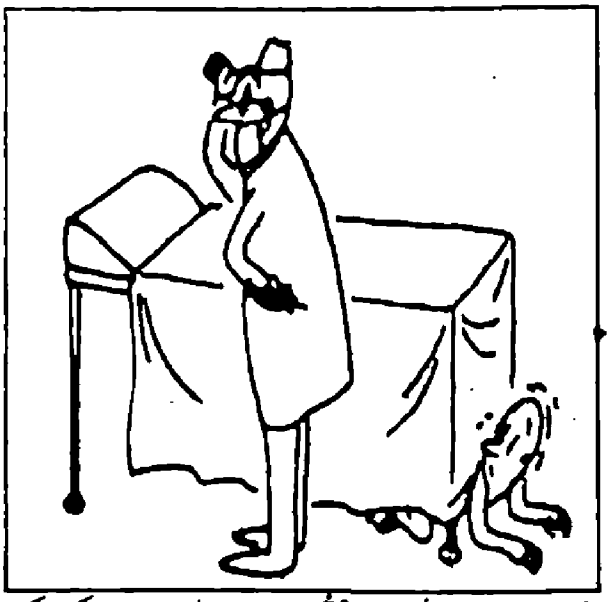

دل کا جذبہ اور وطن سے عشق ضرور شامل ہے۔'' کھوکھے والے نے عاجزی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''عشق؟'' سجاد حسین چونکے۔

''ہاں جی، مجھے اپنے پاکستان سے عشق ہے، پیار ہے۔ اسی لیے تو اپنے عام سے کھوکھے پر یہ خاص پرچم اور جھنڈیاں سجائی ہیں۔ اپنا جشنِ آزادی منانے کے لیے جتنا مجھ سے ہو سکا، میں نے کر لیا ہے۔'' کھوکھے والا بولا۔ سجاد حسین نے اس کی جانب غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے، آنکھوں میں خوشی اور پیار کے رنگ واضح نظر آ رہے تھے۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''راشد علی!'' کھوکھے والے نے جواب دیا۔

''اچھا..... تو راشد علی..... تم کہتے ہو کہ تم وطن سے عشق کرتے ہو اس لیے یہ سب کیا ہے۔ جانتے ہو عشق کسے کہتے ہیں اور عاشق کو محبوب کے لیے کیا کرنا پڑتا ہے؟'' سجاد حسین کو راشد میں نہ جانے کیا نظر آیا کہ یہ خوبصورت سوال کر ڈالا۔

''صاحب جی! میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ زیادہ گہرائی یا بڑی باتیں نہیں جانتا لیکن یہ مجھے پتا ہے کہ یہ وطن کتنی قربانیوں سے بنا، کتنا خون بہایا گیا اور اس کی کتنی قدر کرنا چاہیے۔ ہر چیز سے بڑھ کر قدر کرنا میرے نزدیک عشق ہے اور میرا پاکستان مجھے ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔ میں یہاں آزادی سے جو رہتا ہوں اور آپ نے پوچھا کہ محبوب کے لیے کیا کرنا پڑتا ہے..... سر جی! جس سے پیار کرتے ہیں، اس سوہنی دھرتی کے لیے جان تک دے سکتے ہیں۔ جس زمین نے کھانے کو دیا، رہنے کی جگہ دی اس کی خاطر اپنا آپ قربان کر سکتے ہیں۔'' راشد علی نے بڑے جذب سے کہا۔ سجاد حسین اس کی جانب دیکھے جا رہے تھے۔

pklibrary.com

''تو تم یہاں اکیلے یوم آزادی منا رہے ہو یعنی لوگ تو جلسے جلوس اور اسکولز کالجز کی رونق میں دن منا رہے ہیں۔'' سجاد حسین کو کچھ اور اچھا سننے کی توقع تھی اس لیے یہ جملے کہے۔

''میرے پاس آزادی ہے، آزاد ملک ہے، یہ کھوکھا ہے جو گزارے لائق چلتا ہے، پنکچر بھی لگاتا ہوں اس سے بھی کچھ نہ کچھ آمدنی ہو جاتی ہے۔ میرا گھر ہے، بیوی بچے ہیں، ماں باپ کی خدمت کا موقع ملا ہوا ہے۔ گھر میں بھینس اور دو چار بکریاں بھی ہیں۔ دودھ سے بھی پیسا مل جاتا ہے۔ سب کچھ تو دیا ہے اس آزاد ملک نے..... میں آزاد ہوں اور اپنی ذاتی آزادی، اپنی ذاتی خوشی منانے کے لیے تنبو، قنات، جلسے جلوس کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ میں نے خوشی اپنے لیے منانی ہے اس لیے ہمیشہ ایسے ہی جھنڈیاں، پرچم لگا کر اور ملی نغمے سنتے ہوئے اپنا کام کرتا رہتا ہوں اور پیارے وطن کی آزادی کا جشن مناتا رہتا ہوں۔ یہ دیکھیں اس کولر میں سکنجبین بنا کر رکھی ہوئی ہے۔ میری زیادہ خرچے کی تو طاقت نہیں لیکن اتنی ضرور ہے کہ ہر سال اپنے کھوکھے پر ٹھنڈے میٹھے پانی کا انتظام کر لیتا ہوں۔ یہاں اس جگہ پر زیادہ گاہکوں کا آنا جانا تو ہے نہیں لیکن جو بھی آتا ہے، اسے گلاس بھر سکنجبین ملتی ہے۔ اس طرح دکانداری کے ساتھ ساتھ 14 اگست منا لیتا ہوں۔'' راشد علی نے اپنی سادہ سی تیاری اور تھوڑے سے خرچے سے بھرپور خوشی منانے کی بات بتائی۔ سجاد حسین بے اختیار مسکرا دیے۔ ان کے چہرے پر چمک سی آ گئی۔

''درست کہا بھئی تم نے۔ وطن کی خوشی منانے کے لیے واقعی بہت سے آدمیوں اور ہزاروں لاکھوں خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دل میں جذبہ ہو تو بندہ اکیلا ہی جشن منا لیتا ہے۔''

''ہاں جی، بس ایسا ہی ہے۔'' راشد علی نے سادگی سے کہا۔

''تو میاں راشد علی! تمہاری اس میٹھی، ٹھنڈی، جشن والی سکنجبین کا گلاس مجھے نہیں ملے گا؟'' سجاد حسین نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔

''آپ..... یہ پئیں گے؟ میں نے تو آپ کے لیے کولڈ ڈرنک منگوائی ہے، ابھی لڑکا لاتا ہی ہوگا۔'' راشد علی نے بڑے مرعوب سے لہجے میں کہا۔

''کیوں بھئی، سب پئیں سکنجبین اور میں کولڈ ڈرنک..... میں تمہیں وطن سے پیار کرنے والا نہیں لگتا؟ میں تمہارا بنا شربت پینے سے کیوں محروم رہوں؟'' سجاد حسین نے بڑے شوخ انداز میں شکوہ کیا۔ درخت کی چھاؤں میں کھیتوں کی ہریالی اور ہلکی ہلکی ہوا میں راشد علی سے باتیں کر کے انہیں بہت لطف آ رہا تھا۔

''لو جی..... یہ میں نے کب کہا۔ آپ تو شکل سے ہی اچھے پاکستانی لگ رہے ہیں۔ وہ تو میں نے سوچا.....''

''چلو پھر جلدی سے گلاس بھر لاؤ، بہت پیاس لگ رہی ہے۔'' سجاد حسین نے بات کاٹی۔ راشد علی اٹھا اور صاف ستھرے گلاس میں سکنجبین بھر کر سجاد حسین کو تھما دی۔ ٹھنڈے، میٹھے، لیمو کی آمیزش والے شربت کا گھونٹ بھرتے ہوئے سجاد حسین نے کھوکھے پر لہراتے پرچم کو دیکھا تو انہیں بہت زیادہ سکون و شادمانی کا احساس ہوا۔ بڑے آرام سے پیاس بجھاتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر سجی ٹہنیوں، پرچم اور کولر کی طرف دیکھا اور گلاس خالی کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''بھئی راشد علی! جیتے رہو، خوش رہو۔ مجھے تمہارا 14 اگست منانا بہت پسند آیا۔ یہ ساری سجاوٹ بڑی اچھی لگی۔ شہر سے بہت دور کھیتوں، درختوں کے پاس ایک چھوٹی سی خاموش سی جگہ پر اس چھوٹی سی تقریب نے میرا دل خوش کر دیا۔ تم واقعی وطن سے پیار کرتے ہو، عشق کرتے ہو اور اپنے عشق میں کسی بھی جگہ پر اپنے پیار کا اظہار کر سکتے ہو۔ شربت پلانے کا شکریہ۔'' سجاد حسین واپسی کے لیے اٹھتے ہوئے بڑے دل سے بولے تھے۔ راشد علی جواباً مسکرایا تھا۔

''یہ لو، تھوڑے سے پیسے ہیں۔ جشن آزادی کی خوشی میں بچوں کے لیے آئس کریم لے جانا اور اس شربت میں جو چینی استعمال ہوئی ہے، اس کے پیسے بھی اس میں سے کاٹ لینا۔ اس کولر کے پانی میں میرا حصہ بھی ہو جائے گا۔'' سجاد علی نے والٹ سے چند نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھائے۔

''صاحب جی! کیوں تکلف کر رہے ہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔ بس آپ دعاؤں میں یاد رکھیں اور اس تھوڑے سے خرچے کے پانی میں حصہ ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟ ایک جام سے بندے کے ساتھ کیا حصہ داری؟'' راشد علی نے سادگی سے کہا۔

''میں اپنی خوشی سے بچوں کے لیے دے رہا ہوں۔ انکار کرو گے تو مجھے اچھا نہیں لگے گا اور یہ تم نے کیا بات کر دی۔ عام، خاص..... بھئی پاکستان سب پاکستانیوں کا وطن ہے اور وطن کی محبت میں جشن منانے والے سب برابر ہیں۔ کوئی عام نہیں، کوئی خاص نہیں۔ عشق میں چھوٹا بڑا نہیں،

pklibrary.com

بس شدت دیکھی جاتی ہے جو تم میں بھی ہے اور مجھ میں بھی..... تو کیا اب میں اس تقریب میں حصہ ڈال سکتا ہوں؟'' سجاد حسین نے راشد علی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تقریب؟'' راشد علی نے جھنڈیوں کی چند قطاروں کو دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ اس کی آواز اور آنکھیں دونوں نم تھے۔ وہ اتنی عزت افزائی پر جذباتی سا ہو گیا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ارضِ وطن اس سے اتنا خوش ہو گئی ہے کہ چھوٹے سے کام پر اسے باوقار سا بنا دیا ہے۔

''ہاں..... تقریب..... راشد علی! تم وطن سے پیار کرتے ہو۔ سچا پیار کرتے ہو تم..... تم وطن سے عشق کرتے ہو، تم وطن کے عاشق ہو۔ تمہارا عشق میں اٹھایا گیا ہر قدم خاص ہے۔ خاص الخاص ہے۔'' سجاد حسین کو راشد علی بہت پیارا لگ رہا تھا۔ بولتے ہوئے ان کی آواز رندھ سی گئی۔ پاکستان سے محبت میں وہ ایسے ہی جذباتی اور دیوانے تھے۔ راشد علی نے آنکھوں میں آئی نمی کو صاف کیا اور سجاد حسین کا ''حصہ'' وصول کر لیا۔

''میں اب چلتا ہوں۔ تمہارا کافی وقت لے لیا۔ تم سنو موبائل فون پر نغمے اور مناؤ آزادی کا جشن۔'' کہہ کر سجاد حسین گاڑی میں آ بیٹھے اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی خود سے مخاطب ہو گئے۔

''سجاد حسین! مانا کہ تم اور تمہارا خاندان محبِ وطن ہے لیکن یہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ وطن سے محبت کا ٹھیکا صرف تم نے لیا ہے، تم یہ کیسے سمجھ بیٹھے کہ صرف تم ارضِ پاک سے پیار کرتے ہو؟ لفاظی کرنا، بڑی سی تقریب میں جانا، اپنے بڑوں کا ذکر کرنا اور یہ سوچنا کہ یہ صرف میں ہی کرتا ہوں۔ ارے یہ دھرتی سچے موتیوں جیسے جذبے رکھنے والوں کی ہے۔ وطن سے پیار کرنے والے جا بجا ملتے ہیں..... دیکھو ذرا..... ایک گاؤں کی کچی سڑک کے کنارے چھوٹے سے کھوکھے والا اپنی مٹی سے کیسے اپنا پیار دکھا رہا تھا۔ سجاد حسین! تم ایسے ہی پریشان ہو رہے تھے کہ اب جذبہ نہیں رہا، اب لوگ پاکستان سے پیار نہیں کرتے..... راشد علی نے کیسے تمہاری پریشانی دور کر دی..... یہ وطن محبت و خلوص سے بھرے لوگوں سے بھرا ہے۔ اس سے پیار کرنے والے تھے، آج بھی ہیں اور ان شاء اللہ کل بھی رہیں گے۔'' سجاد حسین مناسب سی رفتار سے گاڑی چلاتے ہوئے شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ شہر میں جشنِ آزادی کی رونقیں عروج پر تھیں۔

''سب پیار کرتے ہیں وطن سے۔ بس ہر ایک کا انداز مختلف ہے۔ اسکولوں، کالجوں کے بچے وطن سے پیار میں نغموں، تقاریر کا مقابلہ کرتے ہیں۔ جو ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہیں، وہ کاروبار سے چھٹی پر آرام بھی کر لیتے ہیں اور اسکرین پر نغمے دیکھ سن کر اپنے طریقے سے دن منا لیتے ہیں۔ چھوٹا موٹا اختلاف تو زندگی کا حصہ ہے۔ سبھی اپنے انداز میں عشق جتاتے ہیں۔'' سجاد حسین بڑے پیار سے سوچ رہے تھے۔ شکوے، شکایتیں، جذبے کم ہونے کا خیال سب ختم ہو گیا تھا۔ راشد علی سے ملاقات کی برکت سے سب مثبت لگنے لگا تھا..... سارے خدشات مٹ گئے تھے۔

''یہ وطن خدا کے فضل کے بعد قائم ہی اس زندہ دل قوم کے دم سے ہے۔ ایک آرمی والے سے لے کر پنکچر لگانے والے تک سب اس کے جیالے ہیں، اس کے سپاہی ہیں..... ہیں اس ارضِ پاک پر ایسے جو ملک کی محبت کے اسیر ہیں، جن کا ہر فعل وطن کی محبت میں گندھا ہوا ہے۔ ایسے جانباز تھے جو دیوانگی میں جان وار گئے اور حال و مستقبل میں بھی ان کی کمی نہیں۔ پاک مادرِ وطن نے پُرخلوص سپوت پیدا کیے ہیں جو اس کی ناموس پر، اس کے نام پر خوشی سے جان نثار کرتے ہیں۔'' سجاد حسین کی گاڑی میں ملی نغمے گونج رہے تھے۔ ''یہ وطن ہمارا ہے، ہم ہیں پاسباں اس کے..... جیوے جیوے پاکستان۔'' سجاد حسین اتنا خوش تھے جتنا وہ بچپن کے 14 اگست پر ہوتے تھے۔ انہیں اماں کے بنائے ہوئے گڑ کے چاول کی شیرینی محسوس ہو رہی تھی۔

سجاد حسین کا دل جذبات سے معمور، آنکھوں میں خوشی کی چمک اور چہرے پر نئی امیدوں کی روشنی و تازگی تھی۔ ''تو میرا دلبر جان..... تو میرا پاکستان'' وطن کی محبت میں گندھی آواز گاڑی میں مسحور کن ماحول پیدا کر رہی تھی اور سجاد حسین ان لفظوں کے پیچھے جذبات کو سمجھتے ہوئے اطمینان و خوشی سے مسکرا رہے تھے۔

''یہ وطن ہے ہی اتنا حسین کہ اس سے عشق کیا جائے اور..... ہیں اس ارضِ پاک پہ عشاقِ وطن..... جن کا عشق، جن کی دیوانگی ہر آنے والے دن کو خوبصورت و جاندار بنا رہی ہے..... شکر خدا کا..... اس دھرتی پر عشاق ہیں..... ہیں عشاقِ وطن..... اور رہیں گے۔''

دل میں گداز یت بھری خوشی لیے وہ بار بار ایک ہی بات دہرا رہے تھے۔ وہ خوش تھے، بے حد خوش۔ ان کو گویا قرار آ گیا تھا۔ ارضِ پاک بھی اپنے اس دیوانے عاشق کے ساتھ اطمینان و فخر سے مسکرا رہی تھی۔

⌘⌘⌘

pklibrary.com

محفلِ شعر و سخن

❁ حیات خان.....میانوالی

اس کا کیا ہے تم نہ سہی تو چاہنے والے اور بہت
ترکِ محبت کرنے والو! تم تنہا رہ جاؤ گے

❁ ناہید یوسف.....اسلام آباد

کیا بیت گئی اُن پہ جنہیں راس نہ آئیں
پانی سے اکھڑتے ہوئے پیڑوں کی پناہیں
کیا جانیے سیلاب کے طوفانِ بلا میں
کس وقت کہاں ڈوب گئیں کس کی کراہیں

❁ روبینہ ناز.....میرپور خاص

غارت گرِ چمن سے عقیدت تھی کس قدر
شاخوں نے خود اتار دیے اپنے پیرہن

❁ راشد اکرام.....ٹنڈو محمد خان

بظاہر ایک ہی شب ہے فراقِ یار مگر
کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

❁ سحر سیف.....گولارچی

اپنی آشفتہ مزاجی پہ ہنسی آتی ہے
دشمنی سنگ سے اور کانچ کا پیکر رکھنا

❁ انیلا یوسف.....جہلم

اک عمر سے ہوں لذتِ گریہ سے بھی محروم
اے راحتِ جاں مجھ کو رُلانے کے لیے آ

❁ عاشق علی بھٹی.....شیخوپورہ

زخموں سے بدن گلزار سہی، پر ان کے شکستہ تیر گنو
خودترکش والے کہہ دیں گے یہ بازی کس نے ہاری ہے

❁ نجمہ انصاری.....مظفرگڑھ

میں شب کا بھی مجرم ہوں سحر کا بھی ہوں مجرم
یارو مجھے اس شہر کے آداب سکھا دو

❁ کامران احمد.....ساہیوال

ڈھونڈ اجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

❁ صدف خالد.....آزاد کشمیر

ستم تو یہ ہے کہ ظالم سخن شناس نہیں
وہ ایک شخص کہ شاعر بنا گیا مجھ کو

❁ سیدہ بتول.....کراچی

مجھ کو دکھ ہے کہ نہ لے جائیں یہ دنیا والے
میری دنیا ہے خزانہ مری تنہائی کا

❁ حسیب شیخ.....فیض آباد

تری یادوں کا وہ عالم نہیں ہے
مگر دل کی اداسی کم نہیں ہے

❁ عاصم خان.....کراچی

رات آئی ہے بلاؤں سے رہائی دے گی
اب نہ دیوار نہ زنجیر دکھائی دے گی
یہ دھندلکا سا جو ہے اس کو غنیمت جانو
دیکھنا پھر کوئی صورت نہ سجھائی دے گی

❁ محمد عارف.....فیصل آباد

جانے والے کو نہ روکو کہ بھرم رہ جائے
تم پکارو بھی تو کب اس کو ٹھہر جانا ہے

pklibrary.com

❁ انور بٹ.....چکوال

ہم کریں بات دلیلوں سے تو رد ہوتی ہے
اس کے ہونٹوں کی خموشی بھی سند ہوتی ہے

❁ محمد حسین.....کراچی

جن کے ہم منتظر رہے ان کو
مل گئے اور ہم سفر ، شاید

❁ فیاض احمد.....اوکاڑہ

اختلاف جہاں کا رنج نہ تھا
دے گئے مات ہم خیال ہمیں

❁ بجل حسین.....تلہ گنگ

کاش تُو بھی کبھی آجائے مسیحائی کو
لوگ آتے ہیں بہت دل کو دکھانے میرے

❁ ماسٹر ارشاد.....کنڈیارو

مجھے وفا کی طلب ہے مگر ہر اک سے نہیں
کوئی ملے مگر اس یار بے وفا کی طرح

❁ محمد آفاق.....ساہیوال

کیا بیت گئی دیس پہ سیلاب کے ہاتھوں
کیسے کوئی اس کرب کو الفاظ میں ڈھالے
انسان بھی ، فصلیں بھی ، مویشی بھی ، مکاں بھی
ہر چیز ہے بپھرے ہوئے پانی کے حوالے

❁ نذیر حسین.....سرگودھا

مجھ سے بچھڑ کے تُو بھی تو روئے گا عمر بھر
یہ سوچ لے کہ میں بھی تری خواہشوں میں ہوں

❁ محمد ظفر اللہ ضیا.....کمالیہ سٹی

باہر سے سجا رکھے ہیں خوش رنگ آئینے
اندر سے ان کا شیشہ مگر ٹوٹتا رہا

❁ عظیم احمد.....جھنگ سٹی

یادش بخیر عہدِ گزشتہ کی صحبتیں
اک دور تھا عجب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

❁ شاہدہ ریاض.....سرگودھا

پڑھنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ مٹ بھی گئی تھی
بجلی نے گھٹاؤں پہ جو تحریر لکھی تھی
چپ سادھ کے بیٹھے تھے سبھی لوگ وہاں پر
پردے پہ جو تصویر تھی کچھ بول رہی تھی

❁ اقم کمال.....حیدرآباد

اپنے دامن کو ذرا آپ بچا کر رکھنا
سرد آہوں سے بھی ہم آگ لگا دیتے ہیں

❁ نسیم اشرف.....کراچی

نامرادی کا یہ عالم ہے کہ اب یاد نہیں
تُو بھی شامل تھا کبھی میری تمناؤں میں

❁ عالیہ خان.....کوئٹہ

اک وہ ہی نہیں ترکِ تعلق پہ پشیماں
ہے اہلِ وفا کو بھی ندامت اسے کہنا

❁ ندا ممتاز.....سرگودھا

میں نے تو تن بدن کا لہو نذر کردیا
اے شہرِ یار تُو بھی تو اپنا حساب دے

❁ مہتاب احمد.....حیدرآباد

یہ کہانیاں ادھوری جو نہ ہوسکیں گی پوری
انہیں میں بھی کیوں سناؤں، انہیں تم بھی کیوں سناؤ

❁ آمنہ الیاس.....مری

ایسا گم ہوں تری یادوں کے بیابانوں میں
دل نہ دھڑکے تو سنائی نہیں دیتا کچھ بھی

❁ ایاز ملک.....لاہور

فراز تُو نے اسے مشکلوں میں ڈال دیا
زمانہ صاحبِ زر اور صرف شاعر تُو

❁ یوسف علی خان.....پشاور

خلق کی سنگ زنی ، میری خطاؤں کا صلہ
تم تو معصوم ہو ، تم دور ذرا ہوجانا

❁ عالم خان.....گجرات

یہ میں بھی کیا ہوں اسے بھول کر اسی کا رہا
کہ جس کے ساتھ نہ تھا ، ہم سفر اسی کا رہا

❁ حنا پرویز.....کھر

جس طرح بادل کا سایہ پیاس بھڑکاتا رہے
میں نے یہ عالم بھی دیکھا ہے تری تصویر کا

❁ شاہین تبسم.....کراچی

مجھ کو سمجھا رہے تھے سبھی ناصحانِ شہر
پھر رفتہ رفتہ خود اسی کافر کے ہوگئے

❁ مہوش شیخ.....نواب شاہ

کسی کے شہر میں کی گفتگو ہواؤں سے
یہ سوچ کر کہ کہیں آس پاس تھا وہ بھی

❁ اسلم خان.....راولپنڈی

تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں ، سورج کو دکھاتے ہیں چراغ

pklibrary.com

❁ عنبر نسیم.....ملتان

تُو اگر چاہے تو ہم اک دوسرے کو چھوڑ کر
اپنے اپنے بے وفاؤں کے لیے روتے رہیں

❁ نصیر احمد شیخ.....بہاولپور

جز ترے، کوئی بھی دن رات، نہ جانے میرے
تُو کہاں ہے مگر اے دوست پرانے میرے

❁ خالد ضیاء.....روڈیرو

جس سمت بھی دیکھوں نظر آتا ہے کہ تم ہو
اے جانِ جہاں یہ کوئی تم سا ہے کہ تم ہو

❁ ناہید خان.....نواب شاہ

اس لمحۂ خیر و شر میں کہیں اک ساعت ایسی ہے جس میں
ہر بات گناہ نہیں ہوتی، ہر کار ثواب نہیں ہوتا

❁ جہانزیب خان.....جہلم

لوگوں سے ایسے ملو کہ وہ زندہ ہو جائیں
اپنی ذات میں زندہ رہنا کوئی کمال نہیں

❁ منیر حسین شاہ.....کراچی

جھوٹ کی پاگل ہوا چہروں کو زخمی کر گئی
خود سے خوف آنے لگے تو آئینہ دیکھے گا کون

❁ خالد شاہین.....سیالکوٹ

دور تک پھیلا ہوا اک واہمہ رہ جائے گا
تُو نہیں ہوگا تو ان آنکھوں میں کیا رہ جائے گا

❁ ایم اے عائشہ.....اوکاڑہ

کبھی عشق کرو اور پھر دیکھو اس آگ میں جلتے رہنے سے
کبھی دل پر آنچ نہیں آتی، کبھی رنگ خراب نہیں ہوتا

❁ فرح بخاری.....ڈیرہ اسماعیل خاں

وقت مقتل سے میری لاش اٹھا لایا تھا
لوگو! میں اپنی گواہی میں خدا لایا تھا

❁ ڈاکٹر شفیق.....چیچہ وطنی

تُو بھی نہ مل سکا ہمیں عمر بھی رائگاں گئی
تجھ سے تو خیر عشق تھا خود سے بڑے گِلے رہے

❁ عدنان یوسف.....تربیلہ ڈیم

اس کی خوشبو سے نکلتا ہی نہیں میرا وجود
جیسے میرے پاؤں میں زنجیر اس مٹی کی ہے

❁ مخدوم اصغر.....منڈی بہاالدین

تجھ کو اس حال میں دیکھا ہے تو جی چاہتا ہے
تیری تصویر کسی روز پرانی دیکھوں

❁ محمد آصف.....لیاقت پور

لذتِ در بدری بھول گیا ہوں اب تو
خالی ہاتھوں میں کبھی ارض و سما لایا تھا

❁ ریشار یحان.....کراچی

کمال شخص تھا جس نے مجھے تباہ کیا
خلاف اس کے یہ دل ہو سکا ہے اب بھی نہیں

❁ غلام شبیر.....میانوالی

عجب اعتبار و بے اعتباری کے درمیان ہے زندگی
میں قریب ہوں کسی اور کے مجھے چاہتا کوئی اور ہے

❁ نعیم اقبال.....راولپنڈی

سایہ تو کجا خود سے بچھڑ جاؤ گے اک دن
یہ شہر ہے اور شہر میں تنہائی تو ہوگی

❁ انیس شیخ.....میرپور خاص

اگرچہ رنج بہت ہے پر لب ہلیں گے نہیں
بس اک نظر تجھے دیکھیں گے کچھ کہیں گے نہیں

❁ ہما خان.....فیصل آباد

اس معرکۂ عشق میں جو حال ہو میرا
لیکن مجھے لوگوں کے حوالے نہیں کرنا

❁ فیصل فاروق.....گوجرانوالہ

مری روشنی ترے خد و خال سے مختلف تو نہیں
تو قریب آ، تجھے دیکھ لوں، تو وہی ہے یا کوئی اور ہے

❁ علی پرویز.....پسرور

اسی لیے تو کبھی تجھ سے تذکرہ نہ کیا
کہ اپنے غم سے ترا غم ہمیں زیادہ تھا

❁ نرگس بھٹی.....گڈو بیراج

سبھی کو اپنے غم ہوتے ہیں لیکن
مجھے جو غم ہے وہ میرا نہیں ہے

❁ شاہ یونس.....ڈی آئی خان

یہ شہر سمندر کے کنارے پہ ہے آباد
اس شہر میں رہنا ہو تو اوقات میں رہنا

کوپن
پرانے شمارہ
ستمبر 2025

مُحفلِ شعر و سخن

نام : _____

پتا : _____

pklibrary.com

حرص و ہوس کے ہاتھوں جرم کی دلدل میں اترنے والوں کا لرزہ خیز انجام

یوٹرن

آصفہ ضیا احمد

اس کی دور رس نگاہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وقت اپنی چال چل چکا ہے۔ اور اگر اس کے دماغ میں یہ برقی رو نہ لہراتی کہ یہ یوٹرن اس کی زندگی کا ایسا سنگِ میل ثابت ہو سکتا ہے جہاں سے مجرموں کا نشان مل سکتا ہے تو شاید تمام عمر وہ اندھیروں میں ہاتھ پاؤں چلاتے رہ جاتے لیکن... جس طرح قسمت مجرموں کو راہ دکھاتی ہے اسی طرح قدرت بھی خطا کاروں کے گرد گھیرا تنگ کر دیتی ہے... اور اس بار تو شاید یہ دائرہ ان کی موت کا سبب بننے والا تھا۔

عمر دراز خاں نے گھر میں داخل ہوتے ہی ایک طویل سانس کھینچی اور باورچی خانے سے اٹھنے والی اشتہا انگیز خوشبوؤں نے اس کا استقبال کیا تو بے اختیار کہا۔ ”سرفراز کی ماں! آج تو کوئی تہوار بہار بھی نہیں ہے، پھر یہ اتنی اچھی اچھی خوشبوؤں سے گھر کیوں مہک رہا ہے؟“

تھوڑے سے توقف کے بعد عمر دراز کی بیوی انوری کچن سے برآمد ہوئی اور اپنا دوپٹا ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔ ”ایک تو اس نسیان کی بیماری نے تمہیں کہیں کا نہیں رکھا۔

pklpram.com

ارے صبح تو میں نے بتایا تھا کہ خیر سے سرفراز کو ایک امیر زادی کو پڑھانے کا کام ملا ہے۔ اسی کی خوشی میں کچھ کھٹا میٹھا بنا کر نیاز دلا رہی ہوں۔''

عمر دراز نے کھوئے ہوئے لہجے میں ایک لمبی ہنکاری بھری اور پھر تلخ لہجے میں بولا۔ ''ساری زندگی محنت مزدوری کر کے بیٹے کو پڑھایا لکھایا کہ ہم بھی کبھی اچھے دن دیکھیں گے لیکن اپنے تو نصیب ہی کھوٹے ہیں۔ اتنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسے ایک ٹیوشن ملی تو، تو شکرانے کی نذر نیاز کرنے لگی۔ اری بھاگوان! کبھی تو عقل سے کام لیا کر۔''

انوری نے ایک دلدوز آہ بھری اور نحیف آواز میں بولی۔ ''سرفراز کے بابا! کبھی تم بھی تو رب کا شکر ادا کر لیا کرو۔ ارے جس نے کم دیا ہے، وہ ایک دن زیادہ بھی دے گا۔ اس کے خزانے میں کوئی کمی تھوڑی ہے۔ میرا بچہ سلامت رہے، ہزاروں روزگار مل جائیں گے۔'' عمر دراز نے بیوی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ تنتناتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کی خوش مزاجی رخصت ہو چکی تھی۔

سرفراز نے جب کیمسٹری میں ایم ایس سی کیا، اس وقت تک وہ خود بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ ڈگری نہیں بلکہ جادو کی چھڑی ہے جسے گھماتے ہی اس کی دنیا بدل جائے گی لیکن سڑکیں ناپتے ناپتے اس کے پاؤں شل ہو گئے لیکن کوئی امید بر نہیں آئی۔ نوکری نہ ہوئی ریت میں چھپی ہوئی سوئی ہو گئی جسے تلاش کرتے کرتے وہ نڈھال ہو گیا۔ اسی اثناء میں اس کے دوست عظمت نے اسے یہ مژدہ سنایا کہ شہر کے مشہور صنعت کار مہتاب سیٹھ کی بیٹی کے لیے ایک عدد ٹیوٹر کی ضرورت ہے۔ لڑکی نے میٹرک بھی بدقت تمام کیا ہے اور اب انٹر میں پھر اٹک گئی ہے۔ اگر تم میں دم خم ہے اور لڑکی کو پہلے ہی دھکے میں انٹر کا سرٹیفکیٹ دلا سکتے ہو تو تمہارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ سرفراز نے ہچکچاتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا اور آگے بڑھ گیا لیکن اس کا دوست عظمت اس کے گھر کے حال احوال سے باخبر تھا۔ وہ فوراً اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''کوئی زندگی بھر تھوڑی ہی ٹیوشن پڑھانی ہے۔ ذرا سی لڑکی پر محنت کر کے اسے فلائنگ کک لگانی ہے۔ اسی اثناء میں سیٹھ صاحب کے دل میں جگہ بنانے کی کوشش کرنا۔ شہر میں ان کی دو ٹیکسٹائل ملز چل رہی ہیں۔ اپنے ورکرز سے کام لیتے ہیں تو پیسا بھی بھرپور دیتے ہیں۔ مل کے کیمیائی سیکشن میں جگہ مل گئی تو دن بدل جائیں گے۔''

عظمت کی دلیل سرفراز کو قائل کر گئی۔ چونکہ فل سبجیکٹس پڑھانے تھے اس لیے ٹیوشن فیس بھی ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے آمادگی میں تاخیر نہیں کی۔

''میرا نام معطر ہے۔'' لڑکی اپنی ریشمی آواز میں گنگنائی۔ سرفراز کو لگا شہنائیاں بج اٹھیں۔ معطر کو دیکھ کر وہ اپنی سابق محبوباؤں کو بھول گیا۔

پہلا پیار جو کہ یکطرفہ تھا۔ اسے اپنے خاندان کی ایک لڑکی سے ہوا۔ اپنی داستانِ عشق اماں کو سنا ڈالی اور لجاجت آمیز لہجے میں گڑگڑا کر کہا کہ ''خالہ بختاں کے گھر جا کر دستِ طلب پھیلا دیں۔''

اماں نہ صرف خوش ہوئیں بلکہ فوراً جانے پر کمربستہ ہو گئیں۔ الگنی پر سے برقع کھینچ کر پہن ہی رہی تھی کہ حسبِ عادت عمر دراز مسکراتا کھنکھارتا گھر میں داخل ہوا اور سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''آج کدھر کی اڑان ہے؟''

انوری نے خوشی سے بے قابو ہو کر ساری تفصیل شوہر کے گوش گزار کر دی۔ عمر دراز فوراً دہاڑا۔ ''انوری! بیٹا تو ہمارا باؤلا ہی ہے مگر تو بھی عمر کے ساتھ ساتھ سٹھیا گئی ہے۔ گھر میں تین افراد کے لیے نپا تلا پکتا ہے۔ جب تک تیرا لاڈلا گھر میں اپنی کمائی دھمائی نہیں لائے گا، یہاں کسی قسم کی کوئی شادی خانہ آبادی نہیں ہو سکتی۔''

بات ختم ہونے سے پہلے سرفراز گھر سے کھسک لیا۔ اماں نے بھی جل کر خاموشی اختیار کر لی۔ یوں اس کی پہلی لَو اسٹوری اختتام پذیر ہوئی۔ عشق دوم اپنی ایک کلاس فیلو سے ہوا۔ جس روز وہ محبوبہ سے اظہارِ عشق کرنے والا تھا، اسی روز پتا چلا کہ خیر سے اس کی منگنی ہے اور اس کا منگیتر امریکا میں براجمان ہے۔ اپنے دونوں ناکام عشق کی ٹیسیں وہ آج بھی محسوس کرتا تو گھنٹوں تصورِ جاناں کیے ہوئے بیٹھا رہتا۔ آج جب وہ سیٹھ مہتاب کے گھر کے لیے نکل رہا تھا تو اماں نے حقیقتاً اسے گوشت کے کباب بنا ہی ڈالے اور پھر شام کی چائے کے ساتھ چنے کی دال کا حلوا اور کباب کھا کر ماں کے سامنے سر جھکایا تو ماں نے اپنا دستِ شفقت اس کے سر پر یوں پھیرا جیسے وہ کسی محاذ پر جا رہا ہو۔

☆☆☆

مطلوبہ کوٹھی کے گیٹ پر وہ جوں ہی پہنچا، گارڈ نے فوراً گیٹ کھول کر اسے اندر کا راستہ دکھا دیا۔ وہ وسیع و عریض لان کے اس حصے میں پہنچا جہاں سیٹھ مہتاب اپنی فیملی کے ساتھ بیٹھ کر شام کی چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ چونکہ اس کی آمد متوقع تھی اس لیے کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ سیٹھ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کے لیے کہا تو اس نے تھرتھراتے ہاتھوں سے ایک کرسی گھسیٹی

pklibrary.com

اور اس پر ٹک گیا۔ وہ بڑی طرح نروس ہو رہا تھا۔

علیک سلیک کے بعد سیٹھ بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ”تم غالباً عظمت کے توسط سے آئے ہو؟ میں نے دراصل اس کے والد سخاوت خان سے اس ٹیوشن کے لیے کہا تھا۔ ویسے شہر میں کئی کوچنگ سینٹرز اور اکیڈمی ہیں لیکن میں نہیں چاہتا کہ لڑکیوں کو باہر کی ہوا لگے۔“

اتنا بول کر سیٹھ نے طویل توقف کیا۔ وہ بڑے اعتماد سے بول رہا تھا اور یہ اعتماد یقیناً دولت کا بخشا ہوا تھا۔ پھر اس نے اپنے پہلو میں بیٹھی ہوئی خاتون کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ”برخوردار! یہ ہماری بیگم عرشیہ مہتاب ہیں۔“ سرفراز نے ڈرتے ڈرتے بیگم صاحبہ کی جانب دیکھا تو احساس ہوا کہ ایسا سحر انگیز حسن کبھی کبھی ہی جنم لیتا ہے۔ گزرتے ہوئے ماہ و سال ابھی بھی اس خاتون پر اثر انداز نہیں ہوئے تھے۔ سرفراز نے خاتونِ خانہ کو بغور دیکھتے ہوئے تعظیماً سر کو خم دیا۔ سیٹھ نے پرے بیٹھی ہوئی حسین اور نوجوان لڑکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہے ہماری بڑی بیٹی اور یہی تمہاری اسٹوڈنٹ ہے۔“

جیسے ہی سرفراز اور اس لڑکی کی آنکھیں چار ہوئیں، وہ بری طرح بوکھلا گیا۔ ایسا طلسماتی حسن اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ ہڑبڑا کر وہ دوسری جانب دیکھنے لگا۔ سیٹھ نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے اپنے دونوں چھوٹے بچوں کو بھی متعارف کروایا۔ دونوں بچوں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا تو سرفراز کا کھویا ہوا اعتماد بحال ہوا۔ اس نے اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے پہلی بار زبان کھولی۔ آج کی اس ملاقات پر خوشی کا اظہار کیا اور یقین دلایا کہ وہ انتہائی محنت سے اپنا فرض انجام دے گا اور انہیں اور ان کی بیٹی کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دے گا۔ اب کافی حد تک چہرے پر برسنے والی اس کی احمقانہ بوکھلاہٹ اور سراسیمگی کم ہو گئی تھی اور زبانی کلامی سلسلہ بھی چل نکلا تھا۔ اس لیے وہ سیٹھ کے تینوں بچوں سے ان کی پڑھائی کے موضوع پر باتیں کر رہا تھا۔ سیٹھ اور سیٹھانی بھی ان کی باتوں میں دلچسپی لے رہے تھے۔ اسی دوران سرفراز نے اس بات کا اندازہ لگایا کہ سیٹھ اپنے اکلوتے بیٹے اور چھوٹی بیٹی پر تو واری صدقے ہو رہا تھا لیکن جب اپنی بڑی بیٹی سے بات کرتا تو آواز میں کرختگی آجاتی لیکن اس بات کو سرفراز نے اپنا وہم قرار دیتے ہوئے ذہن سے جھٹک دیا۔ سیٹھ نے اوقات کار بتاتے ہوئے اسے دوسرے دن آنے کے لیے کہا تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور رخصتی سلام کر کے اپنے گھر کی راہ لی۔

☆☆☆

سیٹھ صاحب کی عالیشان رہائش گاہ کا اندرونی حصہ دیکھ کر سرفراز ہکا بکا رہ گیا۔ ایک باوردی ملازم جس کمرے میں اسے بٹھا کر گیا تھا، وہ بھی انتہائی روشن، ہوادار اور کشادہ تھا۔ فرنیچر بھی جدید اور قیمتی تھا۔ سرفراز چور نگاہوں سے ہر چیز کا جائزہ لے رہا تھا کہ معاً اسے آہٹ محسوس ہوئی اور سیٹھ صاحب کی بڑی بیٹی کمرے میں داخل ہوئی۔ سرفراز نے مسکراتی نظروں سے اس کا استقبال کیا۔ نصابی کتابیں میز پر رکھ کر وہ اپنی نشست پر بیٹھ گئی اور پہلا جملہ جو اس نے سرفراز سے کہا وہ یہی تھا ”میرا نام معطر ہے“۔ سرفراز کا دل چاہا کہہ دے، آپ اسم بامسمّیٰ ہیں۔ بہ مشکل اس نے اپنی زبان کو کنٹرول کیا۔ پہلے ہی دن اس نے اندازہ لگا لیا کہ لڑکی ذہین ہے۔ اگر پوری توجہ سے اسے گائڈ کیا گیا تو نمایاں کامیابی حاصل کر سکتی ہے لیکن وہ بری طرح اسٹریس کا شکار ہے اور کوئی ذہنی دباؤ ہے جس نے اس کی صلاحیتوں کو معدوم کر دیا ہے۔ اپنی ڈیوٹی انجام دے کر جب وہ سیٹھ صاحب کی کوٹھی سے باہر آیا تو پسینے سے اس کے کپڑے تر تھے۔ وہ اس وقت اپنے آپ سے ہمکلام تھا کہ خدایا! میں اس لڑکی کو کس طرح پڑھاؤں۔ گھر پہنچ کر اس نے اس روز کھانا بھی نہیں کھایا بلکہ خرابیٔ طبیعت کا بہانہ کر کے بستر پر لیٹ گیا۔

☆☆☆

آج چونکہ اتوار تھا اس لیے سیٹھ صاحب کی کوٹھی پر حاضری نہیں دینا تھی۔ ناشتے کے فوراً بعد اس کے قدم اپنے دوست ناصر کے گھر کی طرف اٹھ گئے۔ جس بیماری دل میں وہ مبتلا تھا، اس کا علاج ناصر اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ وہ اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا۔ ناصر کا باپ پنساری تھا۔ دکان گھر سے اٹیچڈ تھی۔ جیسے ہی سرفراز نے آواز لگائی، ناصر کے باپ نے ایک غضب ناک نظر اس پر ڈالی اور درشت لہجے میں بولا۔ ”سو رہا ہے نواب زادہ۔ ذرا اور زور سے آواز مار۔“

لیکن سرفراز کو دوسری آواز نہیں لگانا پڑی۔ ناصر بستر سے اٹھ کر آنکھیں ملتا ہوا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کا حلیہ دیکھ کر سرفراز کو کہنا پڑا..... ”ارے یار! تجھ سے ایک مسئلے پر گفتگو کرنا ہے اور مشورہ لینا ہے۔ ذرا اپنی نک سک درست کر لے۔ ناشتا تو تجھے میں باہر ہی کروا دوں گا۔“

ناصر جلدی سے اندر گیا اور تھوڑی دیر بعد باہر نکلا تو مکمل طور پر تروتازہ اور ہشاش بشاش تھا۔ دونوں قریب

کے ایک ہوٹل میں جا بیٹھے۔ سرفراز کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر ناصر نے تولتی ہوئی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا اور مستفسر ہوا۔ ”کیا بات ہے؟ کیا تیرے بابا نے آج پھر جھاڑ پلائی ہے جو یوں منہ لٹکائے بیٹھا ہے؟“

سرفراز اپنی محویت سے چونکا اور پھر بغیر کسی وقفے کے دل کی لگی ناصر کے سامنے بیان کردی لیکن اپنی اسٹوڈنٹ اور اس کے باپ کا نام صیغۂ راز میں رکھا کیونکہ اسے اچھی طرح علم تھا مالدار اور دولت مند لڑکیوں کو پھانس کر ان کے پیسے پر عیش کرنا ناصر کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ناصر نے حلوا پوری پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے چائے کا کپ اپنی طرف گھسیٹا اور گردن ہلاتا ہوا بولا۔ ”تو یہ بات ہے۔ جناب کو اپنی شاگرد سے عشق ہوگیا ہے۔“ پھر قدرے توقف سے بولا۔ ”تو ٹھہرا بکری کا بچہ۔“

سرفراز نے اس کی کسی بات کا برا نہیں مانا بلکہ اعترافی لہجے میں بولا۔ ”اب میں تیری طرح نڈر اور جی دار تو نہیں ہوں۔ تو ہی بتا مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اسی لیے تو صبح صبح تیرے پاس دوڑا چلا آیا ہوں۔“

ناصر نے سینہ پھلا کر، گردن اکڑا کر اپنے سابقہ تجربات بیان کیے جس میں اسّی فیصد جھوٹ کی آمیزش تھی۔ ہر قصے کا لب لباب یہ تھا کہ اس کی ہر معشوقہ اس کے لیے جان دینے کو تیار تھی۔ سرفراز نے اس کی لچھے دار باتوں سے اکتا کر..... جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تجھ سے صرف ایک مشورہ لینے آیا ہوں کہ اب میں کیا کروں؟ وہ لڑکی میرے حواسوں پر چھا گئی ہے۔ کیا اس ٹیوشن پر لات ماردوں؟“

”نہ..... نہ..... ایسا نہ کرنا۔“ ناصر دیدے نچاتے ہوئے بولا۔ ”لڑکی کا باپ تجھے تگڑی ٹیوشن فیس دے رہا ہے اور پڑھانے کے بہانے دیدارِ یار بھی ہو رہا ہے۔ اور کیا چاہیے۔ مجھ سے رابطے میں رہنا تاکہ میں تجھے بتا سکوں کہ اگلا قدم ہمیں کون سا اٹھانا ہے۔ میں تجھے مایوس نہیں کروں گا۔“ سرفراز نے اس کی بات مان کر اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

سیٹھ مہتاب کی فیملی اور سرفراز کے درمیان جو اجنبیت اور ناآشنائی کی دیوار تھی، وہ آہستہ آہستہ گرتی چلی گئی۔ گھر کے نوکر چاکر بھی اسے پہچاننے لگے تھے۔ یہاں اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے سرفراز کا تیسرا مہینا تھا۔ روزانہ اپنے آپ سے ایک جنگ لڑ کر پوری مستعدی اور دیانت داری سے معطر کو پڑھانے کی کوشش کرتا لیکن دل دیوانہ بار بار تنگ کرتا پھر بوڑھے والدین کے چہرے نظروں میں گھوم جاتے جو پچھلے دو مہینوں سے پیٹ بھر کر کھانا کھا رہے تھے۔ اس بات کا بھی امکان یقینی تھا کہ سیٹھ اور سیٹھانی کو ذرا سی بھی سن گن مل گئی کہ ٹیوٹر ان کی بیٹی کو کس نظر سے دیکھ رہا ہے تو اسے بھاگنے کے لیے راستہ بھی نہیں ملے گا۔ اس لیے اس نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ اس کی جان لیوا محنت کے باوجود ابھی تک معطر کی پڑھائی میں کوئی پروگریس نہیں تھی۔ کلاس ٹیچر نے رپورٹ کارڈ پر ہوپ لیس لکھ کر تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔ دونوں میاں بیوی کا سارا نزلہ سرفراز پر گرا۔

سرفراز نے صبر کا بڑا سا گھونٹ لے کر مزید محنت کا وعدہ کیا لیکن سیٹھ مہتاب نے سرفراز کو جو کہا، سو کہا، معطر کو بھی نہیں چھوڑا۔ بیٹی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”لڑکی! سدھر جاؤ ورنہ اب تمہاری ماں کی بھی نہیں سنوں گا۔ ہاسٹل بھجوا کر دم لوں گا۔“ لہجہ دھمکی آمیز تھا لیکن معطر کے چہرے پر ڈر نہ تھا بلکہ وہ بالکل نڈر ہو کر ترکی بہ ترکی جواب دے رہی تھی۔ بیگم مہتاب مسلسل سرزنش کر رہی تھیں لیکن اس کی سرکشی اور خودسری سر چڑھ کر بول رہی تھی۔ سیٹھ مہتاب تنتناتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور جاتے جاتے ایک دھماکا کر گیا۔ جو بات اس نے کہی تھی، اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ اس نے جو جملہ کہا تھا وہ کچھ یوں تھا۔ ”شکر ہے میرے دونوں بچے اس پر نہیں پڑے۔ میں تو ان دونوں کو اس کے سائے سے بھی دور رکھوں گا۔“ یہ فقرہ سرفراز کے سر پر سے گزر گیا لیکن معطر زخمی ناگن کی طرح پھنکارنے لگی۔

بیگم مہتاب بھی اس بات پر چراغ پا ہوگئی اور نہایت طیش میں شوہر سے بولیں۔ ”تفریق کا بیج آپ ہی نے بویا ہے۔ پتا نہیں یہ نفسانفسی کسی دن کیا گل کھلائے گی۔“ یہ کہتے ہوئے بیگم مہتاب نے معطر کا ہاتھ پکڑا اور اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اپنے بیڈروم میں جا کر آرام کرو۔ میں بھی وہیں آرہی ہوں۔“

معطر کے جانے کے بعد وہ سرفراز سے مخاطب ہوئیں اور پھنسی پھنسی آواز میں بولیں۔ ”سرفراز! آج تو تم جاؤ۔ کل اپنے وقت پر آجانا۔“

”اوکے میڈم!“ سرفراز نے مختصراً کہا اور وہاں سے سرپٹ ایسی دوڑ لگائی کہ اپنے گھر پر ہی آکر دم لیا۔ اس روز وہ رات گئے تک سیٹھ مہتاب کے خاندان کے بارے میں سوچتا رہا۔ کسی حد تک بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ معطر سیٹھ مہتاب کی اولاد نہیں ہے۔ اس رات وہ بہت بے قرار

اور مضطرب رہا۔ سونے سے پہلے اس نے فیصلہ کرلیا کہ کل اسے نہ سیٹھ مہتاب کی طرف جانا ہے اور نہ معطر کو پڑھانا ہے۔ اس فیصلے سے وہ مطمئن ہوکر گہری نیند سوگیا۔ دوسری صبح جاگا تو رات کا طے شدہ فیصلہ ریت کے گھروندے کی طرح مسمار ہوگیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے قدم ایک بار پھر درِ محبوب کی دہلیز کی جانب اٹھتے چلے گئے۔

اس روز بیگم مہتاب نے اس کا استقبال کیا اور پُریقین لہجے میں سرفراز سے بولیں۔ ”آئندہ تمہیں معطر سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ تمہاری محنت ضائع نہیں جائے گی۔“ یہ کہتے ہوئے اپنی توجہ معطر کی جانب مبذول کی اور تصدیق طلب نظروں سے بیٹی کی جانب دیکھا۔ جواب میں اس نے اپنی سفید صراحی دار گردن کو جنبش دی۔ ایک دن پہلے کی تیزی طراری رخصت ہوچکی تھی۔ ماں نے پیار سے اس کے گالوں کو تھپتھپایا اور کمرے سے نکل گئی۔ آج سرفراز نے بھی عشق و محبت کو بالائے طاق رکھ کر صرف اور صرف درس و تدریس پر توجہ دی۔ معطر نے بھی پورے انہماک اور توجہ سے اس کا لیکچر سنا۔ درمیان میں چند سوالات بھی کیے۔ اپنی ڈیوٹی پوری کرکے جب سرفراز اٹھا تو کافی حد تک اس کا موڈ خوشگوار تھا۔ معطر بھی پچھلے دنوں کی بہ نسبت کھلی کھلی سی تھی۔

☆☆☆

اپنے پُرتعیش بیڈروم میں معطر محوِ خواب تھی کہ سرہانے رکھا ہوا سیل فون گنگنایا۔ اسکرین پر ”توقیر“ کا نام دیکھ کر نیند آنکھوں سے غائب ہوگئی۔ ”سوئے نہیں ابھی تک؟“

دوسری جانب مردانہ ہنسی کی گونج سنائی دی اور پھر جذبات سے مغلوب ہوکر بھاری آواز میں کہا گیا۔ ”تم آج کی بات کررہی ہو۔ ہماری نیندیں تو اس روز سے اڑ کر پتا نہیں کہاں چلی گئی ہیں جس روز سے آپ کو دیکھا ہے۔ بس اب تو آپ ہیں اور آپ کا تصور ہے۔“

اپنے حسن کی تعریف سن کر معطر سر بہوٹی بن گئی۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ مخالف سمت سے ترنگ بھری آواز آئی۔ ”اوہو، شرما گئیں۔ کاش! اس شرمائے لجائے روپ میں، میں تمہیں دیکھ سکتا مگر اپنی ایسی قسمت کہاں۔ اور سناؤ تمہاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟“

معطر نے ناک سکوڑتے ہوئے برا سا منہ بنایا اور ترش لہجے میں بولی۔ ”اگر پڑھنے لکھنے میں دل لگالیا نا تو مما میری شادی چھ سات سال کے لیے ٹال دیں گی اور میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ بس کسی دن اپنے مما پاپا کو ہمارے گھر لے آؤ۔ اتنے بڑے گھرانے سے تمہارا تعلق ہے۔ میرے پیرنٹس تو انہیں دیکھتے ہی فرشِ راہ بن جائیں گے اور پھر تمہارے ہاتھ میں میرا ہاتھ ہوگا۔ اف میرے خدایا! پھر..... پھر زندگی کتنی حسین، کتنی خوبصورت ہوگی۔“ اس کی آواز خوشی سے سرشار تھی۔ دوسری جانب طویل تر خاموشی تھی۔ اچانک چھا جانے والے اس سناٹے نے معطر کے دل کی دھڑکن بڑھادی اور وہ تشویش ناک لہجے میں بولی۔ ”توقیر! تم خاموش کیوں ہوگئے؟“

دوسری طرف سے آواز ابھری۔ ”معطر! آج میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ ساری حقیقت طشت از بام کردوں گا۔ دراصل ممی اور پاپا تو اس وقت پاکستان میں ہی نہیں ہیں۔ اب اگر وہ یہاں آتے بھی ہیں تو وہ ہرگز ہرگز تمہارے یہاں میرا رشتہ لے کر نہیں جائیں گے کیونکہ امریکا میں رہنے والے میرے ایک چچا کی بیٹی سے وہ مجھے منسوب کرچکے ہیں

لطیفہ

پپو میاں نے گھر آکر امی سے کہا۔ ”وہ جو اپنی گلی میں کریانے کی دکان والے حاجی صاحب ہیں نا، ان کا آج ضرور اپنی بیگم سے جھگڑا ہوا ہوگا۔“

”کیوں، تم بھلا یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟“ پپو میاں کی امی نے حیران ہوکر پوچھا۔

”انہوں نے ایک ہفتے سے اپنی دکان میں لکھ کر لگا رکھا ہے ”لڑکے کی ضرورت ہے“ اور آج حاجی صاحب کے گھر لڑکی پیدا ہوئی ہے۔“

☆☆☆

بیٹے نے باپ کے دفتر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”کیا حال ہے ڈیڈی؟ میں ادھر سے گزر رہا تھا، میں نے سوچا آپ کو سلام کرتا چلوں۔“

”کوئی فائدہ نہیں بیٹا!“ باپ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”تھوڑی دیر پہلے تمہاری ممی ادھر سے گزری تھیں۔ انہوں نے بھی سوچا کہ مجھے سلام کرتی چلیں۔ سارے پیسے وہ لے گئی ہیں۔“

انگریز اور اصول

برنارڈ شا نے کہا۔

”دنیا میں کوئی اچھا یا برا کام ایسا نہیں جو انگریز نہ کرتے ہوں لیکن آپ انہیں کبھی غلطی پر نہیں پائیں گے۔ جب تک وہ آپ سے جنگ کرتے ہیں تو وطن پرستی کا اصول ان کے سامنے ہوتا ہے۔ وہ آپ کو لوٹتے ہیں تو کاروباری اصول پیش نظر رکھتے ہیں اور کسی کو غلام بناتے ہیں تو سلطنت کی توسیع کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔“

(مرسلہ: محمد ظفر اللہ ضیا، کمالیہ سٹی)

pklibrary.com

جو ہم سے زیادہ دولت مند ہیں۔ چچا چاہتے ہیں میں آکر ان کا بزنس سنبھالوں اور گھر داماد بن کر رہوں۔ میں تمہاری وجہ سے ٹال مٹول سے کام لے رہا ہوں۔''

''توقیر! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہم چھپ چھپ کر کئی بار ملے۔ تم نے کبھی اس بات کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔ آج اچانک یہ امیر ترین چچا اور ان کی بیٹی کہاں سے آن ٹپکے۔ جو صورت حال تم بتا رہے ہو، یہ تو بڑی سنگین ہے۔ اب اس کا کوئی حل سوچو۔ میں تو تمہارے بنا جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

ہلکے سے توقف کے بعد معطر کی سماعت سے ایک سرد آہ ٹکرائی۔ توقیر نے انتہائی حسرت ناک آواز میں کہا۔ ''ممی پاپا میری منگیتر کو انگیجمنٹ رنگ پہنانے ہی تو گئے ہیں۔ سچ کہتا ہوں معطر، میرا دل رو رہا ہے۔ نہ دن چین، نہ رات آرام۔''

وہ جیسے ہی خاموش ہوا اسے معطر کی سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ وہ آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''میں اپنے ہی گھر میں کون سی خوش و خرم تھی۔ ایک مما کے علاوہ تو سارے ہی سوتیلے ہیں۔ باپ سوتیلا، بہن بھائی سوتیلے۔ سوچا تھا شادی کے بعد تمہارا ساتھ ہوگا اور میرا اپنا گھر ہوگا۔ کیسے کیسے سپنے بُنے تھے لیکن میرا چھوٹا نصیب کہ.....''

وہ بات مکمل نہیں کر پائی۔ منہ کا جملہ منہ میں ہی رہ گیا۔ مخالف سمت سے توقیر کی ہمت، حوصلے سے بھرپور آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ ''معطر! تمہارے آنسو میرے دل پر گر رہے ہیں۔ ارے بے وقوف لڑکی! خواب تو ہم دونوں نے مل کر دیکھے ہیں اور جب اس کی تعبیر سامنے آئے گی تب بھی ہم دونوں برابر کے حصے دار ہوں گے۔''

''سچ؟'' معطر کی خوشی میں ڈوبی آواز ابھری۔

''سچ، سو فیصد سچ۔ ایک پلان میرے ذہن میں آیا ہے بشرطیکہ تم پورا پورا ساتھ دو۔ میری ہم قدم بن کر میرے ساتھ چلتی رہو گی تو ایک دن منزل پا ہی لیں گے۔'' دوسری طرف سے توقیر کا جواب موصول ہوا۔

قدرے توقف کے بعد معطر کی سوچ میں ڈوبی آواز ابھری۔ ''یہ بتاؤ منصوبہ کیا ہے؟'' توقیر کا طمانیت سے بھرپور قہقہہ گونج اٹھا۔ اس بار معطر بھی اس ہنسی میں شامل تھی۔ کھلکھلاتی ہوئی ہنسی کے بعد بولی۔ ''لگتا ہے کوئی سلوشن مل گیا ہے تب ہی تو قہقہے لگ رہے ہیں۔''

''ارے بھئی بتاتا ہوں، بتاتا ہوں۔'' توقیر کا موڈ بھی خوشگوار تھا اور آواز سے بھی شیرینی ٹپک رہی تھی۔ ''سننے کے لیے بہت مضطرب ہونا تو ذرا دل تھام کے سنو میری جان۔ یہ تو ساری دنیا کو علم ہے کہ تمہارا گھر تمہارے لیے قید خانہ بنا ہوا ہے۔ تمہاری اور تمہارے سوتیلے باپ سیٹھ مہتاب باٹلی والا کی جو پہلے تمہارا چچا تھا، ایک منٹ آپس میں نہیں بنتی۔ ہمیشہ اس کی اور تمہاری ٹھنی رہتی ہے۔ سیٹھ کے طعنے تشنے، آزادی کا فقدان اور بے جا پابندیاں یہ تمہاری جان ہی نہ لے لیں۔ اس لیے میری رائے یہ ہے کہ ہم ایک دن مقرر کرتے ہیں۔ وقت مقررہ پر میں تمہیں ریلوے اسٹیشن پر ملوں گا۔ ہمارا ریزرویشن پہلے سے ہو چکا ہوگا۔ پہلے ہم لاہور جائیں گے۔ کسی ہوٹل میں قیام کریں گے۔ میں اپنے گھر بھی تمہیں نہیں لے جاؤں گا۔ ہوٹل سے قریب جو بھی مسجد ہوگی، وہاں ہم نکاح پڑھوالیں گے۔ بس نکاح کے بعد ہمارے قدم مضبوط ہو جائیں گے۔ خوب گھومیں پھریں گے، موج مستی کریں گے۔ پھر تم اپنے والدین پر یہ راز آشکار کر دینا اور میں اپنے ممی پاپا کو ساری بات بتا کر تمہیں ان کے سامنے بحیثیت بہو پیش کر دوں گا۔ کیوں کیسی رہی میری حکمت عملی؟ تیار ہو ساتھ دینے کے لیے؟''

معطر نے ساری بات سننے کے بعد کافی دیر سے روکی ہوئی سانس خارج کی اور بولی۔ ''پلان تو تمہارا بہت اچھا ہے لیکن مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے اور پھر گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کو کوئی اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا۔ معاشرے میں ان کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ میری مما تو بے موت مر جائیں گی۔''

اپنا موقف بیان کر کے جوں ہی اس نے توقف کیا، جواب میں معطر کو انتہائی سخت لہجے میں کہا گیا۔ ''چلو تو پھر تم اپنی موت کو گلے لگا لو۔'' یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ معطر ڈبڈبائی آنکھوں سے سیل فون کو گھورتی رہی پھر تکیے میں منہ دے کر باقاعدہ سسکیاں لینے لگی۔ دوسرے دن جب وہ سو کر اٹھی تو آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

بیگم مہتاب نے اسے تشویش ناک نظروں سے دیکھا اور بولیں۔ ''مجھے لگتا ہے آج تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں سرفراز کو فون کر کے آنے کے لیے منع کر دیتی ہوں۔''

''اوہ تھینکس مام!'' معطر نے ایک پُرسکون سانس لے کر کہا۔ پھر سوچتے ہوئے بولی۔ ''ملازمین کو بھی منع کر دیجیے کہ کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ دروازہ بھی اندر سے بند کر لیا۔

بیگم مہتاب پُرتفکر نظروں سے دروازے کو گھورتی رہیں اور پھر خود کلامی کے انداز میں آہستہ سے بولیں۔ ''پتا نہیں کیا ہوگا اس لڑکی کا۔ ابھی تک نہ عقل ہے نہ شعور۔''

اپنے بیڈ پر لیٹ کر معطر سارا دن رات والے مسئلے پر

pklibrary.com

ہی سوچتی رہی۔ وہ بُری طرح تذبذب کا شکار تھی۔ قوتِ فیصلہ جواب دے چکی تھی لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنے روٹھے محبوب کو کس طرح منائے۔ ڈنر اس نے گھر کے تمام افراد کے ساتھ کیا۔ اگر ایسا نہ کرتی تو یقیناً ڈاکٹر کو کال کی جاتی۔ ڈنر کے بعد اپنی کتابیں لے کر اسٹڈی روم میں بیٹھ کر اس نے چاروں طرف اپنی نظریں دوڑائیں۔ گھر میں سناٹے کا راج تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ مطمئن ہوکر اس نے نمبر ملایا اور پچھلی رات کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر سے جوڑا۔ چند منٹ انتظار کے بعد کال اٹھالی گئی۔ جیسے ہی توقیر نے ہیلو کہا، معطر کے چہرے پر خوشیوں کی قوس قزح بکھر گئی۔ بالآخر ہتھیار ڈالتے ہوئے بولی۔ ''اچھا چلو، تم جیتے میں ہاری۔ تم جو کہو گے، میں وہی کروں گی۔''

توقیر کی مسرت انگیز آواز لہرائی۔ ''واقعی، تم سچ کہہ رہی ہو؟''

''سو فیصد!'' معطر نے جواب دیا۔ اپنی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے اس نے تفکر آمیز لہجے میں سرگوشی کی۔ ''لیکن یہاں سے نکلنے کی ترکیب تم مجھے بتاؤ گے۔ آج میں صبح سے شام تک یہی سوچتی رہی۔ دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں۔ آخر سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار کا کون سا راستہ اختیار کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کیونکہ ہماری کوٹھی کا جو مین گیٹ ہے، وہاں تو چوبیس گھنٹے گارڈ اپنے سروس ریوالور سمیت براجمان ہوتا ہے۔ ذرا سی آہٹ ہوتی ہے اور وہ فوراً ایکشن لیتا ہے۔''

توقیر کے منہ میں تلخی گھل گئی۔ تھوڑی دیر پہلے کی خوشی کافور ہوگئی۔ کھوکھلی آواز میں بولا۔ ''یہ تو تم صحیح کہہ رہی ہو۔ ہے تو بڑی ٹیڑھی کھیر لیکن کوئی جگاڑ تو لگانا پڑے گی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر رہ بھی نہیں سکتے۔ عجلت اور جلد بازی سے کام نہیں لینا ہے۔ مکمل یکسوئی سے تم بھی سوچو اور مجھے بھی مہلت دو۔ کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکل آئے گی۔ تم بے فکر ہوکر اپنی پڑھائی میں دل لگاؤ تاکہ تمہاری مما تم سے خوش رہیں اور سیٹھ مہتاب سے بھی الجھنے کی کوشش نہ کرنا۔ اگر گھر میں ہی تم بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کروگی تو وہ سب تمہارے دشمن بن جائیں گے اور تمہاری نگرانی میں مزید سختی برتی جائے گی۔ اس لیے میرا تو مشورہ یہ ہے کہ شیر و شکر بن کر رہو۔ جیسے ہی مسئلے کا حل ہمارے ہاتھ آتا ہے، ہم اس چوہے دان میں سے نکل بھاگیں گے۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟''

معطر نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ''آل رائٹ! جو تم کہو گے ویسا ہی ہوگا۔ گڈ نائٹ۔ اب میں سونے جارہی ہوں۔ آج دن بھر تم نے مجھے جس ذہنی ہیجان میں مبتلا رکھا، اسے میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتی۔ پلیز آئندہ سے ایسی کوئی حماقت نہیں کرنا۔''

☆☆☆

بیگم مہتاب اور سرفراز کے لیے یہ بات انتہائی حیران کن اور دل خوش کُن تھی کہ معطر کی ہٹ دھرمی اور ضد میں کافی کمی واقع ہوگئی تھی۔ ہوم ایگزام میں تمام مضامین میں تسلی بخش نمبر تھے۔ سیٹھ مہتاب اور بیگم مہتاب نے بہترین کارکردگی کے صلے میں سرفراز کی ٹیوشن فیس میں قدرے اضافہ کردیا تھا۔ چونکہ سرفراز کو ابھی تک ملازمت یا کوئی اور روزگار کی نوید نہیں ملی تھی اس لیے معطر کی ٹیوشن سے آنے والا پیسا اس کے گھر میں آکسیجن کا کام کررہا تھا۔ دوسرے یہ کہ روزانہ معطر کی قربت بھی نصیب ہوجاتی بلکہ اتوار اس سے کاٹے نہیں کٹتا۔ معطر کے چہرے پر نظر پڑتی تو اس کی ساری بے چینی، بے قراری ختم ہوجاتی۔ جب بھی فرصت کے لمحات نصیب ہوتے، وہ اپنے صلح کار کے پاس پہنچ کر دل کا دکھڑا روتا۔ مغموم آواز میں دل کی بے قراری کا نقشہ کھینچتا جسے سن کر ناصر بھی آبدیدہ ہوجاتا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتا۔ ''یہ کٹھن گھڑی ہر عاشقِ صادق کے نصیب میں آتی ہے۔ چند دن اور صبر کرلے میری جان! وہ لڑکی عنقریب تیری جانب مائل بہ کرم ہوگی۔''

ناصر کے تسلی آمیز جملوں سے سرفراز کے مردہ جسم میں نئی روح سرایت کرجاتی۔ دوسرے دن وہ ایک نئے جذبے اور ولولے کے ساتھ دیارِ محبوب جاکر معطر کے رخِ روشن کا دیدار کرتا تو دل بے قرار کو قرار آجاتا۔ ادھر معطر بظاہر اپنی اسٹڈی میں منہمک تھی۔

☆☆☆

آج بیتابیِ دل کے ساتھ اس نے توقیر کو کال کی۔ چند ساعت بعد توقیر نے پوری گرمجوشی سے اس کی خیریت دریافت کی۔

معطر نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں جواباً کہا۔ ''ارے بھئی ٹھیک ٹھاک ہوں۔ بس وہ تمہاری کزن بھوت بن کر مجھ سے لپٹ گئی ہے۔ کہیں تمہارے ممی پاپا اس سے تمہارا نکاح ہی نہ پڑھوادیں۔ بس یہی دھڑکا دل کو لگا رہتا ہے۔''

توقیر نے بلند و بانگ قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''بالفرض اگر ایسا ہوگیا تو؟'' اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

pklibrary.com

معطر نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ ”بہ خدا توقیر! ایسے مذاق مت کیا کرو۔ میں صرف اپنی مما اور تمہاری خاطر جی رہی ہوں۔ اگر تم دونوں میری زندگی سے نکل گئے تو میں پہلی فرصت میں خودکشی کرلوں گی۔“

توقیر جلدی سے بول پڑا۔ ”نہ..... نہ..... جانِ من! اس طرح نہیں بولتے۔ میں بھی خیالی گھوڑے سرپٹ دوڑا رہا ہوں کہ کس طرح اس جیل خانے سے تمہیں آزاد کرواؤں۔“

معطر نے سب کچھ صبر و سکون سے سنا پھر بولی۔ ”اب تم پوری توجہ سے میری بات سنو۔ درمیان میں مداخلت نہیں کرنا۔ میں بولتی رہوں گی اور تمہیں صرف سننے کا کام کرنا ہے۔ آیا سمجھ میں؟“

توقیر نے پوری فرمانبرداری سے کہا۔ ”او کے..... او کے، میں ہمہ تن گوش ہوں۔“

”ہوں.....“ معطر نے ایک ہنکاری بھری اور بولی۔ ”توقیر! کل میں ٹہلتے ٹہلتے اپنی کوٹھی کے پچھلے حصے میں چلی گئی جہاں کی صفائی ستھرائی شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ میرے پاپا مرحوم سیٹھ گلاب باٹلی والا کے زمانے میں تو اس حصے میں کافی چہل پہل اور گہما گہمی ہوتی تھی کیونکہ اس وقت ہمارا کاروبار کافی بڑھا ہوا تھا۔ تین لیدر فیکٹریز میں بھی کام اپنے عروج پر تھا۔ اس لیے میرے پاپا نے کوٹھی کے عقبی حصے میں ایک چھوٹا سا گودام بنوایا تھا۔ جب ہمارے شہر کے سارے گودام فل ہوجاتے تو پاپا بقیہ بچا کھچا سامان یہاں اسٹور کروادیتے تھے۔ پاپا کی ڈیتھ کے بعد میرے چاچو جنہیں اب میں ڈیڈی کہتی ہوں، انہوں نے بزنس کو سمیٹ کر کافی حد تک مختصر کردیا۔ نتیجتاً تینوں فیکٹریوں کو تالا لگ گیا لیکن اب ڈیڈی پھر سے ان فیکٹریوں میں کام شروع کروا رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں وہ مما سے بات کررہے تھے۔ آج صبح ناشتے کی میز پر انہوں نے مما کے حوالے ایک چابی کرتے ہوئے کہا۔ ”اس چابی کو سنبھال کر رکھنا۔ یہ عقبی گودام کی ہے۔“ گودام کا دروازہ جو باہر کی جانب کھلتا ہے، اس کا قفل بھی باہر سے لگایا جاتا تھا اور باہر سے ہی کھولا جاتا تھا۔ گودام کا نگران اپنے پاس چابی رکھتا، دروازہ کھلواتا، مزدوروں سے سامان رکھواتا اور پھر اپنی نگرانی میں مقفل کروا کر میرے پاپا کو وہ چابی دے دی جاتی۔ یہ چلن برسوں تک چلتا رہا۔ بہرحال وہی سارا عمل اب پھر دہرایا جائے گا۔ کل ڈیڈی اور مما کے درمیان ہونے والی گفتگو میری سماعت سے ٹکرائی تو آج میں نے اس حصے کا جائزہ لیا اور پھر توقیر! میرے دل کی دھڑکنیں خود بخود گنگنا اٹھیں۔ گودام کے عقبی دروازے سے میں بہ آسانی باہر آسکتی ہوں بشرطیکہ تم باہر سے اس کا لاک کھول دو۔ مما نے چابی کہاں رکھی ہے، میں نے اس کا پتا لگالیا ہے۔ میں وہ چابی تم تک پہنچادوں گی اور بس اس کے بعد میری جان پھول ہی پھول راہوں میں کھل جائیں گے۔“

معطر لہک لہک کر اپنا کارنامہ بیان کررہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ یہ ساری سرگزشت سن کر توقیر خوشی سے اچھل پڑے گا اور پھر فوراً مناسب وقت دیکھ کر اسے اس چہار دیواری سے نکال لے جائے گا لیکن یہ سب اس کی خام خیالی تھی۔

توقیر قدرے توقف کے بعد بولا۔ ”منصوبہ تو بڑا بے لاگ اور اچھوتا ہے۔ یقیناً کامیاب رہے گا لیکن میری ممی اور پاپا لیٹ نائٹ سونے کے عادی ہیں اور میری حرکات و سکنات پر بھی نظر رکھتے ہیں اور پھر میری کوٹھی سے تمہاری رہائش گاہ کا فاصلہ کافی طویل ہے۔ ہمیں صحیح وقت پر اسٹیشن بھی پہنچنا ہوگا اس لیے میرا وہاں تک آنا ناممکن ہے۔ ہاں خوبیٔ قسمت ہمیں کوئی ایسا ہمدرد مل جائے جو اس قفل کو کھول دے تو یہ سمجھو کہ ہمارے نصیب کا بند دروازہ کھل گیا۔“

معطر کی مایوسی آسمان کو چھونے لگی۔ وہ اشک بار آواز میں بولی۔ ”تم تو کہتے تھے میں تمہاری خاطر بھڑکتی ہوئی آگ میں کود سکتا ہوں، طوفانوں کا رخ موڑ سکتا ہوں لیکن رات میں آکر ایک دروازے کا قفل نہیں کھول سکتے۔ یہ ہیں تمہارے بلند و بانگ دعوے؟ اب تو مجھے تم سے خوف آرہا ہے۔ پتا نہیں یہاں سے نکلنے کے بعد میرا کیا حشر کرو گے؟“

توقیر بری طرح سٹپٹا گیا۔ اس کی ساری بساط ہی الٹ گئی تھی۔ حلق خشک ہوگیا۔ متوحش نظروں سے سیل فون کو گھورا اور اپنے لہجے میں مصنوعی چاشنی کا تڑکا لگاتے ہوئے بولا۔ ”جانِ توقیر! ناراض کیوں ہوتی ہو۔ کچھ نہ کچھ کرتے ہیں۔ تم تو فوراً بھڑک جاتی ہو۔ جانِ من! ملول ہونے کی ضرورت نہیں۔ خاطر جمع رکھو۔ جو تم نے سوچا ہے اسی پر عمل کریں گے۔ دولت میں بڑی طاقت ہے۔ میں کرائے کا کوئی ایسا آدمی تلاش کرتا ہوں جو مقررہ وقت پر پہنچ کر دروازہ کھول دے اور تمہیں مجھ تک پہنچادے۔ اس کے بعد سارا دردِ سر میرا ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم دونوں شادی کے بندھن میں بندھ جائیں گے۔ پھر میں فوری طور پر سیٹھ مہتاب باٹلی والا پر تمہارے حصے کی آدھی جائداد کا کیس دائر کردوں گا۔ سیٹھ کی عقل ٹھکانے آجائے گی۔ ابھی وہ تمہیں بے یار و مددگار سمجھ رہا ہے۔ جب

pklibrary.com

عدالتی کارروائی شروع ہوگی تو لگ پتا جائے گا کہ مخالف پارٹی کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ لاہور کے مشہور و معروف صنعت کار سیٹھ نورالدین کا بیٹا اور مرحوم سیٹھ گلاب بالٹی والا کا داماد سیٹھ توقیر الدین ہے۔ چھکے چھوٹ جائیں گے۔ تم دیکھنا تو سہی، کیسا کٹھ پتلی تماشا دکھاتا ہوں۔''

معطر کا بگڑا موڈ پل بھر میں بحال ہوگیا۔ لہجے کی شگفتگی عود کر آئی۔ خوشی سے سرشار لہجے میں بولی۔ ''پہلے مجھے دل بھر کر رلاتے ہو، پھر تسلیاں تشفیاں دیتے ہو۔ شادی کے بعد دل بھر کر خبر لوں گی۔''

توقیر بھونڈے انداز میں ہنسنے لگا۔ معطر نے بھی سلسلۂ کلام ختم کرتے ہوئے اپنے گردوپیش پر نظر ڈالی اور مطمئن ہوکر اپنے بیڈ پر لیٹ گئی۔ توقیر نے بھی ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دونوں ہاتھ اٹھا کر بھرپور انگڑائی لی۔ معاً ایک بھاری ہاتھ نے اس کی گردن کو آدبوچا اور پھر اسے اپنے باپ کی کھردری آواز سنائی دی۔ ''ناصرے! یہ تو ساری ساری رات جاگ کر کس سے باتیں کرتا ہے۔ اس سے پہلے بھی میں نے دیکھا کہ تو موبائل سے لگا رہتا ہے۔ ایسا کون سا تیرا یار دوست ہے۔ ذرا مجھے بھی تو بتا۔''

ناصر نے باپ کی گرفت سے اپنی گردن چھڑائی اور آہستگی سے گردن سہلاتے ہوئے بولا۔ ''ابا! آج تو تو نے مار ہی ڈالا تھا۔ ایمان سے میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ تجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا پرائیویٹ معاملہ ہے۔ بس اتنا بتادوں کہ بہت جلد اپنے وارے نیارے ہونے والے ہیں۔ بہت جلد میں سیٹھ بننے والا ہوں۔ اب کوئی مجھے پنساری کا بیٹا نہیں کہے گا۔''

ناصر کے باپ نے اسے دو ہتڑ مارتے ہوئے ایک موٹی سی گالی دی اور بولا۔ ''ابے دو نمبری۔ پہلے بھی دو بار تیری ضمانت پر پیسا خرچ کر چکا ہوں۔ پولیس والوں کے ہاتھ پیر جوڑے ہیں۔ اپنی محنت کے پیسے سے ان کی مٹھی گرم کی تب جاکر تجھے باہر نکالا ہے۔ خود تو ہے ہی پائی پائی کے لیے محتاج لیکن مجھے بھی قلاش بنانے میں تو نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کبھی دکان پر بیٹھ کر باپ کا ہاتھ نہیں بٹایا۔ محنت تجھ سے ہوتی نہیں۔ میں تیرے سارے رنگ ڈھنگ دیکھ رہا ہوں۔ بہت جلد تجھے گھر سے چلتا کروں گا۔''

اپنا بھاشن ختم کرکے صابر نے جیسے ہی توقف کیا اور اپنی عینک کا زاویہ ٹھیک کرکے بیٹے کی طرف دیکھا تو پتا چلا کہ وہ تو گہری نیند سو چکا ہے بلکہ زور زور سے خراٹے بھی لے رہا ہے۔ مشتعل ہوکر اس نے بیٹے کی چارپائی کو ایک ٹھوکر ماری اور تنتناتا ہوا چلا گیا۔ باپ کے جاتے ہی ناصر نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور اپنے ہاتھ سے اپنی پشت کو تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ''بیٹا ناصر! تیری اداکاری بھی لاجواب ہے۔ تیرا باپ بھی تیرے سامنے پانی بھرتا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا اور کروٹ لے کر سونے کی کوشش کی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ چشم تصور سے معطر کی اس دولت کو دیکھ رہا تھا جو عنقریب اس کے قبضے میں آنے والی تھی۔ اپنی مردانہ وجاہت کی بنا پر وہ کئی لڑکیوں کے ساتھ فلرٹ کر چکا تھا لیکن کوئی لڑکی معطر کی طرح امیر کبیر نہیں تھی اس لیے اس نے بڑی چابکدستی سے ان سے پیچھا چھڑالیا۔ اپنی لچھے دار باتوں کا جادو جگا کر اور شہر کے ایک بڑے صنعت کار کو اپنا باپ بتا کر معطر کے دل کے سنگھاسن پر اپنے قدم جمالیے۔ آج نوبت یہاں تک آن پہنچی تھی کہ معطر محض اس کی خاطر اپنے خون کے رشتوں کو بھی چھوڑنے کے لیے تیار تھی اور ناصر اس کو اپنی بڑی کامیابی تصور کر رہا تھا۔ معطر کی منصوبہ بندی سے وہ خود بھی متفق تھا لیکن بلی کے گلے میں گھنٹی باندھے کون؟ یہی سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی۔

معطر ہر دوسرے تیسرے دن کال کرکے اس سے اس مسئلے کا حل دریافت کرتی لیکن جواب نفی میں پاکر مایوس اور افسردہ ہوجاتی۔ ناصر اپنی جگہ ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔ دوستوں کے بارے میں سوچا تو معاً سرفراز کا نام بجلی کی طرح ذہن میں چمکا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے سرفراز کا نام کھرچ کر پھینک دیا کیونکہ اس کے نقطۂ نظر کے حساب سے سرفراز اس دور کا انسان ہی نہیں تھا۔ آہستہ سے اس نے خود کلامی کی۔ ''احمق! ابھی تک زمانے کی اونچ نیچ سے ناواقف ہے۔ پتا نہیں اس کی محبوبہ نے اسے چارا بھی ڈالا یا ابھی تک جوتی کی نوک پر رکھا ہوا ہے۔'' وہ ان ہی سوچوں میں غرق تھا کہ معطر کی کال آگئی۔ اسے علم تھا کہ معطر کا موضوعِ گفتگو کیا ہوگا۔ تھوڑی ناں نکر کے بعد بالآخر اس نے موبائل اٹھالیا کیونکہ جھوٹ سچ بول کر باتیں بنانا وہ خوب جانتا تھا۔

لیکن آج معطر نے اسے لفاظی کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس کے بولنے سے پہلے ہی خود شروع ہوگئی۔ لہجہ انتہائی سنجیدہ اور فیصلہ کن تھا۔ اس نے آغازِ کلام کرتے ہوئے کہا۔ ''توقیر! تم تو اول نمبر کے ناکارہ ہو۔ اس طرح سست روی سے کام کروگے تو شاید ہم دونوں کا ملن روزِ قیامت میں ہی ہوگا۔ بہرحال میری ایک تجویز ہے۔ یہ جو میرا ٹیوٹر ہے نا، انتہائی سادہ لوح، مہذب اور ٹھنڈے مزاج کا آدمی ہے۔

ہم اسے اپنا آلۂ کار بناتے ہیں۔''

ناصر نے متجسس لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا وہ اتنا سیدھا ہے کہ بغیر پیسے کے تمہاری بات مان جائے گا؟''

معطر جھلا کر بولی۔ ''تمہارا تو دین ایمان ہی پیسا ہے۔ وہ مجھ سے ایک پائی طلب نہیں کرے گا۔ میں صرف اسے اپنے حسن کی خیرات دوں گی۔ میں نے نہایت باریک بینی سے یہ بات بھانپ لی ہے کہ وہ میرے عشق میں سر سے پاؤں تک غرق ہو چکا ہے۔ اب جو میں کہوں گی، وہ وہی کرے گا۔''

ناصر نے مصنوعی غصیلا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''میری چیز پر رال ٹپکا رہا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

معطر نے ایک بھرپور طنز آمیز قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''دروازے کا تالا تک تو کھول نہیں سکے اور چلے ہیں قتل کرنے۔ چھوڑو یہ شیخ چلی والی باتیں۔ وہ تو تم ایک دولت مند باپ کے بیٹے ہو اس لیے میں نے بھی منہ لگا لیا ورنہ تم ہو کیا؟'' معطر نے جانے انجانے میں اسے اس کی اوقات یاد دلا دی لیکن اس سچ کو وہ کڑوا گھونٹ سمجھ کر پی گیا۔ رابطہ ختم ہوتے ہی اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور آہستہ سے بولا۔

''گھر کی دہلیز پھلانگتے ہی تو میری چھری کے نیچے آجائے گی معطر! پھر دیکھ میں کیا کرتا ہوں۔'' غیظ و غضب اس کے دل و دماغ میں لہریں لے رہا تھا۔ معطر نے آئینہ دکھا کر اس پر اس کی اصلیت اجاگر کر دی تھی۔

☆☆☆

سرفراز آج چوری چوری نہیں بلکہ معطر کو بھرپور نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ معطر نے بھی اس کی گستاخ نگاہی کا نہ برا منایا، نہ آنکھیں چرانے کی کوشش کی۔ آج سجنے سنورنے میں اس نے کافی محنت کی تھی اور کئی بار آئینے میں اپنے سراپا کا تنقیدی جائزہ لیا تھا۔ سبز رنگ کی بغیر آستینوں کی کھلے گلے کی قمیص کے ساتھ ٹراؤزر زیب تن کیا تھا۔ ہیئر اسٹائل پر بھی بھرپور توجہ دی تھی۔

اس کا بدلا ہوا حلیہ دیکھ کر سرفراز نے استفسارانہ انداز میں پوچھا۔ ''آپ آج کہیں جا رہی ہیں؟''

معطر نے سفید جھوٹ بولا۔ ''جی سر! ایک دوست کی برتھ ڈے پارٹی اٹینڈ کرنا ہے۔ ویسے میں کیسی لگ رہی ہوں؟'' اس نے اپنی جھیل جیسی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے معصومانہ انداز میں سوال کیا۔

سرفراز کے سارے جسم میں ایک لذت آمیز سنسناہٹ دوڑ گئی۔ تھوک کا گولا نگلتے ہوئے بولا۔ ''آج آپ بالکل سبز پری لگ رہی ہیں۔'' اس کی بات پر معطر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ سرفراز جھینپ کر کتابوں کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔ اس روز سرفراز نے کیا پڑھایا اور معطر نے کیا پڑھا، دونوں کو ہوش نہیں۔ گھڑی نے ڈیوٹی ٹائم ختم ہونے کا اعلان کیا تو سرفراز نے اپنے کپکپاتے ہاتھ میں معطر کا نرم و نازک ہاتھ تھام کر کہا۔ ''کل پھر ملیں گے۔''

معطر پھولوں کی لدی ڈالی کی طرح لچکتے ہوئے لب کشا ہوئی۔ ''میں منتظر رہوں گی۔''

سرفراز کے باہر جاتے ہی اس نے ایک قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''وہ کاٹا۔'' اپنی اس کامیابی پر وہ بے حد مسرور تھی۔ مسرور اور خوش تو سرفراز بھی تھا۔ ہر چیز دلکش اور سہانی لگ رہی تھی۔ آج بجائے گھر کا رخ کرنے کے وہ پیر مرشد کے آستانے کی طرف مڑ گیا جہاں اس کا باپ اس کی شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا۔ سرفراز کو دیکھتے ہی اس کا پارہ مزید چڑھ گیا۔ سرفراز الٹے پیر بھاگ نکلا۔

وہ ناصر کو جلد سے جلد خوشخبری سنانا چاہتا تھا۔ بالآخر ایک چائے خانے میں اسے پکڑ ہی لیا۔ جاتے ہی ناصر کے ہاتھ چومتے ہوئے بولا۔ ''یار ناصر! تو، تو کمال چیز ہے۔ تو نے جو کچھ کہا تھا، وہ سو فیصد سچ نکلا۔ وہ لڑکی تو پکے پھل کی طرح میری گود میں آگری۔''

ناصر نے خوشی کا ایک نعرہ لگایا اور بولا۔ ''تو آج کا ڈنر ہو جائے کسی شاندار ہوٹل میں۔''

سرفراز نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''میرے یار! مہینے کا اختتام ہونے والا ہے۔ پھوٹی کوڑی پاس نہیں۔ تیرا ڈنر اُدھار رہا۔''

اس کا جواب سن کر ناصر کو جھنجلاہٹ تو ہوئی لیکن بظاہر خوش دلی سے بولا۔ ''کوئی بات نہیں..... اگلے مہینے سہی۔ ویسے اس چھمک چھلو کا نام اور اتا پتا کیا ہے؟ کچھ ہمیں بھی تو معلوم ہو۔''

سرفراز نے بات اڑاتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ''میں تو اسے سبز پری کہتا ہوں اور ہمیشہ یہی کہوں گا اور اتا پتا پوچھ کر کیا کرو گے۔ بس یہ سمجھو کہ محلوں میں رہنے والی شہزادی ہے۔''

ناصر مسکرایا اور سرگوشی میں بولا۔ ''مطلب یہ کہ بہت بڑی جگہ ہاتھ مارا ہے؟'' سرفراز نے اثبات میں گردن ہلائی اور دونوں ہاتھ ملا کر وہاں سے نکل گئے۔

☆☆☆

اسی شام معطر نے ناصر کو مطلع کیا کہ پہلے ہی محاذ پر وہ فتح کا جھنڈا گاڑ چکی ہے اور یقیناً آگے بھی خیر ہی خیر ہوگی۔

pklibrary.com

وہ پُرعزم لہجے میں ساری روداد سنا رہی تھی۔

اسی دوران اس کی کھنک دار ہنسی کی آواز ناصر کے کانوں سے ٹکرائی تو اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم ہنس کیوں رہی ہو؟''

''وہ دراصل اچانک ایک بات یاد آگئی۔ میرے ٹیوٹر نے میرا نیا نام تجویز کیا ہے۔''

ناصر نے پُرشوق لہجے میں استفسار کیا۔ ''کون سا نام، کیسا نام؟''

معطر پھر دوبارہ ہنستے ہنستے بولی۔ ''سبز پری!''

ناصر اچھل پڑا۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ ''کیا کہہ رہی ہو؟''

معطر خوش دلی سے بولی۔ ''تم اتنے حیران پریشان کیوں ہو رہے ہو۔ دراصل آج میں نے سبز رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔''

ناصر نے ''اچھا'' اتنے طویل انداز میں ادا کیا کہ معطر نے سلسلہ ہی منقطع کر دیا۔ بعد میں وہ ''ہیلو ہیلو'' کرتا ہی رہ گیا۔ اپنا موبائل پٹختے ہوئے بولا۔ ''تو سبز پری کا گل فام یہ ہے۔ اب سرفراز تجھے ایسے شکنجے میں پھنساؤں گا کہ زمین تجھ پر تنگ ہو جائے گی۔ زبانی کلامی ہمیشہ دوستی کا دم بھرتا ہے لیکن مجھے آج تک تیرا وہ رویہ یاد ہے جب میٹرک کے امتحان میں نظر بچا کر تجھ سے میتھس کے پیپر میں مدد مانگی تھی اور تو نے تمام وقت مجھے آس پر رکھا لیکن میرے ساتھ اتنا بھی تعاون نہیں کیا کہ مجھے پاسنگ مارکس ہی مل جاتے۔ اب تجھے سرکاری مہمان بنا کر سلاخوں کے اندر بٹھاؤں گا۔ وہاں بیٹھ کر معطر سے عشق لڑانا۔'' اس کے ہونٹوں پر ایک شاطر اور مکار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

☆☆☆

پہلے سرفراز مؤدب انداز میں سر جھکا کر بڑھاتا تھا لیکن اب استاد اور شاگرد کا رشتہ صرف دیکھنے والوں کے لیے تھا جبکہ ان دونوں کے درمیان کی تمام اجنبیت اور غیریت کے پردے سرک چکے تھے۔ دونوں اپنے دھڑکتے دلوں کی داستان بیان کر رہے تھے۔ دورانِ گفتگو سرفراز نے سوال کیا۔ ''تم کل سالگرہ میں گئی تھیں؟''

جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے اور نہ جھوٹے کی یادداشت اچھی ہوتی ہے۔ معطر کا سارا دماغ فرار کی پلاننگ میں الجھا ہوا تھا۔ الٹا اس نے سوال داغ دیا۔ ''کس کی سالگرہ؟'' یاد آنے پر بری طرح گڑبڑا گئی اور پھر کھسیانے لہجے میں بولی۔ ''ہماری ایسی قسمت کہاں کہ ہم سیر سپاٹے کریں۔ ہم تو یہاں کے قیدی ہیں۔ ہمارے پیروں میں تو آہنی زنجیریں پڑی ہیں۔ پتا نہیں کب یہاں سے چھٹکارا نصیب ہوگا۔''

سرفراز نے اس کا گداز ہاتھ سہلاتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''دل چھوٹا نہ کرو۔ ایک دن تمہاری مما سے اجازت لے کر اور تمہارے دونوں بہن بھائی کو ساتھ لے کر ہم باہر کا راؤنڈ لگائیں گے لیکن پتا نہیں تمہارے فادر اس کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں۔ تمہاری مما تو بہت کوآپریٹو نیچر کی مالک ہیں۔''

معطر تلخ لہجے میں بولی۔ ''ایسا غضب نہ کیجیے گا۔ کبھی بھول کر بھی مما کے روبرو ایسی تجویز پیش نہ کر دینا ورنہ میری شامت آجائے گی۔ ہاں البتہ ایک آئیڈیا ہے میرے ذہن میں تاکہ میں چند ساعتیں آپ کی ہمراہی میں گزار سکوں۔''

''وہ کیا۔'' سرفراز پُرتجسس لہجے میں بولا۔ اپنی ساری منصوبہ بندی معطر نے سرفراز کی سماعتوں میں انڈیل دی۔ سرفراز چند لمحوں کے لیے بے حس و حرکت ہو گیا۔ معطر کی باتوں نے اسے دہلا کر رکھ دیا۔

معطر نے فوراً ''آنسو کارڈ'' کا استعمال کیا اور سرفراز ان آنسوؤں کے سامنے ڈھے گیا۔ معطر نے چلتے چلتے کہا۔ ''میں بہت جلد تمہیں وقت اور تاریخ بتا دوں گی اور چابی بھی تمہارے ہاتھ میں تھما دوں گی۔ ہم دونوں ساری رات باہر رہ کر مٹرگشت کریں گے۔ آئس کریم کھائیں گے۔ واؤ سرفراز! کتنا مزہ آئے گا۔ اس ساری جائداد میں آدھے کی حقدار ہوں میں۔ اوہ، ساری صرف میں نہیں بلکہ اب تو اس میں تمہارا بھی حق بنتا ہے۔ جو میرا وہ تمہارا اور جو تمہارا وہ میرا۔ کیوں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں؟''

سرفراز ایک پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے وہاں سے نکل گیا۔ اس کی پیشانی پر ابھی سے پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس کے قدم پھر ناصر کی جانب اٹھ گئے۔ ایک وہی اس کا ہمدرد اور غمگسار تھا۔ ناصر نے اس کا لٹکا ہوا چہرہ دیکھا تو بولا۔ ''ارے کیا سبز پری نے تھپڑ رسید کر دیا؟''

سرفراز نے نمناک آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر اپنا دل چیر کر رکھ دیا۔ کچھ بھی نہیں چھپایا۔ ناصر دبنگ آواز میں بولا۔ ''تو نے تو عورتوں کو بھی مات کر دیا۔ اس لڑکی کی بہادری دیکھ۔ تیرے ساتھ چند گھنٹے گزارنے کے لیے کتنا بڑا رسک لے رہی ہے اور تو عشق کا دعوے دار بن کر خوف سے کانپ رہا ہے۔ حوصلہ کر اور ہامی بھر دے۔ اس لڑکی کی ماں اور بہن بھائی تو یہاں ہوں گے ہی نہیں۔ رہ گیا باپ، وہ

یقیناً ڈنر کے بعد پی پلا کر خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہوگا۔ بڑے لوگوں کے شب و روز کا مجھے اچھی طرح پتا ہے۔ تو اور تیری سبز پری باہر نکل کر دل بھر کر انجوائے کرنا اور پو پھٹنے سے پہلے پہلے اسی دروازے سے لڑکی کو اندر کر کے دروازہ لاک کرنا اور اپنے گھر کا راستہ لینا..... اور ہاں، اپنی جیب بھی گرم رکھنا ورنہ لڑکی پر بیڈ امپریشن پڑے گا۔ کنگلے لڑکوں کو دنیا کی کوئی لڑکی پسند نہیں کرتی۔ کہیں آئس کریم، کہیں فاسٹ فوڈ اور کہیں سافٹ ڈرنکس۔ واہ میرے یار! کیا سلونی، کیا سہانی رات ہوگی۔ دوستاروں کا ملن چاند ستارے بھی دیکھ رہے ہوں گے اور ہم جل جل کر بھسم ہو رہے ہوں گے۔''

ناصر کی باتیں سن کر سرفراز کا سارا خوف، ساری دہشت ہوا ہوگئی..... رگ و پے میں عشق کی چنگاریاں لہو بن کر دوڑنے لگی تھیں۔ ایک نئے اعتماد اور سرشاری کے ساتھ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وقتِ مقررہ پر وہ گودام کے عقبی دروازے کا قفل ضرور کھولے گا۔

☆☆☆

بیگم مہتاب حیدر آباد کے لیے نکلنے لگیں تو معطر نے ماں کو رخصت کرتے ہوئے مغموم اور التجائیہ لہجے میں کہا۔ ''مما! جلدی آیئے گا۔ آپ کو پتا ہے نا مجھ سے آپ کی جدائی برداشت نہیں ہوتی۔''

ماں نے الوداعی بوسہ لیا اور اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ دونوں بچے بھی بہن سے ہاتھ ملا کر خوشی خوشی گاڑی میں سوار ہوگئے۔ معطر کے چہرے پر مصنوعی افسردگی کا غلاف تھا ورنہ خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ پہلی فرصت میں اس نے یہ گڈ نیوز ناصر کو سنادی۔ ناصر نے ہونٹ سکیڑ کر ہلکی اور مدھم آواز میں سیٹی بجائی۔ یہ خبر سنتے ہی اس کی رگ رگ میں بجلی دوڑ گئی۔

معطر نے بغیر کسی تمہید کے فوری استفسار کیا۔ ''ہاں تو اب بتاؤ کہ ہمیں کب نکلنا ہوگا تاکہ میں اپنے ٹیوٹر کو سارا پروگرام سمجھا کر اسے مقررکردہ وقت پر بلوا کر اس کے ساتھ یہاں سے نکل سکوں؟''

ناصر نے جز بز ہوتے ہوئے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ ''تم نے اپنی تیاری مکمل کرلی؟''

معطر نے بھویں اچکا کر تعجب سے پوچھا۔ ''کیا مطلب؟ کیسی تیاری؟''

ناصر نے لگاوٹ آمیز لہجہ اختیار کیا اور بولا۔ ''تو قیر سیٹھ نور الدین کا بیٹا ضرور ہے لیکن ابھی اتنا خودمختار نہیں ہے۔ جو جیب خرچ ملتا ہے وہ ہماری ضرورتوں کے لیے ناکافی ہوگا۔ اس لیے زادِ راہ کے طور پر کچھ کیش اور اپنی گولڈ کی جیولری ضرور رکھ لینا۔ ہوسکتا ہے ضرورت پڑ جائے۔''

معطر بدستور حیرانی سے بولی۔ ''لیکن نکاح کے بعد تو ہم تمہارے ممی ڈیڈی کے ساتھ رہیں گے پھر بھلا یہ بوجھ کیوں رکھوں؟ علاوہ اس کے یہ چیزیں ساتھ ہوں گی تو سارے سفر میں دھڑکا لگا رہے گا۔ نہ بابا نہ۔ میں تو کچھ بھی نہیں رکھوں گی۔ بس اپنے دو چار جوڑے اور چھوٹی موٹی ضروریات کا سامان..... یہ ہوگا میرے ہمراہ۔''

ناصر دانت کچکچا کر رہ گیا لیکن مواصلاتی رابطہ تھا اس لیے سانس بھی سنبھل کر لے رہا تھا البتہ اس کے دماغ کی شیطانی چکی اپنی پوری رفتار سے رواں دواں تھی۔ ہلکے سے توقف کے بعد بولا۔ ''میری جان! تمہاری میموری کچھ زیادہ ہی ویک ہوگئی ہے۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میرے والدین فی الحال آؤٹ آف کنٹری ہیں اس لیے اپنی سسرال میں آپ فی الفور قدم رنجہ نہیں فرما سکتیں۔ جب ممی ڈیڈی پاکستان آئیں گے تب کیا صورتِ حال ہوتی ہے، اسی حساب سے ہمیں کام کرنا ہوگا۔ ان کی آمد تک ہمیں کسی بہترین ہوٹل میں قیام کرنا ہوگا۔ چھوٹی موٹی جگہ اور سستے قسم کے کھانے کا تو ہم لوگ تصور بھی نہیں کرسکتے۔ شاہانہ زندگی گزارنے کے عادی ہیں تو آگے بھی پیسا ہی خرچ کرنا پڑے گا نا۔ میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں کیونکہ جیسے ہی ہم دونوں کا سفر شروع ہوگا، میری ذمے داریاں بڑھ جائیں گی۔''

معطر بے جان آواز میں بولی۔ ''تو پھر ٹھیک ہے۔ میں تیاری شروع کرتی ہوں۔ کل بدھ کی رات ہوگی۔ میں سرفراز کو آگاہ کردوں گی۔ اوکے، تم بھی ریڈی رہنا۔''

ناصر کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ اس نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم فکر ہی نہ کرو۔ میں سب سنبھال لوں گا۔''

ناصر سے سلسلۂ کلام ختم ہوا تو سرفراز سے جڑ گیا۔ معطر کا نام دیکھ کر سرفراز کو یوں محسوس ہوا جیسے ساری فضا معطر ہوگئی ہو۔ خوشی سے نہال فوراً موبائل پر زوردار ''ہیلو'' کی لیکن جب معطر نے تحکمانہ انداز میں سارا شیڈول سمجھایا تو اس کا دم نکلنا ہی باقی رہ گیا۔ وہ تمام جذبات جو عشق نے تخلیق کیے تھے، مردہ ہوچکے تھے۔ عقل نے مشورہ دیا کہ فوراً انکار کردے اور کہہ دے کہ محترمہ میں واک آؤٹ کر رہا ہوں۔ میں باز آیا اس عشق سے اور اس سیر و تفریح سے۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنی ذہنی رو کو کنٹرول کیا اور

pklibrary.com

مری آواز میں ہوں ہاں کرتا رہا۔

معاً اسے یاد آیا کہ معطر نے چابی تو اس کے حوالے ابھی تک نہیں کی لیکن اس کے سوال کرنے سے پیشتر اس نے سرفراز سے کہا۔ ''کل جب مجھے پڑھانے آؤ گے، تب میں تمہیں چابی دے دوں گی۔'' سرفراز نے بھی کافی کھینچ کر ''اچھا'' کہا۔ معطر نے کھٹ سے موبائل آف کر دیا۔

☆☆☆

عمر دراز نے اپنی پلیٹ صاف کرتے ہوئے آخری لقمہ لیا اور بولا۔ ''سرفراز کی ماں! آج میری نائٹ ہے۔ خنکی بڑھ گئی ہے۔ میرا سوئٹر اور مفلر مجھے یاد سے دے دینا ورنہ بھول جاؤ گی۔''

انوری نے سر ہلا کر اپنے سر کو جنبش دی اور بولی۔ ''آج سارے گرم کپڑے اور لحاف رضائیاں نکالنے میں ہی تکان ہوگئی ہے۔ پیروں میں سخت درد ہو رہا ہے۔''

ماں کے اس جملے پر سرفراز نہایت فرمانبرداری سے بولا۔ ''اماں! آپ کھانا کھا کر فوراً بستر میں لیٹ جائیں۔ میں بابا کو چائے بنا کر دے دوں گا۔ مجھے تھوڑی دیر کے لیے باہر بھی جانا ہے۔ ایک دوست سے اشد ضروری کام ہے لیکن جانے سے پہلے آپ کے پیروں پر سرسوں کے تیل کی مالش کر دوں گا۔''

انوری نے آسمان کی جانب ہاتھ بلند کر کے بیٹے کو بے شمار دعاؤں سے نوازا اور عمر دراز نے دل سے ''آمین'' کہا۔

انوری نے بیٹے کے ہاتھوں کا لمس پا کر شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ ''اللہ تجھے اچھا رکھے۔ تیرے ہاتھ لگتے ہی میری آدھی بیماری دور ہوگئی۔''

بیوی کی بات پر عمر دراز نے بیٹے کو دیکھا مگر کچھ نہیں کہا۔

انوری اپنے پیر کھینچتے ہوئے بولی۔ ''اسے ضروری کام سے اپنے دوست سے ملنے بھی تو جانا ہے۔ جا میرے [illegible] بھی سوئٹر مفلر پہن لے اور اپنے بابا کے ساتھ ہی نکل جا۔''

عمر دراز بیوی کی بات سن کر غصے سے اٹھا اور باہر جاتے ہوئے دروازے پر تالا ڈال کر چلا گیا۔

سرفراز کو اس سنگین [illegible] کا ادراک اس وقت ہوا جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ وہ سر پیٹ کر رہ گیا۔ وہ اپنے ہی بال نوچتا رہا۔ سرفراز کے ذہن میں [illegible] کی بھولی بسری یادیں کلبلانے لگیں جب لگنے پڑھنے میں اس کا دل نہیں لگتا اور محلے کے بچے اسے بار بار بلاتے تو اس وقت عمر دراز یوں ہی اسے قید کر کے اپنے کام پر چلا جاتا تھا۔ وہ غصے میں دانت پیستے ہوئے بولا۔ ''اماں! بابا نے میرے ساتھ بہت بُرا کیا ہے۔''

انوری نے سادگی سے استفسار کیا۔ ''تو کیا آج ہی اس دوست سے ملنا ضروری تھا، کل مل لینا۔'' اس وقت ماں کا ہمدردانہ رویہ بھی سرفراز کو بُری طرح کھل رہا تھا۔ سارا غیظ و غضب ماں پر اتار کر نڈھال ہو کر اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔

انوری دکھی نظروں سے بیٹے کو تک رہی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں بات آگئی تھی کہ معاملہ انتہائی سنجیدہ اور اہم ہے ورنہ اس کا بیٹا بہت خوش مزاج اور شائستہ فطرت کا مالک ہے۔ شدید غصے میں وہ کروٹیں بدل رہا تھا۔ اسی اثناء میں طے شدہ وقت کے مطابق اسے معطر کی کال موصول ہوئی۔ پہلے تو وہ پھٹی پھٹی نظروں سے موبائل کو دیکھتا رہا پھر پژمردہ آواز میں معذرت کے ساتھ اپنے مسمار خوابوں کی داستانِ غم سنا دی اور کپکپاتے لہجے میں دوسرے دن آنے کا وعدہ بھی کر ڈالا لیکن مخالف سمت سے اسے غموں میں ڈوبی سسکیاں سنائی دیں۔ معطر نے سلسلہ منقطع کیا تو سرفراز اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور رو پڑا۔ انوری پُرتفکر اور اداس نگاہوں سے بیٹے کو دیکھتی رہی اور من ہی من میں عمر دراز کو صلواتیں سناتی رہی۔

☆☆☆

معطر کا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ اس نے کپکپاتا ہوا اپنا ہاتھ اپنے دل پر رکھ دیا۔ ناصر کی کال پر کال آرہی تھی لیکن وہ ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ بہ وقت تمام اس نے اپنا سیل فون اٹھایا اور لرزیدہ لہجے میں بولی۔ ''اب تو نئی صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ میرے ٹیوٹر نے عین وقت پر دھوکا دے دیا ہے۔''

''اوہ، اب کیا ہوگا۔'' ناصر [illegible] زہر خند لہجے میں بولا۔

معطر نے اس سے زیادہ زہریلا لہجہ استعمال کرتے ہوئے شعلہ بیانی کی۔ ''اب کیا ہوگا، مجھ سے پوچھ رہے ہو جبکہ سارا معاملہ اپنے ہاتھوں سے تم نے خود بگاڑا ہے۔ تم خود آکر دروازے کا تالا کھولتے تو شاید میں اس وقت تمہارے ساتھ ہوتی۔ اب تو سارا معاملہ گڑبڑ ہوگیا ہے۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ کسی تھرڈ پرسن کو اس معاملے میں شامل نہیں کرو۔ بہرحال اب تو میرا باہر نکلنا ناممکن ہے جبکہ میں پوری طرح سے نکلنے کے لیے ریڈی تھی۔''

ناصر نے دل ہی دل میں سرفراز کو ایک موٹی سی گالی دی اور بولا۔ ''ڈرپوک گیدڑ دبک کر بیٹھ گیا۔''

معطر نے استہزائیہ انداز میں جواب دیا۔ ''وہ اگر ڈرپوک گیدڑ ہے تو تم بھی اس کے ہی بھائی ہو۔''

ناصر کی مردانگی پر ضرب پڑی تو وہ بلبلا اٹھا اور فوراً

بولا۔ ”میں آرہا ہوں معطر! تمہیں لینے میں آرہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے موبائل بند کیا اور قریب کھڑی ٹیکسی کو ہاتھ دکھایا۔ معطر کی کوٹھی سے کافی فاصلے پر اس نے ٹیکسی رکوائی اور کرایہ دے کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ گودام کے اس دروازے پر پہنچ گیا جہاں بڑا سا تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس نے دل شکستہ لہجے میں خود کلامی کی۔ ”چابی تو سرفراز کی جیب میں ہے۔ اب کیا کروں؟“ اچانک اس کی نظر گودام کی دیوار سے ایستادہ اس برگد کے درخت پر پڑی جس کی لمبی لمبی جٹائیں نیچے تک لٹک رہی تھیں۔ وہ بے دھڑک درخت پر چڑھ تو گیا لیکن اندھیرے کی وجہ سے اسے گودام کی چھت تک پہنچنے میں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنی جان پر کھیل کر جب اس نے زمین پر اپنے پیر رکھے تو اسے محسوس ہوا جیسے موت کی وادی سے گزر کر زندگی سے ہاتھ ملایا ہے۔ ایک طویل پُرسکون اور اطمینان بھری سانس لی اور کوٹھی کی جانب قدم بڑھائے۔ کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور ویل ڈیکوریٹڈ تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی متلاشی آنکھیں معطر کو ڈھونڈ رہی تھیں لیکن اس کی پرچھائیں کا بھی پتا نہیں تھا۔ معاً اس کی سماعت سے معطر کی آواز ٹکرائی۔ وہ کسی سے کچھ کہہ رہی تھی۔ ناصر نے آواز کی سمت ہی قدم بڑھا دیے۔ جس کمرے سے معطر کے بولنے کی آواز آرہی تھی، وہ کمرا دودھیا روشنی سے جگمگا رہا تھا اور دروازہ بھڑا ہوا تھا۔

ناصر نے بغیر سوچے سمجھے دروازے کو دھکیلا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ کمرے کے وسط میں سیٹھ مہتاب طیش کے عالم میں کھڑا قہر آلود نظروں سے معطر کو گھور رہا تھا۔ درمیانی ٹیبل پر وہ سوٹ کیس رکھا ہوا تھا جو سیٹھ مہتاب نے معطر کے ہاتھوں سے چھین کر اپنے قبضے میں لے رکھا تھا۔ کرخت اور دھمکی آمیز آواز میں وہ معطر سے سوٹ کیس کی چابی طلب کر رہا تھا۔ معطر نہایت درشتی اور ہٹ دھرمی کے ساتھ ترکی بہ ترکی جواب تو دے رہی تھی لیکن اپنے ہینڈ بیگ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔ ناصر کو یکدم اپنے سامنے دیکھ کر بھونچکا رہ گئی۔ بے ساختہ اس نے کہا۔ ”توقیر! تم؟“

سیٹھ مہتاب نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور طنز آمیز تبسم کے ساتھ بولا۔ ”تو یہ ہے وہ آشنائے راز جس کے ساتھ جانے کے لیے ہماری کبوتری پھڑ پھڑا رہی ہے۔“

ناصر ہونق بنا، منہ کھولے، آنکھیں پھاڑے چاروں طرف نظریں گھما رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ لمحوں میں ساری صورت حال بھانپ گیا تھا۔ ایک جگہ جا کر اس کی نظر ٹھٹک گئی۔ آنکھوں میں چمک سی لہرائی اور اس نے چھلانگ لگائی اور سیٹھ مہتاب کے بیڈ سے وہ ریوالور اٹھا لیا جو ان کے تکیے کے قریب رکھا ہوا تھا۔ معطر نے گھبرائی ہوئی تشویشناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سرزنش کی اور بولی۔

”تو قیر! یہ کیا کر رہے ہو۔ مم..... میں..... میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔ اس سوٹ کیس پر خاک ڈالو۔“

اسی دوران کمرے سے باہر قدموں کی آہٹ ابھری اور مسز مہتاب کمرے میں داخل ہوئیں۔ متوحش اور تعجب خیز نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا اور مرتعش و تجسس آمیز لہجے میں بولیں۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ یہ اجنبی کون ہے؟“ ناصر اور معطر کے ہونٹ سلے ہوئے تھے لیکن سیٹھ مہتاب خاموش نہیں رہا۔ اس کی زبان آگ اگل رہی تھی۔ بیوی کے سامنے وہ بیٹی کے کرتوت بیان کر رہا تھا۔

اسی شعلہ بیانی کے دوران اس نے ناصر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہے تمہاری بیٹی کا آشنا جس کے ساتھ کافی کچھ لے کر فرار ہو رہی تھی۔“

بیگم مہتاب غیظ و غضب کا پیکر بنی ہوئی تھیں۔ وہ ناصر پر چڑھ دوڑیں۔ ریوالور ابھی تک ناصر کے ہاتھ میں تھا۔ ناصر کی کوشش تھی کہ کسی طرح سوٹ کیس اس کے ہاتھ آجائے۔ اسی چھینا جھپٹی میں وہ سوٹ کیس اٹھانے کے لیے جھکا۔ اسی لمحے گولی چلنے کی آواز نے خاموشی اور سناٹے کو چیر کر رکھ دیا۔ سیٹھ مہتاب کا لحیم شحیم جسم کسی تناور درخت کی طرح گرتا چلا گیا۔ کمرے کا قالین خون سے تربتر ہو گیا۔ مسز مہتاب نے ایک دلدوز چیخ ماری اور غش کھا کر گر پڑی، معطر نے ناصر کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ ہچکیوں، سسکیوں کے دوران وہ بار بار ناصر سے کہہ رہی تھی۔

”تم نے ڈیڈی کو کیوں مارا؟ تم نے گولی کیوں چلائی؟“

ناصر عالم سکوت میں کھڑا تھا۔ معطر کے چیخنے چلانے پر احتجاج کرتے ہوئے لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ ”میں نے گولی نہیں چلائی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے تمہارے ڈیڈی کو نہیں مارا۔“

باہر گیٹ پر کھڑا اوچ مین ہاتھ میں اپنا سروس ریوالور تھامے جب جائے وقوعہ پر پہنچا تو چکرا کر رہ گیا۔ دہشت زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”یہ..... یہ سب کیا ہو گیا؟“ اس کے بعد اس نے اپنے موبائل سے پولیس اسٹیشن کا نمبر ملایا اور ڈیوٹی آفیسر کو اس خون آشام واقعے کی اطلاع دی۔

☆☆☆

pklibrary.com

عمر دراز نے جب اپنے گھر کا دروازہ کھولا تو دیکھا کہ اس کا بیٹا کمرے میں یوں ٹہل رہا ہے جیسے آہنی پنجرے میں ببر شیر۔ باپ بیٹے کی نظریں جونہی چار ہوئیں، سرفراز نے نفرت اور خفگی سے منہ پھیر لیا۔ بیٹے کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر عمر دراز مسکرایا اور سرفراز بھی تیزی سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ انوری ناشتے کے لیے اسے پکارتی رہ گئی۔

وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ موبائل وائبریٹ کرنے لگا۔ عظمت کا نام دیکھ کر چلتے ہوئے ٹھٹک گیا اور اپنے مخصوص انداز میں ''ہیلو'' کہتے ہوئے اس کی خیریت دریافت کی۔

عظمت نے علیک سلیک کے بعد خوشدلی سے کہا۔

''تمہارے لیے ایک گڈ نیوز ہے۔''

سرفراز کو اس وقت عظمت کی کال بری طرح کھل گئی تھی لیکن گڈ نیوز کا سن کر موڈ خوشگوار ہو گیا اور پُراشتیاق لہجے میں بولا۔ ''اب سنا بھی دو۔ کیوں سسپنس پیدا کر رہے ہو۔''

عظمت نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ارادہ تھا پہلے مٹھائی کھاؤں گا۔ چلیے جناب! سنا دیتے ہیں۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔ تم نے جس انٹرنیشنل کمپنی میں جاب کے لیے اپلائی کیا تھا، وہاں تمہارا سلیکشن ہو گیا ہے۔''

سرفراز خوشی سے اچھل پڑا۔ اگر عظمت سامنے ہوتا تو شاید اس کا منہ چوم لیتا۔ فی الحال تو اپنے موبائل کو بوسہ دیتے ہوئے بولا۔ ''جیو میرے دوست! ہمیشہ خوش رہو۔ اب یہ خوشخبری اپنی اماں اور بابا کے بعد معطر کو سناؤں گا اور تمہاری مٹھائی پکی آج شام میں۔''

عظمت پھر مستفسر ہوا۔ ''یہ معطر کون ہے جناب؟''

سرفراز کو اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ سنبھل کر بولا۔ ''ارے یار! میری اسٹوڈنٹ معطر، سیٹھ مہتاب کی بڑی صاحبزادی ہے۔ بہت عزت احترام کرتی ہے میرا۔ پُرخلوص اور انسان دوست ہے۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ میں روزگار کے سلسلے میں بہت پریشان ہوں۔''

عظمت نے سخت اور تنبیہ کرنے والے لہجے میں الفاظ چباتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری بے خبری اور سادہ لوحی کسی دن تمہیں لے ڈوبے گی۔ اب کبھی بھول کر بھی اس طرف کا رخ نہ کرنا۔ تمہیں علم نہیں رات وہاں کیا قیامت ٹوٹی ہے؟''

سرفراز نے چونکتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کیوں، کیا ہوا؟''

عظمت نے اپنی جان چھڑاتے ہوئے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''میں زیادہ وضاحت تو نہیں کر سکتا۔ میرا ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ بہرحال سیٹھ مہتاب کو کسی چور نے گھر میں گھس کر قتل کر دیا ہے۔ ٹی وی پر نیوز چل رہی ہے۔ مسز مہتاب کا فون آیا تھا۔ قانونی کارروائی کے سلسلے میں پاپا سے مشورہ طلب کر رہی تھیں۔ میں ابھی ابھی پاپا کو اپنی گاڑی سے چھوڑ کر آ رہا ہوں۔ اچھا دوست! اب اجازت دو.....'' کہتے ہوئے اس نے موبائل آف کر دیا۔ سرفراز کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اچانک کڑکڑاتی بجلی گری اور سب بھسم ہو گیا۔ مختلف اندیشوں میں گھرا ہوا وہ سیٹھ مہتاب کی کوٹھی کے بجائے اپنے گھر کی جانب مڑ گیا۔

بدحواس اور گھبرایا ہوا جب وہ اپنے گھر پہنچا تو عمر دراز اور انوری نے اسے حیران و پریشان نظروں سے دیکھا اور انوری نے فوراً استفسار کیا۔ ''کیا ہوا، اتنی جلدی لوٹ آئے؟ اور یہ صورت پر کیوں بارہ بج رہے ہیں..... کیا بات ہے؟''

سرفراز نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ارے اماں! آپ بھی پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ آج ناشتا نہیں کیا اس لیے کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں گھس گیا۔ چند گھنٹوں بعد ٹی وی اور اخبارات نے

متحدہ عرب امارات میں مقیم

اردو قارئین کے لیے خوشخبری

جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز کراچی (پاکستان)

کے چاروں رسائل

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،

ماہنامہ پاکیزہ اور ماہنامہ سرگزشت

ایک فون کال کے فاصلے پر

آپ کال کریں، مطلوبہ رسالہ آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گا۔

اردو بک ورلڈ ایف زیڈ سی۔ بزنس سینٹر، شارجہ پبلشنگ سٹی

فری زون، الزاہیہ، شیخ محمد بن زاید آر ڈی، ای 311 شارجہ

971504805734

URDU BOOKS WORLD FZC.
BUSINESS CENTRE
SHARJAH PUBLISHING CITY
FREE ZONE, AL ZAHIA,
SHEIKH MOHAMMED BIN ZAYED RD,
E311, SHARJAH, UNITED ARAB EMIRATES

pklibrary.com

وضاحت کے ساتھ اس واردات کو ایکسپوز کیا اور جو سنسنی خیز انکشافات کیے تو ہکا بکا رہ گیا۔ خون کی گردش تیز ہوگئی۔

اس رات ناصر وہاں موجود تھا اور پولیس کی تفتیش اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ قاتل ناصر ہی ہے۔ مسز مہتاب نے بھی سخت آہ وزاری اور آنسوؤں سے بھیگی آواز میں یہی بیان دیا کہ اس شخص کو انہوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ نو وارد ان کے لیے قطعی ناآشنا اور اجنبی ہے۔ ڈکیتی کی نیت سے گھر میں گھس کر کرنسی اور زیورات سفری بیگ میں لے جا رہا تھا کہ کھٹ پٹ کی آوازیں سن کر معطر کی آنکھ کھل گئی اور اس نے اپنے باپ کو مطلع کیا۔ سیٹھ مہتاب اس ڈاکو پر پل پڑے۔ ڈاکو نے اپنا دفاع کرتے ہوئے سیٹھ مہتاب کا لائسنس یافتہ ریوالور اٹھایا اور گولی چلا دی۔ اس کی چشم دید گواہ وہ خود، ان کی بیٹی معطر اور ان کا چوکیدار ہے۔ کچھ اسی قسم کا بیان معطر نے بھی دیا لیکن اس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی اور وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔

ناصر نے اپنے بیان میں کہا کہ میں جھوٹا، فریبی، مکار ضرور ہوں لیکن قاتل نہیں۔ میں نے سیٹھ مہتاب کو قتل نہیں کیا۔ میں نے آج تک کسی رینگنے والے کیڑے کو بھی نہیں مارا۔ یہ سراسر مجھ پر بہتان ہے..... لیکن ریوالور پر ناصر کی انگلیوں کے نشانات تھے اس لیے پولیس نے فوراً اسے اپنی تحویل میں لے لیا تھا جبکہ ناصر کے گھر میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔

ناصر کے گھر کی حالتِ زار دیکھ کر سرفراز دل ہی دل میں خدائے بزرگ و برتر کا شکر بجالایا اور اپنے آپ سے سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ''اے خالقِ کائنات! تیرا دستِ غیب نہ ہوتا تو آج ناصر کی جگہ میں بیٹھا ہوتا اور ناصر کے والدین کے بجائے میرے ماں باپ سر کے بال نوچ رہے ہوتے۔'' یہی سب کچھ سوچتا ہوا والدین کے پاس گیا اور ملائمت کے ساتھ تشکرانہ انداز میں کہا۔ ''بابا! دراصل مجھے بہت اچھی نوکری مل گئی ہے۔ اگلے مہینے کی پہلی تاریخ سے جوائن کرنا ہے۔ کتنی محنت مشقت کر کے آپ دونوں نے مجھے پڑھایا لکھایا ہے تو کیا میرا اتنا حق نہیں بنتا کہ میں آپ دونوں کا شکریہ ادا کروں۔''

عمر دراز اور انوری کی سماعتوں نے جو کچھ سنا، وہ شہد کے قطروں سے کم نہیں تھا۔ عمر دراز فوراً کھڑا ہوا اور بولا۔ ''سرفراز کی ماں! میں ابھی مٹھائی لاتا ہوں۔ سارے محلے میں تقسیم کردے۔''

سرفراز نے باپ کو سختی سے روکتے ہوئے کہا۔ ''نہیں بابا! ابھی کچھ نہیں۔ میرا دوست ناصر اور اس کے ماں سخت مشکل اور پریشانی میں گھرے ہوئے ہیں۔ اس ہمیں خوشی منانا زیب نہیں دیتا۔''

دونوں میاں بیوی نے ہم آواز ہو کر استفسار ''کیا ہو گیا ناصر کو؟''

سرفراز نے مناسب الفاظ میں ماں باپ کو ساری کہہ سنائی۔ دونوں میاں بیوی نے سانس روک کر ساری سنی اور ایک سرد آہ بھر کر بولے۔ ''اللہ ناصر پر رحم کرے۔'' لیکن اس دعا کے جواب میں سرفراز نے آمین نہیں کہا اسے ناصر کی گردن میں پھانسی کا پھندا صاف نظر آ رہا اس کے ماں باپ کو بھی وہ طفل تسلی دے کر آیا تھا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ سارے شواہد اور ثبوت ناصر کے خلاف جا تھے۔ مبہم سی امیدوں کا سہارا لے کر الجھے الجھے ذہن ساتھ عظمت کے گھر پہنچا تو اس کے والد نے بھی کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دیا۔ ہاں، البتہ اپنے رسوخ کا استعمال کرتے ہوئے جیل حکام سے اجازت لے کر ناصر سے کی ملاقات کا انتظام کروا دیا۔ ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ پرامید ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ قتلِ عمد کا مجرم ہے چشم دید گواہ بھی موقعِ واردات پر موجود تھے۔ سرفراز اور غمگین دل کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو کر گھر آ دوسرے دن ناصر سے جا کر ملاقات کی۔

ناصر کی حالت دیکھ کر وہ خون کے آنسو رو دیا۔ سر کے کریدنے پر ناصر نے پہلی بار سچ بولنے کا حلف لے بولا۔ ''سرفراز! آج میں تجھ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔'' کے بعد اس نے جو تکون کہانی شروع کی تب جا کر سر کے علم میں یہ بات آئی کہ معطر اسے گاؤدی اور احمق ہوئے لٹو پیپر کے طور پر استعمال کر رہی تھی۔ اصلی ہ ناصر تھا اور اسی ہیرو کے لیے اس نے اپنے حلفیہ بیان میں کہ اس کے باپ کا قاتل کوئی اٹھائی گیرا اور چور ہے جو اور زیور کے لالچ میں گھسا اور اس کے باپ کو قتل کر دیا۔

یہ تھا اس امیر زادی کا عشق جس نے اپنے محبو ہتھکڑیوں کا تحفہ پیش کیا تھا۔ ناصر نے اپنی غلطیو اعتراف کرتے ہوئے ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہا۔

ناصر کی باتیں، اس کی آہ وزاری، موت کی کھنڈ آلودہ چہرہ اور بے رونق آنکھیں دیکھ کر سرفراز کی آنکھ سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ وقتِ رخصت ناصر بھی نہ کر سکا۔

فون پر تفتیشی افسر انسپکٹر سعد نے بیگم مہتا

pklibrary.com

پُریقین لہجے میں کہا۔ ''بیگم صاحبہ! کیس بالکل صاف و شفاف ہے۔ مکمل جانچ پڑتال اور انکوائری کے بعد ہماری تفتیشی ٹیم اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ سیٹھ مہتاب کا قاتل ناصر ہی ہے حالانکہ اس کی تکرار ابھی بھی جاری ہے کہ قتل اس نے نہیں کیا لیکن بہرحال اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ عنقریب وہ اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔''

بیگم مہتاب نے بھاری اور گلوگیر آواز میں کہا۔ ''سر! مجھے تو اس روز سکون ملے گا جب اس شخص کو پھانسی ہوگی جس نے میرا سہاگ چھینا ہے۔''

''جی جی میڈم! بہت جلد ایسا ہونے والا ہے۔ بہرصورت ہماری ٹیم کا ایک آفیسر آپ سے اس سلسلے میں کچھ سوالات پوچھنا چاہتا ہے۔ آپ کی صاحبزادی بھی گھر پر ہی ہیں نا؟'' تفتیشی آفیسر نے نہایت دھیمے اور ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ جواب اثبات میں پا کر فون بند کر دیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد انسپکٹر سعد کے ساتھ دو اشخاص سیٹھ مہتاب کی کوٹھی میں داخل ہوئے۔ انسپکٹر سعد نے نوجوان شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم فی الحال گاڑی میں ہی بیٹھو۔ میری کال پر فوراً آجانا۔''

نوجوان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''او کے سر!'' اس کے بعد انسپکٹر سعد اور انسپکٹر کا ساتھی اندر داخل ہوئے۔ ملازم نے فوراً آراستہ پیراستہ ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھایا۔ مؤدب انداز میں چائے کافی کے لیے پوچھا لیکن دونوں نے سختی سے انکار کر دیا۔

چند لمحوں بعد بیگم مہتاب دوپٹا لپیٹے انتہائی سادہ انداز میں داخل ہوئیں۔

انسپکٹر سعد نے اپنے ساتھی کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''اس کیس کے کرتا دھرتا اور ہماری ٹیم کے سربراہ جناب عبداللہ آفندی آپ سے سوالات کریں گے۔''

''جی بہتر۔'' بیگم مہتاب نے رکھ رکھاؤ والی شان سے کہا۔

عبداللہ آفندی اپنی ذہانت سے پُر اور عقابی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دبنگ لہجے میں بولا..... ''اپنی صاحبزادی کو بھی بلوائیے۔ ان کی موجودگی بھی ضروری ہے۔''

تھوڑی دیر بعد سحر زدہ اور خواب میں چلنے والی کیفیت میں معطر کمرے میں داخل ہوئی۔ دونوں اشخاص نے ایک چبھتی ہوئی سرسری نظر ڈالی اور بیگم مہتاب سے باتیں کرنے لگے۔ معطر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئی ورنہ عام طور سے اس پر پہلی نظر ڈالنے والا نظر ہٹانا ہی بھول جاتا تھا۔

انسپکٹر سعد کے ساتھ جو شخص تھا وہ معمر ہونے کے باوجود اس کے دل کو چھوتا ہوا گزرا۔ انتہائی پُررعب اور پروقار شخصیت کا مالک تھا۔ انتہائی پُراعتماد آواز میں اس نے بیگم مہتاب سے سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔ ''بیگم صاحبہ! قتل والی رات آپ حیدر آباد سے کراچی پہنچیں تو گاڑی آپ خود ڈرائیو کر رہی تھیں؟''

مسز مہتاب نے بلا جھجک کہا۔ ''نہیں، میرا ڈرائیور۔''

پھر سوال کیا گیا۔ ''کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟''

فوراً جواب موصول ہوا۔ ''وہ ڈرپوک اور بزدل آدمی اس وقت سے غائب ہے۔ اغلب ہے وہ بھی کوئی چور اچکا ہو اور ہمارے گھر کی قیمتی چیز لے کر فرار ہوا ہو یا دونوں ایک دوسرے کے ساتھی ہوں۔''

عبداللہ نے استہزائیہ قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''میں اسے حاضر کرتا ہوں۔ آپ پوچھ لیجیے کہ وہ کون سی قیمتی چیز لے کر یہاں سے بھاگا ہے۔'' پھر اس نے معنی خیز نظروں سے انسپکٹر سعد کی جانب دیکھا۔ سعد نے فوراً موبائل نکال کر کال ملائی اور کہا۔ ''آجاؤ۔''

گاڑی سے اتر کر نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا وہ نوجوان جوں ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، مسز مہتاب کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولیں۔ ''ت.....ت.....تم!''

''جی میڈم! میں علی جان۔ آپ کی نظر میں آپ کا ڈرائیور لیکن درحقیقت میں ایک اخباری رپورٹر ہوں۔ اس کے علاوہ کرائم برانچ سے بھی میرا تعلق ہے اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ سیٹھ مہتاب کا شمار میرے والد کے دوستوں میں ہوتا تھا۔ ان کی ریکوئسٹ پر میں نے بحیثیت ڈرائیور آپ کے یہاں کام کیا اور آپ کی اور آپ کی بیٹی کی مصروفیات پر نظر رکھی۔ آپ کی بیٹی تو گھر کی چہار دیواری میں رہ کر گیم کھیل رہی تھی لیکن آپ اکثر ان تنگ اور پیچ دار گلیوں میں جاتیں جہاں آپ کا ماضی دفن ہے۔ میں سیٹھ صاحب کو مطلع کرنے ہی والا تھا کہ آپ مجھے حیدر آباد لے کر چلی گئیں اور پھر جو کچھ ہوا اس کا مجھے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ میں سیٹھ صاحب کے لیے کوئی دفاعی قدم اٹھاتا، آپ ان کا کام تمام کر چکی تھیں۔''

بیگم مہتاب ہذیانی انداز میں چیخیں۔ ''تمہارا دماغ خراب ہوا ہے۔ میں..... میں..... بھلا اپنے شوہر کو قتل کروں گی؟ ارے میں تو اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی۔

pklibrary.com

مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ میری کن سوئیاں لیتا ہے اور اس کے لیے نکوں نکوں کے لڑکوں کو میرے پیچھے لگا رکھا ہے۔ میری آمد و رفت اور مصروفیات کو میری آوارگی سمجھ کر مجھ پر نظر رکھتا ہے اور میری نگرانی کروائی جاتی ہے۔ میری بچی، جو اس کے سگے بھائی کی اولاد تھی، اسے بھی مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے۔ کاش مہتاب، میں بروقت تجھے پہچان جاتی تو شاید یہ دن دیکھنا نہیں نصیب ہوتا۔''

دونوں ماں بیٹی مل کر بین کر رہی تھیں مگر عبداللہ آفندی کی للکار سن کر دونوں یوں ساکت ہوئیں جیسے بریک لگا دیا گیا۔ علی جان نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ آفندی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''باقی کی کہانی میری زبانی۔'' اس کے بعد اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اپنی گونج دار آواز میں بولا۔ ''میڈم عرشیہ مہتاب! یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ آپ اپنے دو شوہروں کی قاتلہ ہیں۔ آپ کی پہلی شادی دلنواز نامی شخص سے ہوئی جو بہترین نشانہ باز تھا اور اپنا فن میلے ٹھیلوں میں دکھا کر اپنی روزی کماتا تھا۔ آپ کے باپ نے آپ کی شادی اس سے کر تو دی لیکن آپ وہاں رہ نہیں پائیں کیونکہ دلنواز کے پاس دولت کی چمک دمک نہیں تھی۔ انتہائی کسمپرسی اور بدحالی کی زندگی آپ نے اس گھر میں گزاری۔ اسی دوران آپ کی بیٹی معطر پیدا ہوئی۔ دلنواز بہت خوش تھا لیکن آپ کا ذہن کچھ اور ہی تانے بانے بُن رہا تھا۔ آپ نہیں چاہتی تھیں کہ معطر ان گلی کوچوں میں پلے بڑھے۔ ان ہی دنوں آپ کی ملاقات سیٹھ گلاب سے ہوئی اور وہ آپ کے حسن پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ اپنی سدھ بدھ ہی کھو بیٹھے۔ آپ نے بھی خود سپردگی میں کوئی کسر نہیں رکھی۔ دلنواز کو جیسے ہی آپ کی اس گھناؤنی حرکت کا علم ہوا، اس نے آپ سے پوچھ گچھ کی۔ آپ نے رو دھو کر معافی تلافی کر کے بات کو آئی گئی کر دیا لیکن آپ چوکنا اور ہوشیار ہو گئیں۔ چونکہ دلنواز نے نشانہ بازی کی مشق کروا کر آپ کو اس فن کا ماسٹر بنا دیا تھا تو آپ نے سوچا کہ اس کا فن اس پر ہی آزمایا جائے لیکن فوراً آپ کو خیال آیا کہ پولیس آپ کو بغیر کسی پس و پیش کے دھر لے گی۔ آپ نے ڈاکٹر راؤ سے ساز باز کی اور اپنے شوہر کو زہر کا انجکشن دے کر ختم کروا دیا۔ ڈاکٹر راؤ پولیس کسٹڈی میں ہے اور اپنے اعترافی بیان میں اقبال کر چکا ہے کہ آپ کے کہنے پر اور منہ بھر کر پیسا کمانے کے بعد اس نے دلنواز کو دوسری دنیا میں پہنچا دیا۔ اس کے بعد آپ نے اپنے پلان کے مطابق سیٹھ گلاب کو شادی کی ترغیب دی۔ اس کی پہلی بیوی مر چکی تھی اور وہ بے اولاد تھا۔ آپ نے اس سے نکاح کر کے معطر کو اس کی بیٹی بنا کر ساری دنیا کے سامنے پیش کیا۔ حتیٰ کہ اسکول رجسٹر میں اپنی بیٹی کا نام معطر گلاب لکھوایا۔ ولدیت کے خانے میں ہر جگہ گلاب سیٹھ کا نام چلتا رہا۔ شومئی قسمت کہ اچانک سیٹھ گلاب کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ آناً فاناً اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آپ کے وارے نیارے ہو گئے۔ کروڑوں کی جائداد تھی اور اس کی واحد وارث آپ کی اکلوتی بیٹی معطر تھی لیکن اس وقت آپ کے ہوش اڑ گئے جب آپ نے سنا کہ سیٹھ گلاب کے چھوٹے بھائی سیٹھ مہتاب اپنا سارا کاروبار فروخت کر کے پاکستان تشریف لا رہے ہیں۔ یہ آپ کے لیے لمحۂ فکریہ تھا۔ آپ اسی شش و پنج میں مبتلا تھیں کہ سیٹھ مہتاب نے آ کر آپ کو اس فکر سے نجات دلا دی۔ وہ بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح آپ کے ایسے شیدائی بنے کہ آپ کو رفیقِ حیات کا درجہ دے دیا اور یہی آپ چاہتی بھی تھیں۔ سیٹھ مہتاب کی پہلی بیوی دو بچے چھوڑ کر انہیں داغِ مفارقت دے چکی تھیں۔ آپ نے فوراً ان دونوں بچوں کے لیے اپنی آغوش وا کر دی اور ان بچوں پر اپنا سارا پیار اور ممتا نچھاور کر دی۔ دونوں بچے آپ کا کلمہ پڑھنے لگے اور آپ کو ہی سگی ماں سمجھنے لگے۔ یہاں آ کر آپ کے قدم مضبوط ہو گئے لیکن آپ کی جگر گوشہ معطر جس کے لیے آپ پاپڑ بیل رہی تھیں، اس کی حرکات و سکنات دیکھ کر سیٹھ مہتاب آپ سے برافروختہ رہنے لگے۔ آپ کا اور آپ کی بیٹی کا جو حلقۂ احباب تھا، سیٹھ مہتاب انہیں سخت ناپسند کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے آپ دونوں کے گھومنے پھرنے پر پہرے لگا دیے۔ وہ سلم ایریا جہاں آپ اکثر و بیشتر جاتی رہتی تھیں اور علی جان نے آپ کا تعاقب کیا تھا، وہاں آپ کے وہ گرگے تھے جن کے ذریعے آپ وقتاً فوقتاً غیر قانونی اور مجرمانہ کارروائیاں کروا کر اپنا الو سیدھا کرتیں لیکن جوں ہی سیٹھ صاحب نے آپ کی نقل و حرکت پر پابندی لگائی، آپ پریشان ہو گئیں۔ سیٹھ مہتاب، سیٹھ گلاب کی طرح جورو کے غلام نہیں تھے بلکہ اپنی عقل کے بل بوتے پر ہر کس و ناکس کو پرکھتے تھے اور یہی چیز آپ کو کھل گئی اور آپ کو سو فیصد یقین ہو گیا کہ یہ کائیاں اور ہوشیار آدمی ایک نہ ایک دن ضرور معطر کی قلعی کھول کر رکھ دے گا اور معطر تہی دست اور کنگال رہ جائے گی اور ساری جائداد کے مالک وہ دو بچے قرار پائیں گے جو سیٹھ مہتاب کی اولاد ہیں۔ آپ کی راتوں کی نیندیں اڑ گئیں۔ اس لیے آپ موقع کی تاک میں تھیں کہ کسی طرح سیٹھ مہتاب کو ہی راہ سے

ہٹا دیا جائے جو آپ کے اور معطر کے لیے کانٹا بنے ہوئے تھے۔ آپ اسی ادھیڑ بن میں لگی ہوئی تھیں۔ بیٹی کی سرگرمیوں پر بھی آپ کی نظر تھی۔ سرفراز کی نظروں کو بھی پہچان چکی تھیں۔ بیٹی گھنٹوں کمرے میں مقید رہ کر کس سے باتیں کرتی ہے اور کیا باتیں کرتی ہے۔ آپ سب سمجھ رہی تھیں اور انجان بنی ہوئی تھیں۔ ادھر سیٹھ صاحب آپ کی رگ رگ سے واقف ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنا دل کھول کر اپنے دوست علی جان کے والد کے سامنے رکھ دیا۔ کافی سوچ بچار کے بعد ان کے دوست نے اپنے بیٹے علی جان سے اس کا تذکرہ کیا اور علی جان نے سیٹھ صاحب کی مدد کا وعدہ کرتے ہوئے انہیں کامیابی کا یقین دلایا۔ علی جان ڈرائیور بن کر آپ کے گھر میں داخل ہوا۔ اس نے گہری نظروں سے چھان بین شروع کر دی۔ وہ کافی حد تک کامیابی سے ہمکنار ہو گیا تھا۔ سیٹھ صاحب نے علی جان کو کوٹھی میں رہائش بھی دے رکھی تھی۔ اس کے علاوہ ایک ننھا سا جدید ترین اور انتہائی طاقتور کیمرا اس کے حوالے کر دیا تاکہ وقتِ ضرورت کام آئے اور قتل کی اس خوفناک واردات میں وہ ننھا سا کیمرا ہی عینی گواہ ہے۔'' عبداللہ آفندی نے اپنی جیب سے کیمرا نکال کر اچھالا جس کی ساخت بالکل سگریٹ کیس کی طرح تھی۔

''آپ حیدر آباد شادی میں چلی تو گئی تھیں لیکن آپ کی چھٹی حس آپ کو خبردار کر رہی تھی کہ آپ کی غیر موجودگی میں معطر ضرور کوئی گل کھلائے گی۔ آپ کو علم تھا کہ آپ کی بیٹی آپ کے نقشِ قدم پر چل رہی ہے۔ آپ کی سوچوں کا مرکز سرفراز تھا۔ آپ کو یقین تھا کہ سرفراز موقع کا فائدہ اٹھا کر ضرور اس رات معطر سے ملنے کے لیے آئے گا اور اگر معطر اس کے ساتھ فرار ہو گئی تو سیٹھ صاحب کبھی اسے قبول نہیں کریں گے۔ نہ بیٹی کی حیثیت سے اور نہ بھتیجی کی حیثیت سے۔ یہ سوچ آپ کے لیے انتہائی تشویش ناک تھی۔ آپ نے فوراً واپسی کی ٹھانی اور شادی ہال سے نکل کر علی جان کے ساتھ وہاں کی مارکیٹ سے کچھ شاپنگ کی اور کراچی کی جانب کوچ کیا۔ کوٹھی میں داخل ہوتے ہوئے آپ نے اپنے مسلح دربان سے سوال کیا۔ ''گھر میں سب خیریت ہے نا گل خان؟'' گل خان نے اثبات میں جواب دیا لیکن آپ کے دل کو کھٹکے لگے ہوئے تھے۔ معطر کے مشکوک چال چلن کی وجہ سے آپ کو یقین ہو گیا تھا کہ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی بھی نہیں ہاتھ آنے والی۔ کار جوں ہی پورچ میں رکی، آپ کا شک یقین میں بدل گیا۔ ساری کوٹھی میں نیم تاریکی تھی لیکن سیٹھ صاحب کے کمرے کی لائٹ آن تھی جبکہ سیٹھ صاحب اندھیرے میں سونے کے عادی تھے اور بڑی چوکنا نیند سوتے تھے۔ آپ کی دوررس نگاہوں نے لمحوں میں اندازہ لگا لیا کہ وقت اپنی چال چل چکا ہے۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی یہ پرتی رو آپ کے دماغ میں لہرائی کہ اس سے اچھا اور نادر موقع اب کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ یہ سنہری وقت کھونا نہیں ہے بلکہ اس سے فائدہ اٹھا کر ہمیشہ کے لیے سیٹھ مہتاب کو اس جہانِ فانی سے رخصت کرنا ہے۔ بجلی کی سرعت کے ساتھ آپ نے ناصر پر چھلانگ لگائی اور اس سے لپٹ پڑیں۔ آپ کے ہاتھ کی صفائی اور نشانہ بازی کی داد دینا چاہیے۔ آپ نے لمحہ بھر کے لیے اپنی ساڑی کے آنچل سے ریوالور پکڑا اور تاک کر نشانہ لگایا۔ سیٹھ مہتاب فوراً جاں بحق ہو گئے۔ ان کی جان نکلی اور آپ میں نئی جان آ گئی۔ آپ نے بیٹی کو جو سکھایا پڑھایا وہی بیان اس نے پولیس کو دیا۔ اس بے وقوف ناصر نے بھاگنے کی کوشش کر کے اپنے سر دہری مصیبت لے لی۔ چونکہ نشانہ لینے کے بعد آپ نے ریوالور بڑی خوبصورتی اور چابکدستی کے ساتھ ناصر کے ہاتھ میں پکڑا دیا تھا اور احمق کو پتا بھی نہیں چلا۔ آپ کے دربان نے اس کے ہاتھ میں ریوالور بھی دیکھا اور منہ چھپا کر بھاگتا ہوا بھی دیکھا تو اس نے بھی پولیس کو یہی بیان دیا کہ ناصر نہ صرف چور اور ڈاکو ہے بلکہ سیٹھ کا قاتل بھی ہے۔ اس سارے کیس کو ہم سیدھا سیدھا ڈکیتی کا کیس سمجھ کر اگنور کر چکے تھے لیکن ہمیں کرنسی اور جیولری پر مردانہ فنگر پرنٹس نہیں بلکہ فیمیل فنگر پرنٹس ملے۔ اس کے علاوہ علی جان ہم سے آ ٹکرایا جس نے اس تمام ایکٹیویٹی کو اپنے کیمرے میں فلمبند کر لیا تھا جب آپ سیٹھ مہتاب کا نشانہ لے رہی تھیں۔ علی جان کے ہاتھ بہت بڑا ثبوت ہاتھ آ گیا تھا۔ اس لیے وہ فوری یہاں سے نکل کر مجھ سے ملا اور پھر ہم دونوں نے آپ کے ماضی کو کھنگالا تو کافی محنت کے بعد ان باتوں کا سراغ لگا پائے۔ سیٹھ صاحب نے علی جان کو ہائر کر کے اپنے دونوں بچوں کے لیے کروڑوں کی جائداد چھوڑی ہے۔ یہ ان کا ایک دانش مندانہ قدم تھا ورنہ بلاشرکت غیرے آپ اور آپ کی بیٹی معطر دلنواز اس دولت پر قابض ہوتے۔''

میڈم عرشیہ مہتاب کی آنکھوں سے احساسِ جرم عیاں تھا۔ ہونٹوں پر خاموشی کی مہر ثبت تھی البتہ معطر کی سسکیوں کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد انسپکٹر سعد کی کال پر پولیس کوٹھی میں داخل ہو رہی تھی۔

⌘⌘⌘

pklibrary.com

جنگ باز

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

بیالیسویں قسط

قدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید بوسیدہ در و دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عبرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور تحیر انگیز چالوں سے ناآشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید ناآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

pklibrary.com

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

روشنیوں کا شہر کراچی..... اس نے جانے کتنے لوگوں کو اپنے دامن میں ماں کی طرح سمیٹ رکھا ہے، ان گنت داستانوں کی امین اس مہربان گود کے کسی کونے میں سہراب خان یعنی میں بھی رہتا ہوں جو ایک غریب محلے میں محبت کرنے والی ماں اور ایک سخت گیر طبیعت کے حامل باپ کا ایسا ناخلف بیٹا بھی تھا جو ہر وقت باپ کی بے جا مار پیٹ کا نشانہ بنتا رہتا۔ میری ایک بہن بھی تھی راحیلہ، مگر نہیں، بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ میری بہن نہیں تھی، خالہ زاد تھی۔ بچپن میں اس کے ماں باپ ایک ناگہانی حادثے میں مر چکے تھے اور ماں نے اسے میرے ساتھ ہی پال پوس کر جوان کیا تھا۔ یہ راز صرف میری ماں اور راحیلہ کو پتا تھا۔ راحیلہ بچپن سے ہی مجھے ایک بھائی کی نہیں بلکہ کسی اور ہی "نگاہ" سے دیکھا کرتی۔ ماں میری شادی اس سے کروانا چاہتی تھی لیکن میں اب بھی اسے ایک "بہن" کے ہی روپ میں دیکھتا تھا۔ میرا باپ، ماں کو مارا پیٹا کرتا تھا۔ ایک دن ماں کو اس نے گہرا زخم دیا تو میں برداشت نہ کر پایا اور باپ کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہو گیا۔ باپ کا یہ دیکھ کر بلڈ پریشر بڑھ گیا اور اس کی دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ وہ جہان سے کوچ کر گیا تو گھر میں سکون ہوا۔ غربت اور باپ کی سخت گیر طبیعت نے مجھے ایک حد تک جرائم کی طرف لڑھکا ضرور دیا تھا مگر میں جلد ہی سنبھل گیا مگر اس "سنبھلنے" کی مجھے بڑی قیمت چکانا پڑی۔ میں اور میرا باپ ایک فیکٹری میں معمولی ورکر تھے۔ گلی کے محلے میں ہی تین ہم عمر لڑکے میرے یار کہلائے۔ ایک کا نام سلیم، دوسرے کا راجو اور تیسرا ماجد تھا۔ ماجد کی جوان بہن فوزیہ میری پہلی اور آخری محبت ٹھہری۔ ہم چاروں جرائم پیشہ گروہ کے آلہ کار بن گئے۔ اقبال نامی ادھیڑ عمر شخص ہمارا "باس" کہلایا۔ اس کا نائب سجاد بیگ تھا۔ اسی گروہ نے ہم چار یاروں (سلیم، راجو، ماجد اور مجھے) ایک روز آنکھوں پر پٹی باندھ کر کسی نامعلوم مقام پر پہنچا دیا جہاں ہمیں لڑائی بھڑائی کی خصوصی ٹریننگ دی گئی۔ گروہ دیگر جرائم کے ساتھ بھتا خوری بھی کرتا تھا۔ ہمارے فیکٹری مالک سیٹھ سکندر سے بھتا لینے کے لیے "باس" اقبال نے ہمیں استعمال کیا۔ میری غیرت جاگی۔ میں نے سلیم وغیرہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ میرے ہی دشمن ہو گئے، تاہم میں نے سیٹھ سکندر کے ساتھ نمک حلال کیا اور اسے سب باتیں بتا دیں۔ میں نے بروقت بم کی اطلاع دے کر سیکڑوں غریب ورکروں کی جان بچا لی۔ گروہ سمیت میرے تینوں یار میری جان کے دشمن ہو گئے۔ سیٹھ سکندر کی جواں سال خوب صورت بیٹی سدرہ میری "نمک حلالی" سے متاثر ہوئی۔ سیٹھ سکندر کا سالا، سجاد بیگ ہی جرائم پیشہ گروہ کے باس اقبال کا نائب تھا۔ وہ سدرہ کی ماں کا سوتیلا بھائی تھا۔ میں نے اس کی پلاننگ آشکار کر دی۔ وقت تیزی سے بدلا۔ ماں مر گئی۔ ماجد عرف ماجے کے قتل کا الزام مجھ پر لگا۔ فوزیہ مجھ سے متنفر ہوئی تھی کیونکہ بعد میں راحیلہ نے اسے حقیقت بتا ڈالی تھی۔ میں لاک اپ ہوا تاہم رہا ہو گیا۔ باس اقبال، سلیم چھا لیا اور راجو بوری میرے خون کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میں راحیلہ اور فوزیہ کو لے کر کراچی سے سیالکوٹ ہجرت کرنے لگا۔ وہاں سدرہ کا کوئی مکان خالی پڑا تھا۔ صادق آباد میں فوزیہ اور راحیلہ سے بچھڑ کر میں بالآخر "چودھری جی برادران" کے نرغے میں چلا گیا۔ وہاں بھولے سے میری عجیب حال میں ملاقات ہوئی۔ اس کی منگ سے چودھری شالا جی نے زبردستی شادی کر لی تھی۔ اس کا نام نادو تھا۔ ہم تینوں فرار اختیار کر گئے۔ راستے میں پولیس اور چودھری جی برادران کے حواریوں سے مقابلے میں بھولا مارا گیا۔ نادو میری ذمے داری بن گئی۔ وہ ایک عجیب لڑکی تھی۔ اسے درحقیقت کسی اور سے محبت تھی۔ اس کا نام مختیار تھا۔ مختیار راجن پور میں رہتا تھا۔ فوزیہ اور راحیلہ کو بھی میں نے کسی طرح تلاش کر لیا۔ سیالکوٹ میں ایک ماں بیٹی سے میری شناسائی ہوئی۔ وہ محلے دار تھیں۔ لڑکی نگہت اور ماں شگفتہ خاتون۔ نگہت کسی وسیم نامی لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ دونوں فائٹنگ کلب کے ممبر بھی تھے۔ عقدہ کھلا کہ شگفتہ، باس اقبال کی منکوحہ تھی اور نگہت بیٹی مگر شوہر کی مجرمانہ زندگی سے تنگ آ کر شگفتہ اپنی بیٹی نگہت کے ساتھ کراچی سے سیالکوٹ اپنے ماں باپ والے گھر میں آن بسی تھی۔ فائٹنگ کلب کا ایک ماسٹر عرف استاد جوجی میرا دوست بن گیا۔ نگہت اب بھی باپ (اقبال) سے ملاقات کرتی تھی۔ سیالکوٹ میں اقبال چوک پر اس کے باپ یعنی باس کا بنگلا تھا۔ ایک خفیہ گروہ "کالی لہر" سے میرا ٹاکرا ہو گیا۔ یہ جادو ٹونے کرنے والا گروہ تھا۔ عدیل جو کہ جگنو نامی شخص کا بھائی تھا ان کے ہاتھوں مارا گیا۔ جگنو ایک بڑی سیاسی شخصیت کا آلہ کار تھا۔ وہ میرا دشمن اور بعد میں دوست بن گیا۔ کالی لہر کے رانگا بابا اور میڈم چھمی سے میری دشمنی عروج پر تھی اور ان کے میرے خلاف جادو ٹونے بھی۔ میرا دشمن باس اقبال بھی ان کی جادوئی ہانڈیوں کی زد میں آ کر اسپتال پہنچ گیا۔ اس کی بیٹی نگہت میری دشمن بن گئی جبکہ اس کی ماں شگفتہ خاتون مجھے بھائی سمجھتی تھی۔ اب میری بیک وقت جنگ بازی..... باس اقبال کے نائب سجاد بیگ، چودھری جی برادران اور کالی لہر والوں کے ساتھ جاری تھی۔ میں راحیلہ کا پیچھا کرتے ہوئے رانگا بابا کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے اٹھا کر فارم ہاؤس لے آیا۔ رانگا نے منتر پڑھنا شروع کر دیے۔ مجھے سر پر کچھ مار کر بے ہوش کر دیا گیا اور جب ہوش آیا تو وہ لوگ باور کرانے لگے کہ میں مر چکا ہوں اور میری روح ان کے قبضے میں ہے۔ پھر مجھے حالتِ بے ہوشی میں قبر میں دفنا دیا گیا۔ انہوں نے کچھ کھلا کر میرے جسم کو مفلوج کر دیا تھا۔ وہاں بجو نے حملہ کیا اور تب ہی غیبی مدد ہوئی اور ایک ماں بیٹی نے مجھے قبر سے نکالا۔ میری حالت دگرگوں تھی۔ پھر میری محسن میرا علاج کرنے لگی۔ ان ماں بیٹی کو گاؤں والوں نے دربدر کر دیا تھا۔ وہاں کے چودھری کا بیٹا صمد یار چنبیلی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ وہ وہاں آ کر ہم لوگوں کو ہراساں کرنے لگا۔ اماں میرے علاج کی غرض سے خاص بوٹی لینے سرحد پار نکل گئی۔ اماں خاص بوٹی لے آئی تھی اور اس نے دوا کا سفوف اور تیل تیار کر لیا تھا۔ دوا نے مجھ پر جادوئی اثر دکھایا اور میرے اندر طاقت کا خزانہ بھر گیا۔ جنگل میں عورت کی چیخ پر میں وہاں پہنچا تو دیکھا ایک تینوا عورت کو دبوچے ہوئے تھا۔ میں نے درندے کو ٹھکانے لگا دیا۔ زخمی عورت صمد یار کی ماں شمیلہ خانم تھی۔ صمد یار کے گماشتوں نے اماں کی مڑھی کو آگ لگا دی۔ میں انہیں تھانے لے گیا تاہم انہوں نے مجھے ہی لاک اپ کر دیا۔ میں تھانے سے بھاگ نکلا۔ مجھے شمیلہ خانم نے ایک ڈاکٹر کے کلینک پر ٹھہرا دیا۔ ڈاکٹر ہمیں پھنسانا چاہتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کو گرفت میں لیا۔ وہ بھاگا مشتی میں ڈاکٹر جان سے چلا گیا اور میں اماں اور چنبیلی کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میں استاد جوجی کے ٹھکانے پر آ گیا۔ وہاں سے ہم کالی لہر والوں کے

ایک ٹھکانے پر پہنچے تو وہاں نزاکت اور راڑاں کی لاشیں ملیں۔ میں نے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ وہاں سے میں ایک قصائی صورت بدمعاش کو اپنے ٹھکانے پر لے آیا۔ اس پر تشدد کر کے ہم معلومات لے رہے تھے کہ وہاں ہانڈیوں کی بارش ہوگئی۔ ہم نے دشمنوں کو مار بھگایا اور قبضے میں موجود بدمعاش سے کالی حویلی کا پتا معلوم کرلیا۔ ہم کالی حویلی پہنچ گئے۔ وہاں میرا رانگا سے ٹاکرا ہوا۔ رانگا نے استاد جوجی کو شدید زخمی کردیا۔ میں نے رانگا کی ایک ٹانگ کاٹ ڈالی تاہم رانگا بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں دشمن کے ایک اور ٹھکانے پر پہنچا تاہم انہوں نے مجھے قابو کرلیا۔ میں زخمی بھی ہوگیا۔ اچانک وہاں سلیم نے حملہ کردیا۔ مجھے وہاں سے نکال لیا گیا۔ سلیم اور چوہدری برادران نے مجھ سے مفاہمت کرلی تاہم اس کے پیچھے ان کا کوئی خاص مقصد تھا۔ راحیلہ بھی انہی لوگوں کے پاس تھی۔ سلیم اور میں نے راجا تیمور کو چھاپنے کی کوشش کی تاہم ہمیں ناکامی ہوئی۔ وہاں سے واپسی پر ایک جگہ ایمبولینس اور پولیس نظر آئی۔ وہ کسی لاش کو اٹھا رہے تھے۔ جگنو کو مار دیا گیا تھا۔ میں نے تیمور کو چھاپنے کا ارادہ کیا اور اس کی فیکٹری پہنچ گیا۔ وہ لوگ کوئی "شے" لے کر کہیں جا رہے تھے۔ میں نے ان کا تعاقب شروع کردیا۔ ایک مقام پر میری گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوگیا۔ میں نے پیدل ہی ان کا تعاقب شروع کردیا۔ اچانک دوڑتے ہوئے میں گڑھے میں گرا۔ سر پر چوٹ لگنے سے بے ہوش ہوگیا۔ جب ہوش آیا تو دیکھا راجا تیمور اور ڈرائیور ہلاک ہوچکے تھے اور کیوس سے ڈھکی شے غائب تھی۔ راجا تیمور کا ایک ساتھی زندہ میرے ہتھے چڑھ گیا۔ معلومات پر پتا چلا کہ کسی گروہ نے انہیں ہلاک کیا تھا اور بوبسورگا نامی قدیم مجسمہ لے اڑے تھے۔ میں نے میڈم مچھی تک پہنچنے کے لیے ان کا پیچھا کیا اور ان کے ساتھیوں کی کشتی میں سوار ہوگیا۔ ہم انڈین حدود میں داخل ہوگئے۔ بوبسورگا کا مجسمہ بھی انہی کے پاس تھا۔ کشتی ایک جگہ رکی تو بھیڑیوں نے حملہ کردیا تاہم بھیڑیوں سے نمٹ لیا گیا۔ آگے چل کر ایک مگرمچھ نے ہم پر حملہ کیا اور کشتی میں صرف دو افراد بچے۔ ایک میں اور دوسری شینا۔ میں نے شینا کو الٹی سیدھی کہانی سنا کر اسے اپنے ساتھ شامل کرلیا۔ ہماری کشتی ندی کی طغیانی کے باعث تباہ ہوگئی۔ ہم ایک جگہ پہنچ گئے۔ شینا زخمی ہوگئی۔ وہاں موجود میاں بیوی نے ہماری مدد کی۔ ہم ان کے گھر آگئے تاہم وہاں مخالف گروہ کے لوگ آگئے۔ انہوں نے ہمیں پکڑ لیا تاہم میں ان کی گرفت سے آزاد ہوگیا۔ میں واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو وہاں مخالف گروہ کا باس اور ایک لڑکی سے ملاقات ہوگئی۔ باس البرٹ رمنڈو اور اس کی ساتھی بوبسورگا کے مجسمے کے چکر میں تھے۔ میں اور شینا انہیں جل دے کر نکل گئے۔ ایک جگہ جنگل میں باس کے ساتھی مارے گئے اور وہ ہمیں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ میں اور شینا ایک بستی میں پہنچ گئے۔ وہاں شینا کے ساتھی میری طرف سے مشکوک ہوگئے میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ راستے میں مجھے کچھ انگریز ملے۔ گورا پارٹی ایک سرکس کمپنی سے تعلق رکھتی تھی اور وہ وہاں ایک گوریلا کو پکڑنے آئے تھے۔ وحشی قبیلہ ان کا دشمن ہوگیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے مدد کا کہا۔ میں ان کے ساتھ شامل ہوگیا۔ دشمنوں کی تحویل سے گاڑیاں نکالنے کے چکر میں ماریا کا باپ مارا گیا۔ ماریا نے گرگینڈوا کو قابو کرلیا اور ہمارا واپسی کا سفر شروع ہوگیا۔ ہم ماریا کے سرکس والی جگہ پر پہنچ گئے۔ وہاں میری ماریا کے منیجر سے لڑائی ہوگئی اور وہ میرا دشمن ہوگیا۔ منیجر سیڈی غیر قانونی دھندے میں ملوث تھا۔ منیجر سیڈی اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ میں وہاں سے رانگا مائی روانہ ہوگیا۔ میں ایک آبادی میں پہنچ گیا۔ میرا وہاں دشمن کے گروہ سے ٹکراؤ ہوگیا۔ میں نے انہیں زیر کردیا۔ دشمن کے علاقے میں رمنڈو سے میرا سامنا ہوگیا۔ وہ بوبسورگا کے مجسمے کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے شینا کو بھی اغوا کرلیا تھا۔ رمنڈو کو مجسمہ چاہیے تھا اس لیے اس نے مجھے اپنے ساتھ ملالیا۔ میں اس مشن میں زخمی ہوگیا اور مچھی کے چنگل میں پھنس گیا۔ اچانک وہاں کسی گروہ نے حملہ کردیا اور میڈم مچھی فرار ہوگئی۔ انہوں نے مجھے پکڑ لیا تاہم میرے کہنے پر فوزیہ کو رہا کروالیا گیا۔ ہم رمنڈو کے پیچھے گئے۔ گروہ کے کچھ ساتھیوں کو رمنڈو نے ہلاک کردیا۔ رمنڈو کی گاڑی تباہ ہوگئی۔ مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تاہم میں فوزیہ کے ہمراہ بچ نکلا۔ بوبسورگا کے حوالے سے میں ایک صحافی جمیلہ سے ملے اس کے گھر پہنچ گیا مگر جمیلہ کو قتل کردیا گیا تھا۔ وہاں مجھے ایک لبنانی رپورٹر ملی۔ میں مائرہ کے ساتھ بوبسورگا کے مجسمے کو تباہ کرنے نکلا۔ مائرہ ماری گئی۔ واپسی پر مجھے مچھیروں نے پکڑ لیا تاہم میں ان کی گرفت سے نکل بھاگا اور واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ ہم کراچی آگئے۔ میری ایک خاتون سے ملاقات ہوگئی۔ وہ مشہور اداکارہ روبی تھی جو خود کو جگنو کی بہن بتاتی تھی۔ اسے اپنے بھائی کا کچھ ذاتی سامان حاصل کرنا تھا اور میری مدد درکار تھی۔ ہم نور پور روانہ ہوگئے۔ راحیلہ کسی نوید نامی شخص کی آرٹ کار بن گئی تھی۔ میں راحیلہ کو وہاں سے نکالنا چاہتا تھا تاہم مجھے دھر لیا گیا۔ میں راحیلہ کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ راستے میں راحیلہ نے بھاگنے کی کوشش کی تو ایکسیڈنٹ کرا بیٹھی۔ راحیلہ کو میں اپنے ساتھ لے آیا مگر راحیلہ ہمیں ہاری اور میرے پاس سے نکل بھاگی۔ میں نے نادو کو کچھ لوگوں کی تحویل میں دیکھا۔ وہ چوہدری کے گماشتے تھے اور انہوں نے نادو کو مختیار سے طلاق دلوادی تھی۔ میں نے نادو کو آزاد کرالیا تاہم وہ میرے پاس نہیں رکی اور خود چوہدری کے پاس چلی گئی۔ سدرہ کو کچھ لوگوں نے اغوا کرلیا۔ میں نے تعاقب کیا۔ اے سجاد بیگ نے اغوا کرایا تھا۔ میں نے سدرہ کو اس کے چنگل سے نکال لیا۔ میں نے سلیم چھالیا کا پیچھا کیا اور اس کے ساتھ ہولیا۔ وہ روبی کو بازیاب کرانے جا رہا تھا۔ ہم نظام شاہ کے فارم ہاؤس پہنچ گئے۔ وہاں کچھ لوگ آگئے اور مار ماری ہوئی۔ دلاور شاہ مارا گیا جبکہ وہ لوگ روبی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ دلاور شاہ کے قتل کا الزام مجھ پر آیا اور مجھے لاک اپ کردیا گیا۔ نظام شاہ کے راتب خور انسپکٹر نے مجھے حوالات میں ختم کرانے کی کوشش کی۔ تاہم میں بچ گیا۔ میں نے نئے SHO کو اعتماد میں لے لیا۔ مجھے بری کردیا گیا۔ فوزیہ اور میری شادی ہوگئی۔ روبی زخمی حالت میں سدرہ کے گھر پہنچ گئی۔ میں روبی سے ملنے پہنچا تو اس نے اپنی کہانی سنائی۔ روبی نے بتایا کہ جگنو کو نظام شاہ اور لاکھا نے مارا تھا۔ میں نے انہیں عبرتناک انجام سے دوچار کرنے کا عہد کرلیا۔ میں نوید چھیچھرا کے ولا میں پہنچ گیا۔ میں نے نوید کو زخمی کردیا اور اس سے بیع گراہیں کی فائل پر دستخط کرالیے۔ میں وہاں سے نکل پڑا۔ راستے میں راحیلہ سے سامنا ہوا تاہم نوید کے آدمیوں نے راحیلہ پر گولی چلادی۔ وہ تڑپنے لگی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

لمحے بھر کو میں بت بن گیا۔

پھر جب رذیل صفت بنگو کو دونوں ہاتھوں میں اپنا پستول تول کر زمین پر تڑپتی ہوئی راحیلہ کو دوبارہ گولی چلانے کی نیت سے پوزیشن باندھتے دیکھا تو جیسے یکلخت میرے اندر بجلی بھر گئی۔

پل کے پل میں نے حرکت کی اور پہلا لمحہ میرے ہاتھوں میں بیلٹ سے نکل کر اپنا پستول آنے اور دوسرا ٹریگر دبانے پر صرف ہوا۔

گولی چلی، دھماکا ہوا، ساتھ ہی بنگو کے حلق سے کریہہ چیخ بلند ہوئی اور وہ سینہ پکڑے وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اس کے دوسرے ساتھی بری طرح بدکے اور دو گولیاں میں نے ان پر بھی چلا دیں۔

دونوں ہی چیخیں مار کر سڑک پر گر کر تڑپنے لگے۔ میں جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلا اور راحیلہ کی طرف دوڑا۔ اس پر جھکا۔ وہ اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی اور میرا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔ راحیلہ کی اس حالت کو دیکھ کر میرے جیسا مضبوط دل گردے کا آدمی بھی کانپ کر رہ گیا۔ وہ میری بہن تھی۔ میں اسے سگی بہن ہی سمجھتا تھا بلکہ سمجھتا کیا تھا، دل سے بھی بچپن سے ہی میں اسے بہن ہی کے روپ میں دیکھا کرتا تھا۔

میں نے اپنے منتشر ہوتے اعصاب پر قابو پایا اور اس کے زخم کا جائزہ لینے کے لیے اس کی شرٹ ایک جانب سے پھاڑ ڈالی اور اس کے ساتھ ہی میرے حلق سے قدرے طمانیت بھری سانس نکل گئی۔

بنگو کی چلائی ہوئی گولی اس کے دائیں شانے پر لگی تھی اور بہت قریب سے لگنے کے سبب آر پار ہوگئی تھی۔ میں نے جلدی جلدی اپنی شرٹ پھاڑ کر پٹی کر ڈالی تاکہ خون بہنا تو بند ہوجائے۔ اگر میں اسے اسپتال لے جاتا تو معاملہ پولیس کیس تک چلا جاتا جبکہ خود میں اس وقت تین قتل کر چکا تھا۔

بنگو شاید ابھی راحیلہ کو جان سے نہیں مارنا چاہتا تھا لیکن دوسری بار اس کے تیوروں نے بتا دیا تھا کہ آخری گولی فائر کر کے اسے ہلاک کرنے کا ارادہ کر چکا ہے تو میں نے لمحہ ضائع کیے بغیر اسے اڑا دیا تھا۔

میں نے راحیلہ کو حوصلہ دیا۔ وہ ہوش میں تھی اور درد سے کراہ رہی تھی۔ میرے پاس تو پانی کی بوتل نہیں تھی البتہ میں نے جہنم واصل بنگو کی گاڑی کی تلاشی لی تو وہاں بوتل پڑی ملی۔ میں نے پہلے پانی کے چھینٹے راحیلہ کے چہرے پر ڈالے اور پھر اس کے منہ سے بوتل لگا دی۔

چند گھونٹ جیسے تیسے بھر کر اس کی حالت میں کچھ بہتری آئی تو میں نے اگلا کام بڑی تیزی سے نمٹایا۔ میرے پاس بائیک تھی جو میں یہاں نہیں چھوڑ سکتا تھا اور ظاہر ہے زخمی راحیلہ کو بائیک پر لے جانا ناممکن تھا۔ میں نے بنگو کی گاڑی کو اس نازک وقت کے لیے آزمانے کا فیصلہ کیا۔

اگلے چند منٹوں کے اندر اندر رات کے آخری تاریک پہر میں کار ویران سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ اپنی بائیک میں نے جیسے تیسے کار کی ادھ کھلی ڈکی میں ڈال لی تھی۔

جلد ہی میں جوجی کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہاں کھلبلی مچ گئی۔ اس کے ٹھکانے پر بینڈیج کا سارا سامان موجود تھا، پین کلرز بھی تھیں۔ راحیلہ کی پٹی چنبیلی نے کی اور اماں جس نے حکمت آج بھی ترک نہ کی تھی اور گھر بیٹھے جڑی بوٹیوں سے کچھ نہ کچھ بنا کر شیشے کے جار میں محفوظ کر لیا کرتی تھی، گھر والوں کا بھی اسی سے ہی علاج معالجہ کرتی تھی، اس نے لیپ نکالا اور راحیلہ کے زخم پر اچھی طرح بھر دیا۔

اس کے بعد ہلدی ملا گرم گرم دودھ راحیلہ کو پینے کے لیے دیا۔ راحیلہ کی حالت کافی سنبھل گئی تو میں نے جوجی کو سب بتایا۔

"معرکے" کی کامیابی پر اس نے خوشی کے اظہار کے بعد اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

"ائی شاوشے.....! بس اب نوید چھچھرا کے کس بل نکل چکے۔ میرا خیال ہے وہ اب ہمارا راستہ کاٹنے کی کوشش نہیں کرے گا۔"

"ہمارا راستہ تو اس نے پہلے بھی کاٹنے کی جرأت نہ کی تھی۔" میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ "بس، ذرا راحیلہ اور روبی والے معاملے کے سبب میں خود ہی اس کے سر ہو گیا تھا۔ اب راحیلہ کو بھی اس کی اصلیت معلوم ہوگئی اور وہ خود بھی میری ہی وجہ سے اس سے بیزاری اختیار کرنے لگا تھا۔"

"یہ بھی اچھا ہوا کہ راحیلہ بہن کے سر سے نوید چھچھرا کا بھوت اتر گیا۔" جوجی بولا۔ مجھے فوزیہ کی فکر ہونے لگی۔ اگرچہ وہاں شگفتہ موجود تھی لیکن بہرحال دونوں خواتین تھیں اور گھر پر اکیلی تھیں۔ یہاں آنے سے پہلے فوزیہ سے میں نے کہا تھا کہ میں رات گئے تک آجاؤں گا مگر اب سحر ہونے والی تھی۔

میرے چہرے پر اچانک تفکر کے سائے بھانپ کر جوجی بولا۔ "فکر نہ کر، میں نے زبیر کو وہاں بھیج دیا تھا اور اس نے ایک دو گھنٹے بعد فون کر کے مجھے ایک اہم خبر سے آگاہ بھی کیا تھا۔"

میں اس کی بات پر چونک گیا۔ "کیسی خبر..... وہاں تو سب خیریت ہے نا؟" میں نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ائی شاوشے! بھلا ہماری موجودگی میں وہاں کچھ ہوسکتا ہے۔" جوجی بولا۔ "اہم خبر یہ تھی کہ شگفتہ کی بیٹی نگہت وہاں آئی تھی، اپنی ماں سے ملنے..... پہلے وہ سدرہ کے گھر گئی تھی۔ وہیں سے

اسے پتا چلا کہ اس کی ماں اب تیرے اور فوزیہ کے ساتھ الگ گھر میں رہنے لگی ہے۔"

"نگہت آئی تھی، ماں سے ملنے؟" میرے لیے یہ اہم انکشاف تھا۔

"ہاں..... کیوں، اس میں اتنی حیرت والی بات کیا ہے؟"

"بات ہے۔" میں نے جیسے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "باپ کے مرنے کے بعد ان دونوں ماں بیٹی کے درمیان جو تلخ حائل ہوگئی تھی، اس کے بارے میں تو تم بھی جانتے ہی ہو جوجی!" میں نے کہا۔

"ہاں، لیکن ہوسکتا ہے ماں کا درد نگہت کے دل میں اچانک جاگا ہو اور وہ....."

"ممکن ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "لیکن معاملہ اب بھی کچھ اور ہے۔ کیا تو بشارت عرف پپو کی بات بھول گیا اور وہ ..... یاسر..... سجاد بیگ کا آدمی.....؟" میں نے اسے یاد دلایا۔

"ائی شاوشے! اتنی اہم بات میں کیسے بھول سکتا ہوں بلکہ وہ بات تو میں نے سنبھالے رکھی ہے۔" اس کا لہجہ ایک دم معنی خیز ہوگیا، آگے بولا۔ "اس کا مطلب ہے یعنی تیرا خیال ہے، نگہت اپنی ماں سے کسی قسم کی مدد لینے آئی ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں نگہت تم سے بھی....."

"ہاں، کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔" میں نے گومگو سے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "کیا بات ہے، تم نے کیا بات سنبھالے رکھی ہے؟" مجھے اس کا معنی خیز لہجہ کھٹکا گیا۔ وہ اسی معنی خیز انداز میں مسکرایا اور جواب دینے کے بجائے پاس بیٹھے کبیر سے بولا۔

"اوئے عاشق نامراد! پپو تو ٹھیک ہے نا، کوئی ہیر پھیر تو نہیں کر رہا؟"

پپو یعنی بشارت کا سن کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ کبیر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"یہ..... پپو اچانک درمیان میں کہاں سے آگیا؟" میں نے پھر جوجی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"تجھے تو بعض اہم باتوں کا خیال نہیں رہتا مگر میں بے چین ہوگیا تھا۔" اس نے کہا۔ "جب تو ویلی آف ولا کی طرف اکیلا روانہ ہوگیا تھا تو میں نے یاسر کو وہیں چھوڑ کر پپو کو اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ چلا ہوا کارتوس سہی لیکن بوقتِ ضرورت کام آسکتا ہے۔ کیونکہ ابھی ہم نے وسیم کی گردن بھی ناپنا ہے جو تجھے ہلاک کرنے کے درپے ہے۔"

"اوہ.....!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "میں دراصل راحیلہ اور نگہت والے گمبھیر ہوتے معاملے میں الجھا ہوا تھا، اس کی اہمیت کو محسوس نہ کرسکا۔"

"ائی شاوشے! لگتا ہے اب فلم کی ریل الٹی چلنا شروع ہوگئی ہے۔" جوجی نے اچانک کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"لوٹ کے بدھو گھر کو آرہے ہیں۔ پہلے راحیلہ بہن، نوید چھچھرا کے چرنوں سے نکلی اور اب نگہت، سجاد بیگ کی گود سے نکلنے کی کوشش میں ہے۔ شاید....."

مجھے اس کے تبصرے پر ہنسی آگئی۔ اگرچہ اس کا تبصرہ بھی غلط نہ تھا۔

"بظاہر تو ایسا ہی لگ رہا ہے لیکن وسیم تیمور کو تم کس خانے میں فٹ کرو گے؟"

نگہت کا عاشقِ نامراد کبیر بھی ہمارے ساتھ کمرے میں موجود تھا۔ اپنے مطلب کی بات سنتے ہی ایک دم جوش سے بولا۔

"نگہت کو ضرور اب وسیم کی اصلیت کا بھی اندازہ ہوچکا ہوگا اور وہ یقیناً اب اسے چھوڑ کر اپنی ماں کے پاس آکر رہنا چاہتی ہوگی اور اسے ہماری مدد کی اسی لیے ضرورت ہوگی کہ وہ سجاد بیگ سے ہی نہیں، وسیم سے بھی پیچھا چھڑانے کا پکا ارادہ کرچکی ہے۔"

جوجی نے اس کے سر پر ایک دھپ مار کر اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ "ائی شاوشے.....! ابے او پکے کی اینٹ، عاشق نامراد! تجھے بلی کی طرح ہمیشہ خواب میں چھیچھڑے ہی سوجھتے ہیں۔ وہ صرف سجاد بیگ سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں ہے۔ تو بڑا خوش فہم ہے کہ وہ وسیم کو بھی چھوڑنا چاہتی ہے۔"

"کیوں بے چارے کو تنگ کر رہا ہے یار!" میں نے جوجی سے کہا۔ مجھے کبیر سے ہمدردی تھی۔ "خدا کرے ایسا ہی ہو جیسا یہ سوچ رہا ہے۔"

"یہ خوش گمانی ہے شہزادے!" جوجی نے کہا۔ "اور ایسے عاشقوں کو زیادہ خوش گمانی میں نہیں رہنا چاہیے۔ مجھے بھی خوشی ہوگی اس بات پر کہ نگہت، وسیم کے پروں سے آزاد ہوجائے مگر ابھی ایسا کچھ ممکن نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے، اس راز سے بھی پردہ اٹھ ہی جائے گا۔" میں نے رخصت ہوتے ہوئے جوجی سے کہا۔ "تم راحیلہ کا دھیان رکھنا، میں گھر چلتا ہوں اور دیکھتا ہوں آخر یہ نگہت والا نیا معاملہ کیا ہے؟"

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں سہراب بھائی؟" کبیر ایک دم بولا۔ جوجی نے اسے گھورا۔

"تو بڑا اُتاؤلا ہو رہا ہے۔ جیسے نگہت وہاں تیرے ہی انتظار میں بیٹھی ہو۔" اس کی بات پر بیچارہ کبیر دبک گیا۔

میں نے مسکرا کر کبیر سے کہا۔ "تو فکر نہ کر، اگر نگہت کو سجاد بیگ کی اصلیت معلوم ہوچکی ہے تو وسیم کا بھی اسے ایک روز پتا چل ہی جائے گا۔ ابھی میں جا کر شگفتہ آنٹی سے مل کر حقائق جانتا

pklibrary.com

ہوں کہ آخر نگہت اچانک ان سے ملنے کیوں آئی تھی؟"

میں جب وہاں سے رخصت ہونے لگا تو جوجی نے اچانک سنجیدہ لہجے میں مجھ سے کہا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"واپسی میں ذرا سجاد بیگ کی گردن ناپنا ہے۔ بھول گئے، بشارت پپو نے کیا کہا تھا کہ سجاد بیگ تمہیں اغوا کر کے کسی کے حوالے کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے ہے۔ ذرا انگلواتے ہیں اس کے تھوتھنے سے..... کون لوگ تھے وہ؟ جب تک یہ عقدہ نہیں کھل جاتا، ہمارے لیے پپو کا وجود اہم رہے گا۔"

میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ مجھے بھی اسی بات کی کھد بد تھی لیکن میں ابھی اس بات کو قبل از وقت سمجھ رہا تھا۔ ہولے سے مسکرا کر بولا۔

"خیر ہے یار! میرے بھی تو سوجن، سوبیری ہیں۔ ہوگا کوئی، دیکھ لیں گے بعد میں انہیں بھی۔"

"نہیں سہراب!" جوجی بدستور سنجیدہ رہا۔ "خیر کیسے ہو سکتی ہے۔ پپو نے بتایا تھا کہ وہ کوئی خطرناک لوگ ہیں جو سجاد بیگ سے تیرے بارے میں کوئی خفیہ ڈیل کیے ہوئے ہیں۔ بھاری رقم کا بھی ان کا وعدہ ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ کوئی عام گروہ کے لوگ نہیں ہو سکتے۔ آخر پتا تو چلے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ اس سے بھی پردہ اٹھا لیتے ہیں لیکن سجاد بیگ اب ملے گا کہاں؟ وہ تو کراچی جا چکا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"وسیم کس مرض کی دوا ہے؟ اس کے ساتھ بھی حساب چکتا کرنا ہوگا۔ پپو اسی کا آدمی تھا جس نے اسے تمہیں خفیہ طور پر ہلاک کرنے کے لیے یاسر کے ساتھ بھیجا تھا۔ اسے ضرور معلوم ہوگا کہ وہ کون لوگ تھے اور کیا خبر ابھی سجاد بیگ بھی ادھر ہی ہو کیونکہ اس کا ابھی تک نائب سربراہی والا معاملہ چل رہا ہے۔"

استاد جوجی کی بات پر میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اگرچہ وسیم سے دو دو ہاتھ کرنے کا میرا بھی ارادہ تھا تاہم اس نئی اور پیچیدہ سی صورت حال پر میں نے بھی ہامی بھر لی، بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ تم ادھر ہی رہو، میں ذرا چند گھنٹے آرام کرنے اور شگفتہ سے حقیقت معلوم کر کے ادھر آجاتا ہوں پھر یہاں سے روانہ ہونے کا پروگرام بناتے ہیں۔" جوجی نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ میں روانہ ہو گیا۔ پنج گرائیں کی ملکیت والے کاغذات میں نے جوجی کے حوالے کر دیے تھے۔

جوجی نے اپنے کسی لڑکے کو بنگو کی کار دور کسی ویرانے میں چھوڑ دینے کی ہدایت کر دی تھی۔ میں بائیک دوڑاتا ہوا گھر پہنچا۔ فوزیہ بے سدھ سو رہی تھی لیکن شگفتہ بیگم جاگ رہی تھیں اور خاصی پریشان نظر آرہی تھیں۔ دروازہ انہوں نے کھولا اور مجھے دیکھتے ہی انہوں نے سکون کی سانس لی۔

"ارے بیٹا! تم کہاں تھے اتنی دیر سے؟ مجھے تو بہت پریشانی ہو رہی تھی۔"

میں نے ایک نگاہ ان کے چہرے پر ڈالی اور قریب بیڈ پر گہری نیند لیتی فوزیہ کو دیکھا۔

شگفتہ نے فوراً کہا۔ "یہ بھی ابھی سوئی ہے بیچاری! وہ بھی میں نے اس سے کہا تھا کہ سو جائے۔ ساری رات جاگتی رہی تھی تمہارے انتظار میں۔"

میں ہولے سے مسکرا دیا۔ سوئی ہوئی فوزیہ کے چہرے کی تھکن بتا رہی تھی کہ شگفتہ خاتون میرا دل رکھنے کے لیے یہ بات نہیں کہہ رہی تھیں۔

جوجی، شگفتہ کو سلام کرنے کے بعد لاؤنج میں جا بیٹھا تھا۔

"آپ نے اچھا کیا کہ اسے آرام کرنے کا مشورہ دے دیا لیکن آپ بھی نیند پوری کر لیں۔ میں بھی سونا چاہتا ہوں۔ کچھ آرام کرنے کے بعد ہی سکون سے گفتگو کریں گے۔"

انہوں نے اپنے سر کو دھیرے سے اثباتی جنبش دی لیکن ان کے چہرے پر مجھے ایک عجیب سی مسکراہٹ محسوس ہوئی جس نے اندر سے مجھے کچھ چونکا سا دیا۔ شاید یہ بیٹی سے ملاقات کی خوشی تھی لیکن زبیر نے تو مجھے جاتے وقت بتایا تھا کہ نگہت کچھ پریشان سی نظر آرہی تھی اور ضرور اس نے اپنی ماں کو اپنی پریشانی کے بارے میں بتایا ہوگا تو اس صورت میں شگفتہ خاتون کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ چہ معنی.....!

میں نہ سمجھ پایا اور نہ ہی ان کی وجہ پوچھ پایا۔ شاید میں بھی نیند اور تھکن سے بوجھل سا ہو رہا تھا۔

بہرکیف، میری غیر موجودگی میں شگفتہ خاتون ہی ہمارے کمرے میں سوتی تھیں۔ اب میری آمد پر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ میں فوزیہ کے قریب ہی لیٹ گیا۔ زبیر کو یہاں آتے ہی میں نے اس کے حوالے بائیک کر کے اسے واپس جوجی کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ تاہم میں نے اس سے پوچھا تھا کہ نگہت اور شگفتہ کے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں..... وغیرہ۔ اس نے یہی بتایا کہ وہ دونوں الگ کمرے میں تھیں اور نگہت کوئی نصف گھنٹا ماں کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد چلی گئی تھی مگر اس نے ان کی باتیں نہیں سنی تھیں، نہ ہی نگہت کے جانے کے بعد شگفتہ خاتون نے اس سے کوئی بات کی تھی اور اس نے بھی اس بارے میں کچھ پوچھنا مناسب محسوس نہیں کیا تھا۔ تاہم نگہت کچھ پریشان بھی تھی۔

دوپہر کو ہی میری آنکھ کھلی تھی۔ خود کو بستر پر میں نے تنہا ہی لیٹے پایا۔ فوزیہ شاید مجھ سے پہلے ہی جاگ کر کسی کام وغیرہ میں

pklibrary.com

مصروف ہوگئی تھی۔

فوزیہ کو میں نے مطمئن کردیا البتہ شگفتہ مجھ سے کچھ بات کرنے کے لیے بے چین سی نظر آرہی تھی۔

میں نے ہی ابتدا کی۔ ”میں نے سنا ہے نگہت یہاں آئی تھی؟“

”ہاں بیٹا!“ شگفتہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ہم دونوں لاؤنج میں ہی بیٹھے تھے۔ فوزیہ کچن میں مصروف تھی۔

”خیریت تو تھی؟“ میں نے پوچھا۔ میری بے تک سی نظریں ان کے چہرے پر جمی رہیں۔ اب وہاں کوئی عجیب یا پراسراری مسکراہٹ عنقا تھی۔ تاہم میرے سوال پر انہوں نے خاموشی سے ایک کارڈ میرے سامنے کردیا۔

یہ شادی کارڈ تھا۔ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں نہ جانے کیا سمجھا تھا اور یہاں کیا معاملہ نکلا تھا۔ کارڈ دیکھا، وہ وسیم اور نگہت کی شادی کا دعوت نامہ تھا۔ ماں کو نگہت یہی دعوت نامہ دینے کے لیے آئی تھی۔

”صرف مجھے بلایا ہے۔“ شگفتہ خاتون نے ہولے سے کہا۔ میں ذرا گم صم سا رہ گیا۔ ایک ہفتے بعد شادی تھی۔ اس زمانے میں شادی ہالوں کا اتنا رواج عام نہ تھا۔ کسی خالی بنگلے یا میدان یا پھر اپنے ہی گھر کے آگے شامیانے، قناتیں لگا کر مہمانوں کی دعوت کا انتظام کردیا جاتا تھا۔ یہ بھی گل ہاؤس کے ایک پلے گراؤنڈ میں تھا جہاں وسیم کا کوٹھی نما بنگلا واقع تھا۔

”اس کے علاوہ اور کچھ کہا نگہت نے آپ سے؟“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔ وہ چپ سی رہیں تو میں نے ایک لمحہ توقف کے بعد دوبارہ کہا۔

”چلو اچھا ہوا۔ اس بہانے وہ آپ سے ملنے تو آئی۔ میرا خیال ہے آپ کو جانا چاہیے۔“

”وہ غلط کررہی ہے۔“

”کیا؟“

”وسیم سے اسے شادی نہیں کرنا چاہیے تھی۔“

”کیا کہا جاسکتا ہے۔ یہ اس کی مرضی ہے اور دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”بات یہ نہیں ہے۔“ شگفتہ بولی۔ ”وسیم کو میں اچھا لڑکا نہیں سمجھتی۔“

”یہ بتائیں، وہ کیسی تھی؟ میرا مطلب ہے خوش نظر آرہی تھی یا پھر.....“ میں نے کسی خیال کے تحت کہا اور دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس پر شگفتہ خاتون نے چونک کر ایک گہری نگاہ میرے چہرے پر ڈالی اور الٹا سوال کرڈالا۔

”کیا بات ہے، ایسا کیوں کہا تم نے، کوئی بات ہے؟“

”نہیں، یونہی پوچھ لیا تھا میں نے۔“

”نہیں بیٹا! جو تم نے سوال پوچھا ہے، وہ میرے ذہن میں بھی ابھرا تھا کیونکہ وہ مجھے کچھ زیادہ خوش نظر نہیں آرہی تھی۔ ماں ہوں نا، اپنی اولاد کے اندر چھپی فکر و پریشانی میں نے بھی بھانپ لی تھی۔ تب میں بھی نہ رہ سکی تھی۔ بڑے پیار سے میں نے اس سے پوچھ لیا تھا کہ بیٹی! اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو تمہاری مرضی لیکن تمہارا یہ فیصلہ جلد بازی میں عمر بھر کی کوئی غلطی نہ بن جائے۔“ شگفتہ خاتون اتنا کہہ کر چپ ہوئیں۔

”پھر کیا کہا اس نے؟“ میں نے ان کے چہرے پر نظریں جما کر پوچھا۔

”وہ خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔“ شگفتہ بولیں لیکن پھر یکدم میری طرف دیکھتے ہوئے تفکر تلے بولیں۔ ”سہراب بیٹا! تمہیں کیسے اندازہ ہوا اس کی پریشانی کا..... کوئی بات ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے ہولے سے کہا۔

”وہ کیا؟“ شگفتہ ایک دم پریشان ہوگئی۔ ”کیا اس کی وجہ خود وسیم ہی ہے؟ مگر وہ تو.....“

”نہیں۔“ میں نے ان کی بات کاٹی۔ ”سجاد بیگ.....!“ میں نے بتایا۔ وہ لمحہ بھر کو چپ ہوئی پھر بولی۔

”اوہ، سجاد بیگ! یہ وہی شخص تو نہیں جس کے بارے میں تم نے.....“

”ہاں، وہی شخص ہے۔“ میں نے پھر ان کی بات کاٹی۔

”اس سے کیا پریشانی ہے، اسے تو نگہت اپنا انکل سمجھنے لگی تھی؟“

”وہی انکل اب ان کے لیے شاید کسی پریشانی کا سبب بننے لگا ہے۔“

”کیسی پریشانی؟“

میں نے رات والے واقعے کی اصلیت چھپا کر گول مول سے انداز میں اصل بات بتادی۔ یعنی یہ کہ سجاد بیگ درحقیقت نگہت کو کراچی لے جانا چاہتا تھا۔

”لیکن کیوں؟“ شگفتہ نے چونک کر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”وہ اسے تنظیم کا نائب بنانے کی خواہش رکھتا تھا۔“ میں نے بتایا۔

”میرے خدا.....!“ شگفتہ یہ سن کر ہراساں ہوگئی۔ ”وہ تو خود ایک بہت بڑے مجرم (باس اقبال) کا نائب رہ چکا تھا۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”اب اقبال کے مرنے کے بعد تنظیم کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں آگئی ہے۔“

”مگر..... لیکن وہ کمینہ نامراد میری معصوم بیٹی کو اس جہنم میں کیوں جھونکنا چاہتا ہے جہاں میرا اپنا شوہر جل مرا؟ کیا نگہت اتنی بے وقوف ہے لیکن نہیں..... یہ وسیم کی پڑھائی ہوئی پٹی

ہوگی۔" شگفتہ اپنی پیشانی مسلنے لگی، آگے بولی۔ "لیکن..... اس ناہنجار سجاد بیگ کو آخر میری معصوم بیٹی کو اس جہنم میں جھونکنے کا کیا مقصد ہے؟"

"بہت گہرا۔" میں نے کہا۔ "دراصل سجاد بیگ کو تنظیم میں ابھی تک وہ مقام حاصل نہیں ہوسکا ہے جو اس سے پہلے اس کے بانی اقبال کو تھا۔ اس کے لیے سجاد بیگ کے قریبی ساتھیوں نے اسے مشورہ دیا کہ اگر یہی حال رہا تو تنظیم میں پھوٹ اور بغاوت پھیل سکتی ہے کیونکہ اقبال تنظیم کا بانی تھا اور اس کے لوگوں کو اس سے دلی عقیدت اور محبت تھی لہٰذا چونکہ نگہت اس کی بیٹی ہے، اگر اسے تنظیم میں شامل کرلیا جائے تو "باس کی بیٹی" سے تنظیم کے لوگوں کی دلی محبت اور عقیدت دوبارہ جاگ سکتی ہے۔ جیسا کہ ہماری سیاست میں بھی ہوتا رہا ہے۔ خیر، سجاد بیگ کو اپنے قریبی کارپردازوں کا یہ مشورہ اچھا لگا۔ چونکہ وہ آپ اور نگہت سے اچھی طرح واقف تھا، یوں اس نے ان کے ساتھ راہ و رسم بڑھا لیے لیکن یہاں درمیان میں ایک اور عجیب بات ہوئی۔"

اتنا بتا کر میں ذرا خاموش ہوا۔ شگفتہ غور سے میری باتیں سن رہی تھی۔ لحظہ بھر توقف کے بعد میں دوبارہ کہنا شروع ہوا۔

"وسیم کو تو کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ وہ تو خوش تھا کیونکہ وہ خود بھی راجا تیمور جیسے مجرم کا بیٹا ہے جو کالی لہر والوں کا خاص کارندہ تھا۔ آپ تو جانتی ہیں کہ اسے مجھ سے بھی خدا واسطے کا بیر ہے کیونکہ وہ اپنے باپ کی بربادی اور موت کا ذمے دار مجھے ہی سمجھتا ہے۔ اس نے بھی نگہت کو اکسایا کہ اس کے لیے پاور میں آنے کا یہ اچھا موقع ہے۔ دراصل وسیم مجھ سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس کے لیے وہ نگہت کے ذریعے پاور میں آنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا۔ خیر، نگہت نے بھی یہ بات مان تو لی لیکن جب سجاد بیگ اسے کراچی لے کر گیا اور نگہت نے وہاں چند دن رہتے ہوئے جب اس تنظیم کے کالے کرتوت دیکھے تو وہ گھبرا گئی بلکہ دوسرے لفظوں میں خوفزدہ سی ہوگئی۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ آپ کی تربیت آڑے آگئی۔ لہٰذا کراچی سے واپس لوٹنے کے بعد اس نے تنظیم میں شمولیت اور اس کا نائب بننے سے نہ صرف انکار کردیا بلکہ وسیم کو بھی کہا کہ سجاد بیگ سے راستہ فوراً الگ کرلو۔"

میں یہ سب بتا کر چپ ہوا مگر دیکھا تو شگفتہ خاتون کے چہرے پر ایک دم لرزہ سا طاری ہوگیا۔ انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اوہ میرے خدا! تیرا شکر ہے کہ تُو نے میری معصوم اور نادان بچی کو اس گڑھے میں گرنے سے بچالیا جس نے میرا گھر برباد کردیا تھا اور میرا شوہر بھی نہ بچ سکا لیکن....." اس نے میری طرف دیکھا۔

"بیٹا! وسیم اسے دوبارہ مجبور کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس بدبخت نے نگہت سے شادی کا پلان ہی اسی لیے بنایا ہوگا تاکہ بعد میں وہ اس پر اپنا حکم چلا سکے۔" کہتے کہتے وہ ایک دم کھڑی ہوگئی۔ "میری بچی مصیبت میں ہے۔ مجھے یقین ہے اسے زبردستی اس گڑھے میں دھکیل دیا جائے گا۔ میں..... میں نگہت سے جا کر ملوں گی۔ اسے سمجھاؤں گی اور..... اور....."

"آپ آرام و سکون سے بیٹھ جائیں۔ اللہ سب ٹھیک کردے گا۔" میں نے ازراہِ تشفی اس سے کہا۔ میرے لفظوں میں جانے کیا تھا کہ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی لیکن اس کی تشویش اور تفکر کم نہ ہوا۔ وہ اسی کے زیر اثر ہولے ہولے کانپے جارہی تھی پھر میری جانب دیکھتے ہوئے آس بھرے لہجے میں بولی۔

"سہراب بیٹا! تم کو تو ساری حقیقت معلوم ہوچکی ہے۔ خدا کے لیے تم ہی کچھ کرو۔"

"وہی کچھ کرنے والا ہوں۔ آپ حوصلہ رکھیں۔" میں نے پھر انہیں تسلی دی۔

"ارے بیٹا! تم ہی سے تو مجھے حوصلہ رہتا ہے۔" وہ ممنون بھرے لہجے میں بولی۔ اسی وقت فوزیہ اندر آگئی۔ وہ سیدھی کچن سے آئی تھی اور اس کے گلنار چہرے پر پسینے کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

"پھر کہیں جارہے ہو؟" اس نے پوچھا۔ اس نے شاید جوجی کو میرے ساتھ دیکھ کر یہ اندازہ لگایا تھا، پر ایک اندازہ میں نے بھی قائم کیا تھا، اس کے چہرے سے بھی اور غزال چشم آنکھوں سے بھی۔ وہاں مسرت اور حیا کی پُربہار سحر خیزی چمک رہی تھی جو اب ہلکی اور چوری مسکان بن کر اس کے عنابی لبوں تک اتر آئی تھی۔

"ہاں، کوئی کام تو نہیں؟" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سودا ختم ہورہا تھا۔" فوزیہ نے دوپٹے سے چہرہ پونچھتے ہوئے بتایا۔

"میں لادیتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"زبیر بھائی کو پیسے دے دیے تھے میں نے۔ وہ شام تک پہنچادیں گے۔" فوزیہ نے بتایا۔

"واہ، تم تو بڑی عقلمند ہوگئی ہو۔ اس بیچارے سے بھی کام لے لیا۔"

"ائی شاوشے! تو کیا ہوگیا۔ وہ بھی بھرجائی دا بھرا ہے (بھابی کا بھائی ہے)۔" جوجی اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔ ہم اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ اس کے ہاتھ میں لسی کا گلاس تھا جو شاید فوزیہ نے ہی اسے بنا کر دیا تھا۔ آخری گھونٹ بھر کر اس نے شکریے کے ساتھ وہ فوزیہ کو تھمادیا۔

جوجی کی اندر آمد پر فوزیہ کے چہرے کی بہار، آنکھوں کی

pklibrary.com

مسرت اور لبوں کی مسکان ایک دم گھبراہٹ میں بدل گئی۔ پھر وہ قریب کھڑی شگفتہ خاتون کی طرف ایک نگاہ دیکھ کر واپس پلٹ گئی۔ نہ جانے کیوں مجھے فوزیہ کی یہ تبدیلی عجیب لگی۔ جوجی بھی ذرا گم صم سا ہو رہا اور میری طرف دیکھ کر اپنے سر کو یوں جنبش دی جیسے مجھ سے پوچھ رہا ہو۔ ''ائی شاوشے! کیا معاملہ ہے؟''

لیکن جب ہم دونوں کی نظریں شگفتہ خاتون کے چہرے پر پڑیں تو وہ جیسے ہم دونوں کی کیفیت جان کر یا کوئی اور بات تھی، ان کے چہرے پر مجھے پھر وہی مسکراہٹ محسوس ہوئی جو میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

''معاملہ کیا ہے آنٹی؟ فوزیہ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

''فوزیہ بالکل ٹھیک ہے لیکن تمہارے لیے ایک بڑی خوشخبری ہے۔'' شگفتہ خاتون نے اسی مسکراہٹ تلے بتایا۔

''ائی شاوشے..... آنٹی جی! آپ تجسس پھیلا رہی ہیں۔ ہن چھیتی نال دس دیو، اے معاملہ کی ہے؟'' (اب جلدی سے بتا دو یہ معاملہ کیا ہے؟) جوجی بھی چپ نہ رہ سکا۔

''سہراب بیٹا! تم باپ بننے والے ہو۔'' شگفتہ خاتون نے خوشی سے لبریز آواز میں بتایا تو میرے اندر مسرت کی بجلی سی یوں چمکی جیسے کوئی تپتے صحرا میں بھٹکا ہوا مسافر پانی اور چھایا کو ترسا ہوا ہو اور اچانک بادل گرجنے کی آواز کے ساتھ ہی بارش کی پہلی پھوار سے شرابور ہو کر سیراب ہونا شروع کر دے۔

ایک لمحے کے لیے تو میں گنگ ہو گیا پھر یکدم الٹے پاؤں پلٹا اور کچن کی طرف دوڑا۔ وہاں فوزیہ سر جھکائے یوں ہی کھڑی تھی۔ میں نے پیچھے سے جا کر اسے کندھوں سے بڑے پیار کے ساتھ دبوچ لیا اور پھر اسے پلٹا کر اپنے سینے سے بھینچ لیا۔

''ارے..... رے..... کیا کرتے ہیں۔ اندر آنٹی اور جوجی بھائی موجود ہیں۔'' فوزیہ شرم سے گلنار ہو کر بولی۔

''اتنی بڑی خوشخبری..... تت..... تم نے پہلے مجھے کیوں نہیں بتائی۔ تت..... تمہیں کیسے پتا چلا؟'' میں خوشی کے بے پایاں احساس تلے بولا۔ میری بات پر فوزیہ نے دلار سے منہ بنایا اور آہستگی کے ساتھ خود کو میری گرفت سے چھڑا کر بولی۔

''تم گھر پر رہو تو تمہیں کچھ اتا پتا چلے نا۔ سارا دن تو بھاگا دوڑی میں رہنے لگے ہو اور اب تو رات میں بھی.....''

''خدا کے لیے فوزیہ! اتنی بڑی خوشخبری ہے، یہ شکوے شکایتیں مجھ پر ادھار۔ یہ بتاؤ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ تم.....'' میں نے اس کی بات کاٹ دی اور اپنی بھی پوری نہ کر پایا۔

''کل سے میری طبیعت کچھ خراب تھی، سر میں چکر اور ابکائیاں سی آ رہی تھیں۔ میں تو پریشان تھی لیکن شکر رہا کہ آنٹی شگفتہ تھیں۔ وہ پریشان ہونے کے بجائے میری طبیعت دیکھ کر مسکرائیں۔ مجھے حیرت ہوئی اور پھر سب سے پہلے تو انہوں نے مجھے کچن سے آم کے اچار کی ایک پھانک لا کر دی اور پھر رکشے میں بٹھا کر قریبی کلینک لے گئیں۔ وہاں ایک لیڈی ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور یہ خوشخبری سنائی، ساتھ ہی ایک دو ٹیسٹ بھی لکھ دیے۔'' فوزیہ نے بتایا۔

ابھی میں اس سے مزید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اندر سے جوجی چلاتا رقص کرتا ہوا کچن میں سیدھا آن گھسا۔

''ائی شاوشے بھائی! آئی شاوشے..... میں تو چاچا بن گیا۔ میرا ہونے والا بھتیجا یا بھتیجی مجھے چاچا، چاچو کہہ کر پکاریں گے تو رب دی سوں، مزہ ہی آ جانا ہے۔'' جوجی نے ہم دونوں کی طرف دیکھ کر مسرت انگیز مسکراہٹ تلے کہا۔ اس کی خوشی واقعی دیدنی ہو رہی تھی۔ ہم دونوں کا کوئی سگا رشتہ نہ تھا لیکن ایک رشتہ ضرور تھا..... دوستی کا، انسانیت کا، دل اور وفا کا بھی۔ ایسے میں مجھے جگنو یاد آ گیا۔ وہ مجھے ''جگری'' کہا کرتا تھا۔ اسے یاد کر کے میں ایک دم مغموم سا ہو گیا۔ ایسے میں شگفتہ خاتون بھی وہاں آ گئیں۔

یہ تینوں بھی خوشی کے اس موقعے پر مجھے یکدم مغموم پا کر چپ ہو رہے۔ شاید انہیں ادارک ہو چلا تھا کہ مجھے اپنا کوئی بچھڑا ہوا پیارا سا ساتھی یاد آ گیا ہے۔ یہی ہوتا ہے جب خوشی کا ایسا ہی بے پایاں موقع ہو تو اپنا کوئی بچھڑا ہوا پیارا یاد آ جاتا ہے۔

''بیٹا! کیا تمہیں جگنو یاد آ رہا ہے؟'' بالآخر شگفتہ خاتون نے محبت بھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔

''جی آنٹی!'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''دراصل جوجی کی خوشی دیکھ کر مجھے جگنو یاد آ گیا۔ آج وہ زندہ ہوتا تو وہ بھی جوجی کی طرح خوشی سے ناچ اٹھتا اور اپنے چاچو بننے کی خوشی میں جوجی کی طرح ہی خوشی سے جھومتا۔'' کہتے ہوئے میری آواز دکھ تلے بوجھل سی ہونے لگی۔ ایسے میں جوجی نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور بولا۔

''ائی شاوشے..... اخدا جگنو کی مغفرت کرے۔ میں اس بھلے مانس سے کبھی ملا تو نہیں لیکن تیرا دکھ بتاتا ہے کہ وہ واقعی تیرا جگری یار تھا۔''

فوزیہ سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔ تب ہی ایک دم شگفتہ خاتون نے فضا کے اس بوجھل پن کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

''ارے بھئی اب اس خوشی کے موقعے کو منہ میٹھا کر کے منانا چاہیے۔ تم لوگ بیٹھو آرام سے، میں بیسن کا حلوا بناتی ہوں۔''

☆☆☆

پندرہ بیس منٹ بعد میں اور جوجی باہر آ گئے۔ میں بائیک

پر بیٹھا اور جوجی میرے پیچھے۔ ذرا ہی دیر بعد بائیک ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ شام ہو چلی تھی۔ دوپہر کا کھانا ہم کھا چکے تھے۔ میرا رخ گرین سٹی کی طرف تھا۔ یہ علاقہ شہر کے جنوب مشرق میں واقع تھا۔ وہاں تک پہنچنے میں ہمیں بیس منٹ لگ گئے۔ گل ہاؤس اس رہائشی سوسائٹی کا نام تھا جدھر وسیم کا بنگلا تھا۔

پروجیکٹ کے دو اسٹرنس گیٹ تھے۔ نمبر ایک اور نمبر دو۔ ایک پر دو سیکیورٹی گارڈز کھڑے دکھائی دیے جبکہ دوسرے پر ایک ہی کھڑا بیڑی پی رہا تھا۔ اس نے ہمیں روک لیا اور پوچھا کس سے ملنے آئے تھے..... وغیرہ۔

میں نے بتایا وسیم تیمور کے مہمان ہیں۔ وہ بولا۔ اس وقت وہ دفتر میں ملیں گے۔ ہمیں معلوم تھا وہ یہی جواب دے گا۔ میں نے کہا۔

"ہم ان کے دفتر ہی جا رہے تھے لیکن فون پر انہوں نے بتایا کہ وہ بھی گھر ہی آ رہے ہیں لہٰذا ہم بھی وہیں پہنچیں۔" میں نے بتایا۔ گارڈ نے سرسری نظر ہم دونوں پر ڈالی اور ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔ اندر لے جا کر میں نے بائیک سیدھا وسیم کے بنگلے کے سامنے روک کر سائڈ اسٹینڈ پر کھڑی کر دی۔

جوجی نے کال بیل پر انگلی رکھ دی پھر ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ذرا دیر بعد گیٹ کا بغلی دروازہ کھلا اور ایک تنومند سا آدمی باہر نکلا۔ میں اسے پہچان گیا تھا۔ پچھلی والی مہم پر اسی سے میرا سامنا ہو چکا تھا مگر اس طرح کہ وہ میرا چہرہ دیکھنے سے قاصر ہی رہا تھا۔ یہ عموماً وسیم کے ساتھ ہی اس کا باڈی گارڈ بن کر رہا کرتا تھا اسی لیے اسے دیکھتے ہی مجھے لگا شاید وسیم بھی اندر ہی موجود ہو لیکن نہ باہر، نہ اندر اس کی لمبی چوڑی نئے ماڈل کی گاڑی کھڑی نظر آئی۔ البتہ ایک چوڑے ٹائروں والی کیوٹی ہڈ والی جیپ پاس میں کھڑی ضرور دیکھی جس کے بارے میں میرا یہی اندازہ قائم ہو سکا کہ یہ کسی اور نے یہاں پارک کر دی ہوگی۔

جوجی میری ہدایت کے مطابق اِدھر اُدھر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اس گلی میں ہمارے سوا اور کوئی ذی نفس نظر نہیں آ رہا تھا۔

"جی، کون ہیں آپ؟" مذکورہ آدمی نے ہم دونوں کو ایک نظر ڈال کر دیکھنے کے بعد خشک لہجے میں پوچھا۔

"وسیم صاحب دفتر سے آ چکے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔ اتنے میں جوجی بھی اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانے کے بعد قریب آ چکا تھا۔ گارڈ نے اس کی طرف کچھ تشکیک سے دیکھا۔

"نہیں، مگر آپ کون ہیں اور یہاں کیوں آئے ہیں؟" اس نے اب کی بار خاصے سخت لہجے میں سوال کیا۔

"تاؤ کیوں کھا رہے ہو، کیا وسیم صاحب نے مہمانوں سے بات کرنے کی تمہیں یہی تمیز سکھائی ہے؟" میں نے بھی جواب میں ناگوار سے لہجے میں کہا۔

"آپ کیسے مہمان ہیں ان کے۔ رابطہ کیے بغیر بن بلائے مہمانوں کی طرح....."

"ہم فون پر ان سے رابطہ کر چکے ہیں۔ پہلے ہم وہیں جا رہے تھے مگر انہوں نے کہا کہ میرے گھر پہنچو، میں بھی وہیں آ رہا ہوں۔" اس بار جوجی نے کہا۔

گارڈ نے اس کی طرف بھی خشمگیں نظروں سے دیکھا اور بدستور اسی لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے، آپ ادھر کھڑے رہو، میں اندر جا کر فون پر ان سے....."

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ جوجی جو پہلے ہی اطراف میں کسی کی غیر موجودگی کا اطمینان کر چکا تھا، ایک ہی ہاتھ اس کی گردن پر رسید کر دیا۔ گارڈ کٹے ہوئے شہتیر کے مانند گرنے لگا اور میں فوراً ہی اسے سنبھالتا ہوا کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ جوجی نے بھی اندر آتے ہی جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

سامنے مرکزی دروازہ تھا۔ نگہت کی اندر موجودگی متوقع تھی اور ایک آدھ گھریلو ملازم کی۔

دائیں بائیں باغیچہ تھا اور وہاں دو کتے بندھے ہوئے تھے جنہوں نے ہماری طرف دیکھتے ہی بھونکنا شروع کر دیا۔ جوجی نے بے ہوش گارڈ کو کنکریٹ کی پختہ روش پر ڈال کر جیب سے کوئی شے نکالی اور ان کی طرف اچھال دی، یوں کہ بندھے ہونے کے باوجود وہ ان تک جا گرے اور وہ بہ آسانی اس شے تک پہنچ جائیں۔

دونوں کتے زنجیروں میں بندھے ہوئے اس "شے" کی جانب لپکے اور تھوتھنے لگا کر سونگھنے لگے۔ چند ہی سیکنڈز میں وہ "کوں..... کوں" کی آواز نکالتے ہوئے لیٹ گئے۔

گارڈ کو جوجی نے کندھے پر اٹھا لیا اور ہم داخلی دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ سامنے ہال تھا۔ فرش پر دبیز قالین اور جدید فرنیچر سے مزین نشست گاہ..... لیکن وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ بائیں جانب قدرے بل دار نفیس ریلنگ اور سنگ مرمر کے قدچوں والا زینہ اوپر کو جاتا تھا۔ ہم دونوں کی عقابی نظریں تیزی سے گردوپیش میں تھرک رہی تھیں۔

قریب نشست گاہ والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ باقی آگے جا کر دونوں کی طرف مختصر راہداریاں جاتی تھیں اور ان کے سرے پر بھی دو کمرے تھے۔

"تم..... کون ہو تم لوگ؟"

اچانک چلاتی ہوئی آواز گیلری سے ابھری۔ ہم دونوں نے چونک کر گردن اٹھا کر دیکھا۔ ریلنگ سے لگی کھڑی نگہت ہماری طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ پھر مجھے اور جوجی کو پہچانتے ہی وہ تیزی سے زینے طے کرتی نیچے اتری۔

اس کے چہرے پر شناسائی کے تاثرات میں برہمی اور تفکر کے سائے بھی ہلکورے لے رہے تھے۔

"تم..... سہراب! یہاں..... یہ کیا طریقہ ہے تمہارا؟" نگہت نے قریب آکر مجھ سے درشت لہجے میں کہا۔ جوجی پر بھی اس نے ایک نگاہ ڈالی تھی۔ کرائے گروپ کے حوالے سے وہ اسے بھی پہچانتی تھی۔

میں نے اطمینان سے جواب میں کہا۔ "اس کھلونے کو واپس اڑس لو۔ میں وسیم سے چند باتیں کرنے آیا ہوں۔" تب تک جوجی نے بے ہوش گارڈ کو صوفے پر ڈال دیا تھا۔

"لیکن بات کرنے سے پہلے اس گارڈ کے لیے ایک عدد رسّی لادو تاکہ اسے باندھ کر ہم آرام سے بات کرسکیں۔" جوجی نے درمیان میں لقمہ دیتے ہوئے غصے میں بپھری ہوئی نگہت سے کہا تو وہ مزید لال سرخ ہوتے ہوئے جوجی سے بولی۔

"بکواس بند کرو۔ میں ابھی پولیس کو کال کرتی ہوں۔" نگہت نے دھمکی دی اور بہ آوازِ بلند کسی خیرن نامی ملازمہ کو آواز دی۔ کونے والی راہداری سے "جی آئی..... بی بی جی" کہتی ہوئی ایک ادھیڑ عمر کی عورت جس کی وضع قطع دیہاتی تھی، نمودار ہوئی اور ہم پر نگاہ پڑتے ہی اس کے ہاتھ سے کوئی شے چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔

وہ کوئی گلدان تھا جسے صاف کررہی تھی۔ صافی بھی اس کے ہاتھ سے گلدان کے ساتھ ہی گر پڑی تھی۔

"ہائے ربا..... یہ کون لوگ ہیں؟"

"ہم اچھے لوگ ہیں..... بشرطیکہ آپ زیادہ شور شرابا کرنے کی کوشش نہ کریں ورنہ ہمیں سخت قدم اٹھانا پڑجائے گا۔" جوجی نے کہا۔

"یو شٹ اپ!" نگہت نے سخت طیش زدہ لہجے میں جوجی کو ڈپٹ دیا۔ شاید اسی کے (وسیم کے) گھر میں نگہت کی ملازمہ کو جوجی کی ایسی دھمکی نے اسے غصے سے بلبلا دیا تھا جس نے شاید اس کی انا کو ٹھیس بھی پہنچائی تھی۔

"یہ کھلونا ہاتھ میں رکھ کر کسی خوش فہمی میں مت رہنا محترمہ!" جوجی بھی دبنے والا نہ تھا۔ منہ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں بولا۔ "وسیم نے سہراب کو ختم کرنے کے لیے جو اپنے دو کتے بھیجے تھے، اس سلسلے میں اس سے ذرا حساب کتاب کرنے آئے تھے ہم۔"

میں نے دیکھا جوجی کی بات نے نگہت کے چہرے کا رنگ ایک ہی لمحے میں بدل دیا۔ تب میں نے بھی نگہت سے زہرخند لہجے میں کہا۔

"جی، اور ان دونوں میں سے ایک سجاد بیگ کا آدمی یاسر اور دوسرا بشارت عرف پپو نامی قاتل تھا۔ وہ دونوں ہمارے قبضے میں ہیں اور قانون کے سامنے حلفیہ بیان دینے کے لیے تیار بھی۔"

نگہت کے چہرے کا رنگ ایک دم پھیکا پڑنے لگا۔ اس کا پستول والا ہاتھ بھی ڈھیلا پڑا تو میں نے دوبارہ کہا۔

"اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ فون کرکے وسیم کو بلاؤ۔ ذرا اس سے بات کریں، وہ مجھ سے آخر چاہتا کیا ہے؟ میدان کرنا چاہتا ہے تو میں تیار ہوں اس کے لیے بھی۔ قانونی جنگ تو وہ ہار چکا ہے۔ اب کھسیانی بلی کی طرح دو ٹکے کے لوگوں کو میرے پیچھے لگائے گا تو منہ کی کھائے گا۔"

میں صوفے پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ جوجی نے بھی یہی کیا مگر اس سے پہلے ادھیڑ عمر کی ملازمہ کو بھی سامنے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ نگہت کے سارے کس بل نکل چکے تھے۔ استاد جوجی واقعی "استاد" تھا۔ اس نے بشارت عرف پپو کو یرغمال بنا کر بہت عقلمندی کا کام کیا تھا۔ مدعا موجود ہو تو ملزم ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے۔ وہی نگہت کے ساتھ ہوا تھا۔

"تم دونوں یہاں نہیں بیٹھ سکتے۔" معاً ہی نگہت نے دوبارہ پستول تول لیا۔ وہ میرے دائیں بازو کے قریب کھڑی تھی اور اس کا اعتماد دھیرے دھیرے دوبارہ بحال ہورہا تھا لیکن اب اس میں پہلے والی بات نہ رہی تھی۔ وہ خاصی پریشان اور متفکر نظر آنے لگی تھی۔

تب ہی میں یکدم اچھلا اور اس کے پستول والے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ وہ نکل کر جوجی کے پیروں کی جانب لڑھک آیا۔ نگہت کے حلق سے ہلکی سی چیخ خارج ہوئی اور پھر اس کے اندر کی "کرائے والی لڑکی" جاگ اٹھی۔

سنبھالا لیتے ہی اس نے الٹی چھلانگ فضا میں لگائی اور چاہتی تھی کہ مجھ سے فاصلہ لیتے ہی پلٹ کر حملہ کرنے کی کوشش کرے کہ میں نے بھی قالین پر جھکائی دے کر بلّی کی سی پھرتی کے ساتھ ایسی اچھال لگائی کہ فضا میں ہی گھومتی ہوئی نگہت کو دبوچ کر دوبارہ قالین پر آرہا۔

"لخ..... لخ..... لخ....." صوفے پر بیٹھے جوجی نے دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجائیں۔ نگہت کا پستول اس نے اٹھا لیا تھا اور اب اس کی گود میں پڑا نظر آرہا تھا۔ اس کے سامنے ادھیڑ عمر ملازمہ ہراساں مگر خاموش بیٹھی تھی۔

"تم اگر بلیک بیلٹ ہو تو میں نے نیلا، پیلا بیلٹ لے رکھا ہے محترمہ!" میں نے اسے اٹھا کر سیدھا کھڑا کرتے ہوئے کہا۔ "اب خاموشی سے بیٹھ جاؤ اپنی ملازمہ کے ساتھ اور مجھے مزید سختی کرنے پر مجبور مت کرنا۔ جن لوگوں نے میری موت کے پیامبر بھیجے تھے، میں انہیں کسی صورت میں بھی معاف کرنے کی غلطی نہیں کیا کرتا۔ یہ میری

زندگی بھر کا سب سے پہلا اصول رہا ہے۔"

میرے الفاظ کی قطعیت، بے لحاظ سنگ دلی اور لہجے کی گھن گرج کو محسوس کرتے ہوئے نگہت نے خود ہی اپنے کس بل محدود کر دیے۔ اس کے چہرے پر طیش آمیز تاثرات پھیکے پڑ کر متوحش سے نظر آنے لگے۔

"کمال ہے، تم اور وسیم شادی کے بغیر اکٹھے رہ رہے ہو ابھی تک؟" میں نے نگہت کی طرف دیکھ کر ہلکا سا طنز کیا۔

"یہاں اس علاقے میں ماڈرن سوسائٹی کے لوگ رہتے ہیں، دقیانوسی نہیں۔" اس کے لہجے میں حقارت تھی۔

"اچھا..... اور تم پہلے کس سوسائٹی سے تعلق رکھتی تھیں؟"

"فضول باتیں مت کرو اور بہتر ہوگا کہ تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ۔" اس کا اشارہ جوجی اور میری طرف تھا۔

"وسیم سے ایک کچہری لگا کر چلے جائیں گے۔ اسے بلاؤ لیکن یہ مت بتانا کہ ہم یہاں موجود ہیں۔ اوکے؟"

نگہت نے دانت پیسے اور اپنی ادھیڑ عمر ملازمہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ گئی اور اٹھی۔

سامنے قریب ایک فینسی اسٹینڈ پر نفیس قسم کا ٹیلی فون سیٹ رکھا تھا۔ وہ اٹھا کر اس نے نگہت کو تھما دیا اور پھر میرے اشارے پر دوبارہ جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

میری ہدایت کے مطابق نگہت نے وسیم کے دفتر کال کی اور اس نے خود ہی بتا دیا کہ وہ آج جلد گھر آ رہا ہے لہٰذا نگہت کو ویسے ہی اس سے زیادہ بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔

تھوڑی دیر گزری، وسیم بریف کیس تھامے اندر داخل ہوا اور ہمیں دیکھتے ہی اس کے قدم وہیں رک گئے۔ جوجی نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے نگہت کے پستول کی نال کا رخ اس کی جانب کرتے ہوئے نال سے ہی اشارہ کیا کہ وہ قریب آ کر بیٹھ جائے۔

وسیم کا چہرہ پہلے تو ایک دم فق سا ہو گیا لیکن پھر یکدم سنبھل کر درشت لہجے میں میری طرف دیکھ کر بولا۔

"یہ سب کیا ہے؟ تم لوگ....."

"زیادہ سیانا کاں (سیانا کوا) بننے کے بجائے خاموشی سے ایک طرف بیٹھ جاؤ۔" جوجی نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

"وسیم! بیٹھ جاؤ اور ان کی بات سن لو۔" نگہت نے درمیان میں کہا۔ وہ بھی پریشان کن نگاہوں سے وسیم کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"پپو یار تنگ نہ کر..... میرا مطلب ہے تمہارے اور سجاد بیگ کے بھیجے ہوئے دونوں کتے ہماری کسٹڈی میں ہیں۔" میں نے انکشاف کیا۔ وسیم کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔ تاہم وہ خاموشی سے نگہت کے قریب والے صوفے پر براجمان ہو گیا تھا۔

"تم نے بشارت عرف پپو کو خفیہ طور پر مجھے ہلاک کرنے اور یاسر کو مجھے یرغمال بنانے کے لیے روانہ کیا تھا؟" میں نے وسیم کی طرف دیکھ کر تلخ لہجے میں کہا۔

"تم کیا بکواس کر رہے ہو، مجھے کچھ نہیں پتا۔" وسیم نے ڈھٹائی دکھائی تو میرا دماغ بھنا اٹھا۔ مجھے اپنے سامنے تپائی پر جو شے پڑی نظر آئی وہ اٹھا کر اس پر کھینچ ماری۔ وہ گلدان تھا جو سیدھا اس کی تنگ سی نظر آنے والی پیشانی پر جا لگا۔ وہاں سے خون جاری ہو گیا۔ نگہت چیخ پڑی۔ ملازمہ بھی گھٹے گھٹے انداز میں چیخی تھی۔ وسیم کے حلق سے مارے تکلیف کے کراہ خارج ہو گئی۔ اس نے ایک ہاتھ اپنے زخم پر رکھ دیا۔

نگہت اٹھی مگر میں نے ڈپٹ کر اسے بٹھا دیا اور خود اٹھ کر وسیم کی طرف بڑھا۔ اسے گردن سے دبوچ کر کھڑا کر دیا۔ خون اس کی پیشانی سے بہہ کر اس کے قیمتی بزنس سوٹ کو رنگین کر رہا تھا۔

"تم مجھے اچھی طرح جاننے کے باوجود اس طرح کی لغویات کر کے اپنا اور ہمارا وقت ضائع کیوں کرتے ہو؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں ان دونوں کو پولیس اسٹیشن لے چلوں اور پھر تم بھی جیل کی ہوا کھاؤ؟" میں غرایا۔ "اور مت بھولو کہ اس سنگین جرم اقدامِ قتل میں تم نے نگہت کو بھی شامل کر رکھا ہے۔" ایسا میں نے دانستہ نگہت کو بھی سبق دینے کے لیے کہا تھا۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" وہ ہانپتے ہوئے بولا مگر اس کی آواز میں منتقمانہ پن حد درجے موجود تھا۔

"میں تمہیں پہلے بھی وارن کر چکا تھا کہ میرے راستے میں آنے کی کوشش مت کرنا اور اگر دوبارہ میرا تمہارا ایسے حالات میں سامنا ہوا تو میں تمہیں بخشوں گا نہیں..... یوں بھی میری فطرت ہے کہ دشمن کو معاف نہیں کرتا میں۔"

کہتے ہوئے میں نے اپنی جیب سے پستول نکال لیا۔

"مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" کہتے ہوئے میں اس پر پستول تان کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ یکدم نگہت اٹھ کھڑی ہوئی اور میرے اور وسیم کے سامنے آ گئی۔

"ائی شاد شے.....! یارانہ پکا لگتا ہے رے۔" معاً ہی استاد جوجی جو نگہت والے پستول سے صوفے پر بیٹھا بظاہر خاموشی سے کھیل رہا تھا، یکدم اپنے مخصوص لہجے اور امجد خان کے انداز میں بولا۔

"نن..... نہیں..... نہیں سہراب! تم ایسا نہیں کر سکتے۔" نگہت ہراساں ہو گئی۔ وہ پہلے ہی میرا اندازِ بے رحمی دیکھ چکی تھی جبکہ وسیم کا چہرہ کسی بھی خوف یا ڈر سے عاری تھا۔

شاید اسے میرے، نگہت اور اس کی ماں شگفتہ خاتون کے

ساتھ تعلقات پر کچھ طمانیت تھی۔ وہ اپنے باپ راجا تیمور کی طرح مکار تھا کیونکہ کافی حد تک یہ بات درست بھی تھی۔ وہ رذیل میری اس جذباتی کمزوری سے واقف تو تھا ہی۔

"دوسری صورت میں اسے قانون کی سزا بھگتنا ہوگی۔ مدعین دونوں ہماری گرفت میں ہیں۔ کم از کم اس سے کم پر نہیں مانوں گا۔" میں نے زہر خند اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اسے معاف کردو اور مجھے بھی پلیز..... سہراب!" نگہت نے میری منت کی۔ "دیکھو، ہم پہلے ہی سجاد بیگ کی طرف سے کافی پریشانی میں مبتلا ہیں اور پھر..... پھر..... ہم دونوں عنقریب شادی بھی کرنے والے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے یہ سب۔" میں نے کہا۔ "بشارت عرف پپو نے سب کچھ اگل دیا ہے جبکہ تمہاری ماں سے بھی مجھے اس حقیقت کا پتا چل چکا ہے۔ شکر ہے کہ تم نے اپنی ماں کو تو یاد رکھا۔"

میری بات پر اس کے چہرے پر غم اور دکھ کی لکیر سی ابھری۔ اس میں احساسِ ندامت بھی تھا اور پشیمانی بھی۔

میں خاموشی سے پلٹ کر واپس اپنے صوفے پر جا بیٹھا۔ پستول میں نے دوبارہ اپنی شرٹ کے نیچے بیلٹ میں اڑس لیا۔ نگہت کا پستول ہنوز جوجی کے ہاتھ میں کھیل رہا تھا۔ نگہت نے بھی سکون کی سانس لی اور وسیم کے قریب جا بیٹھی۔

وسیم کے چہرے پر بدستور اکھڑ مزاجی اور برہمی کے تاثرات ہویدا تھے۔ شاید اس کے کس بل ابھی نہیں نکلے تھے۔

میں نے وسیم کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے نگہت سے مخاطب ہو کر متانت آمیز نرمی سے کہا۔

"دیکھو نگہت! اس بات کو کبھی میری کمزوری مت سمجھنا کہ تمہاری ماں سے میرے ماں بیٹے والے تعلقات ہیں اور میں بار بار تمہارا لحاظ کر جاؤں گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شگفتہ خاتون کے مجھ پر احسانات ہیں اور وہ تمہارے جانے کے بعد میرے ساتھ ہی رہنے لگی ہیں۔ تم نے اپنی خود غرضی کے تحت خوب اپنی ماں کے احسانات چکائے۔ خیر، یہ تم ماں بیٹی کا معاملہ ہے۔ میں تمہیں یہ بات آخری بار سمجھاؤں گا، اس کے بعد میں بھول جاؤں گا کہ تم کون ہو، کس کی ہونے والی بیوی اور کس کی بیٹی ہو۔ تمہاری بدقسمتی رہی ہے کہ تمہیں باپ بھی ایک کرمنل ملا اور اب شوہر بھی..... سجاد بیگ سے تعلقات یقیناً وسیم نے ہی استوار کرنے کی کوشش کی ہوگی اور یہ اب بھی اسی پر بضد ہوگا کیونکہ خود بھی ایک کرمنل باپ کی اولاد رہ چکا ہے۔ میں اس کی فطرت جانتا ہوں۔ یہ میرے دوسری بار بھی چانس دینے کے باوجود نچلا نہیں بیٹھے گا۔ مجھے قانون کی سازش میں پھنسانے کی ناکامی کے بعد اس نے براہِ راست مجھے پپو اور یاسر کے ذریعے ہلاک کرانے کی کوشش کی۔

یادداشت

شوہر: بیگم! تمہیں یاد ہے، میڈیکل کالج میں ایک لڑکا وارث حمید ہماری کلاس میں پڑھتا تھا، یونین کا صدر بھی تھا، وہی جو تم سے شادی کرنا چاہتا تھا؟

بیوی: ہاں، مجھے یاد ہے۔ یہ تقریباً تیس سال پہلے کی بات ہے۔

شوہر: آج اس سے ملاقات ہوئی۔ وہ تو اتنا موٹا اور گنجا ہو گیا ہے کہ اس نے مجھے پہچانا ہی نہیں۔

احساسِ ذمے داری

پھل فروش کے پاس ایک خاتون قدرے ناراضگی کے عالم میں پہنچیں اور بولیں۔ "کل میں نے تم سے بارہ کینو لیے لیکن گھر جا کر گنے تو دس نکلے۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں۔"

پھل فروش نے اطمینان سے جواب دیا۔ "بیگم صاحبہ! میں نے آپ کے لیے پورے ایک درجن کینو ہی نکالے تھے لیکن جب میں انہیں تھیلی میں ڈالنے لگا تو دیکھا دو بالکل گلے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا آپ گھر جا کر بھی تو پھینکیں گی۔ میں نے آپ کی طرف سے یہیں پھینک دیے تھے۔"

دندان ساز

ایک صاحب جنہیں میٹھی کا مرض لاحق تھا، دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ ان کے ایک دانت میں درد تھا۔ معائنے کے بعد ڈاکٹر بولا۔ "یہ دانت نکالنا ہی پڑے گا۔"

"کیا فیس ہوگی؟" ان صاحب نے دریافت کیا۔

"دو سو روپے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"یہ لیجیے پچاس روپے۔ اسے صرف تھوڑا سا ڈھیلا کر دیجیے۔" ان صاحب نے فرمائش کی۔

پھلجھڑیاں

"نعیس! تمہاری لکھائی کس قدر خراب ہے۔ یہ تم نے تو لکھا ہے؟ بالکل سات معلوم ہو رہا ہے۔"

"یہ سات ہی ہے سر!"

"تو پھر یہ تو کیوں دکھائی دے رہا ہے؟"

(مرسلہ: عامر سعید، ملتان)

pklibrary.com

اب یہ بھی کان کھول کر سن لے، وہ شخص دنیا کا بے وقوف اور احمق ترین آدمی ہوگا جو یہ حقیقت جانتے ہوئے بھی اپنے جانی دشمن کو بار بار کسی رشتے کے حوالے سے معاف کرتا رہے۔ اب محتاط رہنا وسیم!" کہتے ہوئے میں نے آخری جملہ وسیم کی طرف دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔

"یہ میرا اصول نہیں، دشمن کو دوسری بار معاف کروں۔ اگر کر دیا ہے تو اس کی وجہ بھی تم جان ہی چکے ہو مگر تیسری بار مجھے ذرا شبہ بھی ہوا کہ تم پھر میرے راستے میں آنے کی کوشش کر رہے ہو تو مجھے اپنی سگی ماں کی قسم ہے میں تم سے ملاقات یا کوئی بات تک کیے بغیر تمہارا حشر برا کرنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگاؤں گا۔" میں اتنا کہہ کر خاموش ہوا اور پھر نگہت سے دوبارہ مخاطب ہوا۔

"دیکھو نگہت! تمہیں بھی میں آخری بار سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سجاد بیگ سے دور ہو جاؤ۔ اگر وہ پھر بھی تم لوگوں کے گلے پڑ رہا ہے تو پھر مجھے بتانا۔ اس سلسلے میں، میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ بس، میں یہی کہنے کے لیے آیا تھا۔"

"اٹھو جوجی!" میں نے صوفے سے اٹھتے ہوئے آخر میں جوجی کو بھی چلنے کا اشارہ کر دیا۔ اس نے پستول نگہت کی طرف اچھال دیا جو اس نے کیچ کر کے سنبھال لیا۔ جاتے جاتے رک کر میں نے وسیم سے کہا۔

"اپنے حصے کی میری نصیحت یاد رکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ پھر تمہارے پاس کچھ بھی باقی نہ رہے۔"

ہم دونوں باہر آ گئے۔ بائیک پر سوار ہوئے اور روانہ ہو گئے۔

"اس ناہنجار وسیم کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن نگہت تمہاری باتیں غور سے سن رہی تھی اور جب تم نے آخر میں سجاد بیگ والے معاملے کا ذکر چھیڑا تو اس کی آنکھوں میں، میں نے تمہارے لیے ممنون بھرے جذبات محسوس کیے تھے۔"

جوجی کے ٹھکانے پر پہنچ کر اس نے مجھ سے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور کوئی بعید نہیں کہ تمہاری اس بات کے بعد نگہت اور وسیم کے درمیان بھی سجاد بیگ والے معاملے پر بحث ہو۔"

"ایسا ضرور ہوگا۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ میں گیا ہی اسی لیے تھا وہاں کہ یہ بات نگہت کے ذہن میں بھی ڈال دوں۔ اب اگر وسیم واقعی نیک نیت ہوگا کہ سجاد بیگ کا دست راست بننے سے باز رہے تو وہ سب ٹھیک، ورنہ کم از کم اس معاملے میں نگہت اور وسیم کے بیچ ضرور ان بن ہو سکتی ہے اور میں بھی یہی چاہتا ہوں۔"

"ہاں۔" جوجی بولا۔ "تم نے وہ بات بھی نگہت کے سامنے آشکار کر دی کہ وسیم نے پپو کے ذریعے تمہیں خاموشی سے گولی مارنے کا بھی حکم دے رکھا تھا۔"

"میرا مقصد ایک یہ بھی تھا کہ نگہت جان لے، وسیم اپنے کچھ معاملات میں نگہت سے باتیں چھپایا کرتا ہے۔ اب ان دونوں میں اسی معاملے میں گرما گرم بحث ہو رہی ہوگی۔" کہتے ہوئے میں زہریلے انداز میں مسکرایا۔

کبیر منہ لٹکائے ہمارے درمیان بیٹھا تھا۔ دبیر کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اماں اور چنبیلی اوپری منزل میں تھیں۔ ہم تینوں نیچے نشست گاہ میں موجود تھے۔ کبیر کو بتا دیا گیا تھا کہ نگہت اور وسیم کی شادی کے کارڈ چھپ چکے ہیں اور ہفتے بعد ان کی شادی متوقع تھی۔ اسے اب چپ سی لگ گئی تھی۔

☆☆☆

شام سے کچھ دیر پہلے میں بائیک پر نور پور جا رہا تھا۔ بنگو سے تو میں نے حساب چکتا کر لیا تھا اور اب لاکھا اور نظام شاہ رہ گئے تھے جو جگنو کے قاتل تھے۔

بقول روبی کے، نظام شاہ کے ایما پر لاکھے نے جگنو کو یرغمال بنایا تھا اور بیچ گرمائیں والی قاتل کے بارے میں اگلوانے کے لیے اس خبیث نے جگنو پر تشدد کے اس قدر پہاڑ توڑ ڈالے کہ وہ جان سے ہی چلا گیا تھا۔

مجھے یاد ہے جب باؤ چوک پر میں نے ایک ٹھٹھرتی رات جگنو کی لاش دیکھی تھی تو وہیں قسم کھائی تھی کہ اس کے قاتلوں کو عبرت کا نمونہ بنا دوں گا۔

نوید چھجرا کو میں اس کے اپنے ہی زخم چاٹنے پر مجبور کر آیا تھا۔ اب میں راحیلہ کے حق میں یہی دعا کر سکتا تھا کہ خدا کرے اب تو وہ راہِ راست پر آ جائے۔

اب نظام شاہ کی باری تھی اور لاکھا کی۔ نظام شاہ کو ڈنکے کی چوٹ پر جواب دینا اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ آئندہ جگنو کی بہن روبی کی راہ میں آنے کی جرأت نہ کر سکے کیونکہ بیچ گرمائیں کی حق ملکیت والے کاغذات اب روبی کے حوالے کیے جانے والے تھے۔ نوید کے پاس میں نے عدالت میں اسے چیلنج کرنے جوگا بھی نہیں چھوڑا تھا۔ یوں بھی میں سمجھتا تھا کہ رات والے واقعے کے بعد اب اس کے سارے کس بل نکل چکے ہوں گے اور اس نے میرا "پانی" بھی اچھی طرح جانچ لیا ہوگا۔ اب نظام شاہ اور اس کے خاص گرگے لاکھے کا بھی غرور توڑنا لازمی تھا بلکہ یہ تو میری قسم کا حصہ بھی تھا۔

میں سرِ شام نور پور والے فارم ہاؤس پر پہنچ گیا۔ بائیک میں نے دانستہ وہاں سے تھوڑے فاصلے پر گھنی جھاڑیوں میں چھپا کر سائڈ اسٹینڈ پر کھڑی کر دی تھی۔

پیدل ہی میں محتاط روی سے آگے بڑھتا رہا۔ قریب پہنچ کر میں خود رو جھاڑیوں میں دبک گیا اور سامنے فارم کے وسیع

وعریض احاطے کی طرف نظریں جمادیں۔ وہاں ویرانی سی دیکھ کر مجھے کچھ حیرت ہوئی۔ میں سب سے پہلے لاکھے سے حساب چکتا کرنا چاہتا تھا تاکہ نظام شاہ کو سبق مل سکے۔

میں چند لمحے پُرسوچ انداز میں ہونٹ بھینچے رہا۔ اس کے بعد ایک بار پھر گردوپیش پر نظر ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد جھکے جھکے انداز میں سامنے کی جانب بڑھنے کے بجائے قدرے عقب سے آگے بڑھنے لگا۔ فارم کی عمارت کے قریب پہنچ کر مجھے ایک نئی تبدیلی کا احساس ہوا جس نے بے اختیار میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ دوڑادی۔

یہاں اضافی لوہے کی باڑھ کھینچ دی گئی تھی۔ گویا انہیں یقین تھا کہ میں یہاں دوبارہ شب خون مارنے کے لیے آسکتا ہوں۔ یہی خیال ذہن میں آتے ہی یکلخت میرے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔

لاکھے سے میرا دو تین بار سامنا ہو چکا تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ جس قدر سفاک تھا، اسی قدر مکار اور خبیث بھی تھا۔ ایسا نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ موجودہ حالات میں فارم ہاؤس کی عمارت کو ویران یا خالی رہنے دیتا۔ یہ ایک جال بھی ہوسکتا تھا۔ میں ادھر ہی رک گیا۔ دیوار سے چپکا رہا، اندر باہر کن لینے کی کوشش کرتا رہا۔

اچانک نہ جانے میرے ذہن میں کیا آیا کہ میں نے فارم کے اندرونی گوشوں میں جھانکنے کے بجائے اس کے اطراف میں یونہی نظر ڈالنا شروع کردی اور تب ہی میں ایک مچان سی دیکھ کر چونک پڑا۔

اس طرف ایک کھجی کا اونچا پیڑ تھا۔ بظاہر ایسا ہی لگتا تھا جیسے یہ کسی باغبان یا رکھوالے نے اپنے لیے بنایا ہو اور ایسا ممکن بھی تھا۔ وہ ایسی ہی مچان تھی۔ وہاں میری عقابی اور غیر معمولی نظروں نے ایک شخص کو مسلح دیکھ لیا تھا۔ اس کے گلے میں دوربین جھول رہی تھی۔

مزید تصدیق کے لیے کہ کہیں اسے فارم ہاؤس پر نگاہ رکھنے کے لیے تو مامور نہیں کیا گیا تھا، میں چھپ کر دیوار کی آڑ سے اسے تکتا رہا۔ وہی ہوا، اس نے دوربین آنکھوں سے لگائی۔ رخ فارم ہاؤس کی طرف تھا پھر نیچے ہوگیا۔ شاید اس نے وہاں اپنے بیٹھنے کی بھی جگہ بنا رکھی تھی۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ سوچا پہلے جاکر اس کی گردن ناپوں لیکن اس کا کیا فائدہ تھا جبکہ اس کے دیکھے بغیر میری اس پر نگاہ پڑ چکی تھی اور اب میں اس سے بچ سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے پیش قدمی جاری رکھی اور چھپتا چھپاتا ہوا عقبی راستے سے اندر احاطے میں اس طرف سے داخل ہوا کہ مچان نشین "چوکیدار" کی نظروں میں نہ آسکوں۔

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

جولائی کے دلکش شمارے
کی سحر آمیز جولانیاں

اولین سوغات

سچ بولنے کی جرأت رکھنے والے مسافر کی دل دوز مسافت۔ اس کے اطراف سیاست اور غفلت کا راج تھا۔ انتقام کے شعلوں میں گھری داستان

احمد سلیم سلیمی کے قلم سے

سربکف

ماضی کی دھندلی پرچھائیوں کے تعاقب میں دوڑتے بھاگتے کردار کی پُراسرار داستان.....

طاہر جاوید مغل کے قلم سے

دبر

قدم قدم پر بڑھتی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے والے ایک دلیر نوجوان کی کوچہ گردی

حسام بٹ کے قلم سے سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

بدقسمتی سے ایک گھناؤنی سازش کا شکار ہوجانے والے بے گناہ کی بے بسی

عبدالرب بھٹی کی تیکھی کہانی

دوسرا رنگ

موسموں کی طرح رنگ بدلتے دشمن کی سفاک ترین سازشوں کا احوال **زویا صفوان** کے قلم سے

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے ... محبتیں...
شکایتیں... اور نئی دلچسپ باتیں ... کتھائیں

فارم ہاؤس کا مرکزی دروازہ بند تھا لیکن اس پر تالا نہیں دکھائی دیا۔ کیا خبر یہ مچان نشین رات میں ادھر آ کر سوتا ہو لیکن یہاں مستقل طور پر لاکھے کا ٹھکانا تھا۔ وہ کہاں تھا؟ کیا پتا اندر ہو۔ میں گربہ قدمی سے آگے بڑھا اور مرکزی دروازے سے پہلے کان لگا کر اندر کی سن گن لینا چاہی۔ اندر اتھاہ خاموشی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ دروازے کے ایک پٹ پر رکھا اور اسے آہستہ سے اندر کی طرف دھکیلا۔

اندر ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ یہ کسی بلب کی نہ تھی۔ باہر اترتی ملگجی شام کی کرنیں کسی کھڑکی، بلند چھت کے روزن وغیرہ سے اندر در آئی تھیں۔ میں ایک پٹ پورا کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ میں تو یہاں کے چپے چپے سے واقف تھا۔ چاہتا تو سوئچ آن کر کے روشنی کر دیتا لیکن میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے چند ہی منٹوں میں ایک ایک کمرے کی تلاشی لے ڈالی۔ فارم ہاؤس خالی تھا۔ مجھے پریشان کن سی حیرت ہوئی۔ لاکھا کہاں تھا اور لوگ کدھر تھے؟ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ فارم ہاؤس پورا ہی خالی پڑا تھا۔

میں اب ہال نما اس گوشے میں جو ایک بڑی نشست گاہ بھی تھی، کھڑا سوچتا رہ گیا کہ اچانک فون کی بیل گنگنائی۔ فون قریب ہی ایک اسٹینڈ پر دھرا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

فون کی گھنٹی کی آواز یقیناً اس مچان نشین تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ تیسری بار بیل ہوئی تو میں نے جا کر ریسیور اٹھا لیا اور آواز بدل کر "ہیلو" کہا۔

دوسری جانب ایک بے رحمانہ اور سنگ دلی کا تاثر دیتی ہوئی شناسا آواز ابھری۔

"کون ہو تم.....؟ یہاں داخل ہونے کی کیسے جرأت کی تم نے..... سونہڑاں کدھر ہے؟"

یہ لاکھا تھا۔ وہی لاکھا جس بدذات اور خونی نے میرے یار جگنو کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس پر اس قدر تشدد کیا تھا کہ وہ بیچارہ جان سے ہی چلا گیا تھا۔ بے شک ایسا اس نے نظام شاہ کے کہنے پر ہی بہیمانہ اور بزدلانہ ظلم کیا تھا۔ حالانکہ نظام شاہ جانتا بھی تھا کہ جگنو اس کے اپنے ہی چھوٹے بھائی دلاور شاہ کا خاص آدمی تھا لیکن نظام شاہ کے سر پر صرف پنج گرائیں کی جاگیر کی ملکیت کی فائل سوار تھی اور جس سے بیچارے جگنو کو کبھی دلچسپی بھی نہیں رہی تھی۔

"وہ..... وہ جی..... مم..... میں..... جانو ہوں۔ جان محمد..... سونہڑے کا دوست۔" میں نے لہجے میں دانستہ خوف طاری کرتے ہوئے جواب میں کہا اور جان گیا تھا کہ سونہڑاں وہی مچان نشین شخص ہی ہو سکتا تھا۔ ایک جوا ہی تھا جس کی چال کامیاب گئی۔ وہ اسی کا پوچھ رہا تھا۔ اپنی بات میں سچ کا وزن ڈالنے کے لیے میں نے مزید کہا۔

"ہم دونوں جی، کبھی پر ہی بیٹھے تھے۔ میں یہاں چکر لگانے آیا تھا۔ آ..... آپ وڈے چودھری صاحب (نظام شاہ) تو نہیں؟ کیا سونہڑے کو بلا لاؤں؟"

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" دوسری جانب سے لاکھے نے مجھے جھڑکا۔ "اس رذیل کی ہمت کیسے ہوئی کہ کبھی پر اپنا کوئی دوست بٹھانے اور اسے یہاں فارم ہاؤس کے اندر بھیجنے کی۔ اسے فوراً بلا کر لاؤ اور خبردار..... فون اب مت رکھنا۔ صرف ریسیور ایک طرف ڈال دو..... میں فون پر ہی موجود رہوں گا جب تک سونہڑا خود نہیں آ جاتا..... سمجھے۔"

"مس..... سمجھ گیا جی..... سمجھ گیا۔" میں اس کی مکاری پر اندر ہی اندر کھول کر رہ گیا۔ میں نے اس کی ہدایت کے مطابق ریسیور رکھ دیا۔ وہ شاید یہاں کی ہونے والی کسی بھی قسم کی کھڑبڑ سے کوئی اندازہ قائم کرنے کی سوچے ہوئے تھا اور اس کی اس محتاط اندازی اور ہوشیاری پر مجھے بھی اس بدذات کا معترف ہونا پڑا۔

تاہم میں نے ریسیور کا رخ دیوار کی طرف کر کے اسٹینڈ پر ہی جھلا دیا تاکہ دروازے کی طرف ہونے والی کھڑکھڑاہٹ اسے کم سے کم ہی سنائی دے۔

اب میں سوچ میں پڑ گیا کیا کروں؟ کوئی بہانہ بنانا ضروری تھا۔ یہ پتا لگانا بھی کہ لاکھا آخر کہاں سے بول رہا تھا لیکن یہ بھی مشکل تھا۔ حقیقت تو یہی تھی کہ میں اس اچانک صورت حال پر تھوڑا الجھن آمیز پریشانی کا بھی شکار ہو گیا تھا۔ یوں میرا ذہن تیزی سے سوچنے لگا۔

یوں بھی مجھے خاصی دیر بیت چلی تھی اور شام، رات میں ڈھلنے لگی تھی کہ معاً ہی باہر سناٹے میں مجھے کسی کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ میں چونکا اور لپک کر کھڑکی کے قریب آ گیا جدھر سے باہر اور احاطے تک دیکھا جا سکتا تھا۔

وہی مچان نشین چوکیدار گلے میں دوربین جھلائے ہاتھ میں لکڑ سا پکڑے مرکزی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ ایک ٹھگنے قد و قامت کا آدمی تھا۔

میرے لیے یہ ایک اور خطرناک اور عجیب صورت حال پیدا ہو گئی لیکن فوراً ہی میرے تیزی سے سوچتے دماغ میں ایک ترکیب ابھری مگر اس میں پھرتی اور ہوشیاری دکھانے کی ضرورت تھی۔ میرا ارادہ اس کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی اسے چھاپ لینے کا تھا ورنہ اندر ہونے والی کھڑبڑاہٹ سے جھولتے ہوئے ریسیور تک یہ سب آوازیں پہنچ جاتیں اور دوسری جانب ریسیور کان سے لگائے ہوئے مکار لاکھے کو یہاں کے حالات کا اندازہ ہو جاتا جبکہ میں اسے "بلف" کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔

pklibrary.com

یوں میں نے بڑی تیزی سے حرکت کی اور دروازے سے نکلتے ہی اس پر جا پڑا۔

اسے دھکا لگا، دوربین گلے سے ٹوٹ کر گر پڑی۔ میں نے ایک ہاتھ کا شکنجہ اس کی گردن کے گرد اور دوسرا سینے کے گرد لپیٹ لیا۔ وہ حلق سے پھنسی پھنسی سی آوازیں خارج کرنے لگا۔ میں نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں اس سے کہا۔

"خبردار! اگر تم نے اب زیادہ مچلنے کی کوشش کی تو میں تمہاری گردن ایک جھٹکے سے توڑ ڈالوں گا۔"

میری دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ اس نے اپنے ہاتھ پیر چھوڑ دیے۔ اسے ڈھیلا پڑتے دیکھ کر میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کی جامہ تلاشی لی۔ ایک بھرا ہوا پستول اس کی ڈب سے برآمد ہوا۔ اس نے کرتہ اور لنگی باندھ رکھی تھی۔

اس کے بعد میں نے اسے پرے دھکا دیا اور پستول اس پر تان کر تحکمانہ درشتی سے بولا۔

"سونہڑا! تمہارا ہی نام ہے نا؟"

"لل..... لیکن تم کون ہو؟" وہ اٹکتے ہوئے لہجے میں بولا۔ اس نے اور نہ میں نے کبھی ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ یوں ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔

"یہ بات تمہارے لیے اہم نہیں اور دوسرا تمہیں سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس حکم کو اب اپنے ذہن میں رکھنا۔" میں نے درشتی سے تحکمانہ کہا۔ "تم صرف میرے سوال کا جواب دو گے۔"

وہ چپ ہو رہا۔ وہ مکر کر رہا تھا۔ جس خطرے کے پیش نظر اسے یہاں بھی والی مچان پر مقرر کیا گیا تھا ایسا ہو نہیں سکتا تھا کہ اسے اب تک میرے بارے میں "اندازہ" نہ ہوا ہو۔

"لاکھے کا فون ہولڈ پر ہے۔ وہ تمہارا پوچھ رہا تھا، اسے مطمئن کرو اور یاد رکھنا، تم ادھر ہی ہو اور لاکھا دور..... اگر تم نے فون پر میرے بارے میں بتایا تو اسی وقت تمہیں گولی مار دوں گا۔ میرے بارے میں یہی بتانا کہ تمہارا دوست ہوں جانو..... جان محمد..... جلو اب۔"

میں اسے اندر لے آیا۔ ریسیور جھول رہا تھا۔ سونہڑے نے ہونٹ بھینچ لیے۔ ڈبی ڈبی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے ریسیور اٹھا کر اپنے کان سے لگا لیا۔ میں چند قدموں کے فاصلے پر اسی کا پستول اس پر تانے کھڑا رہا۔

"ہہ..... ہیلو لاکھا صاحب!" اس نے ہانپتی ہوئی سی آواز میں کہا۔ میری تیز نظریں اس کے چہرے پر جمی رہیں۔

"وہ..... وہ جی لاکھا صاحب..... ! جج..... جانو میرا دوست ہے، اکیلا..... میں بور ہو رہا تھا..... نن..... نہیں، وہ قابل اعتبار ہے، پڑا گرائیں ہی ہے (اپنے گاؤں کا ہی ہے)۔"

سونہڑے کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ دوسری جانب سے لاکھا اسے خوب جھاڑ پلا رہا تھا۔ اس کا چہرہ لرز رہا تھا اور خفت تلے سرخ ہوتا رہا جس سے مجھے بھی اچھی طرح اندازہ ہوا کہ لاکھے کو ابھی یہاں مجھ پر شبہ نہیں ہو سکا ہے۔

"وہ، منیرا جی، اس کا بچہ بیمار پڑ گیا تھا۔ گھر سے بلاوا آ گیا تھا اس کا..... اسی لیے میں اکیلا رہ گیا تھا۔" وہ بولنے لگا پھر دوسری جانب سے خاصی دیر تک لاکھے کی ہدایت سنتا رہا اور سر ہلا کر "جی، جی..... لاکھا صاحب! سمجھ گیا، اچھی طرح سمجھ گیا" کہتا رہا۔

اس کے بعد اس نے فون رکھ دیا۔ میں آگے بڑھا اور اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور خود بھی اس کے سامنے والی نشست پر براجمان ہو گیا۔

"کیا کہہ رہا تھا لاکھا؟" میں نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ جواب میں اس نے میری طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے جھوٹ بولنے کی کوشش میں ہو۔

"وہ..... کچھ خاص نہیں، بس یہی کہہ رہا تھا کہ یہاں کے کیا حالات ہیں اور....." کہتے کہتے وہ رکا اور الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔ "کیا تم سہراب خان ہو؟"

اس کی دلیری پر میں لمحہ بھر کو چونکا۔ دل تو کیا جواب سخت دوں مگر طنزیہ کاٹ سے بولا۔

"تم زیادہ سیانا بننے کی کوشش مت کرو سونہڑا! اتنا تو اندازہ تمہیں اب تک ہو ہی جانا چاہیے تھا کہ تمہیں کس لیے کچی والی مچان پر پہرے کے لیے لگایا گیا تھا اور اب تمہارے سر پر موت بنا کون حاوی ہو چکا ہے۔" میری بات پر وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

"کیا منیرا نامی آدمی بھی تمہارے ساتھ تھا اور کیا واقعی وہ اپنے گھر چلا گیا ہے جیسا کہ تم نے لاکھے مردود کو بتایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں لیکن یہ ایک بہانہ تھا۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔" سونہڑا بولا۔ یکلخت مجھے اس کے لہجے سے چالاکی کی بو آتی محسوس ہوئی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اب وہ کافی سنبھل چکا تھا اور یقیناً لاکھے کی طرف سے اسے کچھ ایسا کہا گیا تھا کہ اسے کسی بات کی تسلی ہو چلی تھی۔

"لاکھا کیا کہہ رہا تھا، وہ خود اس وقت کہاں ہے اور یہاں کب آتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا کچھ پتا نہیں ہوتا، وہ کہاں ہوتا ہے اور کب یہاں آتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"یاد رکھنا، مجھے تو تم جان ہی چکے ہو اور لاکھا کا کتا ہونے کے سبب تمہیں یہ بھی اندازہ ہو چکا ہوگا کہ میں کون ہوں اور کیا

ہوں۔ اسی لیے تمہارا جھوٹ چھپ نہیں سکے گا اور یہاں کچھ بھی میری توقع کے خلاف ہوا تو میں سب سے پہلے تمہارے سینے میں گولی اتاروں گا پھر دوسرے کسی سے نمٹوں گا۔"

میرے لہجے کی قطعیت اور بے رحمی پر لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر خوف کی جھلک ابھری۔ وہ یکلخت بے چین دکھائی دینے لگا، یوں جیسے ابھی کچھ ہونے والا ہو۔ میری دھمکی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ وہ یکدم ہاتھ جوڑ کر گھگیانے کے انداز میں بولا۔

"ہم تو جی حکم کے غلام ہیں۔ کیا کریں، ابھی آپ کے غلام ہیں۔ ہمارا کیا قصور؟"

"زیادہ مکاری مت کرو میرے ساتھ۔" میں نے اسے گھرکا۔ "تمہاری زندگی کی ذمے داری تم پر ہے۔ بہتر یہی ہے کہ میرے سامنے سچ اگل دو۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ لاکھے نے تمہیں فون پر اپنے آنے یا کسی اور کے یہاں پہنچنے کے بارے میں مطلع نہ کیا ہو۔"

"میری بات کا یقین کریں جی۔ اس نے ایسا کچھ نہیں کہا۔" وہ بولا۔ "ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ منیرا ابھی آجائے۔"

"لیکن تم نے تو لاکھے کو یہی بتایا تھا اس کے بارے میں کہ وہ گھر گیا ہے، اس کا بچہ بیمار ہے؟"

"صحیح کہا تھا جی..... لیکن وہ مجھے یہ کہہ کر گیا تھا کہ حکیم سے دوا دلا کر وہ جلد لوٹنے کی کوشش کرے گا۔"

"ٹھیک ہے، پھر میں ادھر ہی بیٹھا رہتا ہوں لیکن اگر لاکھا یہاں پہنچا تو سب سے پہلے تمہارے سینے میں گولی اتار کر اس سے نمٹوں گا۔" کہتے ہوئے میں نے پستول کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔

"کیونکہ اس وقت میرے پاس زیادہ وقت نہ ہوگا کہ میں تمہیں سنبھالتا پھروں۔" میرے لہجے میں سفاکی تھی۔ میں نے اپنی تہدید کا ردِعمل دیکھنے کے لیے دزدیدہ نظروں سے اس کے چہرے کا بھی جائزہ لیا۔ وہاں مجھے پھر وہی بے چینی کے آثار نمودار ہوتے محسوس ہوئے مگر میں لاتعلق سا ہو کر بیٹھ رہا۔

"وہ..... وہ..... لاکھا اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں پہنچنے والا ہے۔" دفعتاً ہی اس نے اگل دیا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر کھنچ گئی۔ زہر خند نظروں سے اس کی طرف گھور کر بولا۔

"کیا اسے میری یہاں موجودگی کا شک ہو چکا ہے..... کیسے؟"

"آپ لاکھے کو نہیں جانتے۔ بلا کا ذہین اور مکار آدمی ہے وہ۔" سونہڑا بتانے لگا۔ "جب آپ نے فون پر اس سے بات کی تھی تو وہ اسی وقت ہی چونک گیا تھا اور جان بوجھ کر سونہڑے کا نام لے کر چالاکی سے آپ ہی کے منہ سے اگلوا لیا تھا کہ آپ اس کے ساتھ جھوٹ بول رہے ہو کیونکہ میں سونہڑا نہیں، منیرا ہوں۔"

میری بھویں تن گئیں۔ "کیا..... تو پھر یہ سونہڑا کون ہے؟"

"سونہڑا اور لاکھا بچپن کے دوست ہیں جی۔ اب تو وہ لاکھے کا بہنوئی بھی بن چکا ہے۔ وہ ہر وقت لاکھے کے ساتھ ہی رہتا ہے اور اس وقت بھی وہ اسی کے ساتھ ہی ہے۔" سونہڑے یعنی منیرے نے بتایا۔

میں ہونٹ بھینچے چند لمحے کے لیے چپ ہو رہا۔ شبہ تو لاکھے کی طرف سے مجھے بھی ہوا تھا کہ فون پر اپنے آدمی کے بجائے کسی اجنبی کی آواز پر ضرور اندر سے کھٹکا ہوگا۔ تاہم ایک جوا تھا، چل جاتا تو ٹھیک ورنہ میں تو ادھر تھا ہی۔ جو ہوتا دیکھ لیتا۔ جیسا کہ ابھی ہونے والا تھا۔

صرف چند منٹ سوچنے کے بعد میں نے منیرے کو حکم دیا کہ وہ غسل خانے میں بند ہو جائے، اب یہی اس کے لیے بہتر ہوگا۔

"مجھے جانے دیں جی، آپ کی مہربانی ہوگی۔" وہ میری منت کرنے لگا۔ میں اس پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ہی مجھے غلط راہ پر لگایا تھا اور سچ بتانے سے بھی گریزاں تھا۔ یہ تو میری دھمکی تھی جو ایک طرح سے حقیقت پر مبنی تھی، اس سے ڈر کر اس نے یہ سب مجھے بتا دیا تھا ورنہ پہلے یہ بھی مجھ سے چالاکی سے ہی کام لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بکواس بند کرو اپنی۔ جو میں کہتا ہوں، وہی کرو۔" میں گرجا پھر اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بھی اس پر پستول تانے اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور اسے غسل خانے کا راستہ دکھایا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی میں نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

سوچا تو پہلے میں نے یہ تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دوں لیکن اب شاید اتنا وقت نہ رہا تھا کیونکہ مردود لاکھا اپنے مسلح ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہو چکا تھا۔ اس میں وقت ضائع ہو جاتا۔ یوں بھی نہتا منیرا اب کیا کر سکتا تھا۔

اسے اندر بند کر کے میں پھر ہال کے وسط میں آن کھڑا ہوا۔ سوچنے لگا، لاکھے کی آمد آندھی طوفان کی طرح ہوگی یا پھر..... مکار لومڑ کی طرح۔ یہ دیکھنے کے لیے میں نے اس کھڑکی کی طرف کھڑے ہونے کا ارادہ کیا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔

لاکھے کو بہرحال میری یہاں موجودگی کا علم ہو چکا تھا اور وہ اپنے ساتھیوں سمیت پوری طرح کیل کانٹوں سے لیس ہو کر ہی آن دھمکے گا۔ لہٰذا یہ دانشمندی نہ تھی کہ میں فارم ہاؤس کے اندر ہی محض کھڑکی سے ان کی ہنگامہ خیز آمد کا منتظر رہتا۔ یہ فارم ہاؤس میرے لیے چوہے دان بھی بن سکتا تھا۔

میں جلدی سے زینے طے کرتا ہوا اوپر چھت پر جا پہنچا۔

میرے پاس اب دو پستول تھے۔ فاضل راؤنڈ نہیں تھے۔ ایک پستول میرا تھا اور دوسرا منیرے سے چھینا ہوا۔

میں چھت پر آ گیا۔ رات ہو چکی تھی، آسمان صاف تھا اور تارے چمک رہے تھے۔ چہار اطراف گہری خاموشی میں دور کہیں کسی جانور کی ابھرتی آواز عجیب تاثر دیتی محسوس ہوتی۔

مجھے چھت پر گھات لگائے کافی دیر ہو گئی۔ میں الجھنے لگا۔ میرے اندازے کے مطابق اب تک لاکھے کو آ جانا چاہیے تھا۔ الجھن مجھے اس بات پر تھی کہ کہیں وہ مکاری سے میرے گرد کوئی جال تو نہیں بچھانے کی خفیہ تگ و دو میں ہو۔ سفاک اور بے رحم تو وہ تھا ہی لیکن اس کے اندر مکاری اور بلا کی چالاکی بھی تھی جو ایسے وحشی انسان کو اور خطرناک بنا دیتی ہے۔

جب مزید اور دیر ہو چلی تو میں نیچے اتر آیا۔ فارم ہاؤس کی عمارت پر ہُو کا عالم طاری تھا۔ اطراف میں گھور تاریکی اور ویران سناٹا۔ ایسے میں لاکھے جیسے خطرناک آدمی کی اپنے جنگجو اور مسلح ساتھیوں کے ہمراہ متوقع آمد میرے رگ و پے میں جوش کا ایک طوفان سا ابھارے ہوئے تھی۔

دفعتاً ہی میں ایک آواز پر چونکا۔ یہ کسی گاڑی کی آواز تھی۔ یکلخت میرے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ میں الٹے قدموں پلٹا اور عمارت کے اندر داخل ہو گیا۔ کھڑکی کی طرف لپکا اور باہر تاکنے لگا۔

فارم ہاؤس کے احاطے کی طرف آنے والے ناپختہ پل کھاتے راستے پر میں نے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکتی دیکھیں۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ لاکھا پہنچ گیا تھا شاید۔ میرے اندر ابھرا۔ چند ہی لمحوں بعد ایک کار نظر آئی۔ وہ سیدھی احاطے میں داخل ہوئی۔ میں نے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ کار رکی اور جب اس کے اندر سے صرف تین افراد برآمد ہوئے تو مجھے شدید اچنبھا ہوا۔

اگرچہ ان دو آدمیوں میں تیسرا آدمی لاکھا ہی تھا لیکن اس کے ہمراہ صرف دو آدمی..... اور وہ بھی اُن کے انداز و اطوار سے لگتا ہی نہ تھا کہ انہیں میرے بارے میں یہاں پتا بھی ہو پھر یہ اندازِ طمانیت اور بے نیازی کیا معنی رکھتا تھا؟

میں تو یہ توقع کیے ہوئے تھا کہ لاکھے کو میری یہاں موجودگی کا علم ہو چکا ہے اور اب وہ مجھے ہلاک کرنے کے لیے آندھی طوفان کی طرح اپنے کئی مسلح ساتھیوں کے ساتھ یہاں پہنچنے والا ہے لیکن یہاں تو صرف دو آدمی تھے اور وہ بھی بظاہر غیر مسلح..... پھر ان کا انداز بھی ایسا ہی تھا جیسے یہاں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

ایک خیال بجلی کی طرح میرے اندر کوندا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں منیرے نے ہی مجھ سے جھوٹ بولا ہو لیکن میرے حلق سے یہ بات نہیں اتر رہی تھی یا پھر لاکھا یوں "بے خبری" کا مظاہرہ کر کے مجھے "بلف" کرنے کی کوشش تو نہیں کر رہا تھا۔ وہ بلا کا مکار تو تھا ہی۔

اس وقت بھی وہ اپنے مخصوص اسٹائل اور لباس میں تھا۔ یعنی کسرتی جسم پر کھلا ڈلا اور سنہری کڑھائی والا شلوار کرتہ..... بائیں آنکھ پر بھوؤں کے بیچ کالا مسا جو اس کے خاکستری رنگت والے چہرے کو اور کریہہ اور بھیانک بنائے ہوئے تھا۔

وہ گینڈے کی طرح جھومتا جھامتا ہوا داخلی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تاہم اس کے بغلی ہولسٹر پر پستول کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے اندر آ کر ایک صوفے پر ہاتھ پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ساتھی کھڑے رہے۔

ظاہر ہے میں تب تک کھڑکی سے ہٹ کر ایک طرف قریبی اور تاریک گوشے میں گھات لگا کر بیٹھ چکا تھا۔ پستول ہنوز میرے ہاتھ میں ہی دبا ہوا تھا۔ لاکھا میرے لیے یوں آسان شکار بن رہا تھا، سچی بات تھی کہ مجھے یقین نہ آتا تھا لیکن ایسا بھی تھا کہ جانے کیوں میرے اندر ابھی تک یہی تکرار ہو رہی تھی..... "کچھ ایسا تھا جو میں نہیں جانتا تھا۔"

"اوئے کھابے! جا اندر سے بوتل نکال کر لا۔" معاً ہی لاکھے کی کھرکھراتی آواز ابھری۔ دو میں سے اپنے ایک ساتھی کو اس نے تحکمانہ کہا۔ دوسرا اسی کے اشارے پر اس کے سامنے والی نشست پر براجمان ہو گیا۔ ذرا ہی دیر میں کھابا نامی شخص ایک بوتل اور دو گلاس لے آیا۔ بوتل ولایتی شراب کی تھی اور اسی نے ہی ایک گلاس میں شراب انڈیلی، دوسرے ہاتھ میں برف کا باؤل تھا، اس میں ٹکڑیاں تھیں۔ ہاتھ سے ہی اس نے چند ٹکڑیاں باؤل سے نکال کر گلاس میں ڈال کر لاکھے کو تھما دیں۔

یہ تینوں حیرت انگیز طور پر خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ کھابا گلاس "تیار" کرنے کے بعد یوں کھڑا ہو گیا جیسے ابھی لاکھا اسے دوسرا حکم بھی دینے والا ہو اور یہی ہوا۔

"منیرے کو تلاش کرو۔ شاید غسل خانے میں اسے سہراب نے بند کر رکھا ہو۔" لاکھے نے گلاس سے ایک گھونٹ بھر کر کہا تو میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ رگ و پے میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ لاکھا یہ کیا پراسرار چکر چلا رہا تھا؟ میرے اندر سرسراتے ہوئے ابھرا۔ ابھی میں سامنے آ کر ہلّا بولنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک اس بدبخت نے جیسے میری سماعتوں میں ایک اور دھماکا کیا۔

"سہراب.....! تم جہاں بھی چھپے بیٹھے ہو، اب بہتر ہوگا کہ سامنے آ جاؤ۔ مجھے معلوم ہے تم اِدھر ہی کہیں موجود ہو۔"

یکلخت میرا اندر جیسے برفاب ہوگیا۔ دھڑکتا دل رکتا محسوس ہونے لگا۔ اعصاب جو کچھ دیر پہلے تنے ہوئے تھے، یکایک شل ہونے لگے۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ میری زندگی کا یہ ایک عجیب ہی دشمن تھا۔

میں ایک گہری سانس لے کر سامنے آگیا۔ پستول میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ کھابے اور اس کے ساتھی نے سر گھما کر مجھ پر نظر ڈالی اور پھر لاکھے کو تکنے لگے۔ یوں جیسے انہیں پہلے ہی سے کوئی ''سبق'' رٹا دیا گیا ہو۔

لاکھا صوفے پر اسی طرح اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں گلاس دبا ہوا تھا جس کا دوسرا گھونٹ اس نے تب بھرا جب میں اس کے سامنے آچکا تھا۔ مجھے پستول بدست دیکھ کر بھی اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہ آیا تھا اور نہ ہی اس کے چہرے پر ایک ذرا ڈر یا خوف کا کوئی شائبہ تک ابھرا تھا۔ یہی حال اس کے ساجے کھابے دونوں ساتھیوں کا بھی تھا۔

''اس کھلونے کو جیب میں رکھ کر ادھر بیٹھ جاؤ اور مجھے بتاؤ کہ یہاں کیا کرنے آئے تھے؟'' اس نے میری طرف دیکھا تو مجھے اس کے بدرو چہرے پر ایک گھمنڈ اور آنکھوں سے شعلے چمکتے محسوس ہوئے۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے دائیں طرف والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ مجھے اس کا یہ اعتماد انتہائی متحیر کر گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ میرے اندر سو وسوسے نامعلوم اندیشوں کی بجلیاں کڑکڑاتے دھڑکنے لگے تھے۔ میں اس کے اس انداز سے مرعوب ہونے کے قریب تھا کہ میں نے بھی وہی انداز بے اعتنائی اختیار کرتے ہوئے اس سے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''تم نے جگنو پر بے رحمانہ تشدد کر کے اسے مار ڈالا تھا اور میں تم سے اس کا حساب چکتا کرنے آیا ہوں۔''

''وہ ہمارا ذاتی معاملہ تھا۔'' وہ بڑی ڈھٹائی سے بولا۔ گلاس سے اس نے تیسرا گھونٹ بھرا۔ اس کے اعتراف نما جواب سے میرے سینے میں انتقام کی بھڑکتی آگ سوا ہونے لگی۔ اسی لہجے میں بولا۔

''تو پھر میرا بھی یہ ذاتی معاملہ ہی ہوگا کہ میں آج اپنے جگری یار جگنو کے قتل کا بدلہ اسی طرح لوں جس طرح تم نے اسے ہلاک کیا تھا۔''

''شاوا.....!'' وہ حقارت اور تضحیک آمیز انداز میں ہنسی کا ٹھکا مار کر بولا۔ گلاس اس نے تپائی پر رکھا اور میری جانب تیز اور بے رحمانہ نظروں سے گھور کر بولا تو مجھے اس کی آواز بھیڑیے سے مشابہ لگی۔

''جانتے ہو تم کن لوگوں سے ٹکر لینے کی کوشش کر رہے ہو؟ نظام شاہ اور..... لاکھا سے۔''

''یہ دونوں میرے لیے ان دشمنوں سے زیادہ حیثیت واہمیت نہیں رکھتے جنہیں میں کتے کی موت مار چکا ہوں اور ان کا بھی یہی دعویٰ رہا تھا۔'' میں نے بھی اسی انداز میں اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

تب ہی یکلخت لاکھے کی بھیڑیے جیسی چھوٹی چھوٹی اور گول سی آنکھوں میں خونخواری کی چمک ابھری اور پھر معدوم بھی ہوگئی۔ اس نے ایک بدمست قہقہہ لگایا۔

''بدقسمتی یہ ہے سہراب کہ یہاں معاملہ اب اس کے الٹ ہونے والا ہے کیونکہ اب تھوڑی دیر بعد تم کتے کی موت مرنے والے ہو، جس طرح جگنو کا حشر ہوا تھا۔''

میرے یار جگنو کا اس خبیث آدمی نے اس طرح ذکر کر کے میرے اندر کے خوابیدہ آتش فشاں کو جیسے یکدم بھڑکا کر رکھ دیا اور پھر میں اپنے آپے میں نہ رہ سکا اور یکایک میرا پورا وجود جیسے بجلی بن گیا اور اگلے ہی لمحے میں لاکھے جیسے خبیث آدمی کو دبوچ چکا تھا۔ اس کی گردن میرے ایک ہاتھ کے شکنجے میں تھی مگر یہ کیا..... اس کے سامنے بیٹھے ساجے کھابے دونوں ساتھیوں نے ایک ذرا چون وچرا تک نہ کی۔

''اتنی جلدی کیا ہے۔'' لاکھا اطمینان سے بولا۔ گردن دبنے کی وجہ سے اس کی آواز دبی دبی سی برآمد ہوئی۔ ''ابھی ایک اور گاڑی پہنچنے والی ہے مگر تمہاری بدقسمتی یہ ہے کہ اس کے اندر تمہاری محبوب بیوی فوزیہ موجود ہے اور اس کے ہمراہ میرا آدمی..... بس فرق یہ ہے کہ میرا آدمی ذرا خطرناک ہے۔''

اس کی بات سنتے ہی جیسے میرے اندر کا سارا آتش غیظ، جوش اور غضب جیسے ہوا ہونے لگا۔ اول تو مجھے اپنی سماعتوں پر شبہ سا ہوا کہ میں نے غلط سنا ہے لیکن ان مردود لاکھے نے بھی جیسے میری کیفیت کا اندازہ میرے مضبوط ہاتھوں کے شکنجے کی یکایک ڈھیلی پڑتی گرفت سے لگا لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے بکنا بند نہیں کیا۔

''لیکن..... مجھے ڈر ہے کہ اگر اس کمینے نے تمہارے ہاتھوں مجھے جکڑا دیکھ لیا تو وہ کوئی لمحہ بھی ضائع کیے بغیر تمہاری محبوب بیوی کے سر میں گولی اتار دے گا اور وہ اکیلا بھی نہیں ہے۔ اس کے ہمراہ کم از کم چھ، سات افراد ہیں جو سب کے سب کن بردار بھی ہیں۔''

میں اس کی گردن چھوڑ کر ایک دم یوں پرے ہٹ گیا جیسے مجھے لاکھے مردود کے وجود سے بجلی کا زبردست شاک لگا ہو اور حقیقت بھی کچھ ایسی ہی تو تھی۔ اس نے بات ہی ایسی کی تھی جو

میرے لیے شاک سے کم نہ تھی۔

"ی ی..... یہ کیا بکواس کر رہا ہے تُو..... لاکھے.....! جانتا ہے کیا کہہ رہا ہے تو؟" میں نے اس قدر حلق پر زور دے کر غراہٹ تلے کہا کہ میری آواز ہی پھٹ گئی۔ میری پھیلی ہوئی آنکھوں میں سیاہ آندھیاں اُمڈ رہی تھیں اور میں اسی نظروں سے اسے مسلسل گھورتا رہا۔

"بہت اچھی طرح جان رہا ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، جو قطعاً بھی جھوٹ نہیں ہے۔" وہ بھی مجھے زہریلی نظروں سے گھورتے ہوئے سرسراتے لہجے میں بولا۔ میں نے نفرت انگیزی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور دوبارہ چاہتا تھا کہ اس کی جانب لپکوں۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے میرے اور اس کے آگے آکر راستہ روک لیا۔ اگرچہ اب بھی ان دونوں نے پستول نہیں نکالے تھے البتہ لاکھا اپنے ہولسٹر سے بھیانک نال والا ریوالور نکال چکا تھا۔

"بس، اب اس کھلونے کو میری طرف اچھال دو اور خاموشی سے آنے والے اس سنگین وقت کا انتظار کرو جو تمہارے جوش کے سبب مزید سنگینی اختیار کر سکتا ہے۔" اس نے جیسے آخر میں حظ اٹھاتے ہوئے دوبارہ مجھ سے کہا۔

میری کنپٹیاں سلگ اٹھی تھیں۔ اندر سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ اس مردود کا اب تک کا اعتماد، بے نیازی اور بے خوفی کا راز کھل چکا تھا جو مجھ پر یہ زہریلی حقیقت عیاں کرنے کے لیے کافی تھا کہ اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے فوزیہ کے متعلق جو بکواس کی تھی، اس کی خود ہی تصدیق بھی ہو رہی تھی۔ میرے لیے اپنی دردوں وجدوں کیفیات پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ دماغ میں ہنوز آندھیاں چل رہی تھیں اور وجود کا رُواں رُواں جوشِ غیظ تلے لرزاں تھا۔ جی چاہا کہ اس رذیل پر پل پڑوں لیکن اگر اس کی بات سچ تھی تو اس طرح فوزیہ کی جان کو خطرہ ہو سکتا تھا۔ جبکہ میں فوزیہ کا بال بھی بیکا ہوتا دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے کہ اس کے دامنِ ممتا میں میرے گلشن کا، میری محبت کا ایک نو دمیدہ پھول کھل رہا تھا۔

لیکن باوجود اس کے میں نچلا نہ ہوا۔ اسی لہجے میں غراہٹ تلے بولا۔ "لاکھے! تمہاری دشمنی میرے ساتھ ہے۔ یہ بزدلانہ حرکت تمہیں زیب نہیں دیتی۔ میں تو تمہارا یہ جرم بھی معاف نہیں کروں گا کہ تم نے ایسی گھٹیا حرکت کی ہے۔ بہتر ہوگا کہ فوزیہ کو میں ادھر تیرے کسی آدمی کے ساتھ نہیں دیکھوں ورنہ....."

"ہاہاہا..... ہاہاہا۔" اس کے شیطانی قہقہے نے میری بات درمیان میں ہی کاٹ ڈالی اور مجھے ایک چپ لگ گئی مگر اس چپ میں ہزاروں آتش فشاؤں کا لاوا ابلتا ضرور جھلکتا تھا۔

"ابھی یہ گیدڑ بھبکیاں چھوڑو اور وقت کا انتظار کرو کیونکہ....." یوں اس کی بھی بات درمیان میں ہی رہ گئی کیونکہ اسی وقت شاید اندر غسل خانے میں مقید منیرے کے کانوں میں اس کے قہقہے یا ہونے والی گفتگو کی آواز پڑی تھی کہ اس نے غسل خانے کا دروازہ زور سے دھڑ دھڑانا شروع کر دیا۔

صوفے پر ہاتھ پیر پھیلائے بیٹھے لاکھے نے اس شور پر یکدم اپنی بھویں اچکائیں اور اپنے ساتھیوں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ پھر ان میں سے ایک فوراً غسل خانے کی طرف لپکا اور ذرا ہی دیر بعد منیرے کو نکال لایا۔

اب وہ سر جھکائے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ لاکھا اسے گھورنے لگا۔ ابھی وہ اس کی کلاس لینے ہی والا تھا کہ اچانک باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی اور میری نظریں داخلی دروازے پر جم گئیں۔ دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔

وہی ہوا۔ چار، پانچ مسلح آدمیوں کے درمیان میں جو اس وقت مجھے مردار خور گدھوں کی صورت ہی نظر آئے تھے کیونکہ انہوں نے بے بس چڑیا کی طرح فوزیہ کو دبوچ رکھا تھا۔

"لاکھے.....!" میں اپنے اندر کے جوشِ غیظ کو نہ روک سکا اور فوزیہ کو ان شکاریوں کے قبضے میں دیکھ کر لاکھے کی طرف دیکھتے ہوئے زخمی شیر کی طرح دہاڑا۔ اسی وقت اس کے باقی ساتھی میری جانب لپکے اور گنیں تان لیں۔

"دھیرج..... دھیرج..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔" لاکھے نے ہاتھ کے اشارے سے خبیثانہ مسکراہٹ تلے کہا۔ فوزیہ مجھے دیکھتے ہی چلا اٹھی۔

"سہراب.....!" پھر دوبارہ ان کے پنجوں سے خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

"تو نے یہ اچھا نہیں کیا لاکھے.....! بہت قرض چڑھا لیا تو نے اپنے سر پر میرے اندھے اور خونی انتقام کا۔" کہتے ہوئے میری آواز پھٹ گئی۔

لاکھے نے میری تہدید کی ایک ذرا پروا کیے بغیر اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً قریب دھرے فون کی جانب لپکا جبکہ دوسرے کو میرے ہاتھ سے پستول اچکنے کا اشارہ کیا۔ میرا تو جی چاہا تھا کہ اسی وقت سارا پستول لاکھے کے سینے پر خالی کر ڈالوں لیکن اس کے مردار خور ساتھیوں میں سے ایک نے میرے ہاتھ میں پستول دیکھتے ہی ایک دم پستول کی نال فوزیہ کی کنپٹی سے لگا دی تھی۔

"حوصلہ رکھو فوزیہ! ہمت سے کام لو۔ میں یہاں موجود ہوں، تمہارا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔" میں نے فوزیہ کی طرف دیکھ کر اسے ہمت دلائی۔ وہ بہت ہراساں تھی، خوف زدہ بھی..... اسے

چپ سی لگ گئی۔

ادھر ناچار مجھے پستول دینا پڑا۔ پہلا ساتھی ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر لے آیا اور لاکھے کو تھما دیا۔ اس نے بڑے اطمینان سے سیٹ گود میں رکھ کر ریسیور اٹھایا اور کسی کے نمبر ڈائل کر کے رابطہ کیا۔

"شاہ جی..... چودھری صاحب! سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہو گیا ہے۔ آگے کیا حکم ہے؟" رابطہ ہوتے ہی اس نے ریسیور میں کہا۔ اس کا لہجہ فتح کے نشے سے چُور ہو رہا تھا اور میرے اندر بجلیاں کڑک رہی تھیں۔ میں کسی وقت بھی قیامت بن کر ان پر ٹوٹنے کے لیے پر تولے ہوئے تھا لیکن فوزیہ ان کی ہولناک گرفت میں تھی اور اس کی کنپٹی سے جس پستول کی نال لگی تھی اس کا سیفٹی کیچ بھی ہٹایا جا چکا تھا اور انگلی ٹریگر پر تھی۔

"چنگا جی، ابھی بات کر لیتے ہیں۔" دوسری جانب سے حکم سننے کے بعد لاکھے نے مؤدبانہ کہا اور ریسیور رکھ دیا پھر فون سیٹ گود سے ہٹا کر تپائی پر رکھا اور ایک نگاہ فوزیہ پر ڈالنے کے بعد مجھ سے بولا۔

"سہراب! بس ایک ذرا سا کام کروا پڑیں وڈے شاہ جی (نظام شاہ) کا۔ اس کے بعد تم دونوں کی چھٹی۔"

"نظام شاہ سے میری بات کرواؤ۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"انہوں نے جو حکم مجھے دیا ہے، وہ تمہارے لیے ہے۔" لاکھے نے کہا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا۔ چند قدم میری جانب چل کر آیا اور آگے بولا۔

"بیج گرائیں کی فائل تمہارے پاس آ چکی ہے، وہ ہمارے حوالے کر دو۔"

میں اس کی بات پر چونک پڑا اور ایک ہی سوال میرے اندر ابھرا کہ ان مردودوں کو کیسے خبر ہوئی اس کی؟

"کون سی فائل؟ میں تو بیج گرائیں کا نام بھی ابھی سن رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ہر بار چالاکی نہیں چلی جاتی سہراب!" لاکھا بھیڑیے کی طرح غرایا۔ "تم نہیں جانتے کہ شاہ جی کے لیے یہ فائل اور بیج گرائیں کی ملکیت کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔"

"تم لوگوں کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" میں نے کہا لیکن اسی وقت لاکھے نے ہاتھ اٹھا کر مجھے آگے بولنے سے روک دیا۔

"بس..... تم اپنا اور ہمارا وقت برباد کر رہے ہو اب..... سن لو۔" پھر اس نے مجھے اس رات والی "مہم جوئی" کی ایک ایک روداد سیاق و سباق کے ساتھ سنا ڈالی اور یہ کہ کس طرح میں نے نوید چھجرا کے ویلی آف ولا پر تن تنہا حملہ بولا تھا اور پھر آگے کیا ہوا تھا۔

میں اندر سے ششدر رہ گیا لیکن اپنی کیفیت ظاہر نہ ہونے دی۔ آخر میں وہ بولا۔

"اب میں اپنی باتوں کا آخری ثبوت دوں گا۔ اس کے بعد کام کی بات ہوگی۔" لاکھا بولا اور اس نے خود ہی وہ سنسناتا ہوا انکشاف کر ڈالا جس کے بعد میرے لیے جھوٹ بولنے کی مزید گنجائش ہی نہ رہی تھی۔

"نوید چھجرا کے بیڈ روم میں تم نے جو حسینہ لیٹی دیکھی تھی، وہ ہماری ہی بھیجی ہوئی تھی۔ اب کام کی بات کرو ورنہ ہم اپنا کام شروع کر دیں گے۔" کہتے ہوئے اس نے بڑی ہولناک نظروں سے فوزیہ کی طرف دیکھا۔

میں نے ایک ٹھنڈی ہمکاری بھری اور بولا۔

"پہلے فوزیہ کو یہاں سے جانے دیا جائے۔"

"نہیں..... پہلے فائل۔"

"کیا ضمانت ہوگی اس کی کہ فائل مل جانے کے بعد تم مجھے اور فوزیہ کو یہاں سے زندہ سلامت جانے دو گے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں بے خوفی سے گھورتے ہوئے کہا۔

"ضمانت یہی کیا کم ہے کہ ابھی تک میں نے وہ نہیں کیا جو مجھے تمہارے انکار پر ابھی تک کر لینا چاہیے تھا۔"

"فائل میں تب ہی حوالے کروں گا جب فوزیہ کو یہاں سے جانے دیا جائے گا۔ میں تو یہاں موجود ہوں۔" میں بھی اڑا رہا۔

"ٹھیک ہے۔" بڑے اطمینان سے کہتے ہوئے وہ واپس پلٹا اور اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ "فائل تو پھر بھی ہم حاصل کر ہی لیں گے، تمہیں سزا دینا ضروری ہے۔"

اس کے بعد اس نے فوزیہ کو گن پوائنٹ پر لیے اپنے دو آدمیوں سے تحکمانہ کہا۔

"اس لڑکی کو میرے بیڈ روم میں پہنچا دو۔ تھوڑی دیر بعد میں بھی وہاں آتا ہوں۔"

اس خبیث کی بات پر جیسے میں آپے سے ہی باہر ہو گیا۔

"لاکھا.....!" گن پوائنٹ پر ہونے کے باوجود میں غیظ و غضب تلے اس کی طرف چیتے کی طرح لپکا تھا اور اسی وقت گولی چلی۔ میری سماعتوں میں فوزیہ کی چیخ ابھری۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

pklibrary.com

واحدی صاحب پہلے تو کچھ دیر خاموش رہے اور ہانیہ بولتی رہی پھر جب ہانیہ خاموش ہوئی تو واحدی صاحب نے سوال کیا۔

''ایسا کیا ہوا کہ تم اپنی اس محبت کی شادی کے صرف چھ ماہ بعد خلع کی درخواست لے آئی ہو؟''

ہانیہ نے جواب میں کہنا شروع کیا۔ ''وکیل صاحب! اب تک میں نے صرف یہ بتایا کہ ہماری شادی کن حالات میں ہوئی اور آپ ہمارے فیملی فرینڈ ہونے کی وجہ سے بہت

دھوکا

غلام قادر

دنیا میں سب سے بڑا دھوکا محبت کے نام پر کسی کو اپنا بنا کر اسے تنہا چھوڑ دینا ہے... لیکن یہ دکھ جب اسے خود سہنا پڑا تو احساس ہوا مگر افسوس... اس احساس کا فائدہ اب کوئی نہیں تھا... جس کے خوابوں کو بکھرنا تھا بکھر چکے تھے۔ اس شیطان صفت نے محبت کے نام کو بدنام کر دیا تھا... پھر قدرت کیسے اسے معاف کر سکتی تھی... اور قانون بھی اسے کسی طور معاف کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔

بھروسے اور اعتماد سے کھیلنے والے چالاک مجرموں کی بے وقوفی کا عبرت اثر واقعہ

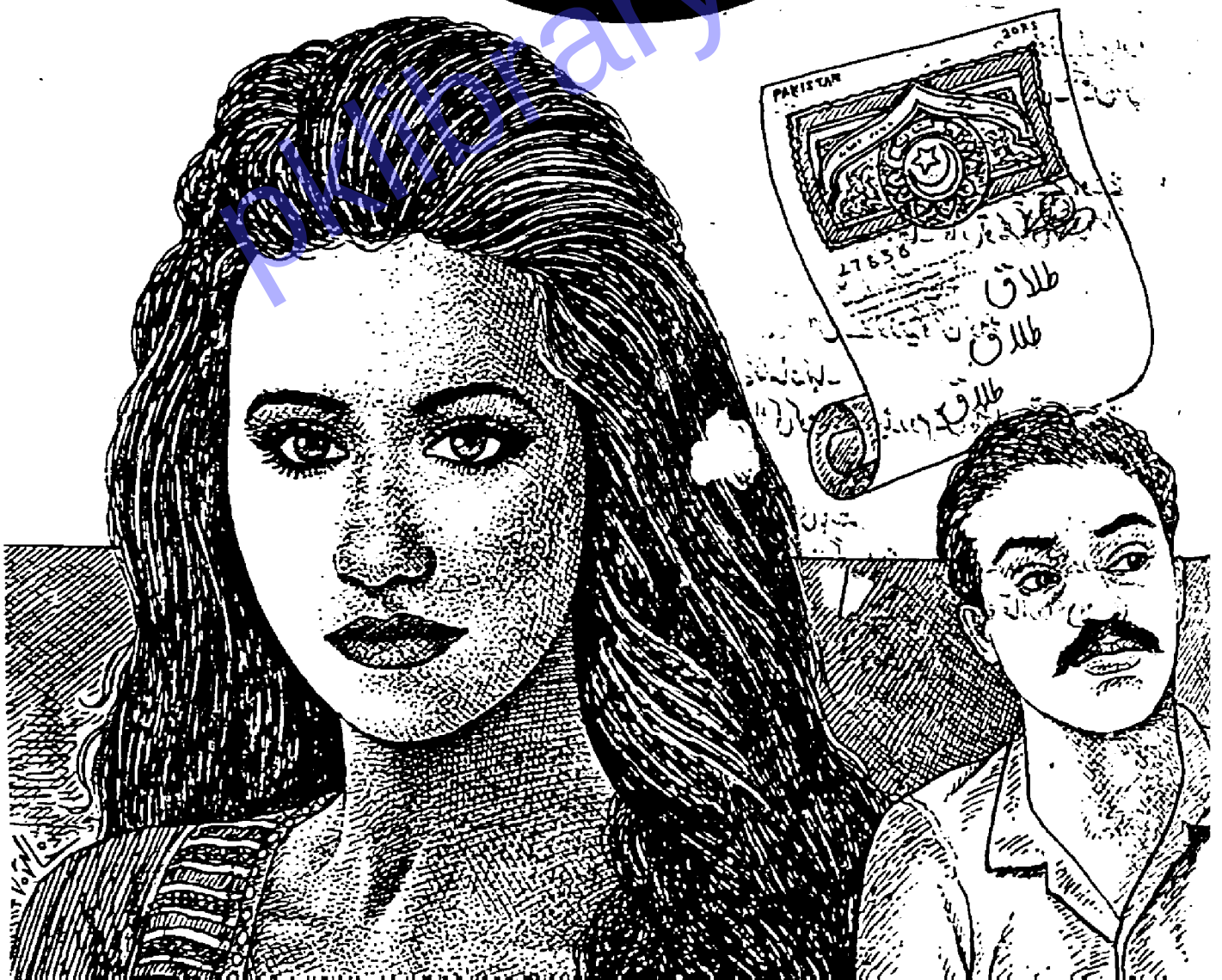

pklibrary.com

سے حقائق..... پہلے سے ہی جانتے تھے اور آپ اس سے واقف تھے کہ یہ شادی میری ضد کی وجہ سے ہوئی تھی جبکہ آپ کے دوست جو میرے والد بھی ہیں، اس شادی کے سخت مخالف تھے۔''

ہانیہ کچھ لمحوں کے لیے رکی تو وکیل واحدی صاحب نے کہنا شروع کیا۔ ''تم نے اب تک جو کچھ بیان کیا، اس میں میرے لیے نئی باتیں بہت کم تھیں بلکہ اب میں تم پر یہ انکشاف بھی کردوں کہ تمہارے والد عرفان کا میں دوست ہی نہیں بلکہ مشیر بھی ہوں۔ عرفان مجھ سے چھوٹی سے چھوٹی بات بھی نہیں چھپاتا تھا اور بیٹی کی شادی چھوٹی بات نہیں تھی۔ عرفان نے مجھ سے یہ بھی نہیں چھپایا اور یہ میرا ہی مشورہ تھا کہ اگر ہانیہ اس لڑکے سے شادی پر ضد کررہی ہے تو تم بھی اسے اپنی ضد نہ بناؤ بلکہ پہلے اس لڑکے سے مل لو پھر کوئی فیصلہ کرنا بلکہ میں نے تمہارے والد سے یہ بھی کہا کہ اگر وہ معقول ہوا تو وہ کرلینا جو ہانیہ چاہتی ہے۔''

جیسے ہی انہوں نے اپنی گفتگو میں وقفہ دیا تو ہانیہ نے دوبارہ سے اپنی بات شروع کی۔ ''وکیل صاحب! شاید آپ ہی کے مشورے پر والد صاحب نے کبیر سے ملنا گوارا کیا اور مجھ سے کبیر کو کھانے پر بلانے کے لیے کہا۔ میں نے کبیر سے یہ بات کی تو وہ فوری طور پر تیار ہوگیا اور پھر وہ ڈنر پر آیا اور والد صاحب سے ملاقات کی۔''

واحدی صاحب نے پھر سے اپنی گفتگو کا آغاز کیا اور کہا۔ ''اس ڈنر کی پوری روداد عرفان مجھے بتاچکا تھا اور یہ میرا ہی مشورہ تھا کہ اگر لڑکا شکل کا بہتر ہے اور جاب بھی معقول ہے تو انکار نہیں بنتا۔''

ہانیہ نے اپنی بات پھر سے شروع کرنا چاہی اور واحدی صاحب سے اجازت طلب کی تو انہوں نے کہا۔ ''میں بھی چاہتا ہوں کہ تم تکلف کی دیواریں گرادو لیکن ساتھ ہی میری خواہش ہے کہ ان حقائق سے گریز کرو جو میں پہلے سے ہی جانتا ہوں بلکہ بہتر ہوگا کہ اپنی گفتگو میرے سوال کے جواب تک محدود رکھو کہ اتنی مشکل سے شادی ہونے کے چھ ماہ بعد ہی خلع کیوں مانگ رہی ہو؟''

ہانیہ نے کہا۔ ''میں خود کو آپ کے جواب تک محدود رکھنے کی کوشش کروں گی لیکن شاید اس میں کچھ وقت لگ جائے۔''

واحدی صاحب نے کہا۔ ''ہم وکیل بہت اچھے سننے والے ہوتے ہیں۔ تم جتنا چاہے وقت لو لیکن جواب ایسا ہونا چاہیے کہ میں خود کو تمہارا خلع کا کیس لڑنے کے لیے تیار کرسکوں۔'' یہ کہہ کر واحدی صاحب تو خاموش ہوگئے اور ہانیہ نے بھی فوری طور پر کچھ نہ کہا بلکہ اس کے چہرے سے ظاہر ہورہا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی ہے۔ پھر کچھ دیر سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد اس نے چہرہ اٹھایا اور کہنا شروع کیا۔

''یہ داستان تب سے شروع ہوئی تھی جب میں جامعہ میں داخلہ فیس جمع کروانے بینک کاؤنٹر پر کھڑی تھی۔ وہ فیس جمع کروانے کی آخری تاریخ تھی اس لیے بینک میں رش بہت تھا اور بینک والوں نے یہ انتظام کیا تھا کہ آنے والے ہر طالب علم کو ایک نمبر دے دیا گیا تھا اور جس کا نمبر کاؤنٹر پر آتا، وہ آگے بڑھ کر کاؤنٹر پر فیس جمع کرواتا۔ میں نے بھی نمبر لیا اور انتظار کرنے لگی لیکن جب کافی دیر انتظار کے بعد بھی میرا نمبر نہیں آیا اور کھڑے کھڑے میری ٹانگوں میں درد ہونے لگا تو میں سائڈ پر پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ابھی مجھے بیٹھے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ میرے سامنے ایک لڑکا آکر کھڑا ہوگیا اور اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کومل کی بہن ہیں نا؟''

میں نے کہا۔ ''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔''

اس نے کہنا شروع کیا۔ ''کومل بی اے میں میری کلاس فیلو تھی۔ اس کی شکل آپ سے بہت ملتی ہے اس لیے میں سمجھا کہ آپ اس کی بہن ہیں۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اس دنیا میں ستر افراد ایسے ہوتے ہیں جن کی شکلیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔'' پھر میں نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کسی لڑکی سے تعارف حاصل کرنے کا یہ بہت پرانا انداز ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ نئے طریقے سیکھ کر آئیں اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔''

یہ ایسا جواب تھا کہ وہ بغلیں جھانکنے لگا اور وہاں سے ہٹ کر کچھ دور کھڑا ہوگیا لیکن فاصلہ اتنا رکھا کہ وہ جس سے بھی بات کرتا، وہ میں سن سکتی تھی۔ ابھی اسے وہاں کھڑے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک لڑکا بہت تیزی سے اس کی جانب آیا اور دونوں کے درمیان گفتگو بہ آواز بلند شروع ہوگئی۔

اس آنے والے لڑکے نے کہا۔ ''واقعی آج مجھے یقین ہوگیا کہ عوامی دور شروع ہوگیا ہے۔''

اس لڑکے نے جس نے مجھے مخاطب کیا تھا کہا۔ ''تمہیں یقین کیسے آیا؟''

آنے والے لڑکے نے کہا۔ ''ایک وزیر کا بیٹا بینک کی لائن میں کھڑا ہے۔''

مجھے مخاطب کرنے والے نے کہا۔ ”اعجاز! یہ ہماری زمینیں تو نہیں ہیں جہاں بینک منیجر ہماری حویلی آ کر بجلی اور گیس کا بل لے جاتا ہے اور جمع کروا کر رسید دینے بھی آتا ہے۔“

آنے والے نے کہا۔ ”سچ کہہ رہے ہو۔ یہ شہر ہے اور یہاں خود بینک آنا پڑتا ہے۔“

میں ان کی گفتگو سن رہی تھی کہ میری ایک سہیلی جو میری کلاس فیلو بھی رہی تھی، نے میرے قریب آ کر کہا۔ ”تم بھی داخلہ لے رہی ہو؟“

میں نے کہا۔ ”داخلہ نہ لیتی تو کیا کرتی؟“

اس نے کہا۔ ”چلو اچھا ہوا۔ یہاں بھی تمہارا ساتھ رہے گا۔“ پھر اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ہم تو سمجھ رہے تھے کہ تمہاری پوزیشن آئے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ چلو سیکنڈ ڈویژن تو آ گئی۔“

میں نے جواب دیا۔ ”امید تو مجھے بھی تھی لیکن والد صاحب کی طبیعت ناسازی کی وجہ سے پندرہ روز تک میں کتابوں سے دور رہی۔“

اس نے کہا۔ ”ہم نے بھی سنا تھا کہ وہ بیمار ہیں۔ اب کیسے ہیں وہ؟“

میں نے کہا۔ ”اب تو سرجری کے بعد ماشاء اللہ وہ بالکل ٹھیک ہیں بلکہ انہوں نے اپنی جاب پر جانا بھی شروع کر دیا ہے۔“

اس نے سوال کیا۔ ”ایم کام کے بعد تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”اس کے بعد جاب کروں گی۔“

کائنات نے سوال کیا۔ ”جب تک باپ کے گھر رہو گی تو شاید مشکل نہ ہو لیکن اگر شادی کے بعد سسرال والوں اور شوہر نے اجازت نہ دی تو کیا کرو گی؟“

میں نے جواب میں کہا۔ ”نکاح سے پہلے ہی میں شرط رکھوں گی کہ میں جاب کروں گی لیکن وہ اپنے وعدے سے مکرا تو میں اسے چھوڑ دوں گی۔“

اس پر کائنات نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”کہنا آسان ہے لیکن عمل کرنا اتنا آسان نہیں۔“

میں نے اس کے قہقہے میں اضافہ دیتے ہوئے کہا۔ ”ابھی بہت وقت ہے اس میں لیکن تم دیکھ لینا کہ آج تک میں نے جو کہا ہے، اس پر عمل بھی کیا ہے۔“

اس کے بعد ہم دونوں اپنے ڈیپارٹمنٹ کی جانب چل دیے جہاں ہمیں ڈیپارٹمنٹ کے باہر ہی کلرک مل گیا۔ کائنات نے اس سے میرا تعارف کروایا۔

”یہ ہانیہ ہیں۔“

خوش نصیب ملک

آج دنیا میں ایک ایسا آزاد اور خودمختار ملک بھی ہے جس میں کوئی شہر نہیں، کوئی ریل نہیں، کوئی ائرپورٹ نہیں، کوئی سی پورٹ نہیں اور کوئی فوج نہیں۔ ایک فرنیچر بیچنے والا فرصت کے اوقات میں اعزازی طور پر وزیر اعظم کے فرائض انجام دیتا ہے پھر بھی یہ ملک دنیا میں سب سے ترقی یافتہ ہے۔ اس کی افرادی ایکسپورٹ دولت چھ ہزار ڈالر سالانہ ہے۔ یہ ملک گزشتہ ایک سو دس سال سے ایک ایسے ملک ”پرشیا“ کے خلاف برسرجنگ ہے جس کا ساٹھ سال سے کوئی وجود نہیں۔ یہ خوش نصیب ملک ہے ”لیچ ٹن اسٹین“ جو یورپ میں آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ کے درمیان واقع ہے۔ رقبہ 98 مربع میل اور آبادی چار ہزار۔

(مرسلہ: راؤ طاہر۔ خانیوال)

ہپی

”دروازے پر گھنٹی بج رہی ہے۔“

”کیا کوئی عورت ہے؟“

”میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں، اس کے سر پر لمبے لمبے بال ہیں۔“

(مرسلہ: غلام شبیر۔ ملتان)

کلرک نے مجھ سے سوال کیا۔ ”آپ نے فیس جمع کروا دی؟“

میں نے بینک سے ملنے والا [illegible] اس کی جانب بڑھا دی جسے اس نے تھام لیا اور ڈیپارٹمنٹ کی جانب چل دیا اور ہم دونوں اس کے پیچھے چل پڑے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر کلرک نے دو فوٹو اسٹیٹ کاغذ ہماری جانب بڑھائے اور ساتھ ہی کہا۔ ”یہ کتابوں کی لسٹ ہے جو پرسوں تک آپ لے لیں کیونکہ پرسوں سے آپ کی کلاسز شروع ہو رہی ہیں۔“

کائنات نے سوال کیا۔ ”ہمارے شناختی کارڈ کب ملیں گے؟“

کلرک نے کہا۔ ”پرسوں لے لیجیے گا۔“

پھر ہم واپس آ گئے لیکن راستے میں کائنات نے کہا۔ ”میں تو کینٹین جا رہی ہوں کیونکہ میں ناشتا کر کے نہیں آئی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”میں تو ناشتے میں دو پراٹھے کھا کر آئی ہوں۔“

کائنات نے کہا۔ ”کھانا نہیں لیکن چائے کی جگہ تو ہو گی؟“

pklibrary.com

میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑی لیکن کینٹین پہنچے تو وہاں وہ دونوں پہلے سے موجود تھے جو بینک میں ملے تھے۔ کینٹین میں رش بہت تھا اور ہمیں کوئی ٹیبل خالی نظر نہیں آئی۔ ہم دونوں کینٹین کے دروازے پر ہی کھڑے تھے کہ وہ اٹھ کر ہماری جانب آئے اور ہم سے کہا۔ ''آپ ہماری میز پر آجائیں۔''

میں نے اور کائنات نے کہا۔ ''تھینک یو، ہم کسی میز کے خالی ہونے کا انتظار کرلیں گے۔''

جس نے مجھ سے تعارف حاصل کرنا چاہا تھا اور جس کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی وزیر کا بیٹا ہے، اس نے کہا۔ ''ہم چائے لے کر باہر چلے جائیں گے لیکن آپ لڑکیاں ہو۔ آپ کا باہر بیٹھ کر کچھ کھانا پینا مناسب نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ہمیں صنفِ نازک سمجھنا آپ کا احساسِ برتری ہے اور میں نے کہیں پڑھا تھا کہ احساسِ برتری دراصل احساسِ کمتری کی بدترین شکل ہے۔'' اس فقرے پر اس کے چہرے کے خدوخال بگڑ گئے۔

ابھی ہانیہ یہیں تک پہنچی تھی کہ واحدی صاحب نے کہا۔ ''بات تو تم نے صحیح کی تھی لیکن یہ تو سوچ لیتیں کہ تمہارا مخاطب کون ہے؟''

ہانیہ نے کہا۔ ''ہمارے بڑوں نے اس کی تعلیم دی ہے کہ سچ بات کہنے سے پہلے کچھ سوچنا منافقت ہے اور میں منافق کہلانا پسند نہیں کرتی۔''

واحدی صاحب نے کہا۔ ''سوری بیٹا! میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔ یہ وعدہ ہے کہ اب ڈسٹرب نہیں کروں گا۔ تم اپنی کہانی جاری رکھو۔''

ہانیہ نے اجازت ملتے ہی اپنی بات دوبارہ سے شروع کی۔ ''یہ تو میرے علم میں تھا کہ سچ کے راستے میں بہت مشکلیں آتی ہیں لیکن وہ ایسی مشکلیں کھڑی کرے گا، اس سے میں ناواقف تھی۔'' پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تو اس وزیر کے بیٹے نے اپنا ٹرانسفر فلاسفی سے کامرس میں کروانا چاہا لیکن جامعہ کے حکام نے مسترد کردیا کہ اس کے بی اے میں کامرس کا کوئی مضمون نہیں ہے اس لیے اس کا ٹرانسفر کامرس میں نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد اس نے اپنے والد سے سفارش کا فون بھی کروایا لیکن جامعہ کے حکام کا وہی جواب رہا اور انہوں نے وزیر کے فون کو نظر انداز کردیا۔''

ہانیہ نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ایم کام کا ابھی نتیجہ آنا باقی تھا کہ میں نے ایک بینک میں اپلائی کردیا اور میرے نتائج کو دیکھتے ہوئے انہوں نے مجھے جاب دے دی۔ میں نے جاب پر جانا شروع کردیا تو وزیر کے بیٹے کی بے کلی میں اضافہ ہوگیا اور میں اس کی ضد اس وقت بنی جب اس نے بینک میں جاب کے لیے اپلائی کیا لیکن یہاں بھی اسے وہی جواب ملا جو جامعہ میں ملا تھا کہ آپ نے فلاسفی میں ایم اے کیا ہے اور ہمیں ایم کام یا کم از کم بی کام گریجویٹ کی ضرورت ہے۔

''اس پر اس کے منفی ذہن نے ایک نیا منصوبہ بنایا۔ دولت کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ اس نے کیبر کو تیار کیا جو اس کا جامعہ سے شکر گزار تھا۔ کیبر تعلیم میں بہتر تھا لیکن اس کے والد پرائمری کے استاد تھے اور جامعہ تک پہنچنے تک وہ اپنے تعلیمی اخراجات خود برداشت کرتا رہا تھا۔ وہ ٹیوشن کرتا تھا اور ریڈیو پروگرام کرتا رہا تھا لیکن پہلے سیمسٹر میں اس کی دو ٹیوشن چھوٹ گئیں جس کی وجہ سے وہ سیمسٹر کی فیس ادا کرنے سے قاصر تھا تو اس نے وزیر کے صاحبزادے سے مدد چاہی۔ اس کے جواب میں اس نے بقیہ سیمسٹروں کی فیس پیشگی ادا کردی تھی۔ کیبر اس پر اس کا احسان مند تھا اس لیے جب اس وزیر کے بیٹے نے بینک نوکری کی بات کی تو وہ تیار ہوگیا۔

''کیبر ہینڈسم تھا اور ایم کام میں مجھ سے جونیئر تھا۔ وزیر کے بیٹے نے اپنا پورا منصوبہ اسے بتادیا تھا اور وہ بینک میں نوکری حاصل کرنے کے بعد اس ڈیپارٹمنٹ میں آگیا جس میں میری پوسٹنگ تھی۔ اب میں یہ بات وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ میرے ڈیپارٹمنٹ میں وزیر صاحب کی سفارش شامل تھی یا نہیں لیکن یہ بات کہہ سکتی ہوں کہ کیبر، وزیر کے صاحبزادے کا ایجنٹ تھا اور اسے مجھے پھنسانے کا ٹاسک دیا گیا تھا۔ اس نے چھ ماہ تک کام سیکھنے کے بہانے سے میرے ساتھ کام کیا اور اس دوران ہمہ وقت میری تعریف کرتا رہتا تھا اور مجھے اس حد تک اپنے جال میں پھنسانے میں کامیاب ہوگیا کہ میں اس کے ساتھ ڈیٹ پر جانے لگی۔ اس دوران اس نے مجھے پروپوز بھی کردیا اور میں نے اس میں کوئی برائی نہیں جانا۔ وہ مجھے ہائی ٹی پر لے جاتا اور اس کے بل بھی ادا کرتا تھا۔ میں اس کے نوٹوں کی گڈی سے متاثر ہوتی چلی گئی اور اس سے رشتۂ ازدواج میں بندھنے کے لیے تیار ہوگئی اور اس سلسلے میں والد کی تمام تر مخالفت کے باوجود میں اس کی اس بات پر راضی نہیں ہوئی کہ ہم کورٹ میرج کرلیں۔''

ہانیہ نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''والد

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	سیالکوٹ	0524568440
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591	میرپور AK	03460397119
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	اٹک سٹی	057210003
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	دیپالپور	03004854922
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	لیہ	03002373988
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	قصبہ ڈنگہ	03083360600
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	03006946782	عارف والا	03008758799
فیصل آباد	03006698022	مظفرآباد	03469616224	لورالائی	03023844266
راولپنڈی	03005583938	بوروالہ	03347193958	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	جلالپور پیروالا	03338303131
صادق آباد	03007452600	تونسہ شریف	03346712400	ہری پور	03321905703
رحیم یار خان	03055872626	ڈیرہ غازی خان	03336481953	چکوال	03348761952
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	وہوا	03346383400
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	حافظ آباد	0307-6479946
جہلم	03235777931	راے ونڈ	03004719056	واہ کینٹ	0301-5497007
سیالکوٹ	03008711949	ہری پور	03317400678	ایبٹ آباد	0992335847
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	پتوکی	03454678832
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	مانسہرہ	0333-5021421
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	محسن آباد	0301-7681279	کوٹ رادھا کشن	03004992290
ڈسکہ	0300-9463975	سمبڑیال	0333-8604306	قصور	0300-6575020
حجرہ شاہ مقیم	03006969881	ٹوبہ ٹیک سنگھ	0315-6565459		

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی فون: 35895313
E-mail:jdpgroup@hotmail.com

pklibrary.com

صاحب اس شادی کی جتنی مخالفت کرتے، میں کبیر کو بتاتی رہی تھی اور اس کے مشورے پر عمل کرتی تھی۔ وکیل صاحب! میرا یقین کریں، نکاح کے وقت تک اس کی حقیقت میں نہیں جانتی تھی۔ کبیر مجھے نکاح کے بعد رخصت کر کے حسن اسکوائر کے ایک فلیٹ میں لے گیا لیکن وہاں اس کا کوئی گھر والا نہیں تھا۔ نہ ماں تھی، نہ بہن۔ اس رات کبیر بھی اس کمرے میں نہیں آیا جہاں میں خواب سجائے بیٹھی تھی۔ صبح جب میں نے کبیر سے یہ سوال کیے تو اس کا جواب ایسا تھا جسے میرے ذہن نے قبول نہیں کیا۔''

اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے ہانیہ نے کہا۔ ''ایک ہفتہ اسی طرح گزر گیا تو میں نے کہا۔ کبیر! شادی سے پہلے تو تم مجھے ہائی ٹی پر لے جایا کرتے تھے۔ اب ہفتہ ہو گیا اور مجھے فلیٹ میں بند کر رکھا ہے۔''

اس نے کہا۔ ''آج شام تیار رہنا۔ ہم رات کا کھانا باہر کھائیں گے۔''

''شام کو میں تیار ہو گئی۔ کبیر نے کار نکالی اور ہم روانہ ہوئے لیکن راستے میں پولیس نے کار کے شیشے کالے ہونے کے الزام میں روکا تو کبیر کے پاس کار کے کاغذات نہیں تھے جبکہ وہ ہر بار یہی کہتا رہا تھا کہ یہ اس کی کار ہے۔ آخر کار پولیس نے ہمیں کار سے اتارا اور سائڈ میں کھڑا کر کے خود کار کی تلاشی لینے لگے۔ پھر کچھ دیر میں ہمارے پاس کچھ کاغذات لے کر آئے اور کہا۔

''یہ کار تو میزان بینک سے لی گئی ہے اور کسی عادل نامی شخص نے لی ہے۔''

کبیر نے کہا۔ ''میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ یہ میرے دوست کی کار ہے جس سے میں نے چند دنوں کے لیے لی ہے۔''

میرے کان کھڑے ہو گئے اور میں نے کبیر سے سوال کیا۔ ''عادل تو اس وزیر زادے کا نام ہے۔ مجھے سچ سچ بتاؤ کہ کار تمہاری ہے یا اس وزیر زادے کی ہے؟''

اس نے بھڑکتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''میرا سر نہ کھاؤ۔''

کبیر نے اس کا بھی خیال نہ کیا کہ پولیس والے بھی وہاں موجود ہیں پھر اس نے اپنے موبائل سے کسی کا نمبر ڈائل کیا اور اگلے دس منٹ میں عادل یعنی وزیر زادہ وہاں موجود تھا۔

اس نے مجھ پر نظر ڈالی اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہانیہ بی بی! مجھ سے بچتی رہی ہو۔ اب بتاؤ کس طرح بچو گی؟ اگر میں کہوں تو کبیر تمہیں میرے حوالے کر دے گا۔''

میں نے کبیر سے کہا۔ ''تو تم نے اس بدذات کے کہنے پر محبت کا ڈراما رچایا تھا؟''

عادل نے کبیر کو اشارہ کیا۔ کبیر نے مجھ سے کہا۔ ''اب تم اس حقیقت کو جان چکی ہو تو تم ابھی اور اسی وقت عادل کے ساتھ چلی جاؤ۔''

میرے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے پولیس والوں سے درخواست کی کہ مجھے ان سے بچاؤ تو ان کے انچارج نے کہا۔ ''ان سے بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے ہمارے پاس کہ ہم تمہیں گرفتار کر لیں۔''

میں نے کہا۔ ''ان دونوں کو جانے دیں گے؟''

انچارج نے کہا۔ ''تمہاری گرفتاری بھی ہم تھانے جا کر ڈالیں گے اور یہ تمہارے ساتھ ہی جائیں گے۔''

ہم تھانے پہنچے تو میں نے والد کو فون کیا اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ آدھ گھنٹے میں وہ تھانے پہنچ گئے اور انہوں نے ضمانت لینا چاہی تو تھانیدار نے کہا۔ ''اب ایف آئی آر کٹ چکی ہے۔ اس کی ضمانت عدالت ہی دے سکتی ہے۔''

اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے ہانیہ نے کہا۔ ''عدالت سے ضمانت لینے میں تین ماہ لگے لیکن میں نے ابا کو سختی سے منع کیا تھا کہ میرے تھانے جانے اور ایف آئی آر کٹنے کی خبر وہ کسی کو نہ ہونے دیں اور آج میں خلع کی درخواست دائر کرنے کے لیے آپ کے پاس آئی ہوں۔''

واحدی صاحب نے سوال کیا۔ ''ان دونوں کا کیا ہوا؟''

ہانیہ نے کہا۔ ''عادل کو اس کے باپ نے اگلے ہی روز اپنے اثر رسوخ سے رہا کروا لیا لیکن کبیر اب تک جیل میں ہے۔''

واحدی صاحب نے لقمہ دیا۔ ''اسے رہا ہونا بھی نہیں چاہیے۔''

ہانیہ نے سوال کیا۔ ''اتنے کچھ حقائق جان کر اب آپ خلع کا کیس لڑنے کے لیے تیار ہیں کیونکہ آپ نے ہی کہا تھا کہ جب تک میں مطمئن نہ ہو جاؤں، میں یہ کیس لڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں گا۔''

واحدی صاحب نے کہا۔ ''خلع کا کیس تو لڑوں گا ہی لیکن اب میں کبیر کے خلاف بھی کیس لڑوں گا اور پوری کوشش کروں گا کہ وہ جیل سے باہر نہ آنے پائے اور اس ضمن میں اپنے پورے تعلقات استعمال کروں گا۔''

ہانیہ نے کہا۔ ''اب تک ابا کے وکیل کیس لڑ رہے ہیں۔ اب وہ کیس بھی آپ کے ہاتھ میں آئے گا تو میں زیادہ مطمئن ہو جاؤں گی۔''

☆☆☆

pklibrary.com

انوکھا فراڈ

عاطر شاہین

چہروں کے پیچھے بھی کئی چہرے ہوتے ہیں۔ لوگ اندر سے کتنے گہرے ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ کسی کو احساس دلانے کے لیے ایسے جملے دُہراتے رہتے ہیں... اسے بھی خبر نہ ہو سکی جس پر وہ اندھا اعتبار کر رہا ہے... وہ کتنا بڑا بیوپاری ہے... دھوکا دینا اس کا شعار تھا مگر معصوم شکل نے اسے اس مشکل میں لا پھینکا۔

روپ بدلتے چہروں اور محبت کی یقین دہانی کے جھانسے میں آنے والے لوگوں کا قصہ

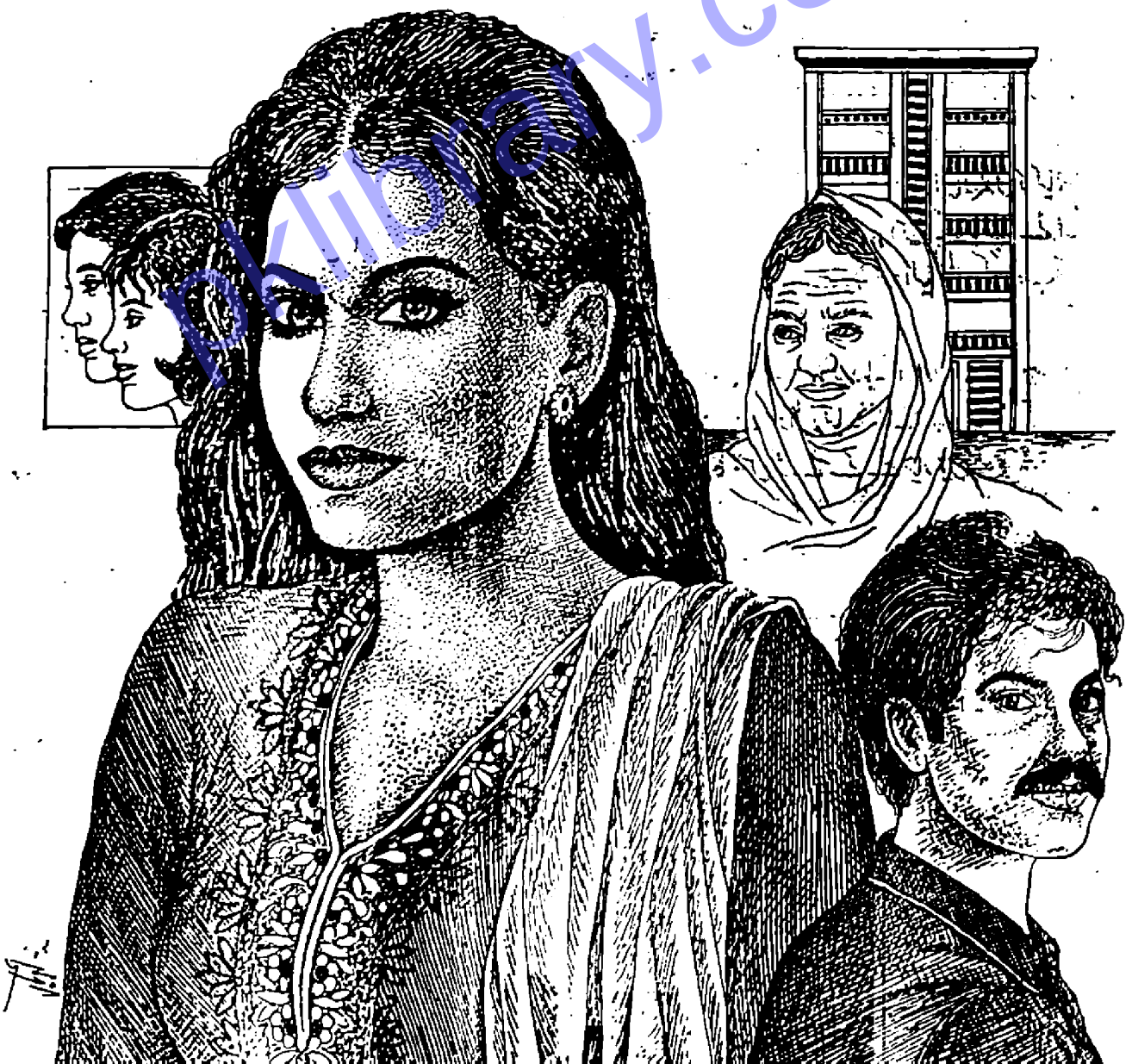

"بیٹا۔" حامد شوکیس میں پڑے زیورات کے ڈبے ترتیب سے رکھنے میں مصروف تھا کہ اس کی سماعت سے ایک نسوانی شفقت بھری آواز ٹکرائی تو اس نے بے اختیار چونک کر دیکھا۔ اس کے سامنے ایک خاتون موجود تھی جس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس نے معمولی سا لباس پہنا ہوا تھا جبکہ سر پر سفید رنگ کا دوپٹا اوڑھا ہوا تھا۔

حامد صرافہ بازار میں سونے کے زیورات کی خرید و فروخت کرنے والی ایک دکان پر ملازم تھا اور اسے وہاں

ملازمت کرتے ہوئے تین سال ہو گئے تھے۔ دکان کے مالک کا نام ملک اقبال تھا اور وہ عمر رسیدہ شخص تھے۔ وہ بے حد اچھے اور جہاندیدہ انسان تھے اور حامد کی ایمانداری اور شرافت سے بے حد متاثر تھے۔ تین سال کے عرصے میں حامد نے کبھی غبن نہیں کیا تھا اور نہ ہی سونے کا ایک ٹکڑا تک چوری کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ملک اقبال نے دکان کی چابیاں حامد کے حوالے کی ہوئی تھیں اسی لیے حامد صبح نو بجے دکان کھول لیتا تھا۔ دکان کھولنے کے بعد وہ دکان کی صفائی ستھرائی کرتا اور زیورات کے ڈبے ترتیب سے رکھتا۔ ملک اقبال تقریباً گیارہ بجے ہی دکان پر آتے تھے۔ ان کے دکان پر آنے سے پہلے اگر کوئی گاہک آتا تو حامد اسے ڈیل کرتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ خاتون کو دیکھ کر حامد یہی سمجھا تھا کہ وہ گاہک ہیں اور زیور خریدنے آئی ہیں۔

"جی آنٹی..... فرمائیں؟" حامد نے خوش اخلاقی سے کہا۔

خاتون بولیں۔ "بیٹا! میں نے تم سے بات کرنی ہے؟ کیا تم مجھ سے تھوڑی دیر کے لیے بات کر سکتے ہو؟"

حامد چونکا۔ "مجھ سے آپ نے کیا بات کرنی ہے؟"

"بیٹا! بات زیادہ خاص تو نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں عجیب بھی لگے۔ کئی بار سوچا کہ میں تم سے بات نہ کروں لیکن میں آج دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہاں آ گئی۔" ادھیڑ عمر خاتون نے کہا تو حامد کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھر آئے تاہم اس نے کہا۔

"جی بولیں۔"

"کیا میں یہاں بیٹھ جاؤں؟ بوڑھی ہوں اس لیے کھڑے کھڑے تھک گئی ہوں۔" خاتون نے کرسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو حامد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ خاتون کرسی پر بیٹھ گئیں۔ حامد تجسس میں پڑ گیا تھا اور ان کی طرف متوجہ تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرنا چاہتی ہیں۔

"تمہارا نام کیا ہے بیٹا؟"

"میرا نام حامد ہے۔"

"ہوں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئیں اور توقف کے بعد بولیں۔ "بات یہ ہے کہ تمہاری شکل میرے مرحوم بیٹے سے بہت ملتی ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ تم ہو بہو میرے بیٹے کے ہم شکل ہو تو غلط نہ ہوگا۔"

حامد خاموش رہا۔ خاتون دوبارہ گویا ہوئیں۔

"اس کا نام فاروق تھا۔ وہ تمہارا ہم عمر ہی تھا لیکن موت نے اسے زیادہ دن زندہ نہیں رہنے دیا۔ وہ میرا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی موت میرے لیے قیامت سے کم نہیں تھی۔"

اتنا کہتے ہی ان کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حامد کے دل میں بھی دکھ کی ایک ٹیس سی اٹھی۔

"مجھے بے حد افسوس ہے آنٹی۔" حامد نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "اللہ آپ کو صبر دے۔"

"آمین....." کہتے ہوئے خاتون رومال سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ ماحول پر یکدم سوگواری کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ چند لمحوں کے بعد خاتون نے خود پر قابو پایا اور ان کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔

"میں نے جب پہلی بار تمہیں دیکھا تو میں دنگ رہ گئی تھی اور مجھے یہی لگا تھا کہ تم میرے بیٹے فاروق ہو پھر میری عقل نے مجھے سمجھایا کہ فاروق مر چکا ہے اور جو میں نے ہم شکل دیکھا ہے، وہ کوئی اور ہے۔" وہ دوبارہ گویا ہوئیں۔ "میں تمہاری دکان پر تین چار مرتبہ آئی تھی۔ تمہیں دیکھ کر مجھے تسلی ہوئی تھی۔"

حامد خوش ہو کر ازراہِ تفنن بولا۔ "آنٹی! آپ مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھیں۔"

"شکریہ بیٹا۔" انہوں نے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے آنٹی۔" حامد نے کہا۔ "اگر آپ کو میری شکل میں آپ کا بیٹا دکھائی دیتا ہے اور مجھے دیکھ کر آپ کو خوشی ہوتی ہے تو یہ میرے لیے خوشی اور اعزاز کی بات ہے۔"

"کیا یہ تمہاری اپنی دکان ہے بیٹا؟"

"نہیں آنٹی! میں یہاں ملازمت کرتا ہوں۔"

"کتنے سال ہو گئے ہیں تمہیں یہاں کام کرتے ہوئے؟"

"تین سال ہو گئے ہیں۔"

"تم کتنے بہن بھائی ہو؟"

"آنٹی! ہم دو بھائی اور تین بہنیں ہیں۔"

"اچھا بیٹا! اب میں چلتی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ "جانے سے پہلے تم سے ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں۔"

"جی فرمائیں۔" حامد نے کہا۔

"بیٹا! اگر تمہیں برا نہ لگے تو میں کبھی کبھار تم سے ملنے آ جایا کروں؟" انہوں نے کہا۔ "تم سے ملنے کے بعد میرے بیٹے کی یاد تازہ ہوتی رہے گی۔"

"ضرور آنٹی۔" حامد نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

pklibrary.com

''شکریہ بیٹا! اب میں چلتی ہوں۔''

''معاف کیجیے گا آنٹی، میں نے آپ سے کھانے پینے کے بارے میں کچھ پوچھا نہیں۔'' حامد نے جلدی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں بیٹا۔'' وہ مسکرائیں۔ ''اب تو آنا جانا لگا رہے گا پھر کچھ کھا پی لوں گی۔''

''جی ٹھیک ہے۔''

پھر وہ خاتون وہاں سے چلی گئیں اور حامد اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

☆☆☆

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خاتون اس سے ملنے آتی رہیں۔ وہ جب بھی آتیں حامد تو ان سے مل کر بے حد خوش ہوتا اور ان کی خوب خاطر مدارت کرتا۔ وہ اب انہیں آنٹی کے بجائے اماں جی کہہ کر پکارتا تھا کیونکہ انہوں نے ہی حامد سے اصرار کیا تھا کہ وہ انہیں آنٹی کے بجائے اماں جی کہہ کر پکارا کرے۔

وہ حامد سے ملنے اس وقت آتی تھیں جب حامد دکان پر اکیلا ہوتا تھا کیونکہ حامد نے اماں جی کو اپنے مالک ملک اقبال کے گھر جانے کا وقت بتایا ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھ کر چلی جاتیں۔ حامد بھی ان سے بے حد مانوس ہو چکا تھا اور اس نے ان کے گھر بھی جانا شروع کر دیا تھا۔ ان کا گھر شہر کے پوش علاقے میں تھا۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی بیٹی کا نام مہوش تھا جبکہ چھوٹی کا نام لائبہ تھا۔ وہ حامد سے دو سال چھوٹی تھی۔ بقول اماں جی کے ان کے شوہر سرکاری ملازم تھے اور انہیں فوت ہوئے دس سال ہو گئے تھے اور وہ تینوں ماں بیٹیاں ان کی پنشن پر گزارہ کر رہی تھیں۔

اماں جی نے بتایا تھا کہ مہوش نے بی اے کیا ہوا ہے اور اس کا چچازاد سے رشتہ طے ہو چکا ہے۔ تین ماہ بعد اس کی شادی تھی جبکہ لائبہ نے ایف اے کیا ہوا تھا۔ وہ ان دنوں نوکری کی تلاش میں تھی۔ لائبہ بے حد حسین اور خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کے چہرے کی معصومیت دل موہ لینے والی تھی، یہی وجہ تھی کہ حامد بھی اس سے مل کر بے حد متاثر ہوا تھا۔ اماں جی نے بتایا تھا کہ لائبہ کا رشتہ ابھی طے نہیں ہوا تھا۔

پھر تو حامد اکثر و بیشتر وہاں جانے لگا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن اماں جی کے گھر آ جاتا۔ وہ کبھی خالی ہاتھ نہ آتا تھا۔ کوئی نہ کوئی چیز لے کر جاتا تھا۔ دراصل حامد کے دل کو لائبہ بھا گئی تھی۔ وہ اس کی من موہنی صورت پر مرمٹا تھا۔ اس نے کئی

گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

کے باذوق قارئین کے لیے خوشخبری

کون خوابوں کے پار رہتا ہے

خوابوں، خیالوں اور تخیلات کی دنیا ہمیشہ ہی مسحور کن لگتی ہے۔ سنہرے اور روپہلے خوابوں پر نہ کسی کو اختیار ہے اور نہ ہی کوئی قدغن لگا سکتا ہے۔ امنگوں، آرزوؤں کی تکمیل میں تخیلاتی دنیا کبھی معاون ہوتی ہے تو کبھی انسان مایوس بھی ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں مایوسی بھی آگے بڑھنے میں معاون ثابت ہو تو منزل تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔

حسین داستاں اور خوابوں کی تعبیر..... ایسے ہی تو بنتی ہے ایک دلکش تحریر

مایہ ناز، قلمکار، ہر دلعزیز ناول نگار محترمہ

افشاں آفریدی

کے ماہرانہ انداز بیان کا ایک اور دلکش، حسین و پُرلطف قسط وار ناول

جلد ہی ماہنامہ پاکیزہ کے صفحات کی زینت بننے جا رہا ہے

بار اماں جی سے کہا کہ وہ ان کے گھر آئیں اور اماں جی ہر بار یہی کہتیں کہ وہ اس کے گھر ضرور آئیں گی لیکن دو ماہ گزر گئے تھے، وہ حامد کے گھر نہیں آئی تھیں۔

☆☆☆

ایک روز شام کے وقت حامد اپنی دکان پر موجود تھا۔ اس کا مالک اپنے ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا اور دو دن بعد اس کی واپسی تھی۔ حامد ایک گاہک کو نمٹا کر جیسے ہی فارغ ہوا تو اماں جی وہاں آ گئیں۔ ان کے ساتھ لائبہ بھی تھی۔ حامد لائبہ کو دیکھ کر خوش ہو گیا جیسے اس پر سرشاری کی سی کیفیت طاری ہو گئی ہو۔ لائبہ پہلی بار اس کی دکان پر آئی تھی۔ حامد بھاگ کر اماں جی اور لائبہ کے لیے جوس لے آیا تھا۔

''حامد بیٹا۔'' جوس پینے کے بعد اماں جی خالی گلاس قریب پڑی میز پر رکھتے ہوئے حامد سے گویا ہوئیں۔

''فرمائیں اماں جی۔'' حامد ان کی طرف جی جان سے متوجہ ہوا۔ وہ کن انکھیوں سے لائبہ کو بھی دیکھ رہا تھا۔ اس کے حسن کا جادو اس کے سر پر چڑھا ہوا تھا۔

''بیٹا! تم جانتے ہو کہ ایک ماہ بعد مہوش کی شادی ہے اور ہمیں اس کے لیے زیور بھی پسند کرنا ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئیں۔

''جی اماں جی! آپ مہوش کو لے آئیں۔ وہ ڈیزائن پسند کر لے تو میں اپنے مالک سے کہہ کر رعایتاً زیور بنوا دیتا ہوں۔'' حامد نے کہا۔

''وہ نہیں آ سکتی۔''

''کیوں..... اسے کیا ہو گیا ہے؟'' حامد چونکا۔

''رات وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے گر گئی تھی۔'' اماں جی نے بتایا۔ ''اس کے پیر میں موچ آ گئی تھی اس لیے وہ اب بستر پر پڑی ہے۔''

''اوہ۔'' حامد نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

''اسی لیے وہ ہمارے ساتھ نہیں آئی۔'' اماں جی بولیں۔

''کوئی بات نہیں اماں جی۔ میں آپ کو زیورات کے ڈیزائن والی کتاب دے دیتا ہوں۔ آپ مہوش باجی کو دکھا دیں، وہ ڈیزائن پسند کر لیں۔'' حامد نے کہا اور دراز سے ایک کتاب نکال کر ان کی طرف بڑھا دی۔

''بیٹا! کتاب میں دیکھنے سے ڈیزائن کیسے واضح دکھائی دے گا۔'' اماں جی نے کہا۔ ''تم نئے ڈیزائن والے چند زیورات دے دو۔ شام کو آؤ گے تو لیتے جانا۔ اس طرح مہوش زیورات بھی پسند کر لے گی۔''

''ٹھیک ہے اماں جی۔'' حامد کتاب واپس دراز میں رکھتے ہوئے بولا اور پھر اس نے سرخ کور والے ڈبوں میں نئے ڈیزائن شدہ زیورات پیک کر کے اماں جی کو دے دیے۔

''شکریہ بیٹا۔'' اماں جی نے مسکراتے ہوئے کہا تو حامد بھی مسکرا دیا۔ اس نے لائبہ کی طرف دیکھا تو وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ حامد کے دیکھنے پر وہ شرما گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں ماں بیٹی وہاں سے چلی گئیں اور حامد لائبہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے لائبہ سے محبت ہو گئی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ مہوش کی شادی کے بعد وہ اپنے گھر والوں سے لائبہ کے بارے میں بات کر کے انہیں اماں جی کے گھر بھیجے گا۔ پھر وہ چشم تصور میں لائبہ کو اپنی دلہن کے روپ میں دیکھنے لگا۔

☆☆☆

شام کو دکان بند کرنے کے بعد حامد نے ایک ریڑھی والے سے فروٹس خریدے اور پھر وہ اماں جی کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے پاس اپنی موٹر سائیکل تھی۔ بیس منٹ کے بعد جب وہ اماں جی کے گھر کے دروازے پر پہنچا تو حیران رہ گیا کیونکہ دروازے پر تالا لگا ہوا تھا اور دروازے کی دائیں دیوار پر ''یہ مکان کرائے کے لیے خالی ہے'' کا بورڈ آویزاں تھا۔ اماں جی نے تو اسے بتایا ہی نہیں تھا کہ وہ کرائے کے مکان میں رہتی ہیں۔ اس نے پتلون کی جیب سے اپنا سیل فون نکالا اور اماں جی کو کال کرنے لگا لیکن دوسری طرف سے نمبر بند ملا۔ حامد نے قریبی پرچون کی دکان پر جا کر دکان مالک سے اماں جی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا۔

''اماں جی تھوڑی دیر پہلے ہی مکان خالی کر کے چلی گئی ہیں۔ وہ کہاں گئی ہیں، میں نہیں جانتا اور نہ ہی محلے کا کوئی فرد جانتا ہے کیونکہ اماں جی کا کسی سے میل جول نہیں تھا اور نہ ہی کوئی ان کے گھر جاتا تھا۔ تم ہی ان کے گھر جاتے تھے لہٰذا تمہیں ہی معلوم ہو گا کہ وہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ کہاں گئی ہیں۔''

حامد کو اپنا دماغ چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ فراڈ ہو چکا ہے۔ ''اماں جی'' اس سے زیورات لے کر کہیں چلی گئی ہیں۔ اب وہ انہیں کہاں ڈھونڈے، حامد کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

pklibrary.com

ماضی کا بھوت

صائمہ دانش

ہر وہ یاد جو آپ کو مسلسل پریشان کرے یا آپ کے لاشعور میں کہیں چھپ کر بیٹھ جائے... کسی بھوت سے کم نہیں ہوتی... وہ بھی ان یادوں سے... ساری باتوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا بلکہ چھڑا بھی لیا تھا لیکن... ایک روز پھر وہ یاد بھوت کی طرح ظاہر ہوگئی... زندگی میں بہت سے لوگ ملتے اور بچھڑ جاتے ہیں... ہر کہانی کا اختتام ہوتا ہے مگر... یادوں کا کبھی خاتمہ نہیں ہوتا... تاوقتیکہ سانسیں پیچھا نہ چھوڑ دیں... اور وہ تو شاید اس کی سانسوں میں بستی تھی پھر کیسے اس کا پیچھا چھوڑ دیتی۔

ماضی کے دن مجسم سامنے دیکھ کر حیران رہ جانے والے ایک گمشدہ مسافر کا قصہ

جب میں دفتر میں داخل ہوا تو ویلیری خوشی سے تقریباً کانپ رہی تھی۔ میں نے ابھی تک اپنا کوٹ بھی نہیں اتارا تھا کہ اس نے مجھے ایک چمکتا گلابی کلر کا پرچہ تھما دیا۔

''سر! آپ نے کبھی بتایا نہیں کہ آپ جیسن پیرلیس کو جانتے ہیں؟'' اس کے چہرے سے ایکسائٹمنٹ چھلک رہی تھی۔ ''میں ہائی اسکول میں بیٹی بیجز کی دیوانی تھی۔''

اگر میری اسسٹنٹ مجھے بوڑھا محسوس کرانے کی کوشش کر رہی تھی تو وہ اس میں مکمل کامیاب ہو چکی تھی۔ جیسن، بیٹی بیجز نامی بینڈ میں ٹرمپٹ بجاتا تھا جس کا ہمارا ڈرمر کرٹ بہت بڑا مداح تھا۔ میری جیسن سے صحیح معنوں

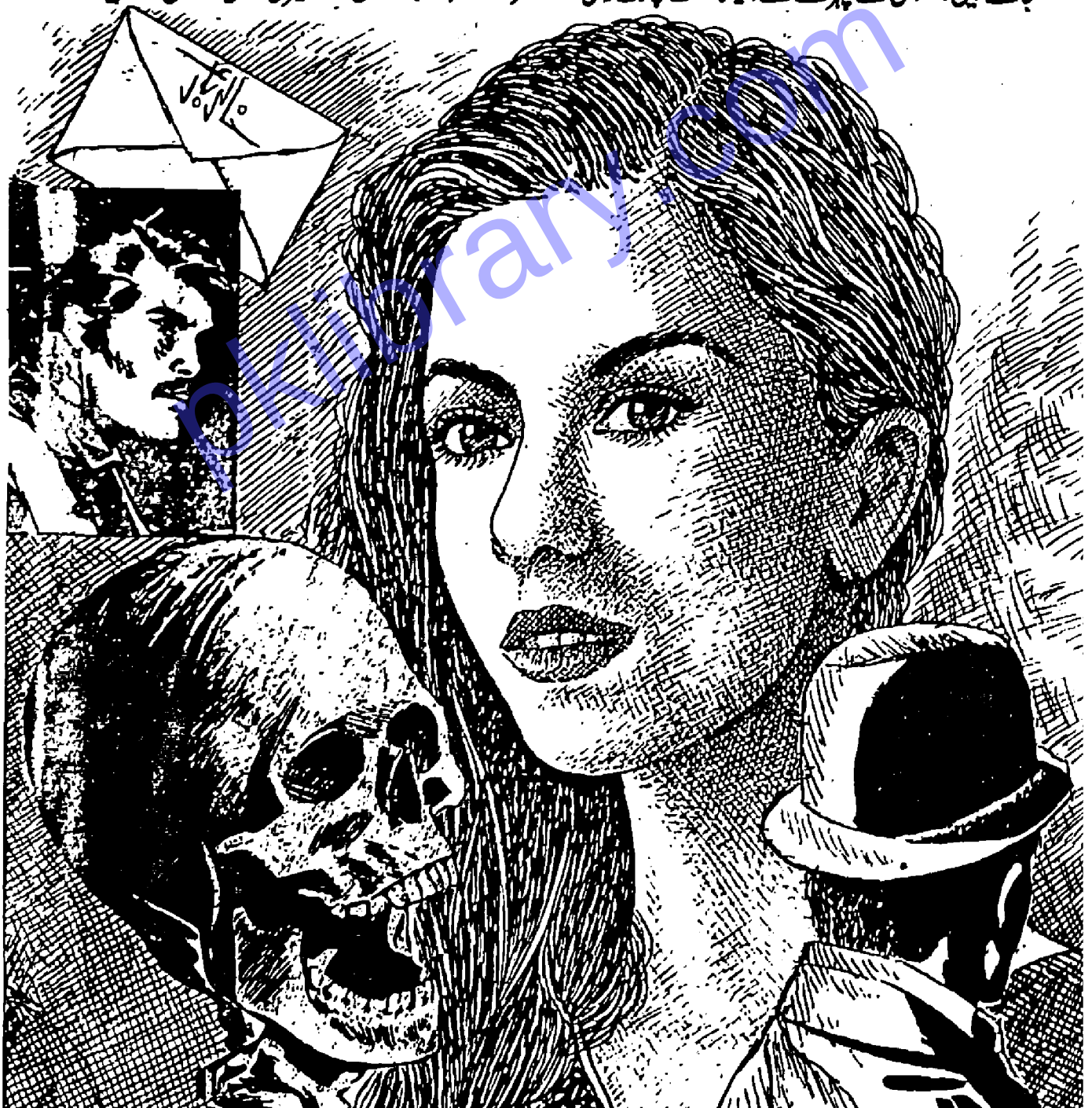

pklibrary.com

میں جان پہچان اس وقت ہوئی جب میں نے اسے بیک اسٹیج پر دی تھن مین کا ایک پرانا ایڈیشن پڑھتے دیکھا۔ جاسوسی ناولز ہم دونوں کا مشترکہ عشق تھا۔

کئی سال بعد جب ایک شام گھر واپسی پر ڈرائیو کے دوران میں نے ریڈیو پر ''پگسکن سوٹ کیس'' سنا اور جب ڈی جے نے بتایا کہ یہ ملک کا نمبر ون گانا ہے تو میں تقریباً ایک گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گیا۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ اپنی زندگی کے اس دور میں کچھ اچھا کر رہا تھا لیکن یہ بات بھی تھی کہ اگر ماضی کا بھوت اتنا وقت گزرنے کے بعد پیچھا نہ چھوڑے تو شاندار کیریئر بن جانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔

''میں تو اس وقت بہت سے لوگوں کو جانتا تھا۔'' میں نے ویلیری کی خوشی نظر انداز کی۔ ''وہ کیا کہہ رہا تھا؟''

''بس کہا کہ آپ اسے کال بیک کریں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''فون پر اس کا انداز کافی دوستانہ لگ رہا تھا مگر آپ فکر نہ کریں، میں نے کوئی فین گرلنگ نہیں کی۔ سب کچھ پیشہ ورانہ رکھا۔''

میں اپنے دفتر میں گیا اور ویلیری کے دیے ہوئے نمبر پر ڈائل کیا۔ دوسری گھنٹی پر اس نے کال کاٹ دی۔

ایک لمحے بعد ایک ٹیکسٹ آیا۔

''کلاس میں ہوں، جلد ہی کال کرتا ہوں۔''

میں ماضی کے دریچوں میں جھانک کر پرانی یادوں کی چھان بین میں مصروف ہو گیا۔

میں نے برسوں سے جیسن کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ وہ ان بہت سے دوستوں میں شامل تھا جنہیں میں لاس اینجلس چھوڑتے وقت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

لگتا ہے اس نے بھی وہ دنیا چھوڑ دی تھی۔ اب وہ یونیورسٹی آف سدرن مین میں حیاتیات کے شعبے میں پروفیسر اور ڈیپارٹمنٹ چیئر تھا اور لابسٹر جینیٹکس پر کئی تحقیقی مقالے شائع کر چکا تھا۔

برا نہیں۔ بالکل بھی برا نہیں۔

پینتالیس منٹ بعد اس نے مجھے دوبارہ فون کیا۔

اگر میری کالر آئی ڈی نہ بھی بتاتی کہ یہ کون ہے تو اس کی تیز دھار آواز خود ہی اس کی پہچان کرا دیتی۔

''بیسل وائز!'' وہ بولا۔ ''یا..... بلکہ مارٹن ویڈ! کیسے ہو؟''

''اس وقت سے بہتر جب ہم آخری بار ملے تھے۔'' میں نے جواب دیا۔

ہمارے ایک ساتھ ٹور کرنے کے چند سال بعد میں اس سے ''وکی اے گو گو'' میں ملا تھا۔ مجھے اس وقت کی اس کی گفتگو زیادہ یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ اس نے پوچھا..... ''کیا میں ٹھیک ہوں'' اور میں نے اسے یقین دلایا کہ میں ٹھیک ہوں حالانکہ اندر ہی اندر مجھے شدید بے چینی ہو رہی تھی کیونکہ وہ مجھے باتھ روم جانے سے روک رہا تھا جہاں مجھے ایک اشد ضروری نشہ پورا کرنا تھا۔

''اور تم؟'' میں نے پوچھا۔

''میں بھی پہلے سے بہتر ہوں۔'' اس نے اعتراف کیا۔ ''میں لیب جا رہا ہوں اس لیے بات مختصر رکھوں گا لیکن شاید میرے پاس تمہارے لیے ایک کیس ہو۔''

یقیناً وہاں اور بھی پرائیویٹ ڈیٹیکٹو موجود ہوں گے لیکن نہ جانے کیسے اس نے مجھے ڈھونڈ نکالا اور میں اس کا احسان مند تھا اس لیے اسے سننا میرا فرض تھا۔ بصورتِ دیگر میں اس کی پیشکش ٹھکرا دیتا اور ہم محض چند لمحے اپنی اپنی لائف کے بارے میں بات کر لیتے۔

''کیا کیس ہے؟''

وہ کچھ لمحے رکا۔ ''میں پولیس کو شامل نہیں کرنا چاہتا۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ یہ بس کوئی مذاق ہے لیکن میں نہیں چاہتا کہ اسٹوڈنٹس میری لیبارٹری کا سامان چوری کریں۔''

''کیا چرایا ہے انہوں نے؟''

وہ کچھ دیر چپ رہا۔

''ریٹا۔'' اس نے کہا۔ ''میرا ڈھانچا۔''

جیسن کا دفتر پورٹ لینڈ کیمپس میں چھوٹا اور بھرا ہوا تھا۔ تین دیواروں پر اونچے اونچے بکس شیلف بنے ہوئے تھے اور ایک پر فائلنگ کیبنٹ اور چند فریم شدہ شو پوسٹرز لگے تھے۔

اس نے اپنے کالے بال چھوٹے کروا لیے تھے اور پرانی باؤلنگ شرٹس چھوڑ کر آکسفورڈ شرٹ اور آرگائل سویٹر پہننا شروع کر دیا تھا۔

اس نے مصافحہ کرتے کرتے مجھے گلے لگا لیا۔ میں نے ایک لمحہ اسے تھامے رکھا پھر ویلیری کا تعارف کرایا۔

''میں آپ کی بہت بڑی فین ہوں۔'' ویلیری نے جیسن کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے گرمجوشی سے کہا۔ ''آپ سے مل کر بہت اچھا لگا۔''

وہ مسکرایا۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''یہ آپ کی بہت مہربانی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ہر چند سال بعد میرے کسی اسٹوڈنٹ کو میرے ماضی کی زندگی کے بارے میں پتا چلتا ہے پھر وہ کچھ پرانی ویڈیوز پھیلانے لگتے ہیں یا اپنی بڑی بہن کے لیے میری دستخط شدہ سی ڈی

مانگتے ہیں۔"

"کیا آپ اب بھی موسیقی بجاتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کیمپس کے کسی استقبالیہ بینڈ کے ساتھ کبھی کبھار شامل ہوجاتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "ریسرچ پروجیکٹس کے بیچ میں وقت نکال کر..... اور تم؟"

"اپنے ڈرائنگ روم سے باہر کچھ نہیں۔"

"یہ بات کافی افسوسناک ہے۔" جیسن نے کہا۔ "لیکن اب بھی وقت ہے کہ ہم اپنی لاؤنج ایکٹ چن لیں۔"

میں ہنس پڑا۔

لیکن جیسن نے مجھے پورٹ لینڈ، مین، بلانے کی زحمت صرف ایک جاز بینڈ شروع کرنے کے لیے نہیں کی تھی۔

"یہ ڈھانچا غائب ہونے کا کیا معاملہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس کے چہرے پر یکلخت سنجیدگی چھا گئی۔

"میں پیر کے دن آیا تو میری لیب تباہ حال تھی۔" اس نے کہا۔ "کافی سارا شیشے کا سامان چوری ہوگیا تھا۔ چند برنرز اور جیل پیکس بھی۔ خوش قسمتی سے کیمیکل محفوظ تھے کیونکہ وہ تالے میں رکھے ہوتے ہیں لیکن ریٹا بھی غائب تھی۔ مجھے شک ہوا کہ یہ ان بگڑے لڑکوں کے گروپ کا مذاق ہے جو خود کو فریٹ بوائز کہتے ہیں۔ شاید ہالووین کی سجاوٹ کے لیے لیکن....."

"لیکن؟"

اس نے آہ بھری۔

"ریٹا پلاسٹک کا ماڈل نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "وہ ایک حقیقی انسانی ڈھانچا ہے۔ میرے پاس اس کی قانونی دستاویزات موجود ہیں لیکن میں بس چاہتا ہوں کہ وہ صحیح سلامت واپس آجائے۔"

ویلیری نے حیرت سے ایک گہری سانس لی۔

عام طور پر میں وہ کیس نہیں لیتا جو لاشوں سے شروع ہوں۔ چاہے کبھی کبھار وہ اس پر ختم ہوتے ہوں۔

"انسانی باقیات کی بے حرمتی۔" میں نے کہا۔ "یہ ریکارڈ پر اچھا نہیں لگے گا۔"

"بالکل۔" اس نے کہا۔ "میں کسی کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ میں بس چاہتا ہوں کہ ریٹا واپس آجائے، بغیر کسی سوال کے۔ کیا تم یہ کرسکتے ہو؟"

"میں کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے پاس ایک انسانی ڈھانچا کیسے آیا؟"

"یہ تو مجھ سے پہلے سے یہاں موجود تھا۔" اس نے کہا۔ "یہ پچھلے پروفیسر ڈاکٹر بل ہیرلڈ کا تھا۔ ان کے نام پر لیکچر لیب کا نام رکھا گیا ہے۔ یہ ہمیشہ سے ڈیپارٹمنٹ کا پالتو سا حصہ رہی ہے۔" اس نے اپنا فون نکالا اور تصویریں دکھانے لگا جن میں وہ ڈھانچا تتلی کے پروں، سرخ پردم ڈریس میں جیسن کی میز پر ہوائی قمیص، سن گلاسز اور ہیٹ میں ایک کاغذی چھتری کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ "انہوں نے اس کے ساتھ کافی مزے کیے تھے، سمجھ گئے نا.....؟"

ایسا لگتا تھا جیسے کچھ زیادہ ہی مزے کیے گئے تھے۔

میں ہالووین کے مذاق سے زیادہ لیب میں ہونے والی چوری کی فکر میں تھا لیکن مجھے اپنے کلائنٹ کی راہنمائی پر چلنا تھا۔

"کیا ہم جائے واردات دیکھ سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"آیئے، اس طرف۔" اس نے کہا۔

وہاں ایک اسٹوڈنٹ موجود تھا جس کے بال بکھرے ہوئے اور گلابی رنگ کے تھے۔ گول چشمہ پہنے ہوئے تھا اور USM کی ہوڈی پہنی ہوئی تھی۔ وہ ایک لیب ٹیبل مطالعہ کررہا تھا۔

"مجھے اندازہ تھا کہ تم یہاں ملو گے، لوگن!" جیسن نے کہا پھر میری طرف دیکھا۔ "لوگن میرے بہترین طلبہ میں سے ہے۔ بیالوجی اور کریمنل جسٹس دونوں کو ساتھ لے کر چل رہا ہے اور فرانزک سائنس میں اپنے جونیئر ریویو تھیسس پر بھی کام کررہا ہے۔ کبھی تمہاری ایجنسی کے لیے بھی کام کرسکتا ہے۔"

لوگن اپنے خستہ حال کونورس جوتوں کو قدرے شرمندگی سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" اس نے کہا۔ "ڈاکٹر پیرس! ریٹا کے بارے میں سن کر افسوس ہوا۔"

"کیا تم نے اِدھر اُدھر سے کچھ سنا؟" اس نے پوچھا۔ "کوئی ایسی بات کہ مذاق کرتے ہوئے کسی نے کہا ہو کہ ریٹا ان کے پاس ہے؟"

"نہیں، سوری..... لیکن میں عموماً فریٹ بوائز کی باتوں پر توجہ نہیں دیتا۔"

مجھے عجیب سا سکون محسوس ہوا۔ جانے کیوں مجھے یوں لگ رہا تھا کہ لوگن اس میں ملوث نہیں ہے۔ اب مجھے ایک ایسے نوجوان گواہ کی تلاش تھی جس سے مجھے تفتیش کرنا پڑتی اور جسے خود کو معصوم ثابت کرنا پڑتا لیکن اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ میرے پاس جرم کے استعارے کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔

"کیا عمارت کے باہر کیمرے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ "کی کارڈ ایکسیس ہے؟"

"ہیں۔" اس نے کہا۔ "اور میں کیمپس سیکیورٹی سے

ریکارڈ حاصل کرسکتا ہوں لیکن پھر یہ معاملہ باضابطہ بن جائے گا اور میں ابھی یہ قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ جب تک واقعی ضرورت نہ پڑے۔"

اس فوٹیج سے کیس منٹوں میں حل ہوسکتا تھا۔ یقیناً یہ سستا بھی ہوتا لیکن جیسن جیسے مرد اور میں پولیس کو شامل کرنے سے پہلے ہزار بار سوچتے ہیں۔ ایک بار پولیس کو شامل کرلیا تو واپسی کا کوئی راستہ نہیں رہتا۔

"جب تم نے لیب کو پایا تو اس کی حالت کیسی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"کیبنٹ کا تالا ٹوٹا ہوا تھا، کچھ شیشے کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ شاید جب وہ سامان باندھ رہے تھے تو حادثاتی طور پر گرا ہو اور ظاہر ہے ریٹا اپنے ریک سے غائب تھی۔" اس نے کہا۔ "میں تو بس خوش ہوں کہ انہوں نے کوئی کیمیکل چرانے کی کوشش نہیں کی ورنہ حالات بہت خراب ہوسکتے تھے۔"

یہ کم از کم ایک اطمینان کی بات تھی۔

جیسن نے ہمیں فری پورٹ کے ڈاؤن ٹاؤن میں ہاراسی کیٹ ان ہوٹل کے ایک سوئٹ میں ٹھہرایا۔ میں نے لیونگ روم کو اپنا آفس بنایا، کافی بنائی اور جمعرات کی رات کے منصوبے ترتیب دینا شروع کردیے۔

"یہاں سولہ ایسے گروپس ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں نے ان سب کے سوشل میڈیا اکاؤنٹس کو چیک کیا اور جو معلومات ملی ہیں، ان کے مطابق دس گروپ آج رات ہالووین پارٹی کررہے ہیں۔"

"اور تم سوچ رہے ہوگے کہ مجھے ساتھ لے کر نہ جاؤ۔" ویلیری نے باتھ روم سے مذاق کرتے ہوئے کہا جہاں وہ اپنی پلکوں پر مسکارا لگا رہی تھی۔ "لیکن اگر تم اکیلے گئے تو وہ تمہیں سیکنڈز میں پہچان لیں گے۔"

یقین کرنا مشکل تھا کہ ویلیری نے محض چھ ہفتے پہلے ہی میری فرم جوائن کی تھی۔ وہ نہ صرف اپنی ذمے داریاں بخوبی سمجھ چکی تھی بلکہ میری بھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں اس کا روزمرہ کا کام اس کی صلاحیتوں سے کم تر تو نہیں۔

میں کافی دیر سے اپنے ہاتھوں کو بھینچنے اور ڈھیلا کرنے، گہری سانس لینے اور اپنی بے چینی کو خالی بیئر کے کین کی طرح کچلنے کی کوشش کررہا تھا۔

"یاد رکھو، کچھ پینا نہیں ہے۔" میں نے شاید تیرھویں بار اسے تاکید کی۔ "اگر کوئی مسئلہ ہو تو میسج کرنا۔ میں فوراً تمہیں نکالنے آجاؤں گا۔"

"اوکے ڈیڈ!" اس نے مذاق میں کہا۔

لیکن میرا ہنسنے کا اس وقت بالکل بھی موڈ نہیں تھا۔

میں خود بھی کئی بار خفیہ مشن میں نازک صورتِ حال سے دوچار ہوچکا تھا۔ دو بار گولی لگنے سے بال بال بچا تھا لیکن میرے پاس لائسنس تھا۔ میں خطرات سے نمٹنا جانتا تھا۔

"میں سنجیدہ ہوں، ویلیری!" میں نے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔ اندر جانا اور فوراً واپس آنا۔ ہمیں اور بھی بہت سے گھروں پر جانا ہے۔"

"مارٹن! میں وعدہ کرتی ہوں، میں بالکل محتاط رہوں گی۔" اس نے کہا۔ وہ لیگنگز اور ایک بڑی سی شرٹ میں آئی جو میں نے بک اسٹور سے خریدی تھی۔ یہ کوئی مخصوص پوشاک تو نہیں تھی لیکن بھیڑ میں گھل ملنے کے لیے مناسب تھی۔ وہ مسکرا کر بولی۔ "چلیں پارٹی کرنے؟"

میرا دل بالکل بھی نہیں چاہ رہا تھا یا پھر شاید کبھی نہ چاہا ہو۔

"چلو۔" میں نے بغیر کسی جوش کے کہا۔

پہلے دو گھروں پر کچھ خاص نہیں ملا۔ بس وہی گروہ چمکدار ٹائیوں میں اور پتلی لڑکیاں چھوٹے ٹاپ میں ادھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ ٹیکسیوں یا دوستوں کی کاروں سے نکل کر، تیز موسیقی کے ساتھ۔ یہ وہ منظر تھا جسے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ ہاؤس پارٹیاں، اونچی موسیقی، سستی شراب اور خوبصورت لڑکیاں۔ صرف کپڑے اور گانے بدلے۔

تیسرے گھر پر میں نے کونے پر گاڑی پارک کی اور ویلیری کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ ویلیری کار میں دوران بیٹی پیجز کے تیسرے البم "ویکیشن فوٹوز" لائی تھی لیکن یہ پہلا موقع تھا جب میں نے اسے واقعی سنا لیکن اب سن کر محسوس ہوا کہ جیسن کے بول پہلے کہیں زیادہ تیز اور کاٹ دار تھے۔

"لوسی کا ڈائمنڈ رنگ" تو شاید ان میں سب سے زیادہ تاریک گانا تھا۔

میں نے پورا البم مکمل کرلیا۔ "پگسکن سوٹ" دوبارہ بجنے لگا۔ پینتالیس منٹ ہوچکے تھے۔ میں اپنی سیٹ پر بے چین ہورہا تھا۔

میں نے اسے میسج کیا۔ "تم ٹھیک ہو؟"

اگر ویلیری کو وہاں سے نکالنے کی ضرورت پڑتی تو میں دروازہ توڑ کر بھی اندر گھس جاتا۔ چاہے کوئی مجھے سمجھے یا پولیس والا۔ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

اچانک میں نے اسے سیڑھیوں پر دیکھا۔ وہ آہستہ نیچے آرہی تھی۔ حتیٰ کہ جب ایک کھلاڑی نما لڑکا اس سے ٹکرا کر اپنا بیئر گرا بیٹھا اور چیخنے لگا، تب بھی وہ نہیں گھبرائی۔ وہ کار میں آکر بیٹھ گئی۔ زرد چہرہ، لرزتے ہاتھ۔ سیدھا سامنے دیکھنے لگی جیسے میں وہاں تھا ہی نہیں۔ میں

''ویلیری!'' میں نے بمشکل کہا۔ ''تم ٹھیک ہو؟''

کیا اسے نشہ دیا گیا تھا..... کیا اسے ڈاکٹر کی ضرورت تھی یا پھر محض ایک ٹھنڈے شاور اور ایک لمبی نیند کی؟

آخر کار وہ میری طرف مڑی۔ ''ہمیں پولیس کو بلانا ہوگا۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔ ''نیچے تہ خانے میں میتھ لیب ہے۔''

ریٹا کا کوئی نشان نہیں تھا لیکن ویلیری کے مطابق سارا چوری شدہ گلاس ویئر تہ خانے میں سیٹ اپ تھا جس میں پینٹ تھنر اور نزلہ زکام کی گولیاں بھری ہوئی تھیں۔

ہم نے دیکھا کہ کچھ ہی دیر میں کیسے پولیس کی گاڑیاں گلیوں میں بھر گئیں اور طلبہ کھڑکیوں اور فائر اسکیپ سے ایسے بہہ نکلے جیسے سیلاب آگیا ہو۔

ہم وہاں زیادہ دیر نہیں رکے۔ ہمیں بطور گواہ کسی کیس میں الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ خاص طور پر جب یہ مقام ہمارے گھر سے چھ گھنٹے کی دوری پر تھا۔

ہوٹل میں واپس آکر میں نے ویلیری کو بیڈ روم دے دیا۔ میرا ویسے بھی ابھی سونے کا ارادہ نہیں تھا۔ مجھے اپنے آپ پر بہت غصہ آرہا تھا۔

میتھ لیب۔

کیا کسی نے لیب کا سامان چوری کیا؟

اور میں وہ بے وقوف تھا جس نے ویلیری کو وہاں بھیجا۔ پورا مقام دھماکے سے اڑ سکتا تھا جبکہ وہ اندر موجود ہوتی۔ اس کا کام صرف فون سننا اور میری فائلیں ترتیب میں رکھنا تھا۔ چاہے اس نے میرے ساتھ جانے کے لیے کتنی ہی منتیں کی ہوں مگر اس سب کے لیے کوئی کنٹریکٹ نہیں کیا تھا۔

بیڈ روم کا دروازہ کھلا، ویلیری باہر نکلی۔ اس نے چیک دار پاجامہ اور لمبی آستینوں والی اسٹیلی ڈین ٹور شرٹ پہن رکھی تھی۔

''تمہیں بھی نیند نہیں آرہی؟'' اس نے پوچھا اور ے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

''بالکل بھی نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم ٹھیک محسوس ہی ہو؟''

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''بس کچھ پرانی بری واپس آگئیں اور بس۔''

مجھے ویلیری کی زندگی کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں تھا۔ پہلی بار جب وہ مجھ سے ملی تب اسے اپنے ن کے ایک آرٹیکل کے لیے میرے بینڈ کے بارے

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اچھی دلچسپیاں رکھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

سرگزشت کراچی
ماہنامہ
شمارہ اگست 2025ء
کی جھلکیاں

ابنہ گیر
اردو کے درویش صفت قلمکار کا احوال زیست

خوابوں کی قیمت
ایک سعی لاحاصل کا عبرت بھرا انجام

مرد بحران
کرکٹ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے تحفہ

شہر آشوب
اسی شہر میں صرف جرائم پلتے تھے

جان جا
قدم قدم پر حادثات تھے، ایک بے وطن کی روداد

انیس درد مند
1947ء کے فسادات سے ابھری ایک انوکھی سچ بیانی

اس کے علاوہ
ڈھیر سارے سچے قصے، دلچسپ
واقعات اور عبرت بھری سچ بیانیاں

وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے
ہیں۔ آپ کو پڑھنا چاہیے

یہ شمارہ بہت خاص ہے، ضرور ملاحظہ کریں

میں کچھ سوال پوچھنے تھے۔ اس کا بیک گراؤنڈ چیک کیا تو صاف آیا اور اس کی آنٹی جینا نے اس کی ضمانت دی لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس کی زندگی کا ایک بڑا حصہ ابھی تک مجھ سے اوجھل تھا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں؟'' میں نے احتیاط سے کہا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ میتھ لیب ہے؟''

اس نے ایک تکیہ اٹھایا اور سینے سے لگالیا۔ ''میں میمفس میں کچھ خطرناک لوگوں کو جانتی تھی۔'' اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''میں خود شامل نہیں تھی، بس میں اس کے بارے میں مزید بات نہیں کرنا چاہتی۔''

میں اسے سمجھ سکتا تھا۔ ہم چند لمحوں تک خاموش بیٹھے رہے پھر میں نے دوبارہ بات کی۔

''یہ بات مجھے پریشان کررہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس لڑکے کے پاس لیبارٹری کا سارا سامان تھا لیکن ڈھانچا نہیں تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کررہا ہے اور شاید وہ توجہ نہیں چاہتا تھا۔ تو پھر ریٹا کو کیوں لے گیا؟''

''موقع پر کیا گیا جرم!'' اس نے اندازہ لگایا۔ ''وہ لیب کا سامان لے رہا تھا اور اس کے کسی ساتھی نے موقع دیکھ کر ریٹا کو بھی اٹھالیا۔''

''لیکن پھر بھی ہمیں یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے؟'' میں نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ہم دو مختلف کیسز دیکھ رہے ہیں۔''

ویلیری نے آہ بھری۔ وہ پیچھے ہوئی اور پاؤں میز پر رکھ دیے۔

''لیکن ان میں سے صرف ایک ہمارا کیس ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اور وہی ہے جس کے بارے میں ہمارے پاس کوئی خاص معلومات نہیں ہیں۔''

میں نے ویلیری کو سونے دیا جبکہ اگلی صبح میں جیسن سے یونیورسٹی کیفے میں ملا۔

''راستے میں لیب پوسٹ پر یہ دیکھا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے ایک پیپر پکڑایا جس پر have you seen me? لکھا ہوا تھا اور ساتھ میں ریٹا کی تصویر تھی۔

''پوری یونیورسٹی اس سب کو مذاق سمجھ رہی ہے۔''

''شاید اس سے کچھ مدد مل جائے۔'' میں نے کہا۔

وہ ہنسا اور کافی کا گھونٹ لیا۔

''مگر مجھے ایسا کچھ خاص یقین نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''سنا ہے تم نے میرا سامان ڈھونڈ لیا؟''

''ہاں ڈھونڈ لیا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تم اسے واپس نہیں لینا چاہو گے۔''

''میتھ بنانے والے۔'' اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ ''میں درجن بھر اور اسٹوڈنٹس کا سوچ سکتا تھا لیکن میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ٹائلر اس سارے گند میں شامل ہوگا۔ مجھے بے حد حیرت ہوئی تھی جب اس نے ان آوارہ لڑکوں کا گروپ جوائن کیا تھا۔ حالانکہ وہ کسی بھی طرح سے پارٹیز کا شوقین نہیں تھا۔ میرا ماضی دیکھ کر تم ہی بتاؤ مجھ میں کتنی صلاحیت ہے کسی کو پہچاننے کی؟''

''جیسن!'' میں نے کہا۔ ''اگر کوئی بات ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو.....''

''کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں نے انہیں میتھ بنانا سکھایا؟'' میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتے ہو میں نے کبھی اس چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ حتیٰ کہ جب ہم پارٹیز میں جاتے تھے، تب بھی۔''

''میں نے یہ نہیں کہا۔'' حالانکہ میں واقعی نہیں جانتا تھا۔ جیسن اور میرا رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ ایسے وقت میں جب کیمیکل کا نشہ عام تھا، میں ہیروئن کی دنیا میں گم ہو چکا تھا۔ اس کی لت شاید مختصر رہی ہو۔ جیسن بہت اسمارٹ بندہ تھا، بہت ہوشیار اور اس کی ٹیوشن فیس کہیں سے تو آتی تھی۔ یقینی طور پر رائلٹیز سے تو نہیں۔

''تو پھر تم کہنا کیا چاہتے ہو، مارٹن؟''

''میرے تجربے میں.....'' میں نے احتیاط سے کہا۔ ''وہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اہم ہوتی ہے۔ چاہے وہ لاشعوری طور پر چھپی ہو یا جان بوجھ کر چھپانے کی کوشش کی گئی ہو۔ کسی کیس کا رخ موڑنے کے لیے سارے طریقے آزمانے پڑتے ہیں، ٹھیک ہے نا؟''

اس نے اپنی آنکھیں ملیں پھر کافی کا ایک گھونٹ لیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے معاف کردو۔ میں بس تھوڑا سا پریشان ہوں۔ اس کے بعد مجھے صدر اور اسٹریٹجک کمیونی کیشنز کے نائب صدر کے ساتھ میٹنگ کرنا ہے تاکہ یہ طے کرسکیں کہ ہم اس معاملے کو کیسے سنبھالیں گے۔ میڈیا پہلے ہی ہم پر دباؤ ڈال رہا ہے۔ بڑی سرخی بن چکی ہے۔''

مجھے اس میں کوئی شک نہ تھا۔ ''میں اب بھی کیس پر کام کررہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اب دھیان دو۔ کوئی ایسا اسٹوڈنٹ جس کا رویہ عجیب ہو یا جس دن ریٹا لاپتا ہوئی تھی، اس روز کوئی غیر حاضر رہا ہو۔ کیا کچھ یاد آرہا ہے؟''

اس نے ایک پرانی گریڈنگ بک نکالی۔ ''پرانے زمانے کی چیز ہے۔'' اس نے صفحات پلٹتے ہوئے کہا۔

"لوگن اس دن کلاس میں نہیں تھا۔" اس نے نوٹ کرتے ہوئے کہا۔ "مگر اس نے پہلے ہی بتایا تھا کہ وہ جمعے کو شہر سے باہر جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ سب موجود تھے۔ یہاں تک کہ ٹائلر رابن، ہمارا باورچی بھی۔"

"ٹائلر کے بارے میں بتاؤ۔"

"اس کے ساتھ کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی۔" اس نے کہا۔ "وہ میرے اچھے اسٹوڈنٹس میں سے ایک ہے لیکن چند دنوں سے وہ کچھ الجھا الجھا لگ رہا تھا۔ پچھلے ہفتے وہ کلاس میں ہی سو گیا تھا۔"

"میتھ کا نشہ اترتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

جیسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے نہیں لگتا کہ وہ نشہ کر رہا ہے۔" اس نے کہا۔ "اس نے جاگنے پر معذرت کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ پوری رات پڑھائی کرتا رہا تھا اس لیے، مگر میرے خیال سے ایسا کرنے کی اسے کچھ خاص ضرورت بھی نہیں تھی کہ ماسٹرز اور پی ایچ ڈی پروگرامز حاصل کرنے کے لیے اسے اضافی محنت کرنا پڑے۔"

میں ہر قسم کے بہانے سنتا رہتا تھا۔ خود بھی زیادہ تر بہانے بنا چکا تھا مگر اب بھی کچھ چیزیں غائب تھیں اور میرے پاس جیسن پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ واحد شخص تھا جس کے پاس مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

میرا خیال تھا کہ جب میں ہوٹل واپس آؤں گا تو ویلیری نے کسی کاغذ پر نوٹ لکھا ہوا چھوڑا ہوگا کہ وہ پیرین واپس بس سے چلی گئی ہے اور مجھے چھوڑ دیا ہے۔

مگر ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ جاگ رہی تھی اور کافی پی رہی تھی۔

"جب تم گئے تو میں نے تھوڑی تحقیق کی۔" اس نے کہا اور اپنا لیپ ٹاپ میری طرف گھمایا۔ "ڈاکٹر ہیروڈ پر، ریٹا کے اصل مالک پر۔ سوچا شاید کوئی رشتے دار یا پرانا طالب علم کوئی نشانی لینے واپس آیا ہو۔"

مجھے معلوم تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ کیوں لایا تھا۔

"بہترین سوچ ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا پتا چلا؟"

"اپنی تمام کامیابیوں اور ایوارڈز کے علاوہ وہ ڈرمیسٹڈ مکھیوں کی حیاتیات پر کئی کتابیں شائع کر چکے تھے۔ وہ اوکلاہوما اسٹیٹ میں پڑھا رہے تھے جب 1996ء میں ایک طالبہ سینڈرا کریسٹ لاپتا ہوگئی تھی۔" اس نے کہا۔ "یہ بات دی ڈیلی اوکلاہوما اخبار میں درج تھی کہ انہوں نے پولیس کو بتایا تھا کہ سینڈرا اس دوپہر ان کی لیب میں موجود تھی۔"

غیر معمولی

ایک صاحب کو مجبوراً ایک حویلی کے ایسے حصے میں ٹھہرنا پڑا جو آسیب زدہ مشہور تھا۔ میزبان کا ملازم انہیں ان کے کمرے تک چھوڑنے آیا تو انہوں نے اس سے پوچھا۔ "حال ہی میں اس کمرے میں کوئی غیر معمولی واقعہ تو پیش نہیں آیا؟"

"جی نہیں۔ چالیس سال سے یہاں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔" ملازم نے جواب دیا۔

مہمان نے اطمینان کی گہری سانس لی اور پوچھا۔ "چالیس سال قبل کیا غیر معمولی واقعہ پیش آیا تھا؟"

"ایک صاحب اس کمرے میں سوئے اور صبح زندہ پائے گئے۔" نوکر نے جواب دیا۔

(مرسلہ: نازیہ سلطان، فیصل آباد)

"کیا وہ کبھی ملی؟"

"نہیں۔" اس نے کہا۔ "لیکن تلاش روک دی گئی تھی، جب اس کے والدین کو اس کے اسکول اکاؤنٹ سے ایک ای میل موصول ہوئی کہ وہ اپنے بوائے فرینڈ رائن شاک کے ساتھ نیویارک بھاگ گئی ہے جو کہ ڈاکٹر ہیروڈ کی کلاس میں اس کا اسسٹنٹ تھا۔ وہ اکیس سال کی تھی اور اپنی مرضی سے گئی تھی۔ یہ کوئی قابلِ تشویش بات نہیں تھی اس لیے اسے واپس لانے کے لیے کچھ خاص نہیں کیا گیا۔"

"رائن کا کیا ہوا؟"

"شاید وہ دونوں الگ ہو گئے تھے۔" اس نے کہا۔ "رائن کی 2007ء میں ایریزونا میں موت ہوگئی اور اس کی موت کی خبر میں سینڈرا کا کوئی ذکر نہیں ہے۔"

"نوجوان محبت۔" میں بڑبڑایا۔ "لیکن اس کا ہمارے کیس سے کیا تعلق ہے؟"

"ڈاکٹر ہیروڈ کے پاس اوکلاہوما میں سب کچھ تھا۔" اس نے کہا۔ "وہ ڈیپارٹمنٹ چیئر تھے، نکولس ہلز میں گھر تھا، اوکلاہوما سٹی سمفنی اور سائنس میوزیم اوکلاہوما کے بورڈ پر بھی تھے۔ تو پھر سب کچھ چھوڑ کر ملک کے دوسری طرف نئی زندگی کیوں شروع کی؟"

واقعی کیوں؟

☆☆☆

سینڈرا کی والدہ باربرا اب بھی ٹولیڈو، اوہائیو میں رہتی تھیں۔ میں نے ان کا نمبر تلاش کیا اور انہیں فون کیا۔ اپنا تعارف کروایا اور سانس روک لی۔ شاید میں بھوتوں کا پیچھا

کر رہا تھا۔ شاید میں اپنے مؤکل کے پیسے کا زیاں کر رہا تھا۔

''میری بیٹی بھاگ کر نہیں گئی تھی۔'' باربرا نے اصرار کیا۔ ''وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے مجھے خود بتایا تھا کہ وہ رائن سے تعلق توڑنے والی ہے۔ وہ کہتی تھی وہ بہت حاکم مزاج اور بورنگ ہے۔ خود اپنا سارا وقت لیب میں گزارتا تھا لیکن چاہتا تھا کہ وہ اس کے بغیر کہیں نہ جائے۔ وہ بہت ذہین نوجوان لڑکی تھی۔ مسٹر ویڈ! وہ اپنے ہاسٹل روم میں بیٹھ کر فلمیں دیکھتے رہنے اور اس کے مینڈکوں کی چیر پھاڑ ختم ہونے کا انتظار کرنے والی نہیں تھی۔''

''پولیس کہتی ہے کہ اس کے لاپتا ہونے کے فوراً بعد آپ کو اس کی طرف سے ایک ای میل موصول ہوئی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''کیا اس کے بعد آپ کا اس سے کوئی اور رابطہ ہوا؟''

''نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''گزشتہ بیس سالوں میں کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ ایسی لڑکیاں اپنی ماں کو اس طرح نہیں چھوڑتیں۔ کیوں..... کیا آپ کو اس کی کوئی خبر ملی ہے؟''

''بدقسمتی سے نہیں۔'' میں نے تسلیم کیا۔ ''لیکن ایک اور تفتیش کے دوران اس کا نام سامنے آیا ہے۔ کیا اس نے کبھی آپ سے ڈاکٹر مل ہیروڈ کا ذکر کیا تھا؟''

''وہ اس کے پروفیسرز میں سے ایک تھا۔'' انہوں نے کہا۔ ''رائن اس کا ٹیچنگ اسسٹنٹ تھا۔ وہیں ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ کبھی کبھار ڈاکٹر کے گھر کھانے پر جاتے تھے۔ میرا خیال ہے رائن اسے ایک باپ کی طرح دیکھتا تھا لیکن سینڈرا کو وہ تھوڑا عجیب لگتا تھا۔ کہتی تھی کہ اس کے تہ خانے میں گوشت کھانے والے بھونرے رکھے تھے اور پورے گھر میں جانوروں کی ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔''

ایک عجیب سی سنسناہٹ میرے پورے بدن پر رینگ گئی۔ شاید مجھے ایسا جواب مل گیا تھا جس کی میں نے کبھی توقع نہیں کی تھی۔ ایک ایسے کیس کے بارے میں جس کا میں نے کبھی حصہ بننے کا سوچا بھی نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ میری آواز ساتھ چھوڑ دیتی، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اگر سینڈرا کے بارے میں کچھ معلوم ہوا تو رابطہ کروں گا اور کال بند کر دی۔

مجھے یہ کیس ذرا بھی پسند نہیں آ رہا تھا۔

ویلیری دوسرے کمرے سے آئی۔ ''میں ابھی اوکلاہوما یونیورسٹی میں شعبہ حیاتیات کے سربراہ سے بات کر کے آ رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''پتا چلا ہے کہ ڈاکٹر ہیروڈ نے جب اپنا لیب چھوڑا تھا تو اپنی پلاسٹک کی ڈھانچے والی لاش وہیں چھوڑ دی تھی۔''

☆☆☆

اگر ٹائلر نشہ کر رہا تھا تو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ منشیات نے ابھی اسے ہڈیوں کا ڈھانچا نہیں بنایا تھا۔ اس کے دانت ٹھیک تھے، جلد صاف تھی۔ وہ کاؤنٹی جیل کے باہر اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا مگر جیسن سے آنکھیں نہیں ملا پا رہا تھا۔

''مجھے افسوس ہے ڈاکٹر پیریس!'' وہ بڑبڑایا۔ ''میری نیت یہ سب کرنے کی نہیں تھی۔''

''مجھے بس یہ جاننا ہے کہ کیوں؟'' جیسن نے کہا۔ ''اسے تمہاری ضمانت ادا کرنے کی قیمت سمجھ لو۔''

''ٹیوشن بہت مہنگی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں نے سوچا ہم تھوڑا سا میتھ بنا لیں گے۔ جیسے ٹی وی پر ہوتا ہے۔''

وہ ٹی وی سیریز ''بریکنگ بیڈ'' کا فین نکلا جس میں ایک کیمسٹری پروفیسر اپنے سابق اسٹوڈنٹ کے ساتھ مل کر میتھ بناتا ہے۔

''میرا نہیں خیال کہ ''بریکنگ بیڈ'' تمہارے دفاع کے لیے مناسب مثال ہے۔'' میں نے کہا۔ ''خاص طور پر جب تمہارے پاس سول گڈ مین جیسا وکیل بھی نہ ہو۔''

''ٹائلر! میں تمہاری مدد کر سکتا تھا۔'' جیسن نے کہا۔ ''اسکالرشپس ہیں، ورک اسٹڈی ہے، میرے پاس اضافی نصابی کتب بھی ہیں۔''

''اسکالرشپس میری ماں کی مدد نہیں کرتیں۔'' وہ بڑے کرب کے ساتھ بولا۔ اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔ ''میرے والد پچھلے سال فوت ہو گئے اور میری ماں کو کوئی نوکری نہیں ملی۔ لائبریری میں شیلفز سجانے سے اتنے پیسے نہیں آتے کہ میں اپنی ماں کو بھی بھیجوں اور اپنی فیس بھی ادا کر سکوں۔ یا تو میں نشہ بناتا یا یونیورسٹی چھوڑ دیتا۔ میرے دوست کا بھائی ساؤتھ میں رہتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ہمارا مال بیچ دے گا۔ دو بچ میں، ایسے میں، میں اپنی ماں کی کفالت کے لیے کچھ پیسے بھیج سکتا تھا تاکہ اسے کوئی دوسرا کام ملنے تک کچھ آسانی ہو۔''

''کیا تم نے کچھ بیچا؟''

''ابھی نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''یہ میرا پہلا بیچ تھا اور اب سب کچھ برباد ہو گیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم اب میری ماں کے ساتھ کیا ہو گا۔'' وہ رونے لگا۔

مجھے اس پر افسوس ہوا۔ میرے خیال میں جیسن اور ویلیری کو بھی ہوا۔ پورے معاملے کا مقصد ہی کچھ اور تھا۔

pklibrary.com

یہاں موجودگی کا مقصد پولیس کو شامل ہونے سے بچانا تھا لیکن کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں روکا نہیں جاسکتا۔ میں کسی بھی کہانی کے باوجود ایک میتھ لیب (Meth Lab) کو نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ کوئی بھی یونہی میتھ بنانے کے کام میں نہیں پڑتا۔

''میں تمہیں ایک اچھا وکیل دوں گا۔'' جیسن نے کہا۔ ''لیکن بدلے میں مجھے تم سے کچھ چاہیے۔''

''جو کہو۔'' اس نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

''ریٹا کہاں ہے؟'' جیسن نے پوچھا۔

''میں اسے لے جانا نہیں چاہتا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن اس نے مجھے پکڑ لیا اور ایک سودا کیا۔ اگر میں ریٹا کو اس کے حوالے کردوں تو وہ میرا سامان چرانے پر چپ رہے گا۔''

''کس نے تمہیں پکڑا تھا؟''

اس نے آہ بھری پھر نوٹ بک کا ایک ورق پھاڑا۔ اس پر ایک نام لکھا، تہ کیا اور مجھے تھما دیا۔ مجھے کھولنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں پہلے ہی جانتا تھا کہ اس پر کس کا نام لکھا ہے۔

ہم لوگ لوگن سے اس وقت ملے جب وہ اپنی ریسٹورینٹ جسٹس کلاس سے باہر نکل رہا تھا۔

''سنا ہے تم لوگوں نے ایک میتھ لیب پکڑی ہے؟'' اس نے کہا۔ ''پاگل پن ہے، ہے نا؟''

میں موڈ میں نہیں تھا۔ ''ٹائلر نے تمہیں کچھ بیچا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس نے ہمیں سب کچھ بتا دیا۔''

اس نے اپنے گلابی بالوں کو آنکھوں سے ہٹانے کے لیے زور سے سانس خارج کی۔ ''ظاہر ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یقیناً ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔''

''تم نے ریٹا کو کیوں لیا؟'' ویلیری نے پوچھا۔

''کیونکہ وہ ایک باعزت تدفین کی حقدار تھی۔'' اس نے کہا۔ ''وہ کبھی ایک جیتی جاگتی انسان تھی۔ وہ ہم سب کی تماش بین نظروں کے لیے یہاں لٹکی رہنے کی مستحق نہیں تھی۔''

''لوگن! اس نے اپنی لاش عطیہ کی تھی۔'' جیسن نے وضاحت کی۔ ''وہ اس لیے زمین پر تھی کہ وہ چاہتی تھی کہ دوسرے لوگ اس سے سیکھیں۔''

میں نے گلا صاف کیا۔ میں یہ بات یہاں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تصدیق کا انتظار کر رہا تھا لیکن اگر میں واقعی ریٹا کو ڈھونڈنا چاہتا تھا تو مجھے آخری بار کوشش کرنی تھی۔

''یہ پوری طرح سچ نہیں ہوسکتا۔'' میں نے کہا۔

مختصر مختصر

☆ اگر آپ عورت کو ایک کتاب کی طرح پڑھنا چاہتے ہیں تو یاد رکھیے کتاب بہ آوازِ بلند نہیں پڑھی جاتی۔

☆ بعض گنجوں کو تیراکی کے لباس میں دیکھ کر خیال آتا ہے کہ ان کا مسئلہ بالوں کی کمی نہیں بلکہ بالوں کی غلط تقسیم ہے۔

☆ بے خوابی اتنا بُرا مرض نہیں ہے بشرطیکہ آپ اسی کے بارے میں سوچتے سوچتے نہ جاگ رہے ہوں۔

تشکر

جج: شراب..... شراب..... اور صرف شراب نے تمہیں اس حال کو پہنچایا ہے۔

ملزم: شکریہ جنابِ عالی! آپ پہلے شخص ہیں جس نے حقیقت کو محسوس کیا ہے ورنہ سب یہی کہتے ہیں کہ یہ صرف اور صرف میری غلطی ہے۔

شخصیت

دو بکرے ٹہلتے ہوئے گلی میں جا رہے تھے۔ ایک بکرے نے اپنے سینگوں پر بولروں والا ہیٹ ٹکایا ہوا تھا۔ دوسرے بکرے نے اس سے کہا۔

''یار! بولروں والا یہ ہیٹ تم پر بالکل نہیں جچ رہا۔ اتنے مضحکہ خیز لگ رہے ہو۔''

''کوئی بات نہیں پیارے! میں ایک مغرور بکرا ہوں۔ یہ ہیٹ میں نے ذرا مختلف نظر آنے کے لیے سر پر رکھا ہوا ہے۔ قصاب کی دکان پر لٹکا ہوا تو میں اس سے کہیں زیادہ مضحکہ خیز نظر آتا۔''

☆☆☆

ٹیچر: ہارون! تمہاری لکھائی کافی بہتر ہوگئی ہے۔

ہارون: شکریہ سر!

ٹیچر: اور اب مجھے پتا چلا ہے کہ تمہاری املا میں کتنی غلطیاں ہوتی ہیں۔

☆☆☆

ایک ہوٹل میں نئے شادی شدہ جوڑوں کے لیے ہدایت درج تھی۔

''کھڑکیوں پر پردے ضرور ڈال لیجیے۔ آپ کا پیار اندھا ہوسکتا ہے مگر آپ کے پڑوسی نہیں۔''

(مرسلہ: علیزہ شاہ، لاہور)

pklibrary.com

''کیا مطلب؟''

''ڈاکٹر ہیروڈ سے ایک اوکلاہوما یونیورسٹی کی طالبہ کی گمشدگی پر سوالات کیے گئے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ کبھی نہیں ملی۔ اس کا بوائے فرینڈ رائن، ڈاکٹر ہیروڈ کا اسسٹنٹ تھا۔ وہ اس سے رشتہ توڑنے والی تھی اور کبھی وہ اور رائن دونوں لاپتا ہوگئے۔ پولیس نے سمجھا وہ میکسیکو بھاگ گئے لیکن اس کی ماں کو کچھ اور شک تھا۔''

جیسن کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا۔ ''پلیز! اتنا بتا دو کہ تم مذاق کر رہے ہو۔'' اس نے کہا۔

''ہمیں کچھ پتا نہیں چلے گا جب تک ہم ریٹا کو نہ ڈھونڈ لیں۔'' میں نے کہا۔ ''اس لیے لوگن! براہِ مہربانی ہمیں بتاؤ کہ وہ کہاں دفن ہے کیونکہ تم ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اگر وہ وہی ہے جس کے بارے میں ہم سوچ رہے ہیں تو وہ ایک باعزت تدفین کی مستحق ہے۔ اس کی ماں اپنی بیٹی کو الوداع کہنے کی حقدار ہے۔''

جیسن دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ وہ بے ہوش ہونے کے قریب تھا اور میں نے خود کو اسے سنبھالنے کے لیے تیار کرلیا۔

''مجھے بالکل خبر نہیں تھی۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''میرے پاس اس کے کاغذات تھے۔ میں نے ڈاکٹر ہیروڈ کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ میں اس کے بھوتروں کے لیے نمونے لایا تھا۔ وہ ایسا کیسے کرسکتا تھا؟''

''مجھے نہیں لگتا کہ اس نے اسے قتل کیا۔'' میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے اس نے صرف رائن کی مدد کی تاکہ وہ اس کی لاش کو ٹھکانے لگا سکے۔''

''یہ بھی کوئی کم بھیانک بات نہیں ہے۔'' جیسن نے کہا۔

''نہیں، بالکل نہیں۔'' ویلیری نے کہا۔ ''لیکن ہم حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے جب تک ریٹا نہ مل جائے۔''

لوگن نے سر جھکا لیا۔ ''وولف نیک اسٹیٹ پارک۔'' اس نے کہا۔ ''گرین ہاؤسز کے پار۔''

☆☆☆

دانتوں کے ریکارڈ سے تصدیق ہوگئی کہ ڈھانچا سینڈرا کریسٹ کا تھا۔ جسم پر کوئی واضح زخم کے نشانات نہیں تھے لیکن لوگن نے اپنے کریمنل جسٹس کے نصابی کتب سے اندازہ لگایا کہ رائن نے غصے میں آکر اسے گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا پھر ڈاکٹر ہیروڈ نے اپنے گوشت خور بھونروں کے ذریعے لاش کو ختم کرنے میں مدد دی۔ یہ ایک ہولناک بات تھی۔ کبھی ایک زندہ رہے انسان کا گوشت اپنے بھونروں کو کھلانا۔

سینڈرا کو کیمپس پر ایک جنازہ دیا گیا۔ اس کے بعد اس کی لاش کو مناسب تدفین کے لیے گھر بھیج دیا گیا۔ جیسن نے تعزیتی تقریر کی اور اس کے طلباء جن میں لوگن اور ٹائلر بھی شامل تھے، اس کے جنازے میں تابوت کو کندھا دینے والے بنے۔ ڈاکٹر ہیروڈ کا نام لیب سے ہٹا دیا گیا۔ میرا نام اخبارات میں مختصراً آیا لیکن جب رپورٹر نے میرے دفتر فون کیا تو میں نے تبصرہ کرنے سے انکار کردیا۔ میرا کردار محض ایک دوست کی مدد کرنے والے پرائیویٹ ڈیٹیکٹو کا تھا۔ حقیقی کہانی سے توجہ ہٹانے کا کوئی مقصد نہیں تھا۔

کچھ ہفتے بعد دفتر میں ایک ڈبا آیا۔ اندر ایک نوٹ تھا جو ویلیری کے نام تھا۔

جیسن نے لکھا۔ ''یہ کافی عرصے سے میرے گیراج میں پڑے تھے۔ یہ ان کے پاس جانے چاہئیں جو ان سے خوشی حاصل کریں۔''

ڈبے میں دستخط شدہ سی ڈیز، کچھ ٹی شرٹس اور ایک پوسٹر تھا جس پر دوروں کی تاریخیں قطاروں میں درج تھیں۔ ویلیری شرما گئی۔

''یہ تو پیار ہے اس کا۔'' ویلیری نے کہا۔ ''مجھے اسے شکریے کا نوٹ اور ساتھ میں بل بھیجنا ہوگا۔''

''بل بھیجنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''مگر شکریے کا نوٹ ضرور بھیج دینا۔''

ڈبے میں ایک پتلا سا لفافہ بھی تھا جس پر میرا نام لکھا تھا۔ میں نے اسے کھولا اور اس میں سے ایک پولرائڈ تصویر نکالی جس میں، میں اور جیسن ہالیڈے ان لاؤنج میں تھے۔

ان دونوں کی اپنی زیادہ تصاویر میرے پاس نہیں ہیں۔ بہت سی دھندلی یادیں، بہت سے زخم جنہیں میں بھول جانا چاہتا ہوں۔

مگر یہ دو آدمی جو نیلے اور چیتے کے پرنٹ والے کپڑوں میں مسکرا رہے تھے، ان سب سے الگ تھے۔

میرے ذہن میں جیسن کا گانا ''پگسکن سوٹ کیس'' گونجا۔

''ہمیں اپنے گلاس ٹکرانے کی ضرورت نہیں۔ بس ہیلو کہہ دینا کافی ہے۔''

''کبھی سوچا واپس جانے کا؟'' ویلیری میرے دروازے میں کھڑی تھی۔ ''دوبارہ میوزک پلے کرنے؟''

''شاید۔'' میں نے کہا۔ میں نے تصویر کو اپنے اسٹیپلر کے ساتھ لگا دیا اور لیپ ٹاپ کھولا۔ ''مگر ابھی نہیں۔''

⌘⌘⌘

pklibrary.com

دو نام قابیل اور ہابیل بہت زیادہ مشہور ہیں اور ان دونوں کے بارے میں لوگ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو قتل کر دیا تھا۔ اولادِ آدمؑ میں یہ پہلا قتل تھا اور یہ پہلی موت تھی کیونکہ حضرت آدمؑ و حوّا کے دنیا میں آنے کے

قابیل اور ہابیل

ضیا تسنیم بلگرامی

کائنات کی بنیاد سے جڑے دو اہم کردار... مثبت اور منفی... رقیب و حلیف... بھائی بھی دشمن بھی... قابیل اور ہابیل... کئی باتوں میں ان کرداروں کو اوّلیت حاصل ہے۔ پہلا قاتل، پہلا مقتول، پہلا حاسد، پہلا محسود، والدین کا پہلا نافرمان اور پہلا موت کا مزہ چکھنے والا انسان...! کرۂ ارض پر شیطان کا پہلا شکار۔ اس چھوٹے سے مضمون میں بڑے بڑے راز پوشیدہ ہیں جو رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لیے ہدایت و راہنمائی کا سبب ہیں... دنیا و آخرت کی زندگی سے متعلق چونکا دینے والے انکشافات کا مجموعہ۔

دنیا کو چلانے والے بہترین و راہنما اصولوں

پر مشتمل ایک پُرفکر تحریر

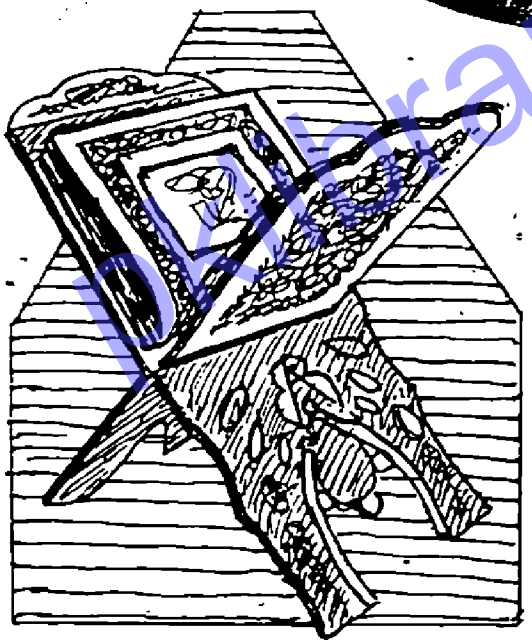

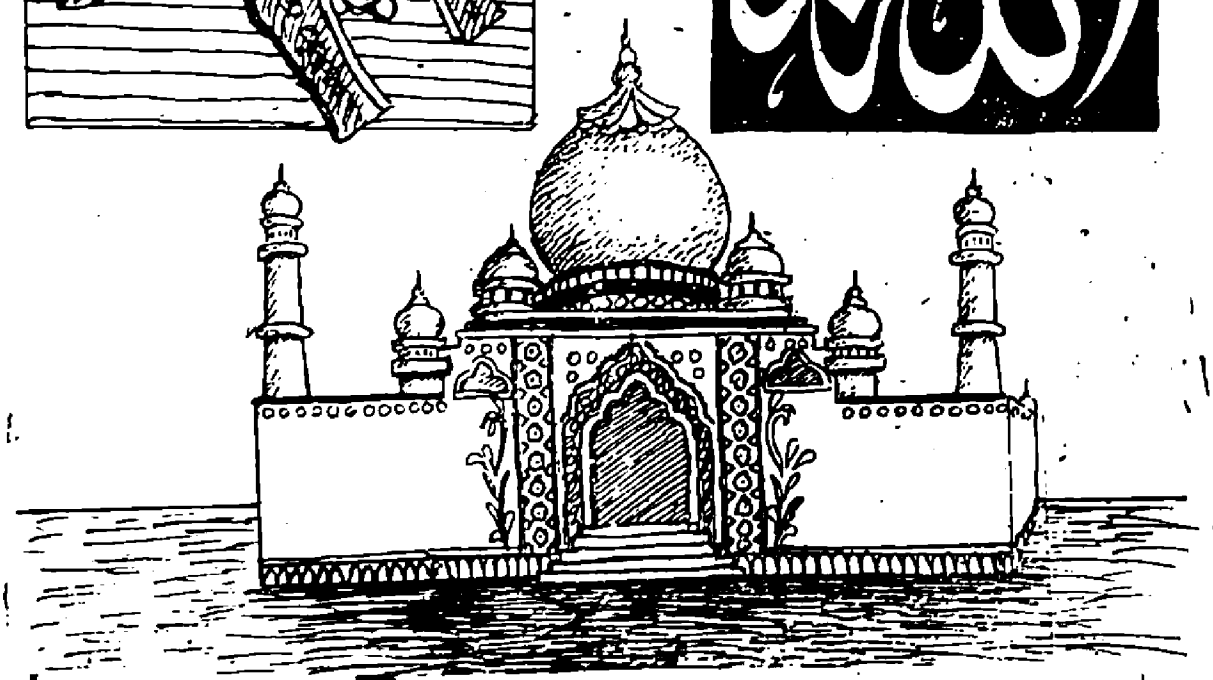

Library.com

بعد حضرت آدمؑ کی نسل اس طرح پیدا ہو رہی تھی اور پروان چڑھ رہی تھی کہ بیک وقت حضرت حوّا کے بطن سے دو بچے پیدا ہوتے۔ ان جڑواں بچوں میں ایک بیٹا ہوتا اور دوسری بیٹی اور پھر جب دوسری بار بیٹا اور بیٹی پیدا ہوتی تو حضرت آدمؑ و حوّا کو یہ فکر لاحق ہو جاتی کہ ان کے رشتے کس طرح کریں۔

حضرت آدمؑ نبی تھے اور مسجود ملائک بھی۔ خدا نے انہیں دنیا میں نہ صرف پہلے انسان کی حیثیت سے بھیجا تھا بلکہ اپنی نسل کے یہ پہلے نبی بھی تھے اور نبیوں کی راہنمائی اللہ کرتا ہے۔ حضرت آدمؑ بھی اپنے ہر معاملے میں اللہ کے حکم کے منتظر رہتے تھے۔

فرشتوں میں حضرت جبریلؑ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اور نبیوں کے درمیان واسطہ بنایا تھا۔ حضرت آدمؑ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حضرت جبریلؑ واسطہ بنے۔ چنانچہ جب جڑواں اولادوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اللہ نے انسانی رشتوں کے بارے میں حضرت جبریلؑ کے ذریعے حضرت آدمؑ کو مطلع کیا۔ انہیں حکم دیا گیا کہ پہلی جڑواں اولاد کو دوسری جڑواں اولاد سے اس طرح وابستہ کر دو کہ پہلی بیٹی کو دوسرے جڑواں بیٹے سے منسوب کر دیا جائے اور پہلے بیٹے کو دوسری جڑواں بیٹی سے منسوب کیا جائے۔ اسی طرح سے بقیہ بیٹے اور بیٹیوں کو وابستہ کیا جاتا رہے۔

اولادیں پیدا ہوتی رہیں۔ ان کی تفصیل قرآن پاک میں تو مذکور نہیں لیکن بنی اسرائیل کی کتابوں میں جس طرح مذکور ہے، اسی کی بنیاد پر اس واقعے کی جزئیات بیان کی جاتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ جب حضرت آدمؑ و حوّا کو رہتے ہوئے زمانہ گزر گیا اور اولادیں بھی پیدا ہوتی رہیں تو انہوں نے پہلے پیدا ہونے والے بیٹے قابیل کی بہن اقلیمہ کو چھوٹے بیٹے ہابیل سے اور ہابیل کی بہن غازہ کو قابیل کے لیے طے کر دیا۔

اقلیمہ بے حد حسین تھی مگر اس کے مقابلے میں غازہ کی شکل و صورت واجبی سی تھی۔

جب دونوں بھائیوں کے سامنے یہ رشتے رکھے گئے تو قابیل نے غازہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے لیے اقلیمہ کو پسند کر لیا۔ عذر یہی تھا کہ اقلیمہ بہت خوبصورت ہے اور میری بہن ہے اس لیے اس کا رشتہ مجھ سے ہونا چاہیے۔

حضرت آدمؑ نے قابیل کو سمجھایا۔ ”تو اس خدائی فیصلے میں تبدیلی چاہتا ہے جو ممکن نہیں ہے اور میں اپنا ہر کام خدا کی اجازت اور منظوری سے انجام دیتا ہوں کیونکہ میں نافرمانوں میں شامل نہیں ہونا چاہتا۔“

جب اسی قسم کی بات ہابیل سے کی گئی تو اس نے فوراً ہامی بھر لی اور کہا۔ ”میں اپنے کسی معاملے میں بھی نہ تو آپ کی حکم عدولی کروں گا اور نہ اللہ کو ناراض کروں گا۔“

اس وقت تک حضرت آدمؑ نے اپنی اولاد کو یا تو کاشت کاری سکھائی تھی یا کلہ بانی۔ قابیل کو کھیتی باڑی میں لگا دیا تھا اور ہابیل نے بہت سے مویشی پال لیے تھے۔

اقلیمہ کی وجہ سے دونوں بھائیوں میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور قابیل، ہابیل کو سمجھاتا رہتا تھا کہ وہ اس رشتے سے انکار کر دے۔ ہابیل نے ہر بار یہی جواب دیا۔ ”میں اپنے باپ اور اللہ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتا۔“

ہابیل اپنی شادی سے بہت خوش تھا لیکن قابیل انتہائی ناخوش۔ اب دونوں کی مخاصمت شدت اختیار کر گئی۔ جب بھی دونوں بھائیوں کا آمنا سامنا ہوتا، قابیل کی تیوریاں چڑھی رہتیں اور ہابیل نظریں نیچے کیے ہوئے سامنے سے گزر جاتا۔

اب جب بھی ہابیل کا قابیل سے سامنا ہوتا تو قابیل زور دیتا۔ ”بھائی ہابیل! اقلیمہ کو الگ کر دو تاکہ میں اسے اپنے ساتھ رکھوں۔“

ہابیل معذرت کر لیتا۔ ”میں ایسا نہیں کر سکتا۔“

ایک دن قابیل نے ہابیل کو راہ میں روک لیا اور کہا۔ ”میں تجھ سے آخری بار کہہ رہا ہوں، تو میری بات مان لے۔“

ہابیل نے کہا۔ ”بھائی! میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ میں اللہ کے نافرمان بندوں میں شامل نہیں ہونا چاہتا۔“

یہ جھگڑے بڑھتے رہے اور حضرت آدمؑ کی دوسری اولاد یہ تماشے دیکھتی رہی۔ جب حضرت آدمؑ کو یہ معلوم ہوا کہ قابیل نے ہابیل کو دھمکی دی ہے اور اقلیمہ کے لیے بضد ہے تو انہوں نے قابیل کو سمجھایا۔ ”مجھے اور اللہ کو ناراض نہ کرو۔“

قابیل نے کہا۔ ”کیا آپ نے اللہ کو ناراض نہیں کیا جو اب مجھے تلقین کرتے ہیں کہ میں اللہ کو ناراض نہ کروں۔“

حضرت آدمؑ نے کہا۔ ”میں نے دانستہ خدا کو ناراض نہیں کیا تھا بلکہ تیری ماں حوّا کی وجہ سے مجھے شرمندگی اٹھانا پڑی۔“

حضرت آدمؑ کو بیٹے کی گستاخی بہت ناگوار گزری تھی۔ انہوں نے کہا۔ ”مجھے جبریل کا انتظار ہے کیونکہ تم دونوں بھائیوں کا مسئلہ میں نے اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔“

حضرت آدمؑ نے خود بھی کھیتی باڑی کر رکھی تھی۔ وہ زمین جوتنے میں بیل کو کام میں لاتے تھے لیکن ادھر کچھ عرصے سے بیل نے بھی پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ حضرت آدمؑ اس سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ وہ چلتے چلتے کبھی اختیار کرتا تھا۔ حضرت آدمؑ نے بیل کے لکڑی رسید کی اور بیل نے بلبلانا شروع کر دیا۔ حضرت جبریلؑ نے پوچھا "اے آدم! کیا بات ہے پریشان کیوں ہیں؟"

حضرت آدمؑ نے جواب دیا۔ "اس بیل نے مجھے پریشان کر دیا ہے اور جب میں نے لکڑی سے اسے تنبیہ کی تو اس نے پتا نہیں اپنی زبان میں کیا کہہ ڈالا۔"

حضرت جبریلؑ نے کہا۔ "بیل کہہ رہا تھا کہ آدم مجھ کو تم ناحق مارتے ہو۔ اگر تم میں ذرا بھی عقل ہوتی تو اس دنیا میں نہ پھنستے۔"

حضرت آدمؑ کو یہ بات ناگوار گزری اور بہت تکلیف پہنچی۔ بیل کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور ایک طرف چل دیے۔

حضرت جبریلؑ نے پوچھا۔ "اے آدم! کہاں چلے؟"

حضرت آدمؑ نے جواب دیا۔ "اے جبریل! بیل نے مجھے سرزنش کی ہے اور مجھ پر طنز کیا ہے اس لیے میں نے اس سے قطع تعلق کر لیا۔"

حضرت جبریلؑ نے تسلی دی اور سمجھایا۔ "اے آدم! آپ کو اور آپ کی اولاد کو ہمیشہ یہ بات ذہن نشین رکھنی ہوگی کہ جو اللہ کی نافرمانی اختیار کرے گا وہ رنج میں گرفتار رہے گا۔ اب آپ کو ہمیشہ رنج و عذاب برداشت کرنا ہے اور تبھی آپ نعمت کھائیں گے۔"

خود حضرت آدمؑ کو بھی یہ احساس ہوا کہ جب تک وہ جنت میں رہے، انہیں رنج و غم کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا لیکن دنیا میں جانور تک ان پر طنز کر رہے تھے۔ حضرت آدمؑ نے حالات سے سمجھوتا کیا۔ بیل کو دوبارہ ہل میں جوتا اور کھیت میں کام شروع کر دیا۔

بیل نے اس بار کاندھے سے جوا اتار پھینکا اور دوبارہ پریشان کیا۔ حضرت آدمؑ نے بیل کی پشت پر دوبارہ لکڑی رسید کی۔

بیل شدت کرب سے چیخنے چلانے لگا لیکن اس بار اس کا منہ آسمان کی طرف تھا جیسے وہ اللہ سے فریاد کر رہا ہو۔ حضرت آدمؑ نے اس بار پھر بیل کو اس کے حال پر چھوڑا اور کھیت سے باہر نکل آئے۔

اس بار پھر حضرت آدمؑ کی ملاقات حضرت جبریلؑ سے ہوگئی۔

حضرت آدمؑ نے پھر بیل کی شکایت کی اور کہا۔ "اس بار جو میں نے اسے مارا تو یہ گریہ وزاری کرنے لگا اور یہ مسلسل آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔"

حضرت جبریلؑ نے جواب دیا۔ "آدم! بے شک بیل اللہ سے آپ کی شکایت کر رہا تھا، کہہ رہا تھا کہ نافرمانی کرنے والا مجھے نافرمانی پر سرزنش کرتا ہے۔ اللہ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے، سلام کہلوایا ہے اور کہا ہے کہ آپ نے بھی بہشت میں ایسا ہی کیا تھا۔ اس وقت آپ اذیت میں مبتلا ہیں، بیل پر سختی نہ کریں کیونکہ یہ آپ کے حق میں بہتر نہیں ہے۔ اپنے کھیت میں جائیں اور اپنا کام شروع کر دیں۔ میں بیلوں کی زبان پر مہر لگا دوں گا کہ وہ آئندہ بات نہ کر سکیں۔"

حضرت آدمؑ دوبارہ کھیتی باڑی میں مشغول ہوگئے لیکن اب وہ سوچ رہے تھے کہ دنیا میں ہر طرف دکھ ہی دکھ ہیں۔ بیل تکلیف پہنچا رہا ہے، اولاد بات نہیں مان رہی۔ وہ بھی من مانی کر کے اذیتیں دے رہی ہے۔

حضرت آدمؑ نے حضرت جبریلؑ سے کہا۔ "اے جبریل! قابیل میری نہیں سنتا اور بضد ہے کہ وہ اقلیمہ سے شادی کرے گا۔ اب اللہ سے معلوم کریں کہ میں قابیل کو کس طرح قابو کروں؟"

حضرت جبریلؑ چلے گئے پھر واپس آ کر بتایا۔ "اللہ تعالیٰ نے ہابیل اور قابیل کو حکم دیا ہے کہ دونوں بھائی قربانیاں پیش کریں۔ جس کی قربانی قبول ہوگی... اقلیمہ اسی کے حصے میں چلی جائے گی۔"

حضرت آدمؑ نے دونوں بیٹوں کو بلوایا اور انہیں اللہ کے فیصلے سے مطلع کر دیا۔

ہابیل نے اپنے گلے کے جانوروں میں سے کئی صحت مند جانور الگ کیے اور پھر انہیں کوہِ منیٰ پر لے جا کر باندھ دیا اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اے اللہ! میرے ریوڑ میں ان سے بہتر جانور نہیں تھے۔ انہیں تیری بارگاہ میں پیش کر رہا

ہوں۔"

قابیل نے بھی اپنے اناج کے ڈھیر میں سے خوب جستجو کے بعد ناقص اناج الگ کیا اور اسے لے کر کوہ منیٰ پر پہنچ گیا۔ اناج کو اونچی جگہ پر رکھ کر کہا۔ "اے اللہ! تو نے مجھ سے کچھ طلب کیا، وہ حاضر ہے۔ اسے قبول کر یا مسترد کر، تیری مرضی۔"

قربانی کی چیزیں کوہِ منیٰ پر رکھ دینے کے بعد قابیل اور ہابیل وہاں سے ہٹ آئے اور دور سے نظارہ کرنے لگے کہ دیکھیں کس کی قربانی قبولِ بارگاہِ انام ہوتی ہے اور کس کی نامقبول اور نامنظور۔

حضرت آدمؑ بھی یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد آسمان سے ایک آگ نمودار ہوئی۔ آگ کے اس شعلے کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں سے دھواں نہیں نکل رہا تھا۔ آگ نیچے آئی اور ہابیل کی پیش کی ہوئی نذر کو جلا کے راکھ کر دیا۔

دونوں بھائی بھاگے بھاگے اس جگہ پہنچے جہاں ایک کی قربانی قبول ہوئی تھی اور دوسرے کی نامقبول۔

اس وقت ہابیل کو بہت خوشی حاصل ہوئی تھی جبکہ قابیل کے چہرے کا رنگ فق تھا اور غم و غصے کی ساری علامات چہرے سے ظاہر ہو رہی تھیں۔ حضرت آدمؑ نے دونوں بھائیوں سے کہا۔ "اب تو تم دونوں سمجھ گئے ہو گے کہ اللہ کیا چاہتا ہے۔ وہ اللہ جو دلوں کے بھید جانتا ہے۔ اب اقلیمہ کی شادی ہابیل سے اور غازہ کی شادی قابیل سے برقرار رہے گی اس لیے اب تم دونوں بھائی آپس میں کوئی جھگڑا نہیں کرو گے۔"

قابیل نے غصے میں کہا۔ "مجھے اس فیصلے سے اتفاق نہیں ہے۔ میری قربانی کیوں نامقبول ہوئی۔ میں اب بھی اقلیمہ سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ میں اقلیمہ کے معاملے میں کسی کے فیصلے کو نہیں مانوں گا۔"

ہابیل نے کہا۔ "بھائی! اللہ ہم انسانوں کی نیتوں سے واقف ہے۔ وہ پرہیزگاروں کی قربانی قبول کرتا ہے اور اللہ کو ہم اپنی مرضی کے فیصلے پر مجبور نہیں کر سکتے۔"

قابیل کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ اس کے خلاف فیصلہ ہونے کے بعد وہ اب ہابیل سے اقلیمہ کو کس طرح جدا کرے گا۔ اب حضرت آدمؑ بھی اس فیصلے میں ردّوبدل نہیں کر سکتے تھے۔

قابیل حیران اور پریشان اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ اس کے سینے میں نفرت، حسد اور غصے کی آگ جل رہی تھی۔

ابھی تک نسلِ آدمؑ کو موت کا علم نہ تھا کہ زندگی کے ساتھ موت بھی لگی ہوئی ہے۔

یہ واقعات دمشق کے قریب جبلِ قاسیون میں پیش آ رہے تھے۔

قابیل آتشِ حسد میں جلا بھنا مارا مارا پھرتا رہا کہ ایک روز اس نے ایک ایسے انسان کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا جسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ حضرت آدمؑ کی تمام اولاد قابیل کے سامنے تھی لیکن یہ انسان ان میں سے نہیں تھا۔ اس شخص کے سامنے آنے کے بعد قابیل کے غیظ و غضب اور غصے میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔

اس شخص کے ہاتھ میں سانپ تھا جس کا منہ اس نے پکڑ رکھا تھا اور سانپ تلملا رہا تھا۔

قابیل کو اپنے باپ حضرت آدمؑ کے سلسلے میں یہ معلوم تھا کہ کبھی وہ بہشت میں رہتے تھے اور پھر ایک دن ایک مور نے سانپ کو جنت میں اُگل دیا تھا۔ یہ سانپ دراصل شیطان تھا جس کا جنت میں داخلہ ممنوع تھا لیکن وہ حضرت آدمؑ کو اپنے حسد کی وجہ سے ورغلانے پر کمربستہ تھا۔ مور سے دوستی تھی اور وہ بشکل سانپ مور کے پیٹ میں چلا گیا کیونکہ مور سانپ کو کھا جاتا ہے۔ اس مور نے سانپ کو بہشت میں اُگل دیا اور پھر شیطان نے حضرت حوّا کو ورغلایا اور حضرت حوّا نے حضرت آدمؑ کو شجرِ ممنوعہ کے استعمال پر مجبور کر دیا۔

دونوں نے گناہ کیا اور اللہ نے ان دونوں کی حکم عدولی پر انہیں جنت سے نکال دیا اور دنیا میں بھیج دیا۔ گویا قابیل کو یہ علم تھا کہ ایک بار شیطان سانپ کی شکل میں آ چکا ہے۔

آنے والے بڑے میاں نے قابیل سے پوچھا۔ "تم کیا سوچ رہے ہو؟"

قابیل نے جواب دیا۔ "میں تیرے ہاتھ میں سانپ کو دیکھ کر سوچ رہا ہوں کہ سانپ شیطان ہی کی ایک شکل ہے۔ کیا تو نے شیطان کو پکڑ رکھا ہے؟"

بڑے میاں نے جواب دیا۔ "اگر یہ شیطان بھی ہو تو مجھ سے سبقت نہیں لے جا سکتا۔ میں نے اسے اپنے قابو میں کر رکھا ہے۔"

پھر دفعتاً وہ سانپ اس شخص کے ہاتھ سے نکل گیا اور آزادی پاتے ہی وہ ایک طرف بھاگ نکلا۔

قابیل نے اس کا مذاق اُڑایا۔ ''بہت خوب! کیا قابو میں کیا ہے۔ وہ تو تیرے ہاتھ سے نکل گیا اور اب تیرے ہاتھ نہیں آئے گا۔''

بڑے میاں نے کہا۔ ''اے قابیل! تو مجھے ابھی نہیں جانتا۔ میری دسترس میں پوری دنیا ہے۔ یہ سانپ تو بہت معمولی شے ہے۔'' اور پھر اِدھر اُدھر زمین پر کچھ تلاش کرنے لگا۔ بالآخر اسے ایک پتھر نظر آ گیا۔ اسے اٹھایا اور بھاگتے ہوئے سانپ کے سر پر رسید کر دیا۔

قابیل نے دیکھا کہ پتھر کی ضرب نے سانپ کے سر کو کچل دیا تھا اور سانپ بالکل بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔

قابیل نے پوچھا۔ ''یہ سانپ کو کیا ہو گیا کہ پتھر نے اس کی شکل ہی بدل دی اور اب یہ حرکت بھی نہیں کر سکتا۔''

اس بزرگ نے کہا۔ ''میں نے اسے مار دیا۔ یہ مر چکا ہے۔ اب یہ کبھی بھی حرکت نہیں کر سکے گا۔''

قابیل نے پوچھا۔ ''تو کیا اس پتھر سے ہر جاندار کو اسی طرح کچلا اور مارا جا سکتا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''بالکل..... اور جب ایک بار کوئی جاندار مر جاتا ہے یا مار دیا جاتا ہے تو پھر وہ کبھی زندہ نہیں ہوتا۔''

اب قابیل کو موت کے بارے میں بہت کچھ جاننے کی فکر تھی۔ وہ اس بڑے میاں سے دیر تک موت کی باتیں کرتا رہا۔ قابیل کو خوب اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ جب کسی جاندار کو کسی وجہ سے موت آ جاتی ہے تو پھر وہ کبھی اپنی اصلی حالت پر نہیں رہ سکتا۔

قابیل کو جو کچھ معلوم ہوا تھا اس میں ایک عجیب سی لذت تھی اور روح کو کچھ عجیب سا سکون مل رہا تھا، پوچھا۔ ''اے شخص! میں تجھے نہیں جانتا لیکن یہ تو نے مجھے کیا دے دیا کہ مجھے ایک عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی ہے اور عجیب سی لذت مل رہی ہے۔''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''اے قابیل! اسے علم کہتے ہیں اور جب کسی کو یہ حاصل ہو جاتا ہے تو وہ انسان بڑی لذت اور خوشی محسوس کرتا ہے۔ نسلِ آدمؑ اس سے بہت زیادہ لطف اندوز ہو گی۔''

اس شخص نے قابیل کو جو کچھ بتایا تھا، اس میں قابیل کے لیے صرف ایک ہی بات قابلِ قدر تھی اور وہ یہ کہ ہر جاندار کو موت آتی ہے یا موت دی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ موت کے سلسلے میں پتھر کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

اب قابیل کو خیال آیا کہ ہابیل کو بھی اسی طرح مارا جا سکتا ہے اور اقلیمہ اس کی بیوی بن سکتی ہے۔

جس شخص نے سانپ کو مارا تھا، موت کے بارے میں بتایا تھا اور پتھر کے استعمال سے آگاہ کیا تھا، اب وہ شخص کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کہیں غائب ہو چکا تھا۔

قابیل نے ہابیل کو تلاش کیا اور کہا۔ ''دیکھو، میں نے کہہ دیا ہے کہ تم اقلیمہ کا خیال دل سے نکال دو اور اس کو میرے حوالے کر دو۔''

ہابیل نے جواب دیا۔ ''تم اللہ کے فیصلے کو نہیں بدل سکتے۔''

قابیل نے کہا۔ ''مجھے تمہارے سلسلے میں ایک ایسی بات معلوم ہوئی ہے کہ اگر میں اس پر عمل کروں تو تم مر جاؤ گے۔''

ہابیل نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہ مر جانا کیا چیز ہوتی ہے؟ میں نے موت کا نام پہلی بار سنا ہے اور اگر کسی کو موت آتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟''

قابیل نے کہا۔ ''جب تو اقلیمہ سے باز نہیں آئے گا تو میں تجھ کو قتل کر دوں گا اور قتل کر دینے کا مطلب ہے تجھ کو مار دوں گا۔ اس کے بعد اس دنیا سے تیرا رشتہ ختم ہو جائے گا۔''

ہابیل نے سب کچھ سمجھنے کے بعد جواب دیا۔ ''بھائی! قتل اور موت کے سلسلے میں تم نے مجھے جو کچھ بتایا ہے، میں اسے اچھی طرح جان گیا مگر تم مجھ پر کتنی ہی زیادتی کر لو، میں تم کو نہیں ماروں گا۔ تمہارے جو جی میں آئے وہ کرو۔''

ہابیل کی اس یقین دہانی کے بعد کہ میں تم کو نہیں ماروں گا، قابیل منصوبہ بندی کرنے لگا۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر وہ ہابیل کو مارے گا تو ہابیل بھی اس پر جوابی حملہ کر سکتا ہے اور وہ بھی اسے مار سکتا ہے۔

اسی دوران میں حضرت آدمؑ حج کی نیت سے مکہ چلے گئے اور قابیل نے موقع تلاش کرنا شروع کر دیا۔ وہ دن رات کے ہر حصے پر غور کرتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہابیل پر حالتِ غفلت میں حملہ کیا جائے تاکہ ہابیل بچاؤ بھی نہ کر سکے اور اس کے خلاف جوابی حملہ بھی نہ کر سکے۔

کئی دن بعد ہابیل اپنی مخصوص چٹان پر سویا ہوا تھا کہ قابیل کا بھی اُدھر سے گزر ہوا۔ وہ کچھ دیر کھڑا ہابیل کو دیکھتا رہا

اور آہستہ آہستہ آوازیں بھی دیں مگر جب دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو وہ اِدھر اُدھر پتھر تلاش کرنے لگا اور جب پتھر مل گیا تو قابیل نے اس پتھر سے اپنے چھوٹے بھائی کا سر کچل دیا جس سے بھیجا باہر نکل آیا۔

کچھ دیر کھڑا وہ یہ عبرتناک منظر دیکھتا رہا اور جب ہوش آیا تو اب یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اس مردہ ہابیل کو کہاں چھپایا جائے۔ آخر تنگ آ کر لاش کو اپنی پیٹھ پر لادا اور اِدھر اُدھر گھومنا پھرنا شروع کر دیا۔

لاش خراب ہونے لگی اور اندازہ ہوا کہ اس کو قتل کر تو دیا مگر قتل کرنے کے بعد مردہ جسم کو کس طرح چھپایا جائے یا اس سے کس طرح نجات حاصل کی جائے؟

اسی پریشانی کے عالم میں قابیل نے دو کوؤں کو آپس میں لڑتے ہوئے دیکھا۔ طاقتور کوّے نے کمزور کوّے کو اتنا مارا کہ وہ مر گیا اور جب وہ زندہ کوا اس کی موت کی طرف سے مطمئن ہو گیا تو چونچ اور پنجوں سے زمین کھودنا شروع کر دی۔ جب گڑھا ہو گیا تو مردہ کوے کو گڑھے میں ڈال کر اس پر مٹی ڈال دی۔

قابیل کو بے حد دکھ پہنچا کہ مردے کو دفن کرنے کا یہ معمولی سا علم بھی اس کو حاصل نہیں تھا اور اس حقیر پرندے کو قابیل سے زیادہ علم حاصل ہے۔ اگر کوے نے زمین کھود کر کوّے کو دفن نہ کیا ہوتا تو قابیل کو خود سے یہ تدبیر نہیں سوجھ سکتی تھی۔

قابیل نے بہ آواز بلند اپنے آپ سے کہا۔ ''ہائے میری شامت کہ میں اس کوّے سے زیادہ عاجز ہوں کہ اپنے بھائی کی لاش اپنی عقل سے کہیں چھپاؤں۔''

حضرت آدمؑ واپس آئے تو ہابیل کو نہ پا کر قابیل سے پوچھا۔ ''تیرا بھائی ہابیل کہاں چلا گیا۔ وہ کہاں ہے؟''

قابیل نے کوئی جواب نہ دیا۔

حضرت آدمؑ و حوا کئی دن تک بے قرار رہے اور کھانا پینا بھی چھوڑ دیا۔

اسی دوران میں حضرت آدمؑ نے خواب میں دیکھا کہ ہابیل انہیں مدد کے لیے پکار رہا ہے اور الغیاث الغیاث کی آوازیں آ رہی ہیں۔

حضرت آدمؑ نے قابیل سے کہا۔ ''میں تجھ سے تیرے بھائی ہابیل کے بارے میں پوچھتا ہوں اور تو کوئی جواب نہیں دیتا۔ آخر بات کیا ہے؟''

قابیل نے پھر کوئی جواب نہیں دیا اور اٹھ کر کہیں چلا گیا۔

حضرت آدمؑ کی فکر اور تشویش میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور کہا۔ ''اے اللہ! میں قابیل سے ہابیل کے بارے میں پوچھتا ہوں تو وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ میں قابیل سے بیزار ہوں۔''

جب حضرت آدمؑ بہت زیادہ پریشان ہوئے تو حضرت جبریلؑ نے اللہ کے حکم سے ان کے پاس آ کر پوچھا۔ ''اے آدم! آپ نہیں جانتے کہ قابیل آپ کے سوال کا جواب کیوں نہیں دیتا؟''

حضرت آدمؑ نے کہا۔ ''میں ہابیل کی طرف سے بہت فکرمند ہوں کہ اُسے کہاں تلاش کروں؟''

حضرت جبریلؑ نے کہا۔ ''اے آدم! قابیل نے حسد میں اپنے بھائی کو قتل کر دیا، اب ہابیل سے کبھی بھی آپ کی ملاقات نہ ہو گی کیونکہ وہ مر چکا ہے۔''

حضرت آدمؑ نے کہا۔ ''اے جبریل! مجھے اس مردہ ہابیل ہی سے ملوا دیں۔ اس کی لاش کہاں ہے؟''

حضرت جبریلؑ نے جواب دیا۔ ''اب ہابیل کی لاش بھی نہیں دکھائی جا سکتی کیونکہ قابیل نے اس کو قتل کر کے دفن کر دیا۔ میں آپ کو زیادہ سے زیادہ قتل کی جگہ دکھا سکتا ہوں۔ چٹان پر اب بھی خون کے دھبے موجود ہیں یا پھر ہابیل کی قبر دکھا سکتا ہوں جہاں کوے کی راہنمائی کے بعد ہابیل کو دفن کیا گیا۔''

حضرت جبریلؑ، حضرت آدمؑ کو اس جگہ لے گئے جہاں ہابیل اپنی بکریاں باندھا کرتا تھا اور وہیں چٹان پر سو جاتا تھا۔

حضرت جبریلؑ نے چٹان کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہابیل اس پر سویا ہوا تھا کہ سوتے میں قابیل نے اُس کا سر کچل دیا۔ یہ واقعہ منگل کے دن پیش آیا اور خون کے دھبے ابھی تک چٹان پر موجود ہیں۔''

حضرت آدمؑ نے پوچھا۔ ''اے جبریل! میری نسل کو ابھی تک موت کا علم نہیں تھا کہ موت بھی کوئی شے ہے اور اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ جاندار کو ہلاک بھی کیا جا سکتا ہے پھر قابیل کو یہ ساری باتیں کس طرح معلوم ہو گئیں؟''

حضرت جبریلؑ نے بتایا۔ ''ابلیس نے آپ سے حسد کیا، اللہ کی نافرمانی کی اور مردود بارگاہ ہوا۔ ابلیس نے مردود

بارگاہ ہو جانے کے بعد یہ عہد کیا تھا کہ وہ نسلِ آدم کو گمراہ کرے گا چنانچہ اس نے قابیل کو گمراہ کیا۔ گویا یہ اس کا پہلا شکار ہے۔ ابلیس بشکلِ انسان قابیل سے ملا۔ وہ اپنے ساتھ ایک سانپ بھی لایا تھا۔ پہلے تو اس نے قابیل کے دل میں والدین کی نافرمانی پیدا کی اور اس نے آپ کا حکم اور فیصلہ نہیں مانا پھر اس نے اللہ کی نذر میں دینے کے لیے گھٹیا چیزوں کا انتخاب کیا اور اللہ کے فیصلے سے بھی اتفاق نہیں کیا۔ اس کے بعد شیطان نے سانپ کو مار کر قابیل کو قتل کرنے کا علم دے دیا پھر کوّے نے لاش کو چھپانے کا علم دیا۔ اب جو آپ قابیل سے ہابیل کے بارے میں پوچھتے ہیں تو وہ کوئی جواب نہیں دیتا اور وہ اٹھ کر چلا جاتا ہے تو یہ بھی نافرمانی کی ایک قسم ہے۔ گویا شیطان نے آپ کی نسل میں گمراہی پھیلانا شروع کر دی ہے۔"

حضرت آدمؑ نے کہا۔ "میری نیک اولاد جو میری اولادوں کی راہنمائی کر سکتی تھی، اسے قابیل نے قتل کر دیا اور قابیل شرارت اور فتنہ و فساد پھیلانے کے لیے زندہ ہے تو اب میری نسل میں نیکی کس طرح پھیلے گی؟"

حضرت جبریلؑ نے جواب دیا۔ "اللہ نے ابھی تک آپ کو جڑواں اولاد دی تھی مگر اب وہ ہابیل کی جگہ آپ کو ایک بیٹا دے گا، نیک اور صالح بیٹا۔ اس کا نام شیث رکھا جائے۔ گویا آپ کی نسلوں میں گمراہی قابیل اور اس کے ہم خیال پھیلائیں گے اور شیث نیکی اور پرہیزگاری کا راستہ دکھائے گا۔"

حضرت آدمؑ نے کہا۔ "اے جبریلؑ! آپ مجھے ہابیل کی قبر ہی دکھا دیں کہ اسے قابیل نے کہاں دفن کیا ہے؟"

حضرت جبریلؑ انہیں ہابیل کی قبر پر لے گئے۔ اس وقت حضرت حوّا بھی ان کے ساتھ تھیں۔ دونوں نے مل کر قبر کھودی، دیکھا لاش خون میں تربتر ہے اور ہابیل کا مغز باہر نکل آیا ہے۔

دونوں نے لاش پر بہت آنسو بہائے۔ لاش کے لیے لکڑی کا تابوت بنایا گیا اور اس تابوت میں لاش گھر لے آئے۔

اب جانور بھی بہت شور کر رہے تھے اور پرندے بھی جمع ہو کر بین کر رہے تھے۔ حضرت آدمؑ نے حضرت جبریلؑ سے پوچھا۔ "اے جبریلؑ! آپ ان کی زبان سمجھ سکتے ہیں، بتائیے یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

حضرت جبریلؑ نے کہا۔ "یہ سب گریۂ وزاری کر رہے ہیں اور آپس میں کہتے ہیں کہ انسان سے دور رہنا چاہیے کہ یہ بے وفا اپنے بھائی کو بھی قتل کر دیتا ہے۔"

حضرت آدمؑ نے ہابیل کے تابوت کو اپنے مکان میں دفن کر دیا۔ مدتوں قابیل راندۂ درگاہ رہا۔ حالانکہ اب وہ کسی قدر پشیمان بھی تھا۔

کہتے ہیں کہ اللہ نے زمین کو حکم دیا تھا کہ قابیل کو داب لے اور زمین نے اس کو زانو تک داب لیا تھا۔

اب قابیل کو خاصا علم حاصل ہوتا جا رہا تھا اور وہ سوال و جواب کرنے لگا تھا۔ قابیل نے پوچھا۔ "اے اللہ! مجھے یہ سزا کیوں دی جا رہی ہے؟"

جواب ملا۔ "تو نافرمان بندہ ہے اس لیے تجھے مردود قرار دیا گیا ہے۔"

قابیل نے کہا۔ "اے اللہ! ابلیس نے بھی تو نافرمانی کی تھی اور اسے بھی مردود قرار دیا گیا تھا مگر اسے تو آزاد چھوڑا گیا اور مجھے زمین کے حوالے کیا گیا؟"

جواب ملا۔ "اے ملعون! ابلیس نے محض نافرمانی کی تھی، اپنے بھائی کا خون نہیں بہایا تھا۔ تو گناہ گار ہے۔"

قابیل نے کہا۔ "اے اللہ! جہاں تک گناہ گاری کا تعلق ہے، میرے باپ نے بھی گندم کھا کے گناہ کیا تھا پھر اسے زمین کے حوالے کیوں نہیں کیا گیا؟"

جواب ملا۔ "تیرے باپ نے گندم کھانے کا گناہ کیا تھا مگر قطعِ صلہ رحمی نہیں کیا تھا۔"

اب زمین نے قابیل کو سینے تک دبا لیا تھا۔

آخر قابیل کی ندامت نے اسے اس عذاب سے نجات دلائی اور زمین کو حکم دیا گیا کہ اسے چھوڑ دے۔

کہتے ہیں کہ اس کے بعد ایک فرشتہ محض اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ نیزے سے قابیل کو ہلاک کرتا رہے اور جب وہ مر جائے تو اسے پھر زندہ کیا جائے اور نیزے سے پھر ہلاک کر دیا جائے اور یہ عمل قیامت تک جاری رہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت شیثؑ کو پیدا کیا۔ یہ شکل میں بھی حضرت آدمؑ جیسے تھے اور سیرت بھی انہی کی پائی تھی۔ حضرت آدمؑ نے حضرت شیثؑ کو اپنا خلیفہ نامزد کیا۔

pklibrary.com

ان کے دوسرے بھائی دنیا کے مشاغل میں مصروف ہوگئے مگر حضرت شیثؑ باپ کی خدمت میں حاضر رہتے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار حضرت آدمؑ بیمار ہوئے تو اس وقت حضرت شیثؑ کے سوا کوئی اور بیٹا ان کی تیمارداری نہ کرتا لیکن جب وہ اپنے مشاغل سے فارغ ہوتے تو اپنے باپ کے پاس آتے اور مزاج پُرسی کرتے۔

حضرت آدمؑ نے پھلوں کی خواہش کی اور کہا۔ ''تم سب میرے لیے پھل لاؤ۔''

وہ سبھی پھل لینے چلے گئے مگر حضرت شیثؑ نے تیمارداری کی وجہ سے کہیں جانا گوارا نہ کیا۔

کافی وقت گزر گیا اور حضرت شیثؑ کے بھائی پھل لے کر واپس نہیں آئے تو حضرت آدمؑ نے حضرت شیثؑ کو حکم دیا۔

''اے میرے بیٹے! تو سامنے اس پہاڑ پر جا اور اللہ سے میرے لیے میوے مانگ۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تیری دعا کی برکت سے میرے لیے میوے ضرور بھیجے گا۔''

حضرت شیثؑ نے عاجزی سے عرض کیا۔ ''آپ میرے باپ ہیں اور جو مقام آپ کو حاصل ہے، وہ مجھے حاصل نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے دعا مانگنے سے میوے ضرور بھیجے گا اور آپ کی دعا ضرور قبول ہوگی۔''

حضرت آدمؑ نے شرمندگی سے کہا۔ ''بیٹے! میں خدا کی درگاہ میں شرمندہ ہوں کیونکہ میں نے حکم عدولی کی تھی اور منع کرنے کے باوجود گندم کھالیا تھا۔ میرے مقابلے میں تم پاک وصاف ہو۔''

حضرت شیثؑ نے باپ کے حکم کے بموجب پہاڑ پر جا کے دعا مانگی۔ ان کی یہ دعا قبول ہوئی اور کچھ ہی دیر بعد حضرت جبریلؑ بشکل انسان کئی قسم کے پھل لے کر حاضر ہوگئے۔ ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔

حضرت آدمؑ نے حضرت جبریلؑ کو پہچان لیا اور کہا۔ ''اے جبریل! یہ پھلوں کی بات تو سمجھ میں آگئی کہ میرے فرزند شیث نے ان پھلوں کے لیے دعا کی تھی مگر یہ لڑکی کون ہے؟''

حضرت جبریلؑ نے بتایا۔ ''اے آدم! اب تک آپ کی اولاد جڑواں پیدا ہوتی رہی ہے مگر شیث کی ولادت تنہا ہوئی تھی۔ اللہ نے اسے شیث کے لیے بھیجا ہے۔ یہ شیث کی زوجہ بنے گی۔''

ان پھلوں کو حضرت آدمؑ نے بھی کھایا اور ان کی جملہ اولاد نے بھی اور جس نے بھی ان پھلوں کو کھایا وہ دانا و بینا ہوتا چلا گیا۔

اب حضرت آدمؑ، حضرت شیثؑ کے سامنے جنت کا ذکر کیا کرتے۔ آخر اسی حال میں نو سو تیس برس گزر گئے اور حضرت آدمؑ نے انتقال کیا۔

اب حضرت آدمؑ کی اولاد دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ کچھ حضرت شیثؑ کی پیروی کرتی اور بعض قابیل کی اولاد کی تابعداری میں مشغول رہنے لگی۔ نو سو بارہ سال زندہ رہنے کے بعد حضرت شیثؑ بھی چل بسے۔

حضرت شیثؑ نے جو نصیحتیں کی تھیں، وہ یہ تھیں۔ ''مومن حقیقی وہ ہے جس میں یہ چند خصلتیں پائی جاتی ہوں۔ اللہ کو پہچاننا، نیک و بد کو پہچاننا، ماں باپ کا حق پہچاننا، ان کی خدمت کرنا۔''

امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دنیا میں جب بھی کوئی ظلم سے قتل ہوتا ہے تو اس کا گناہ حضرت آدمؑ کے پہلے بیٹے قابیل کی گردن پر ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ظالمانہ قتل کی ابتدا کی اور یہ ناپاک سنت جاری کی۔''

دمشق کے شمال میں جبلِ قاسیون پر ایک زیارت گاہ بنی ہوئی ہے جو مقتل ہابیل کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے متعلق ابن عساکر نے احمد بن کثیر کے تذکرے میں ان کا ایک خواب نقل کیا ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ ہابیل ان کے ساتھ ہیں اور ہابیل نے جبل قاسیون کی اس زیارت گاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا مقتل یہی ہے۔'' اور رسول اللہ ﷺ نے ہابیل کے قول کی تصدیق فرمائی۔

مضمون کے مآخذ

بلاد فلسطین و شام، جی ای اسٹرینج۔ کتاب الھدیٰ، یعقوب حسن۔
توریت۔ قصص الانبیاء، مولانا عبدالمنان۔ انبیائے قرآن، جمیل احمد

"کیا تم تیار ہو جوانو؟" مجاہد نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔

"یس سر....." تینوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔

وہ اس وقت ایک بلڈنگ کے باہر کھڑے ہوئے تھے جس میں اُن کا ٹارگٹ "کے خان" آج کل رہائش پذیر تھا۔ جس کے بارے میں انہوں نے بڑی کوشش سے پتا لگایا تھا اور آج اپنے اس کام کو انجام تک پہنچانے آئے تھے۔ مجاہد اور اس کے ساتھی ملکی سیکرٹ سروس میں کام کرتے تھے۔ کے

امانت دار

محمد عثمان ذوالفقار

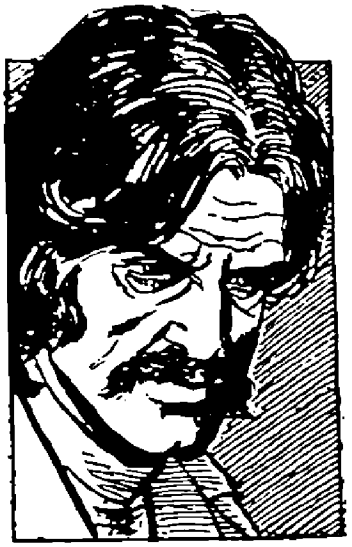

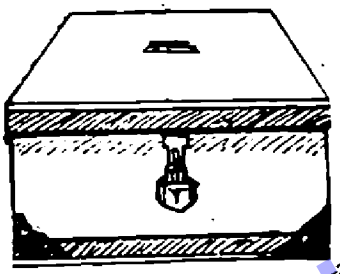

اگرچہ اپنی زندگی خود سے جینا بہت مشکل ہوتا ہے مگر پھر بھی زندگی گزار لی جاتی ہے لیکن... اپنی زندگی دوسروں کے نام کرنا اس سے بھی مشکل کام ہے اور یہ مشکل اس نے بہت آسانی سے جھیل لی تھی... کیونکہ اس کا مقصد عظیم تھا... اس کے جسم میں روح دوسروں کی امانت تھی۔ وہ آسانی سے دشمنوں کے ہاتھ آنے والا نہیں تھا... اسے دوستوں سے وعدہ نبھانا آتا تھا۔ وہ دشمنی میں بھی اصولوں کا قائل تھا... اور یہی عادت ایک دن اسے زندگی سے دور اور موت کے قریب لے گئی... لیکن اس کے مقصدِ حیات کو دوام مل گیا۔

وحشت اور رنج والم میں اپنے مقصد کو انجام تک پہنچانے والے ایک عظیم انسان کا کارنامہ

pklibrary.com

خان ایک خطرناک مجرم تھا جس کا سراغ مجاہد نے بڑی مشکل سے لگایا تھا۔

''شیر عالم! تم عمارت کی عقبی طرف چوکس رہو گے تاکہ اگر وہ بھاگنے کی کوشش کرے تو پھر بھی ہمارے ہاتھوں سے جانے نہ پائے۔'' مجاہد نے شیر عالم سے کہا تو وہ عمارت کی پشت کی جانب چلا گیا۔

''نبیل! تم اب جاسکتے ہو، اطلاع دینے پر شکر گزار ہوں۔ اختتام پر تمہیں یاد رکھا جائے گا۔'' مجاہد نے نبیل سے کہا۔ نبیل عمارت کا ملازم تھا۔

''اس میں شکریے کی کیا ضرورت ہے جناب! ملک کی خدمت کرنا ہمارا اولین فرض ہے۔'' نبیل نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

''آؤ.....'' مجاہد اپنے باقی دو ساتھیوں احمد اور زبیر کے ساتھ بلڈنگ کے مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت انہوں نے اپنا اسلحہ چھپایا ہوا تھا تاکہ ان کا ٹارگٹ کے خان پہلے سے چوکنا نہ ہو جائے۔ وہ تینوں عمارت کے اندر داخل ہوئے تو ان کے سامنے لفٹ اور سیڑھیاں موجود تھیں۔

''احمد! تم لفٹ کے ذریعے تیسری منزل پر جاؤ اور ہم دونوں سیڑھیوں کے ذریعے اوپر آرہے ہیں۔'' مجاہد نے احمد سے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

جب وہ دونوں تیسری منزل پر پہنچے تو احمد پہلے ہی ایک طرف پوزیشن سنبھالے کھڑا تھا۔

''تم یہیں رہو، اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا۔'' مجاہد نے کہا تو احمد نے اثبات میں سر ہلا دیا اور مزید چاق چوبند ہو گیا۔ مجاہد اور زبیر آگے بڑھ گئے۔ وہ ایک فلیٹ کے دروازے پر رکے جس پر ''مسٹر جمیل معروف'' نام کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ مجاہد نے دستک دی۔

''کون ہے؟'' چند لمحوں بعد اندر سے کے خان کی آواز آئی۔ مجاہد نے زبیر کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ زبیر اس کا اشارہ سمجھ گیا۔

''میں نبیل ہوں۔ دھونے والے گندے کپڑے لینے آیا ہوں، آپ نے بلایا تھا۔'' زبیر نے نبیل کی آواز کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے کہ کہیں وہ پہچانا نہ جائے۔

''اوکے ٹھیک ہے۔ میں کپڑے لاتا ہوں۔'' اندر سے کے خان نے مصروف لہجے میں کہا جیسے کسی ضروری کام میں مصروف ہو۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو دونوں مزید چوکنے ہو گئے اور اپنے اپنے پستول نکال لیے۔

جیسے ہی دروازہ کھلا تو انہوں نے دیکھا کہ کے خان اپنے ہاتھوں میں دھونے والے کپڑے لیے کھڑا تھا۔ اس وقت وہ اصل شکل کے بجائے بدلے ہوئے حلیے میں تھا۔ وہ دونوں کے خان کو دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہو گئے اور زبیر نے پیچھے سے دروازہ بند کر دیا۔

''کون ہو تم؟'' کے خان غرایا، وہ اب سنبھل چکا تھا۔

''ہماری فورس اس پوری عمارت کو اپنے گھیرے میں لے چکی ہے۔ اس لیے اگر بھاگنے کی کوشش کی تو مارے جاؤ گے۔'' مجاہد نے بھی غراتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا چاہتے ہو مجھ سے؟'' اس نے بدستور غصے سے پوچھا۔

''وہ فائل جو تم چرا کر لائے ہو۔ اسے ہمارے حوالے کر دو ورنہ.....'' مجاہد نے غراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ مجاہد کی بات سن کر، کے خان کے اعصاب تن گئے کیونکہ وہ اب سمجھ چکا تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے آئے ہیں۔

''وہ میرے پاس نہیں ہے۔''

''تو پھر کہاں ہے؟''

''یہ میں نہیں بتا سکتا۔''

''ہمیں اگلوانے کے بہت سے طریقے آتے ہیں۔ زبیر! اسے ہتھکڑی لگا دو۔ باقی باتیں ہم ہیڈ کوارٹر میں کریں گے۔'' مجاہد نے زبیر سے کہا تو زبیر نے اپنا پستول ہولسٹر میں لگایا اور ہتھکڑی نکال کر آگے بڑھا۔ جیسے ہی زبیر نے ہتھکڑی اس کے ہاتھوں کی طرف بڑھائی تو کے خان کے ہاتھ حرکت میں آئے اور دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں زبیر کا پستول نظر آیا۔

''تم مجھے کبھی بھی زندہ نہیں پکڑ سکو گے ہاہاہا۔'' کے خان نے اپنی کنپٹی پر پستول رکھ کر ایک قہقہہ لگایا اور دوسرے ہی لمحے ٹریگر دبا دیا۔ گولی اس کی کنپٹی میں روشن دان بناتی ہوئی ایک طرف سے گھس کر دوسری طرف سے باہر نکل گئی۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ ان دونوں کو سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ زبیر کو پوری توقع تھی کہ وہ اس پر حملہ کرنے کی کوشش کرے گا اور اس کے لیے وہ پوری طرح تیار بھی تھا لیکن، جو ہوا وہ اس کی توقع کے بالکل برعکس تھا۔ کے خان نے ان کے ہاتھ آنے کے بجائے خودکشی کر لی تھی اور یہ بات ان دونوں کے لیے پریشان کن تھی۔

''شٹ یار! یہ کیا ہو گیا۔'' مجاہد نے ہاتھ کو ماتھے پر مارتے ہوئے کہا۔

pklibrary.com

''اب کیا ہوگا؟'' زبیر نے پریشان کن لہجے میں سوال کیا۔

اسی وقت فلیٹ کے دروازے پر دستک ہوئی تو مجاہد نے زبیر کو تیار رہنے کا اشارہ کیا اور خود دروازہ کھولنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔ مجاہد نے دروازے کی جھری سے باہر جھانکا تو ایک ہٹا کٹا آدمی نظر آیا۔

دروازہ کھول کر مجاہد نے خود کو دروازے کے پیچھے چھپا لیا۔ اچھی خاصی صحت کا حامل آدمی جو باہر کھڑا ہوا تھا، اندر آیا اور جب اس نے زمین پر کے خان کی لاش دیکھی اور اس کے قریب ایک اجنبی آدمی کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے پھرتی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پستول نکال کر زبیر پر تان لیا۔

''کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' نووارد نے غراتے ہوئے کہا۔

''یہ پوچھنے والے تم کون ہوتے ہو؟'' جواباً زبیر نے بھی غراتے ہوئے پوچھا۔

''تم نے اسے مار کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اس لیے تمہیں بھی زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔'' نووارد نے ٹریگر پر دباؤ ڈالا۔

''اپنا پستول نیچے پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لو ورنہ بھون دوں گا۔'' نووارد نے اپنی گردن کی پشت پر ٹھنڈی سلاخ کا لمس محسوس کیا۔ مجاہد نے پیچھے سے اپنا پستول نووارد کی گردن پر تانا ہوا تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد نووارد نے اپنا پستول نیچے پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔

''اسے ہتھکڑی لگاؤ اور جلدی سے باہر لے آؤ۔'' مجاہد نے زبیر سے کہا تو زبیر نے آگے بڑھ کر اسے ہتھکڑی لگا دی۔ اس دفعہ زبیر پوری طرح ہوشیار تھا کہ کہیں یہ بھی کے خان والا حربہ استعمال کرنے کی کوشش نہ کرے۔

''چلو.....'' زبیر نے اسے باہر کی طرف دھکا دیتے ہوئے کہا۔

''کہاں لے جانا چاہتے ہو تم لوگ؟'' وہ آدمی چیخا۔

''چلو تو سہی! یہ بھی پتا چل جائے گا۔'' زبیر اُسے دھکیلتے ہوئے باہر لے کر آیا۔ مجاہد پہلے ہی جا چکا تھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ ہیڈ کوارٹر میں تھے۔

''شیر عالم! اس آدمی سے سچ اُگلوانا تمہاری ذمے داری ہے۔'' مجاہد نے شیر عالم سے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں بھائی۔ اس کی زبان ایسے چلے گی جیسے مشین۔'' شیر عالم نے جوش سے کہا تو مجاہد اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

اگلے دن مجاہد ہیڈ کوارٹر پہنچا تو اس نے شیر عالم کو طلب کیا تاکہ کل والے معاملے کے متعلق جان سکے۔ شیر عالم فوراً حاضر ہو گیا۔

''کیا بنا تمہارے کام کا جو تمہیں دیا گیا تھا۔ کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی؟'' مجاہد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''پہلے تو وہ نہیں مانا۔ زیادہ سخت جان ثابت ہوا لیکن پھر میں نے بھی اپنا مخصوص حربہ آزمایا تو وہ سچ بولنے پر آمادہ ہو گیا۔'' شیر عالم نے پُرجوش انداز میں بتایا۔

''آؤ..... پھر اسی سے پوچھتے ہیں۔'' مجاہد اٹھ کھڑا ہوا اور شیر عالم اس کے پیچھے چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس آدمی کے سامنے تھے جس کو وہ کل کے خان کے ٹھکانے سے پکڑ کر لائے تھے۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' مجاہد نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کے بعد پوچھا۔

''آکاش.....'' اس آدمی نے جواب دیا۔

''کے خان سے تمہارا کیا تعلق تھا اور وہاں کیوں آئے تھے؟'' مجاہد نے سوال در سوال کیا۔

''کے خان میرا باس تھا۔ انہوں نے کچھ ڈسکس کرنے کے لیے مجھے وہاں بلایا تھا۔'' آکاش نے جواب دیا۔

''تو پھر یقیناً تم اس فائل کے متعلق بھی جانتے ہو گے جس کی ہمیں تلاش ہے؟'' مجاہد نے صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''تم وہاں تک نہیں پہنچ سکو گے ہاہاہا۔'' آکاش نے قہقہہ لگایا۔

''اس تک پہنچنا ہمارا کام ہے اور میں جاؤں گا چاہے وہ دنیا کے آخری کونے پر ہی کیوں نہ ہو۔'' مجاہد دہاڑا۔

''کشمیر کے اُس تاریک جنگل میں جہاں پہنچنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔'' آکاش نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ اس کی بات سن کر مجاہد کے چہرے پر واقعی پریشانی کے تاثرات نمودار ہو گئے۔

''اُس تک پہنچنے کا راستہ بھی تم ہی ہمیں بتاؤ گے۔'' شیر عالم نے خونخوار نظروں سے آکاش کو دیکھا تو آکاش کی آنکھوں میں خوف پیدا ہوا کیونکہ وہ ..... شیر عالم کا دوسرا روپ دیکھ چکا تھا۔

''کے خان نے کسی غیر متوقع صورتِ حال کے لیے اس فائل تک پہنچنے کے لیے ایک نقشہ بنایا تھا جو میرے پاس

pklibrary.com

موجود ہے۔'' آکاش نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

''اور وہ نقشہ کہاں ہے؟'' مجاہد نے پوچھا۔

''اس کے بدلے مجھے کیا ملے گا؟'' آکاش نے مجاہد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''کیا چاہیے؟'' سوال کیا گیا۔

''زندگی.....'' جواب دیا گیا۔

''نقشہ میرے فلیٹ پر ایک خفیہ خانے میں موجود ہے۔'' آکاش نے اس جگہ کا بتایا جہاں وہ نقشہ پڑا ہوا تھا۔

''شیر عالم! تم جلدی سے آکاش کے فلیٹ پر جاؤ۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور اس تک پہنچے تم وہ نقشہ لے آؤ۔'' مجاہد نے شیر عالم سے کہا اور اپنے آفس کی طرف چل دیا۔

''اب فائل ملنے کے بعد ہی تمہیں جانے دیا جائے گا۔'' مجاہد نے آکاش کے متعلق اپنا فیصلہ سنایا اور اپنے آفس کی طرف چل دیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد وہ نقشہ اور مجاہد کی پوری ٹیم اس کے آفس میں موجود تھی۔

''جیسا کہ آپ کو پتا ہے کہ کے خان نے کچھ عرصہ پہلے ملکی سلامتی کی ایک اہم فائل چرائی تھی۔'' مجاہد نے اپنے ساتھیوں کو بریفنگ دینا شروع کی۔ ''اور ہم نے وہ فائل حاصل کرنے کے لیے کے خان کی رہائش پر آپریشن کیا تھا۔ کے خان کا خیال ہوگا کہ اگر وہ مارا بھی گیا تو ہم اس فائل کو اسی شہر یا اس کے آس پاس شہروں میں ڈھونڈتے رہیں گے۔ اور اگر ہمیں آکاش کے ذریعے پتا نہ چلتا تو ہم نے ایسا ہی کرنا تھا۔ کے خان نے مکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ فائل ایک ایسے علاقے میں چھپا دی جہاں ہمارا جانا مشکل ہے اور اس طرح ہم وہ فائل کبھی بھی حاصل نہ کر سکتے تھے۔ لیکن اللہ کی مہربانی سے ہمیں نہ صرف اس جگہ پتا چل گیا جہاں فائل موجود ہے بلکہ اس تک پہنچنے کا نقشہ بھی مل گیا ہے۔''

''تو اب وہ فائل کہاں ہے؟'' مجاہد نے اپنی بات ختم کی تو زبیر نے پوچھا۔

''وہ فائل مقبوضہ کشمیر کے ایک تاریک جنگل میں چھپائی گئی تھی تاکہ ہم اس تک رسائی حاصل نہ کر سکیں۔ لیکن الحمدللہ، ہمارے پاس اس تک جانے کا پورا نقشہ موجود ہے۔'' مجاہد نے تفصیل سے بتایا۔

''تو ہم کب جا رہے ہیں؟'' احمد نے پوچھا۔

''تین چار دنوں تک سارے انتظامات مکمل ہو جائیں گے۔ یہاں ہم سب اکٹھے جائیں گے لیکن کشمیر میں داخلے سے پہلے الگ الگ ہو جائیں گے اور پھر وہاں اپنے مخصوص پوائنٹ پر ملیں گے۔ کوئی سوال؟'' مجاہد نے سارا منصوبہ بیان کرنے کے بعد پوچھا۔

''نو سر.....'' سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔ اب ان کو جلد از جلد کشمیر پہنچنا تھا تاکہ اس فائل کو حاصل کیا جا سکے۔

☆☆☆

صبح کا وقت تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہری بھری گھاس پر شبنم موتیوں کی طرح چمک رہی تھی۔ اس شبنم بھری گھاس کو اپنے جوتوں سے کچلتا ہوا ایک نوجوان جاگنگ کے انداز میں بھاگا جا رہا تھا۔ اس کا نام محسن تھا اور جس زمین کو یہ اپنے پاؤں تلے روند رہا تھا یہ کشمیر کا دارالحکومت سرینگر تھا۔ اکیسویں صدی کے اواخر میں یہ وہ زمانہ تھا جب کشمیر ایک آزاد مسلم ریاست بن چکی تھی اور سائنس نے بھی بہت ترقی کر لی تھی کہ اب تک ٹائم مشین بھی ایجاد ہو چکی تھی اور بہت سی دوسری ایجادات بھی ہو چکی تھیں جو اکیسویں صدی کے اوائل میں ناممکن تھا وہ اب ممکن ہو چکا تھا۔ محسن کو تاریخ میں بہت دلچسپی تھی۔ یہی اس کا خصوصی مضمون تھا۔ وہ تاریخ میں ایم فل کر رہا تھا۔ محسن کو یہ جاننے میں بہت دلچسپی تھی کہ تاریخ میں انسان کیسے رہتا تھا؟ خاص کر دو ہزار کے ابتدائی دور میں جب انٹرنیٹ اور اس سے متعلق دوسری چیزیں نئی نئی ایجاد ہوئی تھیں۔ اس دور میں تاریخ پڑھنے والوں کے لیے بہت سہولتیں میسر تھیں۔ سائنس نے بھی اس میدان میں خاصی ترقی حاصل کر لی تھی۔

محسن کے استاد کا نام عالم تھا جو اپنے نام کی طرح عالم تھے۔ محسن کو جب بھی تاریخ میں کوئی الجھن ہوتی یا وہ کسی خاص چیز کو ڈسکس کرنا چاہتا تو وہ عالم صاحب سے بات کر لیتا تھا۔

آج کل وہ کشمیر پر ریسرچ کر رہا تھا کہ ماضی میں یہ کیا تھا اور اب کیا بن گیا۔ اس نے جب کشمیر کی تاریخ پڑھنا شروع کی تو اس پر یہ باتیں ظاہر ہوئیں کہ ماضی میں بھارت نے اس جنت نظیر وادی پر ناجائز قبضہ کر رکھا تھا۔ بہت زیادہ ظلم نے بھی کشمیریوں کے حوصلے پست نہیں ہونے دیے اور وہ برابر کوشش کرتے رہے۔ اس کوشش میں لاکھوں کشمیری زخمی ہوئے اور لاکھوں ہی کشمیری مجاہدین نے جامِ شہادت نوش کیا۔ آخرکار اپنی جدوجہد اور کچھ پاکستان کی کوششوں سے بھارت سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد میں یہ وادی پاکستان میں شامل ہو گئی لیکن کشمیری مجاہدین کے قائدین نے یہ شرط عائد کی کہ یہ وادی تو پاکستان میں شامل

ہوگی لیکن کشمیر کا نظام حکومت پاکستان سے جدا ہوگا اس طرح کشمیر میں خلافت قائم ہوگئی۔

یہ سب پڑھنے کے بعد محسن کو یقین نہ آیا کہ ماضی میں واقعی ایسا ہوتا رہا ہے۔

محسن نے عالم صاحب سے بات کی کہ وہ اُس زمانے کے حالات و واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے۔ پہلے تو عالم صاحب ہچکچائے لیکن محسن کے اصرار پر وہ چلنے کے لیے راضی ہو گئے۔ آج ناشتے کے بعد انہوں نے اس سفر پر جانا تھا۔ ایک نئے سفر کا آغاز کرنا تھا۔

گھر پہنچ کر محسن نے جلدی جلدی ناشتا کیا اور تیار ہو کر عالم صاحب کی جانب چل دیا۔ ہر بار کی طرح وہ اپنے اس سفر کے لیے بھی بہت پُرجوش تھا۔

''کیا تم تیار ہو، جانے کے لیے؟'' عالم صاحب نے طے شدہ سفر کے بارے میں پوچھا۔

''میں پوری طرح تیار ہوں۔'' محسن نے جوش بھرے انداز میں کہا۔

''تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ آؤ چلتے ہیں۔'' عالم صاحب نے ایک مشین کی طرف بڑھتے ہوئے کہا جو کہ ٹائم مشین تھی۔ اس کی مشینری بہت پیچیدہ تھی اور اس کے نظام کو سمجھنا بھی کافی مشکل تھا۔ محسن کے جاننے والوں میں صرف عالم صاحب ہی اس کو چلانا جانتے تھے۔ آپریٹنگ کے دوران ذرا سی غلطی جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی اور بندہ کہیں کا کہیں پہنچ سکتا تھا۔

عالم صاحب مشین کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو محسن بھی ان کی پیروی کرتے ہوئے اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کر دیا۔ مشین کے اندر پانچ چھ لوگوں کے بیٹھنے کے لیے نشستوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ عالم صاحب مشین کے آپریٹنگ پینل کی طرف بڑھے اور مشین آپریٹ کرنے والے لی مخصوص سیٹ پر بیٹھ کر مختلف بٹن دبانے لگے۔

''سیٹ بیلٹ اچھی طرح باندھ لو اور اسٹینڈ مضبوطی سے تھام کر اپنی آنکھیں بند کر لو۔'' عالم صاحب نے محسن کو ہدایت دی۔ اگرچہ محسن کو بارہا سفر کرنے کی وجہ سے یہ سب ازبر تھا لیکن پھر بھی عالم صاحب نے یاددہانی کروانی ضروری سمجھی تاکہ کسی بھی ممکنہ غلطی کو ہونے سے روکا جا سکے۔

محسن نے اپنی سیٹ بیلٹ اچھی طرح کس کر باندھ لی اور دائیں جانب موجود اسٹینڈ کو مضبوطی سے تھام کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

''ریڈی اینڈ گو.....'' عالم صاحب کی آواز گونجی۔

اس کے ساتھ ہی محسن کو ایک زوردار جھٹکا لگا جیسے کسی نے ٹائم مشین کو یک دم جھٹکے سے اوپر اٹھایا ہو۔ اگر اس نے سیٹ بیلٹ نہ باندھی ہوتی تو یقیناً اس زوردار جھٹکے سے اچھل کر نیچے گر جاتا۔

سفر کے دوران اسے کئی بار ایسے جھٹکوں سے واسطہ پڑا۔ یوں جیسے بندہ کوئی دراڑ عبور کرنے کے لیے چھلانگ لگانے کے لیے اپنے جسم کو جھٹکا دیتا ہے۔ شاید ٹائم مشین بھی وقت کی دراڑ عبور کرنے کے لیے اپنے جسم کو جھٹکے دے رہی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ٹائم مشین کا وجود ساکت ہو گیا اور وہ پُرسکون ہو گئی جیسے کوئی انسان اپنی منزل پر پہنچ کر سکون کا سانس لیتا ہے۔

''ہم پہنچ چکے ہیں۔'' محسن کو عالم صاحب کی آواز سنائی دی تو اس نے اپنی آنکھیں کھول لیں اور سیٹ بیلٹ کھولنے لگا۔

''آؤ، باہر چلتے ہیں۔'' عالم صاحب نے دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے کہا۔ محسن بھی تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا اور باہر نکل آیا۔ عالم صاحب نے دروازہ لاک کر دیا تاکہ کوئی اور اس کے اندر نہ چلا جائے اور ٹائم مشین کے بٹنوں کو چھیڑ چھاڑ کر کے کوئی مسئلہ نہ پیدا کر دے۔

ٹائم مشین ان کو ایک پہاڑی پر لے آئی تھی۔ آس پاس بہت سی چھوٹی بڑی پہاڑیاں تھیں جن میں سے کچھ پر ہری بھری گھاس اور جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اونچائی سے دیکھنے کے باوجود آس پاس کوئی آبادی نظر نہیں آئی مگر سامنے کچھ فاصلے پر ایک کالی پٹی نظر آ رہی تھی جو شاید سڑک تھی۔

''اب کہاں جانا ہے؟'' محسن نے پوچھا۔

''وہ جو سامنے کالی پٹی نظر آ رہی ہے میرا خیال ہے کہ وہ کوئی سڑک ہے۔ وہاں جا کر دیکھتے ہیں۔'' عالم صاحب نے کہا اور اس پہاڑی کو پھلانگ کر دوسری پر چھلانگ لگائی اور تیزی سے آگے موجود پہاڑیوں کو عبور کرنے لگے۔ محسن بھی جلدی جلدی ان کے پیچھے بھاگنے کے انداز میں چھلانگیں مارتے ہوئے پہاڑیوں کو عبور کرنے لگا۔ پہاڑیوں کی بلندی زیادہ نہ تھی۔ زمین سے صرف چند فٹ اونچی تھی اور ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی تھیں۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے، ویسے ویسے ان کی بلندی کم ہوتی گئی۔

تقریباً دس منٹ میں پہاڑیوں کو عبور کرنے کے بعد وہ سڑک کے پاس پہنچ گئے۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ دور دور تک کسی گاڑی کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ پہاڑیاں عبور کرنے کی وجہ سے عالم صاحب اور محسن دونوں کا سانس چڑھا

ہوا تھا۔ وہ ایک ٹیلے پر بیٹھ کر اپنا سانس درست کرنے لگے۔ اس دوران ان کے درمیان میں کوئی بات نہیں ہوئی۔

"اب کیا کرنا ہے؟ کوئی گاڑی وغیرہ تو نظر نہیں آرہی۔" محسن نے عالم صاحب سے پوچھا۔

"کسی گاڑی یا بس کا انتظار کرنا پڑے گا تاکہ شہر پہنچ سکیں۔ پھر شہر کی صورتِ حال دیکھ کر آگے کے بارے میں کچھ پلان کریں گے۔" عالم صاحب نے جواب دیا۔

انہوں نے آس پاس کے ٹیلوں پر کچھ مخصوص نشانات لگا دیے تاکہ جب وہ واپس آئیں تو آسانی سے اس جگہ کو پہچان سکیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک بس نمودار ہوئی جس کو محسن نے رکنے کا اشارہ کیا۔ بس ان کے قریب آکر رک گئی تو کنڈیکٹر نے بس کا دروازہ کھولا اور وہ دونوں کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔

"کہاں جانا ہے آپ کو؟" کنڈیکٹر نے پوچھا۔

"شہر کی بڑی مارکیٹ میں۔" عالم صاحب نے مختصر جواب دیا اور پیچھے موجود خالی سیٹوں میں سے ایک پر بیٹھ گئے تو محسن بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ عالم صاحب کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔

"یہاں تو کوئی ترقی نظر نہیں آرہی ہے۔ حالانکہ ہمارے زمانے میں تو ہر علاقہ اتنی ترقی کر چکا ہے کہ دوسرے علاقوں کے لوگ رشک کرتے ہیں۔" محسن نے باہر دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"بیٹا! وہ ترقی تو آزادی کے بعد ہمارے خلیفہ نے کروائی ہے اور جیسا کہ تم نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ یہ زمانہ بھارتی تسلط کا ہے۔ جس میں بجائے ترقی کے ظلم و بربریت کی نئی داستانیں رقم کی گئیں۔" عالم صاحب نے کہا تو محسن کو ان کی آواز میں درد محسوس ہوا۔

"بھائی! آج کیا تاریخ ہے؟" محسن نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی سے پوچھا۔

"آج 6 فروری ہے۔" اس آدمی نے کہا۔

"یعنی کل 5 فروری تھا۔ یومِ یک جہتی کشمیر۔" محسن بڑبڑایا۔

عالم صاحب یہ سن کر چونک کر محسن کی طرف دیکھنے لگے۔

"کیا ہوا؟" محسن نے عالم صاحب کو اس طرح چونک کر اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تو پوچھ لیا۔

"اگر آج 6 فروری ہے تو یقیناً ہم بڑے خطرناک وقت پر آئے ہیں۔ کشمیری احتجاج کر رہے ہوں گے اور جواباً بھارتی فوج کشمیریوں کے خلاف آنسو گیس وغیرہ کا بے دریغ استعمال کر رہی ہوگی۔ اس وقت آکر ہم نے بڑی خطرناک غلطی کی ہے۔ میری مانو تو واپس چلتے ہیں۔" عالم صاحب نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

"ابھی تک تو ہمیں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ آگے بھی اللہ سب اچھا کرے گا۔ اِن شاء اللہ۔" محسن نے دعائیہ انداز میں کہا۔

"ابھی ہم شہر میں داخل نہیں ہوئے اس لیے میری بات مان لو۔ واپس چلتے ہیں۔ جان سے پیارا کچھ نہیں ہوتا۔ کیا فائدہ ان چیزوں کا اگر جان ہی چلی گئی۔" عالم صاحب نے ایک بار پھر محسن کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

"آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب میں کسی کام کو شروع کر لوں تو اسے پورا کیے بنا نہیں رہ سکتا چاہے مجھے کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑ جائے۔" محسن نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا اور اپنا رخ دوسری طرف موڑ لیا۔ عالم صاحب نے محسن کی بات سن کر اپنا منہ کھڑکی کی طرف موڑ لیا اور باہر دیکھنے لگے۔

"ویسے آپ کا نام کیا ہے؟" محسن نے یونہی وقت گزارنے کے لیے پیچھے والے آدمی سے پوچھا۔

"مجاہد....." محسن کو اس کے لہجے میں ایک رعب اور فخر محسوس ہوا۔

کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اچانک عالم صاحب کے چہرے پر خوف کی ایک لہر نمودار ہوئی۔ محسن نے فوراً یہ بات محسوس کر لی۔

"کیا ہوا؟ آپ کے چہرے پر یہ خوف کیسا؟" محسن نے ان کے خوفزدہ چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھارتی فوج....." ابھی عالم صاحب کے منہ سے دو ہی لفظ نکلے تھے کہ بس نے بریک لگائے اور ایک جھٹکے سے رک گئی۔ سب حیران ہوئے کہ اس ویرانے میں بس کھڑی کرنے کا مقصد کیا ہے۔

دوسرے ہی لمحے تین بھارتی فوجی بس کے اندر داخل ہوئے تو سب کو بس کھڑی کرنے کی وجہ سمجھ آ گئی۔ محسن بھی جان گیا کہ عالم صاحب کے چہرے پر خوف نظر آنے کی وجہ یہی تھی۔

آگے والا فوجی باقی دو کا افسر لگ رہا تھا۔ وردی پر اس کا نام شنکر لکھا ہوا تھا۔

"ایک ایک مسافر کی اچھے سے تلاشی لو۔ کوئی بچنا نہیں چاہیے۔" شنکر نے اپنے پیچھے کھڑے دونوں فوجیوں کو تحکمانہ انداز میں کہا تو وہ دونوں سپاہی جو وردی پر لکھے ہوئے

ناموں کے مطابق رام داس اور رام لال تھے "او کے سر" کہتے ہوئے ایک دائیں طرف اور دوسرا بائیں جانب نشستوں کی قطار پر بیٹھے ہوئے مسافروں کی جانب بڑھا۔

"سر! آپ لوگ کیوں تلاشی لینا چاہتے ہیں؟ ہم نے کیا کیا ہے؟" کنڈیکٹر نے ہمت کر کے ڈرتے ڈرتے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

"ہمیں خبر ملی ہے کہ اس بس میں ایک آتنک وادی سوار ہے۔ اگر وہ اس بس میں ہوا تو تم لوگ میرے غضب سے نہیں بچ پاؤ گے۔" شنکر نے کنڈیکٹر کو گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

"چل جلدی کھڑا ہو۔" رام لال نے دائیں طرف پہلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر سے کہا جو ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ وہ ادھیڑ عمر آدمی فوراً کھڑا ہو گیا تو رام لال نے اس کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ اس کے پاس جو چیزیں تھیں وہ باہر نکالنے لگا۔ اس طرح دونوں سپاہی باری باری ہر ایک شخص کی تلاشی لینے لگے۔ جس سے کوئی قیمتی چیز نکلتی وہ بھی اپنی جیب میں ڈال لیتے۔ کچھ مسافروں نے احتجاج کیا تو ان کو دھمکی دی کہ اگر آواز بھی نکالی تو تجھے بھی آتنک وادی بنا دیں گے۔ عالم صاحب خوف زدہ انداز میں ان سپاہیوں کو تلاشی لیتے ہوئے دیکھ رہے تھے کہ کس ہتک آمیز انداز میں وہ مسافروں کی تلاشی لے رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ ابھی تھوڑی بعد ان کی بھی باری آئے گی۔

ایک سیٹ پر ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ رام داس اس کے پاس پہنچا اور پُرغرور لہجے میں بولا۔

"کھڑی ہو جاؤ۔" لیکن وہ عورت کھڑی نہ ہوئی۔

"یہ خاتون میری بیوی ہے۔ اس لیے درخواست کرتا ہوں کہ اس کی چیکنگ نہ کی جائے۔ کیونکہ ہمارے ہاں عورتوں کو غیر مرد نہیں چھوتے۔" عورت کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی سے گزارشانہ لہجے میں کہا۔

"اگر یہ وہی ہوئی جس کو ہم ڈھونڈ رہے ہیں تو کون ذمے دار ہوگا؟" رام داس نے سوال کیا۔

"آپ خود سوچیں بھلا یہ ایسا کر سکتی ہے؟" آدمی بولا۔

"اب اگر تم نے میری ڈیوٹی میں دخل اندازی کی تو انجام اچھا نہیں ہوگا" رام داس غرایا۔

یہ سب دیکھ کر محسن کو بہت غصہ آیا۔ محسن جو کہ بہت آگے کی دنیا میں رہنے والا تھا جہاں یہ سب کچھ نہیں ہوتا تھا۔ وہاں ہر ایک شہری کے لیے برابر کا قانون تھا۔ چاہے وہ بڑا ہو یا چھوٹا۔ محسن بھارتی فوج کا یہ رویہ دیکھ کر تلملا اٹھا اور اس نے ایکشن میں آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے سیلف ڈیفنس کے لیے لڑائی بھڑائی اور اسلحے کا استعمال سیکھا ہوا تھا لیکن اس وقت بھارتی فوجیوں کے پاس اسلحہ تھا اور خالی ہاتھ ان سے ٹکرانا کوئی دانشمندی نہیں تھی۔ اس لیے وہ کوئی اور حل سوچنے میں لگا ہوا تھا تاکہ ان فوجیوں سے خود بھی چھٹکارا پا سکے اور دوسرے لوگوں کو بھی نجات دلا سکے لیکن اس طرح کہ دوسرے مسافروں کو بھی کچھ نہ ہو۔ ابھی وہ اسی سوچ میں پڑا ہوا تھا کہ رام داس نے عورت کی تلاشی لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس کے ساتھ والا مرد اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔

"میرے ہوتے ہوئے تم ایسا نہیں کر سکتے۔" اس بار وہ آدمی غراہٹ بھرے لہجے میں بولا۔

"تم زندہ رہو گے تو کچھ کر سکو گے نا۔" رام داس نے قہقہہ لگاتے ہوئے پستول کی نال اس آدمی کی پیشانی پر رکھی اور ٹریگر پر دباؤ ڈالا۔

ایک دھماکا ہوا۔ رام داس کے ماتھے سے خون کا ایک فوارہ نکلا اور وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند نیچے گر گیا۔ پستول بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گر گیا۔ لوگ بُت بنے حیرانی سے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے کہ کیا ہونے والا تھا اور کیا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے تو کسی کو سمجھ نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے۔ سب کی گردنیں اس طرف کو مڑیں جہاں سے فائر ہوا تھا۔ تو انہوں نے ایک حیران کن منظر دیکھا کہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے ایک آدمی پستول ہاتھ میں تھامے ہوئے کھڑا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے محسن کو اپنا نام مجاہد بتایا تھا۔ اس کے پستول کی نال سے ابھی تک [illegible] ہاتھا۔

اسی وقت محسن نے تیزی سے رام داس کے گرے ہوئے پستول پر جھپٹا مارا اور رام لال کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ اس کے ساتھ ہی مجاہد کے پستول نے بھی فائر اُگلا اور اگلے لمحے رام لال کے ساتھ شنکر بھی ڈھیر ہو چکا تھا۔ شنکر اور رام لال کے گرتے ہی ہلکا سا دھماکا ہوا اور بس کا فرش کچھ لمحوں کے لیے لرزا تو سب کو ہوش آیا اور ان کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا کہ کیا ہوا ہے۔ وہ سب حیرانی سے محسن اور مجاہد کو تکنے لگے۔

"میرے خیال میں ان کی لاشیں جھاڑیوں میں چھپا دینی چاہئیں تاکہ مزید کسی مشکل سے بچ سکیں۔" عالم صاحب کی آواز بس میں گونجی تو ساتھ کئی لوگوں نے ان کی تائید میں اپنی آوازیں بلند کیں۔ محسن نے مجاہد اور دوسرے چند لوگوں کے ساتھ مل کر ان فوجیوں کی لاشوں کو جھاڑیوں میں اس طرح چھپا دیا کہ وہ صرف ڈھونڈنے سے ہی مل سکتی تھیں۔ لاشیں

pklibrary.com

ٹھکانے لگانے کے بعد انہوں نے بس کے فرش پر لگا خون بھی صاف کر دیا اور بس پہلے کی طرح آرام سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔ باقی سارے راستے ان کا کسی اور بھارتی فوجی سے ٹکراؤ نہیں ہوا جس کی وجہ سے وہ سب دوبارہ کسی اور پریشانی سے دوچار ہوئے بغیر شہر پہنچ گئے۔ لیکن اصل مشکلات تو شہر میں تھیں۔ جیسے ہی بس اڈے پر رکی تو سارے مسافر اتر کر اپنی اپنی منزل کی طرف چل دیے۔ محسن، مجاہد اور عالم صاحب بھی اتر گئے۔

''اب کہاں جاؤ گے؟'' محسن نے مجاہد کو مخاطب کیا۔

''وہیں جہاں بھیجا گیا ہوں۔'' مجاہد نے مختصر جواب دیا۔

''تو پھر ہم بھی تمہارے ساتھ جانا پسند کریں گے اگر مناسب سمجھو تو۔'' عالم صاحب نے مجاہد سے کہا۔

''اگر آپ میرے ساتھ رہیں گے تو بہت سی مشکلات اور مصیبتیں آپ پر آسکتی ہیں۔ بھارتی فوج آپ کو میرا ساتھی سمجھ کر کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرسکتی ہے جو آپ برداشت نہیں کرسکیں گے۔ ہم تو یہ سب برداشت کرنے کے عادی ہیں۔ ویسے بھی آپ شکل سے شریف لگتے ہیں۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ مجھے اکیلا ہی جانے دیں۔'' مجاہد نے التجائیہ انداز میں کہا تو عالم صاحب کو اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔

''ٹھیک ہے بیٹا جیسے تمہاری مرضی، اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' عالم صاحب نے کہا اور وہ دونوں وہاں سے چل دیے۔ مجاہد بھی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔

اس وقت ایک جلوس وہاں سے گزر رہا تھا جس میں حسب معمول کشمیری، بھارتی فوج کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ محسن اور عالم صاحب بھی اس جلوس میں شامل ہوگئے۔ چونکہ وہ بھی کشمیری تھے۔ اس لیے کسی نے ان کی طرف توجہ نہیں دی۔ جلوس مختلف راستوں سے آگے بڑھتا رہا اور وہ دونوں بھی ان کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ محسن اور عالم صاحب لوگوں کے درمیان میں تھے۔ عالم صاحب کو بھارتی فوج کی طرف سے اندیشہ تھا کہ ابھی وہ کہیں سے نکلیں گے اور ان پر فائرنگ اور آنسو گیس چھوڑ دیں گے تو درمیان میں ہونے کی وجہ سے ان پر یہ چیزیں کم اثر انداز ہوں گی۔

تقریباً آدھا گھنٹا چلنے کے بعد یہ جلوس میونسپل کارپوریشن کے صدر دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ صدر دروازے کے قریب پہنچتے ہی جلوس کے نعروں میں تیزی آگئی اور وہ پہلے سے بھی اونچی آواز میں نعرے لگانے لگے۔

''لے کے رہیں گے آزادی۔''

''تجھے دینی پڑے گی آزادی۔'' آس پاس نظریں دوڑاتے ہوئے اچانک محسن کو ایک قطار سے ایک شخص پاکستانی جھنڈا تھامے نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ آدمی گیٹ کے اس حصے کی جانب بڑھ رہا تھا جہاں بھارتی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ محسن کو اس شخص کی آنکھوں میں ایک عجیب جنونی چمک نظر آئی۔ شاید وہ بھارتی جھنڈے کی جگہ پاکستان کا جھنڈا لہرانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ محسن نے اشارے سے عالم صاحب کو بھی اس طرف متوجہ کیا۔

جیسے ہی وہ آدمی گیٹ کے اس حصے کے پاس پہنچا جہاں بھارتی جھنڈا لہرا رہا تھا، وہ پھرتی سے گیٹ پر چڑھا اور انتہائی سرعت کے ساتھ بھارت کا جھنڈا اتار کر پاکستان کا جھنڈا لگا دیا اور ساتھ اس آدمی کی آواز گونجی جو شاید اس نے اپنی پوری طاقت صرف کر کے نکالی تھی۔

''لے کر رہیں گے آزادی۔ پاکستان زندہ باد۔'' اسی وقت کہیں سے ایک گولی آئی اور آدمی کے دائیں بازو میں گھس گئی۔ بھارتی فوجیوں کی آمد تو پہلے ہی ہو چکی تھی لیکن وہ اسی بہانے کے انتظار میں تھے کہ وہ شخص جھنڈا لہرائے تو پھر وہ گولیاں برسانا شروع کریں۔ چند لمحے ٹھہر کر دوبارہ اس آدمی کی آواز گونجی۔

''نعرۂ تکبیر۔'' تو سب لوگوں نے اپنی پوری قوت سے جواب دیا۔ ''اللہ اکبر۔''

بھارتی فوج نے آنسو گیس چھوڑ دی جو فوراً آنکھوں میں گھس گئی۔ جس کی وجہ سے ان کی آنکھوں میں شدید جلن محسوس ہونے لگی اور وقتی طور محسن اور عالم صاحب کو نظر آنا بند ہوگیا۔ اسی وقت گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں جو بھارتی فوجیوں کی طرف سے چلائی گئی تھیں۔ دونوں کو اپنے آس پاس گولیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

''ادھر میرے ساتھ آئیں۔'' محسن اور عالم صاحب کو اپنے دائیں جانب کہیں قریب سے آواز آئی جو بلاشبہ مجاہد کی تھی۔ انہوں نے ہلکی سی آنکھیں کھولیں تو ان کے دائیں جانب کھڑا مجاہد ان کو اپنے پیچھے آنے کا کہہ رہا تھا۔ اس نے ایک بڑے کپڑے سے اپنے منہ کو ڈھانپا ہوا تھا۔ مجاہد دوسری طرف بھاگا تو وہ دونوں بھی بلا سوچے سمجھے بدحواسی کے عالم میں مجاہد کے پیچھے بھاگے۔ تقریباً دس منٹ مسلسل بھاگنے کے بعد وہ اسی بس اسٹاپ پر موجود تھے جہاں وہ پہلے اترے تھے۔ ان کی سانس پھول چکی تھی۔ وہ ایک جگہ کھڑے ہوئے اور لمبے لمبے سانس لینے لگے۔

"میرا نہیں خیال کہ آپ یہاں کے رہنے والے ہیں۔ اس لیے آپ کو یہاں سے چلے جانا چاہیے۔" مجاہد نے کہا تو وہ دونوں اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے جو کہہ رہا تھا۔ "ابھی تھوڑی دیر میں بھارتی فوجیوں نے جگہ جگہ ناکے لگا دینے ہیں۔ آپ ان کے ظلم سے بچ نہیں پائیں گے۔ آپ کی طرف صورتِ حال اچھی نہیں تو کم از کم اس سے بہتر ضرور ہوگی۔ کیونکہ جو یہاں اس وقت ہو رہا ہے، وہ وہاں نہیں ہو رہا ہوگا۔ اس لیے میرے خیال میں آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔" مجاہد نے اپنی بات مکمل کی۔ وہ ان کو اپنی دنیا کا سمجھ کر مدد کر رہا تھا۔ اس کے تو خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ اگلے زمانے سے سفر کر کے آئے ہیں۔

"واقعی اب ہمارے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ محسن! آؤ چلتے ہیں۔" عالم صاحب نے محسن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ایک بس جانے کو تیار تھی۔

"میں نہیں جاؤں گا بلکہ یہیں رہوں گا۔" محسن نے کہا تو مجاہد اور عالم صاحب دونوں چونک کر اسے گھورنے لگے۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو محسن..... کیا تم ہوش میں تو ہو؟" عالم صاحب نے چیختے ہوئے کہا۔

"جی بالکل۔ میں اپنے ہوش و حواس میں رہتے ہوئے یہ کہتا ہوں کہ آپ جانا چاہیں تو بے شک چلے جائیں لیکن میں یہیں رہوں گا۔" محسن نے دوٹوک انداز میں کہا تو عالم صاحب اسے گھور کر رہ گئے۔ وہ اپنے غصے کو دبانے کی کوشش کرنے لگے جس سے ان کا منہ تقریباً سرخ ہو گیا تھا۔

"جیسی تمہاری مرضی۔ مجھے اپنی جان پیاری ہے۔ اگر تم خود ہی اپنی زندگی کو بچانا نہیں چاہتے تو میں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں لیکن یہ یاد رکھنا کہ پھر تم ہماری دنیا میں کبھی واپس لوٹ نہیں سکو گے۔" عالم صاحب نے غصے سے چیختے ہوئے کہا اور بس کی طرف بڑھ گئے جو چلنے والی تھی اور مجاہد اپنی آنکھوں میں الجھن لیے عالم صاحب کی بات کے مطلب کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کس دنیا میں واپس جانے کا کہہ رہے تھے۔

"کتابیں ہمیں کسی بھی زمانے کے احساسات و خیالات پہنچانے کی کوشش تو کرتی ہیں لیکن اپنی پوری کوشش کے باوجود وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہو پاتیں اور اس بات کا علم مجھے یہاں آ کر ہوا۔" عالم صاحب کو پیچھے محسن کی آواز آئی لیکن انہوں نے کچھ کہنے سے گریز کیا اور اس بس میں سوار ہو گئے جو جانے کے لیے تیار کھڑی تھی اور عالم صاحب کے بیٹھتے ہی چل پڑی۔ عالم صاحب ایک سیٹ پر بیٹھ کر محسن کی طرف دیکھنے لگے جو انہیں الوداع کہنے کے لیے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ منظر اوجھل ہو گیا۔ عالم صاحب واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے جہاں ان کے لیے بہت سی دلچسپیاں موجود تھیں۔

محسن مجاہد کے ساتھ ایک نئے سفر پر روانہ

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 3000 روپے

بیرونِ ممالک کے لیے زرِ سالانہ 50,000 روپے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا تنویر عباس

0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

مین کورنگی روڈ، کراچی

ہوگیا۔ جس کے لیے اس نے اپنی ساری قابلیت اور زندگی وقف کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ کل کا انسان تھا مگر آج کی طرح سوچنے اور اس پر عمل کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

☆☆☆

عالم صاحب کے واپس جانے کے بعد محسن کے پاس رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی تو اس نے مجاہد سے اس بارے میں بات کی۔ مجاہد کچھ دیر ہچکچاہٹ کا شکار رہا کیونکہ محسن اس کے لیے اجنبی انسان تھا۔ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد بالآخر مجاہد مان گیا اور محسن کو ساتھ رکھنے پر رضامند ہوگیا۔

اس طرح محسن نے مجاہد کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ فروری کے وسط میں وادی کا ماحول پہلے کی نسبت کچھ بہتر ہوا۔ کیونکہ دسرا فروری کے بعد جلوس وغیرہ نکلنا بند ہو چکے تھے... وہ لاک ڈاؤن جو پہلے بہت سخت تھا اب اس میں کچھ نرمی کی گئی تھی تاکہ کاروبارِ زندگی مکمل طور پر بند نہ ہو اور اسی طرح چلتا رہے کہ تاکہ بھارتی حکومت کو اپنی فوج کے لیے اناج وغیرہ نہ بھیجنا پڑے اور وہ یہیں سے حاصل کرتے رہیں۔

محسن نے مجاہد کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ اس کی باتیں سن کر پہلے تو مجاہد کو یقین نہ آیا مگر پھر محسن کے دلائل اور عالم صاحب کی آخری بات کی بنا پر مجاہد نے یقین کرلیا۔ محسن نے اس سے وعدہ کیا کہ یہ راز صرف ان دونوں کے درمیان ہی رہے گا اور وہ کسی دوسرے کو اس سے آگاہ نہیں کرے گا۔ ویسے اگر بتا بھی دیا تو شاید ہی کوئی اس کی بات پر یقین کرے کیونکہ ابھی یہ باتیں صرف تخیلاتی تھیں اور موجودہ دنیا میں فی الحال اس کو ناممکن سمجھا جاتا ہے۔

ایک صبح محسن اور مجاہد ناشتا کر رہے تھے کہ مجاہد نے محسن سے کہنا شروع کیا۔

"حالات پہلے سے کچھ بہتر ہوگئے ہیں۔ میرے خیال میں ہمیں کچھ کام کرنا چاہیے۔" مجاہد نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔

"کیا کام.....؟" محسن نے پوچھا۔

"چونکہ تم نے اپنے بارے میں ساری حقیقت سچ سچ بتا دی ہے اور اب رہنا بھی میرے ساتھ ہی ہے تو میرے خیال میں مجھے بھی تمہیں اپنے بارے میں بتا دینا چاہیے تاکہ تم بھی ہمارے ساتھ مل کر کام کرسکو۔" مجاہد نے خلوص سے کہا۔

"کیا بتانا چاہتے ہو؟" محسن نے تجسس ہوتے ہوئے کہا۔

"میں ملکی سیکرٹ سروس میں کام کرتا ہوں۔" مجاہد نے انکشاف کیا تو محسن ہکا بکا مجاہد کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

"تو یہاں کیا کرنے آئے ہو؟" محسن نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کچھ عرصہ پہلے ایک خطرناک مجرم جو "کے خان" کے نام سے مشہور تھا۔" مجاہد نے کہنا شروع کیا۔ "اس نے ہمارے ملک کی قومی سلامتی کی ایک خفیہ فائل بڑی چالاکی سے چُرائی۔ میں اور میرے ساتھیوں نے بڑی مشکل سے اس کے خفیہ ٹھکانے کا سراغ لگا کر اسے گرفتار کرنا چاہا لیکن اس نے ہمارے ہاتھ آنے سے پہلے خودکشی کرلی۔ اس کے ایک ساتھی سے ہمیں اتنا پتا چل گیا کہ اس نے وہ فائل کہاں چھپائی تھی۔" مجاہد نے تفصیل سے بتایا۔

"اور وہ جگہ یہاں کشمیر میں ہوگی۔" محسن نے کہا۔

"بالکل، اس نے یہاں تاریک جنگل کے ایک خفیہ گوشے میں وہ فائل چھپائی تھی تاکہ ہم اسے تلاش نہ کرسکیں۔ کے خان نے اس جگہ کا ایک چھوٹا سا نقشہ بنا کر اپنے دستِ راست کو احتیاطاً دیا تھا۔ تاکہ اگر وہ نہ رہے تو اس کا ساتھی آسانی سے وہ فائل حاصل کرکے اس کے نامکمل کام کو تکمیل تک پہنچا سکے۔" مجاہد نے بات پوری کی۔

"کیا اکیلے آئے ہو؟"

"نہیں۔"

"تو تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟" محسن نے پوچھا۔

"وہ تیاری میں مصروف ہیں۔ ہم شام کو جائیں گے ان شاء اللہ۔ اگر ساتھ جانا چاہو تو چل سکتے ہو۔" مجاہد نے پیشکش کی۔

"ضرور۔" محسن نے ہامی بھر لی پھر مجاہد شام والے منصوبے کو محسن کے ساتھ ڈسکس کرنے لگا اور ساتھ ساتھ محسن کے سوالات کے جوابات بھی دیتا رہا۔ شام تک محسن اُن کے ساتھ جانے کے لیے ذہنی و جسمانی طور تیار ہو چکا تھا۔

شام کے بعد وہ سب اس تاریک جنگل کے سامنے کھڑے تھے جس میں انہوں نے جانا تھا۔ سورج غروب ہونے کے بعد سے جنگل میں ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ویسے بھی درختوں کی اوپر والی شاخیں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔ جن کی وجہ سے شاخوں اور پتوں کی چھت سی بنی ہوئی تھی۔ پتوں اور شاخوں کی چھت کی وجہ سے جنگل دن میں بھی تاریکی میں ڈوبا رہتا تھا۔ اسی لیے اسے تاریک جنگل کا نام دیا گیا تھا۔ جہاں کہیں پتوں کی تعداد کم تھی وہاں سے چاند کی ہلکی ہلکی روشنی... آرہی تھی۔

مجاہد اپنے تینوں ساتھیوں احمد، زبیر اور محسن کے ساتھ

pklibrary.com

اسی ہلکی سی روشنی میں درختوں کی شاخوں کو ہٹاتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ چاروں پوری طرح چاق چوبند اور آس پاس نظریں جمائے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے کوشش کی تھی کہ ضرورت کی ہر چیز ساتھ لے کر آئیں۔

''کیا آپ کو پورا یقین ہے کہ آکاش نے ہم سے سچ بولا ہے کہ وہ فائل یہیں چھپائی گئی ہے اور وہ نقشہ بھی صحیح ہے؟'' زبیر نے چلتے ہوئے سوال کیا۔

''کہیں ہمیں باقاعدہ منصوبہ بندی سے گمراہ کر کے نہ بھیجا گیا ہو تاکہ ہم یہاں پھنس جائیں اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔'' محسن نے بھی اپنا خدشہ بیان کیا۔

''اگر ہمیں ٹریپ کیا بھی گیا ہے تو ہم تب بھی اتنے آسان شکار نہیں ہیں کہ ان کے لیے تر نوالہ ثابت ہو جائیں۔ مجھے تم سب کی صلاحیتوں پر یقین ہے۔'' مجاہد نے کہا۔ اسی طرح وہ باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے کندھوں پر بیگ باندھے ہوئے تھے جن میں ان کا ضروری سامان تھا۔

چلتے ہوئے محسن کو اپنے پاؤں تلے کچھ حرکت محسوس ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے اس بارے میں تبادلۂ خیال کرتا، کسی نادیدہ رسی نے ان سب کے پاؤں کو جکڑا اور اگلے ہی لمحے وہ چاروں الٹے لٹک رہے تھے۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ وہ اپنے بچاؤ کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ ایک تو وہ الٹا لٹکے ہوئے تھے اور دوسرا اندھیرا ہونے کی وجہ سے وہ دیکھ نہ سکے کہ ان کے پاؤں کو کس چیز نے جکڑا ہے۔ الٹا لٹکے ہونے کی وجہ سے ان کو سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ ابھی وہ اس اچانک آجانے والی اُفتاد سے نبٹنے کا سوچ رہے تھے کہ ان کے تھنوں سے ایک نامانوس سی بُو ٹکرائی اور اگلے ہی لمحے ان کے ذہن تاریکی میں ڈوبتے چلے گئے۔

مجاہد کے دماغ میں آخری خیال یہی تھا کہ محسن کا خدشہ بے جا نہیں تھا۔

☆☆☆

جیسے گھپ اندھیرے میں جگنو چمکتا ہے بالکل اسی طرح مجاہد کے دماغ میں بھی روشنی کی ایک کرن نمودار ہوئی جس نے پورے دماغ کو روشن کر دیا۔ مجاہد نے آنکھیں کھولیں تو خود کو اسی طرح الٹا لٹکے ہوئے پایا جس طرح بے ہوشی سے پہلے پایا تھا۔ آس پاس نظر دوڑائے پر اس نے محسن، احمد اور زبیر کو بھی اسی حالت میں پایا۔ لیکن یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں وہ بے ہوش ہوئے تھے۔ کیونکہ روشنی پھیلی ہوئی تھی جو کہ ایک طرف جلتے ہوئے آگ کے الاؤ سے آ رہی تھی۔ آگ کے الاؤ کے قریب بیٹھا ہوا خوفناک چہرے کا مالک شخص مجاہد کو گھور رہا تھا۔

''تو تمہیں ہوش آ گیا۔'' خوفناک چہرے والا آدمی بولا۔

''کون ہو تم؟ اور ہمیں اس حالت میں رکھنے کی وجہ؟'' مجاہد نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ اسی دوران اس کے باقی تینوں ساتھیوں کو بھی ہوش آ چکا تھا۔

''مجھے پتا تھا کہ تم یہاں ضرور آؤ گے۔ اسی لیے تمہارا استقبال کرنے کے لیے پہلے سے موجود تھا۔ میرا نام ہے ''جے خان۔'' جے خان نے خوفناک آواز میں قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے ہاتھ میں موجود پستول آگ کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

''یعنی تم کے خان کے بھائی ہو؟'' محسن نے پوچھا۔

''بالکل صحیح سمجھے۔'' جے خان نے خوفناک آواز میں جواب دیا۔

''تو اب ہم سے کیا چاہتے ہو؟'' احمد بولا۔

''وہ فائل جس کے لیے یہاں آئے ہو۔'' جے خان نے کہا۔

''خود کو'' کے خان'' کا بھائی کہہ رہے ہو اور فائل کا ہم سے پوچھ رہے ہو۔'' زبیر نے طنز کیا۔

''وہ مجھے بتانے ہی والا تھا مگر اسی دن تم لوگوں کی وجہ سے اسے خودکشی کرنا پڑی۔ میں اسی وقت سے تم لوگوں کا پیچھا کر رہا ہوں اور تم کو فالو کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہوں۔ اب یا تو تم لوگ مجھے وہاں تک لے کر جاؤ گے یا پھر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو لو گے۔'' جے خان نے اپنے لہجے کو مزید خوفناک بناتے ہوئے کہا تو تینوں کی نظریں مجاہد کی طرف اٹھیں جو کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''ہم تمہیں کسی صورت نہیں بتائیں گے۔ وہ ہمارے ملک کے قیمتی راز ہیں۔'' احمد نے غصے سے کہا۔

''اس ملک نے آخر تمہیں دیا ہی کیا ہے۔ اب اگر اس جگہ تمہیں مار دوں تو کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ ذرا سوچو تمہارے گھر والوں کا کیا بنے گا؟ آخر کس لیے فضول میں اپنی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو۔'' جے خان نے سمجھایا۔

''اس ملک نے ہمیں پہچان دی، رہنے کے لیے جگہ دی ہے۔ ہمارا مقصد اسلام کے اس قلعے کی حفاظت کرنا ہے اور شہادت کو ہم اپنے لیے تحفہ سمجھتے ہیں۔'' زبیر نے جوش بھرے انداز میں جواب دیا تو جے خان نے ایک قہقہہ لگایا۔

''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ فائل حاصل کرنے کے بعد تم ہمیں زندہ چھوڑ دو گے؟'' محسن نے سنجیدہ لہجے

pklibrary.com

میں کہا۔

"ضمانت کے لیے میرا کہہ دینا ہی کافی ہے۔ جے خان جو کہہ دیتا ہے، اس پر قائم رہتا ہے۔" جے خان نے کہا۔

"اگر ہم تمہیں وہاں لے جائیں تو بدلے میں ہمیں کیا ملے گا؟" مجاہد نے سوال کیا۔

"جو مانگو گے ملے گا لیکن اگر تم نے کوئی چال چلی تو اس کے ذمے دار خود ہو گے۔" جے خان نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔" مجاہد نے ہامی بھرتے ہوئے کہا۔ مجاہد کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ شاید اس نے کچھ سوچ لیا تھا۔ جے خان نے سر ہلاتے ہوئے کسی کو آواز دی تو ایک طرف اندھیرے سے جے خان کی طرح ہی خوفناک دو آدمی نکلے اور ان کو کھولنا شروع کر دیا۔

"ہمارے بیگ تو واپس کر دو۔" مجاہد نے جے خان سے کہا کیونکہ ان کے کندھوں سے بیگ اتار لیے گئے تھے۔ جے خان نے اپنے ساتھیوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا تو ان چاروں کو بیگ پکڑا دیے گئے۔ مجاہد نے فوراً اپنا بیگ کھول کر چیک کیا تو ان میں سوائے اسلحے کے ہر چیز موجود تھی۔ بیگ کے خفیہ خانے میں نقشہ بھی موجود تھا جس کو جے خان کے ساتھی ڈھونڈ نہیں سکے تھے۔

"تم میرے ساتھ آگے چلو گے۔" جے خان نے مجاہد کو کہا پھر اپنے ساتھیوں کی طرف رخ کر کے کہنے لگا۔ "اور تم لوگ میرے پیچھے آؤ گے۔ ان تینوں کا بھی خیال رکھنا۔ اگر کوئی چالاکی کرنے کی کوشش کریں تو بلاتوقف گولیوں سے بھون دینا۔" جے خان نے محسن، زبیر اور احمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحکمانہ انداز میں اپنے ساتھیوں سے کہا اور چل دیا۔

مجاہد نے وہ نقشہ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تاکہ مطلوبہ جگہ ڈھونڈنے میں آسانی رہے۔ گھنے درختوں کی وجہ سے چھائے ہوئے گھپ اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس لیے جے خان نے اپنی ٹارچ نکال لی۔ ٹارچ کی روشنی بہت کم تھی لیکن اتنی ضرور تھی کہ سب کو ایک دوسرے کے ہیولے نظر آ رہے تھے اور وہ دوسری چیزوں کو ان کے سایوں سے پہچان سکتے تھے۔ جے خان کی توجہ راستے پر تھی۔ اس وجہ سے وہ مجاہد کے ہاتھ پکڑا ہوا چھوٹا سا نقشہ نہیں دیکھ سکا۔ نہیں تو ایک اور جھگڑا ہونے کا امکان تھا۔ جے خان سوچ رہا تھا کہ فائل کے مل جانے کے بعد وہ کافی امیر ہو جائے گا۔

مجاہد نے نقشے پر موجود نشانیوں سے سارا راستہ سمجھا ہوا تھا۔ جہاں وہ فائل موجود تھی۔ تقریباً بیس منٹ چلتے رہنے کے بعد مجاہد ایک جگہ رک گیا۔

"کیا ہوا؟ رک کیوں گئے؟" مجاہد کو جے خان کی غصے سے بھری ہوئی آواز سنائی دی۔

"یہی وہ جگہ جہاں وہ فائل موجود ہے۔" مجاہد نے اپنے سامنے دائیں طرف ایک جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہاں پر ہر طرف جھاڑیاں ہی جھاڑیاں موجود تھیں۔

"یہاں تو ہر طرف جھاڑیاں ہیں۔" جے خان نے کہا۔

"مجھے بتایا گیا تھا کہ جب ان جھاڑیوں کو ہٹایا جائے گا تو پیچھے لکڑی کے تختے نظر آئیں گے۔ جن کو اکھاڑنے سے پیچھے ایک گڑھے نما غار میں پڑا ہوا صندوق ملے گا۔ فائل اسی صندوق میں ہے۔" مجاہد نے جواب دیا اور جھاڑیوں کو ہٹانے کے لیے آگے بڑھا۔

"تم وہیں رہو۔ یہ کام میں خود کروں گا۔ اگر تم نے کوئی غلط بیانی کی ہو گی تو پھر اپنے بھیانک انجام کے لیے تیار رہنا۔" جے خان نے غراہٹ بھرے انداز میں کہا اور آگے بڑھ کر جھاڑیاں ہٹانے لگا۔ اس کے دونوں ساتھی بھی مزید چوکنا ہو گئے۔

جھاڑیاں اور لکڑی کے تختے ہٹانے کے بعد آخر کار صندوق برآمد ہو ہی گیا۔ صندوق کو دیکھ کر جے خان کے چہرے پر ایک خوفناک مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آخر کار اتنی کوششوں کے بعد وہ چیز مل ہی گئی جس کے لیے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اتنا سارا کچھ کیا۔ ہاہاہا۔" جے خان نے اپنی خوفناک آواز میں قہقہہ لگاتے ہوئے صندوق کھولا اور اندر موجود فائل نکالنے لگا۔

احمد، زبیر اور محسن کے چہروں پر دور دور تک کسی پریشانی یا اضطراب کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے بلکہ اس کے بجائے ان کے چہروں پر اطمینان پھیلا ہوا تھا اور وہ سکون بھری نظروں سے یہ سب دیکھ رہے تھے جس فائل کے لیے وہ اتنی دور آئے تھے۔ اپنی جان کو خطرے میں ڈالا، وہ ان کے ہاتھ سے جا رہی تھی لیکن پھر بھی وہ مطمئن تھے۔ جے خان نے جب ان کے چہروں پر کسی بھی قسم کے اضطراب کے آثار نہ دیکھے تو وہ الجھ گیا اور سوچ میں پڑ گیا کہ کہیں انہوں نے

pklibrary.com

اسے کوئی چکما تو نہیں دے دیا۔ جے خان نے جلدی سے فائل کھول کر دیکھنی شروع کی لیکن فائل بالکل اصلی تھی۔ اس نے ایک بار پھر مجاہد کے ساتھیوں کو دیکھا۔ فائل پر نظر دوڑائی تو مجاہد اور اس کے ساتھیوں کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھ کر مزید اُلجھ گیا۔

اس نے اپنا پستول نکال کر مجاہد پر تان لیا۔ اس کے ساتھی تو پہلے ہی اپنے ہتھیار سنبھالے چوکس کھڑے ہوئے تھے۔

''تم نے میرے ساتھ کیا چال چلی ہے؟'' جے خان غرایا۔

''ہم نے کیا چال چلنی ہے۔ کیا فائل اصلی نہیں ہے؟'' مجاہد نے پوچھا۔

''پھر تم مسکرا کیوں رہے ہو؟'' جے خان نے پستول کے ٹریگر پر دباؤ بڑھا دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ ٹریگر دباتا پستول اس کے ہاتھ سے نکلتا ہوا دور جا گرا۔ جے خان اور اس کے ساتھی چونک پڑے۔ ان کی نظریں فوراً مجاہد اور اس کے ساتھیوں کی طرف اٹھیں مگر وہ ہنوز ساکت کھڑے ہوئے تھے۔

''جب ملک دشمن میرے بھائیوں کی جان کے درپے ہو اور وہاں شیر عالم نہ ہو، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' اندھیرے میں ایک زوردار آواز گونجی۔ جے خان اور اس کے ساتھی ابھی تک حیرانی میں ڈوبے ساکت وجامد کھڑے ہوئے تھے کہ اب یہ کون آ گیا ہے؟

زبیر، احمد اور محسن نے جب جے خان کے ساتھیوں کو حیرت میں ڈوبا دیکھا تو فوراً حرکت میں آئے اور جے خان کے ساتھیوں سے ہتھیار چھین کر اپنے قبضے میں کر لیے۔ شیر عالم نے ایک پستول مجاہد کی طرف اچھالا جو مجاہد نے تیزی سے آگے بڑھ کر جھپٹ لیا۔

''جہاں ہو، وہیں رہو ورنہ بھون دیے جاؤ گے۔ تم میرے نشانے پر ہو۔'' محسن جو کہ جے خان کے آدمیوں کی ایک گن پر قبضہ کر چکا تھا غراتے ہوئے جے خان کی طرف بڑھا۔ جے خان نے محسن کو گن پکڑے نشانہ لیتے ہوئے دیکھا تو ساکت ہوگیا۔ اس دوران زبیر اور احمد جے خان کے... دونوں آدمیوں کا کام تمام کر چکے تھے۔ محسن نے ایک نظر اپنے ساتھیوں پر ڈالی تو جے خان نے محسن کی اس لمحاتی غفلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر چھلانگ لگا دی تاکہ اس کو دبوچ کر خود کو بچا سکے۔

''محسن بچ کر۔'' احمد نے چیخ کر محسن کو جے خان کی طرف متوجہ کیا۔ محسن نے فوراً اپنی نظروں کو جے خان کی طرف گھمایا مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ وہ جے خان سمیت نیچے گر گیا۔ گرتے ہی جے خان نے محسن کے ہاتھ سے گری ہوئی گن کو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ عین اسی وقت احمد کی گن حرکت میں آئی اور کئی گولیاں جے خان کے جسم کے آر پار ہوگئیں۔ گولیاں لگتے ہی جے خان کے منہ سے ایک خوفناک چیخ برآمد ہوئی اور وہ ساکت ہوگیا۔

''خس کم جہاں پاک۔'' زبیر بولا۔

شیر عالم نے آگے بڑھ کر وہ فائل اٹھالی جس کے لیے... اتنا کچھ ہو چکا تھا، وہ جانے کے لیے واپس مڑے۔

ان کے مڑتے ہی جے خان کے جسم میں حرکت ہوئی اور اس نے اپنے جسم کی پوری قوت بروئے کار لاتے ہوئے اپنا ہاتھ گرے ہوئے پستول کی طرف بڑھایا۔ پستول پکڑتے ہی اس نے شیر عالم کی پشت کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ گولی پیچھے سے شیر عالم کے کندھے سے تھوڑا سا نیچے عین دل کے مقام پر لگی اور سامنے سینے سے نکل گئی۔ شیر عالم کے منہ سے چیخ نکلی۔ شیر عالم کی چیخ سن کر چاروں چونک کر واپس مڑے اور جے خان کے اٹھے ہوئے ہاتھ میں پستول دیکھ کر ساری بات سمجھ گئے۔ مجاہد اور احمد نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گنوں سے اس پر فائر کھول دیے۔ کئی گولیوں نے ایک بار پھر جے خان کے جسم میں روشن دان بنا دیے۔ وہ چاروں دوڑ کر شیر عالم کے پاس پہنچے جو اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ شیر عالم نے فائل احمد کے ہاتھ میں دے دی۔ مجاہد نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

''میرے بھائی۔'' مجاہد کی آواز میں بلا کا کرب تھا۔

شیر عالم نے اپنے ہاتھ مجاہد کے ہاتھوں میں دیے جیسے وعدہ لینا چاہ رہا ہو کہ میرے بعد اسلام کے اس قلعے کی حفاظت کرتے رہنا۔ اس کو یوں دشمنوں کے حوالے مت کر دینا۔

کچھ دیر بعد شیر عالم نے اونچی آواز میں کلمۂ شہادت پڑھنا شروع کیا۔ اس نے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لیے ہوئے کھلی آنکھوں سے اپنے ساتھیوں کو یوں دیکھا جیسے کہنا چاہ رہا ہوں۔

''الوداع میرے بھائیو! میں نے اپنا کام پورا کر دیا ہے۔''

مجاہد نے شیر عالم کو اپنے کندھوں پر اٹھایا اور واپس چل دیے جہاں مزید کامیابیاں مشکلات کے ساتھ ان کی منتظر تھیں۔ ابھی اسے بہت سے کام پورے کرنے تھے۔ اسے واپس جانا تھا۔ اسے شیر عالم کے ساتھ کیا ہوا وعدہ نبھانا تھا۔

✖✖✖

pklibrary.com

گمنام منزلیں

طاہر جاوید مغل

زندگی سفر اور انسان مسافر... یہاں کوئی جگہ کسی کی مستقل منزل تو نہیں ہوسکتی اس کے باوجود ہمیں کسی نہ کسی منزل کا انتظار رہتا ہے... کیونکہ آنکھوں میں بسے خواب دل کے جذبات کو نئی راہ سُجھاتے ہیں... اور وہ تو دل کی گہرائیوں میں کسی کی محبت کو چھپائے... مسلسل سفر میں تھا کیونکہ اسے ہر قیمت پر خوابوں کی تعبیر درکار تھی... محبت کے رشتوں کو محبت سے پانے اور نبھانے کا عزم لیے اس نے ہر آزمائش سے گزرنے کا فیصلہ کرلیا تھا... اس کٹھن راہ پر اس کے ساتھ محبت ایک سایہ بن کر ساتھ تھی... اندھیری راتوں میں اپنوں سے دوری اور آس و امید کے سہارے اسے ہر حال میں اپنی طے شدہ منزل کو پانا تھا... ارادے مضبوط ہوں تو منزل بھی خود چل کر پاس آتی ہے۔

گمنام منزلوں کے مسافر کی قدم قدم پر آزمائشوں سے بھری درد بھری داستان

pklibrary.com

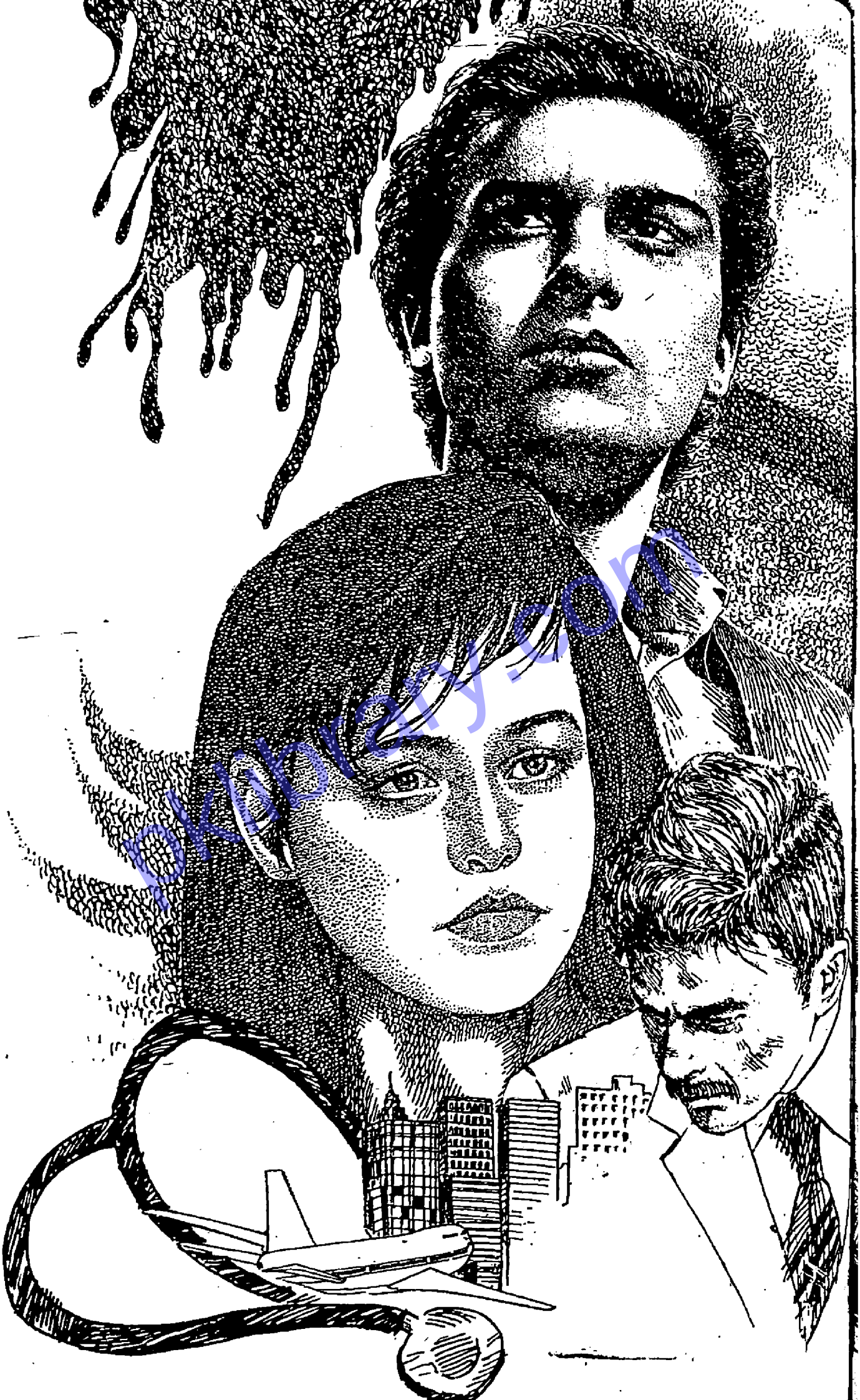

دسمبر کی اس یخ بستہ رات میں چوبیس سالہ یاور اور اس کی معصوم نیک صورت ماں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ بیٹے کے زخمی ہاتھ پر سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ماں نے یہی پٹی والا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھا ہوا تھا۔ ایک پستول سامنے میز پر پڑا تھا۔

''آج تجھے ایک قسم کھانا ہوگی یاور! یا پھر میرا مرا ہوا منہ دیکھے گا۔'' وہ دبلی نازک سی عورت چٹانوں جیسی مضبوط آواز میں بولی۔

یہ کہانی قریباً تین سال پہلے دسمبر کی ایسی ہی خنک رات کو شروع ہوئی تھی۔ ان دنوں یاور اکبر کا ڈرائی فروٹ والا کام چل پڑا تھا اور یہ کوئی شاپ وغیرہ نہیں تھی۔ ایک طرح کا چھوٹا سا ٹھیلا یا اسٹال ہی تھا جو اس گنجان علاقے میں گھڑیوں کی ایک دکان کے سامنے یاور نے اپنی ماں ہی کے اصرار پر لگایا تھا۔ گھڑیوں کی اسی دکان کے اوپر چوبارے میں یاور اپنی والدہ اور بارہ سالہ بہن گوشی کے ساتھ رہتا تھا۔

سردیوں میں لوگوں کا رجحان خشک میوہ جات کی طرف ہوجاتا ہے۔ یاور نے بھی اپنے اسٹال نما ٹھیلے پر بادام، کشمش، اخروٹ، مونگ پھلی اور بھنے ہوئے چنے وغیرہ رکھے تھے۔ کام تو چل پڑا تھا لیکن پریشانی ایک ہی تھی..... مفت خورے۔

یوں تو ہر جان پہچان والا کوئی نہ کوئی چیز پوچھے بغیر اٹھا کر منہ میں ڈال لیتا تھا مگر ایک مقامی نوجوان راشد عرف راشی تو جیسے اسے زچ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ ایک طرح سے اندرونِ شہر کے اس محلے کا ایک غنڈا ہی تھا۔ آتے جاتے یاور کے اسٹال سے مٹھی بھر کر کوئی نہ کوئی چیز لے جاتا۔ بیہودہ قسم کا بھونڈا مذاق علیحدہ تھا۔ یاور تنگ دل نہیں تھا لیکن راشی تو جیسے اس کا کڑا امتحان لینے پر تلا ہوا تھا۔ ایک روز جھنجلاہٹ کے عالم میں یاور بول ہی پڑا۔

''یار! ذرا ہاتھ ہولا رکھو۔ تمہاری دیکھا دیکھی دوسرے بھی.....''

ابھی بات یاور کے منہ میں ہی تھی کہ راشی نے اٹھاتے ہوئے بادام دوبارہ ٹرے میں پھینک دیے۔ ''بڑا کمینہ ہے بھئی تو۔''

''بھرا جی، میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی ہے؟'' یاور گھبرا کر بولا۔

''تو کہہ کر دیکھ کمینے۔ زبان کھینچ کر تلی پر نہ رکھ دوں تو۔''

بات بڑھتی جارہی تھی۔ باقاعدہ جھگڑا شروع ہوگیا۔ دھکم پیل میں راشی نے یاور کا اسٹال تقریباً الٹا کر رکھ دیا۔ یاور سب کچھ برداشت کرتا رہا اور کوشش میں رہا کہ بات بہت نہ بڑھ جائے لیکن جب راشد عرف راشی نے اسے ماں کی گالی دی تو کچھ بھی اس کے بس میں نہ رہا۔ وہ دنیا میں سب کچھ برداشت کرسکتا تھا مگر ماں کی گالی نہیں۔ وہ ایک دم ہی آگ بگولا ہوا اور راشی پر پل پڑا۔ اوپر چوبارے سے یاور کی ماں چلا رہی تھی۔ یاور کی منتیں کر کے اسے لڑنے سے منع کررہی تھی۔ اسی دوران میں شدید طیش کے عالم میں یاور نے ایک پھل فروش کی ریڑھی سے چھری اٹھالی اور دستے تک راشد کی ران میں گھونپ دی۔ بازار میں بھگدڑ سی مچی اور ڈولفن والوں نے آکر یاور کو پکڑ لیا۔

.....اس ایک واقعے نے پچھلے تین سال میں یاور کو کیا سے کیا بنا دیا۔ چھ ماہ جیل میں گزار کر جب وہ ضمانت پر باہر آیا تو یکسر بدل چکا تھا۔ جیل میں ہی دو تین دوست اس کے ایسے بن گئے جنہوں نے اس کی کایا کلپ کردی۔ جیل سے نکلنے کے دو ہفتے بعد اس نے پھر سے اس راشد عرف راشی کو جالیا جس نے اسے ماں کی گالی دی تھی۔ اس نے مار مار کر اسے بے ہوش کر ڈالا۔

راشی بھی کوئی معمولی پھڈے باز نہیں تھا۔ اندرونِ شہر کے اس علاقے میں راشی اور اس کے دو بھائیوں کی دھاک تھی۔ وہ ویڈیو گیمز کی شاپس اور اسنوکر کلب چلاتے تھے۔ ان کا باپ کسی قتل کیس میں دس سال کی سزا بھگت رہا تھا۔

یاور اور راشی برادران میں جھگڑے شروع ہوئے تو پھر بڑھتے ہی چلے گئے۔ ان جھگڑوں اور مار ماری نے دو سال میں ہی یاور اکبر کو ٹھیک ٹھاک غنڈا بنا دیا۔ راشی اور اس کے بھائی اب کچھ دب گئے تھے۔ دو تین اور پھڈے باز گروپوں کو بھی یاور نے ٹھنڈا کردیا۔ وہ اس سے کنی کترانے لگے۔

اب یاور کی گھٹنوں تک جاتی قمیص کے نیچے ہر وقت بھرا ہوا پستول رہتا تھا۔ اسلحے بلکہ ہر طرح کے اسلحے کی شناخت اسے ہوچکی تھی۔ ماں اس کی یہ صورت حال دیکھ دیکھ کر بے حال ہوتی تھی۔ اس کا تر لا منت کرتی تھی، اس کے سامنے ہاتھ جوڑتی تھی کہ وہ اس راہ سے پیچھے ہٹ جائے مگر یوں لگتا تھا کہ اب پیچھے ہٹنا یاور کے بس میں ہی نہیں رہا۔

انہی دنوں یاور نے انارکلی بازار میں شاپنگ کرتی ہوئی ایک اریبہ نامی خوبرو لڑکی کو چند آوارہ گردوں کی

''ہراس منٹ'' سے بچایا اور اریجہ سے اس کی راہ و رسم پیدا ہوگئی۔ اریجہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے والد الیکٹرانکس کی شاپ کرتے تھے۔ اریجہ نہ صرف یاور کی دلیری پر فدا ہوئی تھی بلکہ وہ یہ بھی دیکھتی تھی کہ دبنگ اور نڈر ہونے کے باوجود وہ اپنے علاقے کے شرفاء کے ساتھ نرمی سے ہی پیش آتا تھا۔ وہ ایف اے کر چکی تھی اور اب کوکنگ کا کوئی کورس کر رہی تھی۔ گاہے بگاہے یاور اس سے مل تو رہا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ ان کا ملن آسان نہیں ہے۔ وہ ایک بار جیل کی ہوا کھا چکا تھا اور اس جیل کے بعد وہ بتدریج اور ہی رنگ میں ڈھل گیا تھا۔ اس نے یہ بات اریجہ سے بھی کہی تھی مگر وہ آنکھیں بند کر کے اس کے کندھے سے لگ گئی تھی اور اس کے کان میں نرم گرم سرگوشی کرتے ہوئے بولی تھی۔

''یاور! جب پیار ہوگیا تو پھر ہوگیا..... اور یہ تو ہوتا ہی اس جگہ ہے جہاں مشکلیں زیادہ ہوتی ہیں۔''

''ان مشکلوں سے گزر سکو گی؟'' یاور نے اس کے نم رخسار کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

وہ چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ بولی۔ ''تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہا تو ہر مشکل سے گزر جاؤں گی اور نہ گزر سکی تو زندگی بھی نہیں گزاروں گی۔ فل اسٹاپ لگا دوں گی ایسی دردناک زندگی کو۔''

پھر وہ حسبِ معمول یاور کو سمجھانے بجھانے میں مصروف ہوگئی کہ وہ اس کی باتوں کو رد نہ کرے اور نہ ہی ماں کی باتوں کو۔ وہ لڑائی جھگڑے اور دشمنی داری کے چکروں سے نکل جائے، کوئی اچھا سا ذاتی کام شروع کرنے کی کوشش کرے۔

وہ بھی جانتی تھی کہ اس کے اور یاور کے ملن میں جو بڑی رکاوٹیں پیدا ہوں گی، وہ دو ہی ہیں۔ یاور کی دشمنی اور اس کے مالی حالات..... بلکہ اریجہ کے نزدیک مالی حالات کی اہمیت دیگر معاملوں سے زیادہ تھی۔

یاور نے بی اے کے علاوہ چھوٹا موٹا ٹیکنیکل کورس بھی کر رکھا تھا۔ ماں کے بار بار کہنے پر وہ روزگار ڈھونڈنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ دو چار ہفتے کہیں کام کر بھی لیتا تھا مگر اب اس کا مزاج بدل چکا تھا۔ کسی سے بھی بہت جلد جھگڑ پڑتا تھا اور تعلقات خراب کر لیتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ دنیا میں صرف تین افراد ہی ہیں جن کے لیے یاور کے دل میں مہر و محبت موجود ہے۔ اس کی بیوہ ماں جسے سب لوگ ممتاز بی بی کہتے تھے، اس کی چھوٹی بہن گوشی جو ساتویں کلاس کی طالبہ تھی..... اور اریجہ جس کا خیال سوتے جاگتے اس کے دل و دماغ میں سمایا رہتا تھا۔

کہتے ہیں کہ دشمنی اور عداوت کے اپنے ہی رنگ ڈھنگ ہوتے ہیں۔ کسی وقت وہ بظاہر دب بھی جائے تو راکھ کے ڈھیر میں الاؤ بھڑکانے والی چنگاریاں سلگتی ہی رہتی ہیں۔ یاور کو ماں کی گالی دینے والے اور پھر یاور کے ہی ہاتھوں ذلیل و خوار ہونے والے راشد عرف راشی کا کلیجا اندر سے تو سلگتا ہی رہتا تھا۔ پھر ایک معاملہ ایسا ہوا کہ جس کے سبب راشی کی اندرونی کدورت کو بڑا سہارا ملا اور وہ نئے سرے سے باہر آنے کے لیے تیار ہوگئی۔

راشی اپنے تینوں بھائیوں میں بڑا تھا۔ اس کی شادی اندرونِ شہر کی ہی ایک دبنگ اور جھگڑالو فیملی میں ہوگئی۔ سکندر موبائیلاں والا قریباً قریباً ایک بدمعاش ہی تھا اور راشی کی بیوی اس کی چھوٹی بہن تھی۔ اس رشتے کے بعد راشی اور اس کے دونوں بھائیوں نے پھر تیزی سے پر پُرزے نکالے۔ پرانی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے عین عید کے تہوار سے ایک روز پہلے انہوں نے سرِ راہ یاور کو روک لیا۔ راشد عرف راشی نے اسے حسبِ سابق علی الاعلان ماں کی گالی دی۔ جب یاور سیخ پا ہوا تو اسے موٹر سائیکل پر سے کھینچ کر سڑک پر پٹخا اور ہاکیوں اور آہنی راڈوں سے مارنا شروع کر دیا۔ وہ اس کی دو چار ہڈیاں توڑنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اسے یاور کی خوش قسمتی ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کے جیل کے دو ساتھی منور اور فدا حسین موٹر سائیکل پر ہی پیچھے آ رہے تھے۔ وہ بھی للکارے مار کر راشی وغیرہ سے بھڑ گئے۔ ٹھیک ٹھاک معرکہ ہوا۔ اس سے پہلے کہ گولی وغیرہ بھی چل جاتی، گشتی پولیس کی ایک گاڑی موقع پر پہنچ گئی اور سب لڑنے والے تتر بتر ہوگئے۔

اس سنگین جھگڑے میں ہاکیوں کی ضربوں سے دو بندوں کی ٹانگیں ٹوٹی تھیں۔ ایک بندہ یاور کی پارٹی کا اور ایک راشی بھائیوں کا ساتھی تھا۔ ایک لڑکے کو چاقو کے زخم آئے۔ خود یاور کے ایک ہاتھ کی انگلیاں بھی بری طرح گھائل ہوئیں۔

یقیناً یہ پولیس کیس تھا لیکن چونکہ دونوں طرف کے بندوں کو زخم آئے تھے لہٰذا علاقہ ناظم جو کسی حد تک یاور کے لیے نرم گوشہ بھی رکھتا تھا، بیچ میں آ گیا اور علاقہ امن کمیٹی کی مدد سے دونوں پارٹیوں میں صلح کرا دی۔ البتہ عام خیال یہی تھا کہ یہ عارضی صلح ہے۔ گالی دینے والے راشد عرف راشی کی ٹانگ یاور نے توڑ دی تھی اور وہ اسپتال میں تھا۔ اس کا سالا سکندر موبائیلاں والا بھی ایک سنگین کیس میں پھنسا ہوا

تھا لہٰذا وہ لوگ صلح کی طرف آ گئے تھے۔ غالب امکان یہی تھا کہ جونہی ان لوگوں کے لیے صورتِ حال بہتر ہوئی، وہ پھر اس آگ کو بھڑکا دیں گے۔

اور یہی صورتِ حال تھی جس میں دسمبر کی اس یخ بستہ رات میں یاور اور اس کی نیک صورت ماں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بیٹے کے زخمی ہاتھ پر سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ماں نے یہی پٹی والا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھا ہوا تھا۔

''آج تجھے ایک قسم کھانا ہوگی یاور.....! یا پھر میرا مرا ہوا منہ دیکھے گا۔''

یاور نے جلدی سے اپنا دوسرا ہاتھ ماں کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

''تمہیں کتنی بار کہا ہے ماں! اپنے مرنے کی بات مت کیا کرو۔ کیوں مجھے جیتے جی مارنے لگتی ہو۔''

''تو پھر کھاؤ قسم، میرے لیے اور اپنی بہن کے لیے۔ یہ سب لڑائیاں، جھگڑے ختم کر دو گے۔ بالکل ویسے ہو جاؤ گے جیسے کبھی تھے..... بالکل ویسے۔''

ماں کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب دیکھ کر وہ تڑپ گیا۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن اپنا سر جھکا لیا۔ بچپن سے اس کا یہی اشارہ تھا۔ جب ماں کی بات مان لیتا تھا تو سر جھکا لیتا تھا۔

''لیکن ماں .....! ایک بات کے لیے تمہیں مجھے معاف کرنا پڑے گا۔'' وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''ماں کی گالی مجھ سے برداشت نہ ہوگی..... کبھی نہ ہوگی۔''

''وہ بھی کرنا پڑے گی..... ماں کی خاطر۔''

''نہیں ماں! تمہیں اچھی طرح پتا ہے۔ تمہاری توہین مجھ سے برداشت ہوئی ہے نہ کبھی ہو سکے گی۔ یہ میرے بس میں ہی نہیں ہے۔''

''تو پھر چلا جا یہاں سے۔ دشمنی کی اس آگ سے نکل کر کہیں دور چلا جا..... تیرے جیسے ہزاروں جا ہی رہے ہیں نا۔ شاید تیرے بھی دن بدل جائیں۔''

ایک مرتبہ پہلے بھی ماں نے اس طرح کی بات کی تھی جب اسے پتا چلا تھا کہ وہ ایک اونچی جگہ پر متھا لگا بیٹھا ہے۔ اریجہ کی محبت میں گرفتار ہے جو ایک کھاتے پیتے گھرانے سے ہے۔ ماں نے تب اس سے کہا تھا کہ یہاں اس کا کچھ بھی نہیں بننا۔ وہ بھی اپنے چچا کے بیٹے کی طرح کوشش کر کے پاکستان سے نکل جائے۔ دبئی یا کہیں اور چلا جائے۔ آج پھر وہ یہی بات کہہ رہی تھی۔

یہ بات تو یاور بھی اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اگر وہ واقعی لڑائی جھگڑوں سے بچنا چاہتا ہے تو اسے یہاں سے کنارہ کر لینا چاہیے۔ اریجہ کے پہلو سے دیکھا جاتا تو بھی یہ قدم اٹھانا ضروری تھا۔ اس کے اور اس کی ماں کے پلے کچھ ہوتا تو ہی وہ اریجہ کا ہاتھ مانگنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ ماں کے دل سے جو آواز نکلی تھی، وہ اس کے دل تک پہنچی تھی۔ اس رات یاور نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ پاکستان سے باہر قسمت آزمائی کرے گا۔

☆☆☆

کہتے ہیں کہ جس طرح شرافت اپنانے والی طوائف کو تماش بین جینے نہیں دیتے، اسی طرح شرافت اختیار کرنے والے غنڈے یا دبنگ شخص کا جینا بھی لوگ حرام کر دیتے ہیں۔ اگلے ڈیڑھ دو ماہ میں یاور کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا۔ ہر کوئی اس پر چڑھائی کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ بہرطور اس نے اقراری انداز میں ماں کے سامنے اپنا سر جھکایا تھا تو پھر جھکائے ہی رکھا۔ بول چال، لباس، حلیہ وہ سب کچھ بہت تیزی سے تبدیل کرتا چلا گیا۔ جیل میں بننے والے دوستوں سے مکمل کنارہ کشی اختیار کر لی۔ پستول کے علاوہ اس کے پاس ایک رائفل بھی تھی، دونوں چیزیں بیچ ڈالیں۔ اس کے روز و شب زیادہ تر بیرونِ ملک جانے کی کوششوں میں گزر رہے تھے۔ چچازاد بھائی کے علاوہ اس کا ایک دور کا کزن امین بھی اٹلی میں تھا۔ پتا نہیں کس طرح پہنچا تھا لیکن پہنچ گیا تھا۔ کبھی کبھار یاور سے بھی اس کا رابطہ ہو جاتا تھا۔ اسی نے یاور کو ایک قابلِ اعتماد ایجنٹ کا پتا بتایا جو کافی لوگوں کو بڑے مناسب خرچے پر بڑے محفوظ طریقے سے یورپ اور جنوبی افریقا وغیرہ پہنچا چکا تھا۔ وہ امین کے چھوٹے بھائی اکرم عرف راجا کو بھی براستہ لیبیا، اٹلی لے جا رہا تھا۔ سیالکوٹ کا رہنے والا یہ ٹریول ایجنٹ لاہور آیا تو یاور نے بھی اس سے ملاقات کی۔ وہ بظاہر قابلِ اعتماد شخص ہی نظر آتا تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ یاور کا چچازاد سلمان اور دور کا کزن امین بھی اسی ایجنٹ کے ذریعے یورپ پہنچے تھے اور ٹھیک ٹھاک پیسے بھی کما رہے تھے۔

ٹریول ایجنٹ مجید رانا نے یاور کو اٹلی پہنچانے کے عوض 20 لاکھ روپے طلب کیے۔ بعد ازاں اٹلی میں موجود سلمان اور امین وغیرہ کی کوششوں سے معاملہ 18 لاکھ میں طے ہوا۔ مزید رعایت یہ ملی کہ وہ 8 لاکھ روپے اٹلی پہنچنے کے بعد چھ سات ماہ کے اندر ادا کر سکتا تھا۔

10 لاکھ روپے مہیا کرنا یاور کے لیے کوئی آسان کام

pklibrary.com

نہیں تھا۔ ماں کا آخری اثاثہ اس کے سہاگ کی نشانی دو چوڑیاں تھیں۔ وہ اس نے فروخت کردیں۔ روایتی ماؤں کی طرح ماں نے اپنی تیرہ چودہ سالہ گوشی کے لیے کافی عرصے سے جہیز کی اشیا جمع کرنا شروع کی ہوئی تھیں۔ ان میں طلائی جھمکے بھی تھے۔ یاور کو بتائے بغیر ماں نے یہ اشیا بھی خاموشی سے فروخت کرڈالیں۔ کچھ رقم اپنے ایک بھائی سے ادھار لی۔ یاور نے بھی اپنی موٹر بائیک بیچی، ایک دو دوستوں سے کچھ قرض لیا۔ یہ سب ملا کر بھی بس دو تہائی رقم ہی اکٹھی ہو پائی۔ اس مشکل وقت میں ایک روز اریجہ نے اس سے ملاقات کی۔ اریجہ کی والدہ زینت بیگم اپنی بیٹی کی آنکھوں میں سجے سپنوں کے متعلق سب کچھ جانتی تھی۔ اپنے خاوند کو بتائے بغیر اس نے کچھ زیور اریجہ کے حوالے کردیا۔ اریجہ نے یہ یاور کو سونپنا چاہا۔ یاور کی غیرت کو یہ گوارا نہیں تھا مگر جب اریجہ نے رو رو کر آنکھیں سوجالیں اور بے طرح ناراض ہوگئی تو یاور کو اس کی بات ماننا پڑی۔

وہ اس کے گلے لگ گئی۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بولی۔ ”یاور! اپنی اور تمہاری محبت کی طاقت پر یقین ہے مجھے۔ تم ضرور اپنے حالات بدل لوگے۔ اللہ نے چاہا تو تمہاری واپسی اچھی دنوں کے ساتھ ہوگی۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔“

”ماں کی طرح تم بھی میری طاقت ہو اریجہ! مجھے تم دونوں کی دعاؤں کی شدید ضرورت رہے گی۔“

وہ پھر اس کے گلے لگ گئی۔ حسب معمول اس کے شانے کو اریجہ کی دلکش آنکھوں کی نمی بھگونے لگی۔ اس الوداعی ملاقات میں یاور نے پہلی بار اس کے ہونٹوں کو جذبے کی پوری شدت کے ساتھ چھوا..... اور اس کے کانوں میں تادیر یاور رہنے والی حسین سرگوشیاں کیں۔ وہ گلنار ہوگئی تھی۔

☆☆☆

اس سفر میں یاور کے ساتھ امین کے چھوٹے بھائی اکرم عرف راجا کے علاوہ قریباً پندرہ اور پاکستانی نوجوان تھے۔ ان میں سے زیادہ تر وسطی پنجاب سے تعلق رکھتے تھے۔ ٹریول ایجنٹ مجید رانا نے حسب وعدہ ان لوگوں کو سفری ویزے پر بائی ائر ہی طرابلس پہنچایا تھا۔ وہاں ایک علیحدہ عمارت میں وہ قریباً ایک ماہ قیام پذیر رہے۔ مجید رانا بھی وہیں پر موجود تھا۔ وہ قریباً ہر روز ہی ان سے وعدہ کرتا تھا کہ اٹلی کے لیے ان کا ویزا لگنے والا ہے اور دو چار روز میں وہ یہاں سے آگے روانہ ہوجائیں گے مگر روانگی کا دن آکر نہیں دے رہا تھا۔ گروپ کے افراد کو اب کسی گڑبڑ کا احساس ہونے لگا تھا۔

آخر ایک روز مجید رانا نے نئی صورت حال بیان کی۔ اس نے گروپ کے اراکین سے کہا۔ ”یہاں سے ویزا نہیں لگ رہا۔ ہمیں پہلے موریطانیہ پہنچنا ہوگا، وہاں سے روم کے لیے پرواز کریں گے۔“ ان سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ اپنے اپنے لواحقین سے کچھ اور پیسے منگوائیں۔ کچھ افراد کو پانچ لاکھ اور کچھ کو آٹھ لاکھ منگوانے کے لیے کہا گیا۔ یہ وہی صورت حال تھی کہ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ یاور اور اس کے دوست کزن امین کا بھائی راجا بھی ان نوجوانوں میں شامل تھے جن کو فی کس پانچ لاکھ روپے مزید منگوانے کا کہا گیا تھا۔

یاور کے لیے بھی یہ بڑی پریشانی کے شب و روز تھے۔ وہ جانتا تھا کہ جہاں جہاں سے قرض لے سکتا تھا، لے چکا ہے۔ حتیٰ کہ اریجہ کی مدد بھی اسے مجبوری کے عالم میں قبول کرنا پڑی تھی۔ ہر تیسرے چوتھے روز بذریعہ فون ماں سے اور کبھی کبھی اریجہ سے اس کی مختصر بات ہورہی تھی۔ البتہ اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ انہیں موجودہ صورت حال سے آگاہ کرے۔

پاکستان سے لیبیا پہنچنے والے اس گروپ میں ایک نوجوان تیمور جاہ بھی تھا۔ سرگودھا کا رہنے والا تھا۔ پانچ بھائیوں میں تھوڑی سی زرعی زمین اس کے حصے میں بھی آئی تھی۔ اس نے یہ زمین بیچ دی تھی اور بہتر مستقبل کی تلاش میں پاکستان سے نکل آیا تھا۔ بھائیوں میں وہ سب سے چھوٹا تھا اور والدین اس کے پاس ہی تھے۔ تیمور نے بتایا تھا کہ اس کے عمر رسیدہ والد جگر کے سنگین مرض میں مبتلا ہیں۔ وہ ان سے بے حد پیار کرتا ہے۔ انہیں دھیرے دھیرے موت کی طرف جاتے نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی پہلی ترجیح یہی ہے کہ وہ ان کا علاج کرا سکے۔ اس کی والدہ ایک برس پہلے وفات پاگئی تھیں۔

طرابلس کی اس رہائش گاہ میں پانچ پانچ بندوں کو ایک کمرا دیا گیا تھا۔ تیمور اور یاور کمرے کے ساتھی بھی تھے۔ یاور اکثر تیمور کو بالکل خاموش اور گمشدہ دیکھتا۔ گھنے سیاہ بالوں کے نیچے اس کی فراخ پیشانی پر سوچ کی لکیریں، بڑی بڑی آنکھوں میں رینگتے اداسی کے سائے۔ وہ سرگودھا کے ایک پسماندہ گاؤں کا رہنے والا تھا پھر بھی اس نے ایف اے کیا تھا اور گفتگو بھی پڑھے لکھوں جیسی کرتا تھا۔ اس سفر میں یاور اور تیمور ایک دوسرے کے کافی قریب آگئے تھے۔ یاور نے بھی اپنے حالات کے بارے میں اسے تھوڑا بہت

بتادیا تھا۔ البتہ یہ بات اس نے تیمور سے بھی راز ہی رکھی تھی کہ وہ ماضی میں جیل کاٹ چکا ہے اور پچھلے دو ڈھائی برس اس نے کسی اور ہی رنگ ڈھنگ سے گزارے ہیں۔

ایک روز یاور خاموش اور پریشان عمارت کے عقبی برآمدے میں بیٹھا تھا کہ تیمور جاہ اس کے قریب آن بیٹھا۔ یاور کی طرح اس کا قد کاٹھ بھی اچھا تھا۔ تاہم یاور کے مقابلے میں وہ قدرے دبلا تھا۔ یاور کا خیال تھا کہ اپنے دیگر بھائیوں کے برعکس وہ کھیتی باڑی سے دور ہی رہا تھا۔ ٹریول ایجنٹ مجید رانا نے تیمور سے بھی پانچ لاکھ کی ڈیمانڈ کر رکھی تھی۔ وہ یاور کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''میرے پیسے تو آگئے یار!''

''چلو مبارک ہو۔'' یاور نے خوش ہو کر کہا۔ ''پورے آگئے نا..... پانچ لاکھ؟''

''ہاں، پورے آگئے..... دس لاکھ۔''

''دس لاکھ؟'' یاور نے حیران ہو کر کہا۔

''ہاں، پانچ میرا..... اور پانچ اس بیوقوف کا جو مجھے کچھ نہیں بتاتا اور سمجھتا ہے کہ مجھے کچھ پتا نہیں۔''

یاور نے چونک کر تیمور جاہ کی طرف دیکھا۔ تیمور نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان لے لیا اور آہستہ آہستہ تھپتھپانے لگا۔

☆☆☆

ان کی اگلی منزل موریطانیہ تھی۔ طرابلس سے آگے روانہ ہوتے وقت ایک اور ایشیائی گروپ ان میں شامل ہو گیا تھا۔ یہ قریباً پچیس بندے تھے۔ چند انڈین، چند بنگلا دیشی اور باقی سری لنکن۔ یہ زیادہ تر نوجوان ہی تھے۔ سری لنکنز میں واجبی سی شکل صورت والی دو لڑکیاں بھی شامل تھیں لیکن پتا نہیں کیوں وہ راستے میں اس سفر سے علیحدہ ہو گئیں۔ اس وقت باقی مسافروں کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ لڑکیاں خوش قسمت رہی ہیں یا بدنصیب۔ انہوں نے کچھ فاصلہ بائی روڈ طے کیا پھر لیبیا کے ہی شہر ''مزدہ'' سے بائی ائر موریطانیہ کے دارالحکومت نواک چاؤٹ پہنچ گئے۔

یہاں ایک بار پھر انہیں ایک الگ تھلگ کشادہ عمارت کے اندر رکھا گیا۔ عمارت میں دیگر سہولتیں تو موجود تھیں مگر بجلی نہیں تھی۔ مرطوب گرم موسم کے سبب بجلی کا نہ ہونا شدت سے محسوس ہو رہا تھا۔ البتہ ایجنٹس کے بقول یہاں عارضی قیام تھا۔ وہ سب خوش تھے کہ اب اگلی منزل اٹلی ہوگی۔ بہرحال یہ بات واضح نہیں ہو پا رہی تھی کہ آگے کا سفر بائی ائر ہوگا یا کسی اور ذریعے سے۔ گروپ میں جو چند تجربہ کار نوجوان موجود تھے، وہ پریشان نظر آتے تھے۔ ایک بنگلا دیشی بلال کا کہنا تھا۔ ''دال میں کافی کچھ کالا نظر آرہا ہے۔ ہمارے پاسپورٹ ان لوگوں نے اپنے قبضے میں لے رکھے ہیں۔ یہ ہمیں سمندر کے قریب بھی لے آئے ہیں۔ ہوسکتا ہے ہمیں سمندری راستے سے آگے روانہ کریں۔''

راجا نے تنک کر کہا۔ ''ہم سے کہا تو یہی جاتا رہا ہے کہ ہوائی جہاز سے جانا ہے۔ مزید رقم بھی انہوں نے اسی لیے منگوائی ہے کہ ٹکٹ مہنگے مل رہے ہیں۔''

راجا اس سارے گروپ میں سب سے کم عمر تھا۔ قریباً اٹھارہ انیس سال کا۔ ابھی مونچھیں بھی پوری طرح نمایاں نہیں ہوئی تھیں۔ پریشان جلدی ہو جاتا تھا اور غصے میں بھی جلدی آجاتا تھا۔ یہی غصہ آگے چل کر اس کے لیے ایک بڑی مصیبت بننے والا تھا۔

گروپ میں ایک گجراتی لڑکے نے راجا سے کہا۔ ''تمہارے بھائی نے روم سے جو ویڈیو بھیجی تھی، اس میں تو خوب تسلیاں دی تھیں۔ اس سے پوچھو نا کہ یہ لوگ ہمیں ڈیٹ پر ڈیٹ کیوں دے رہے ہیں؟''

''رابطہ کیسے کروں؟ فون تو دوسروں کی طرح میرا بھی بند ہے۔''

پچھلے تین روز سے بلڈنگ میں بجلی نہ ہونے کے سبب قریباً سبھی کے فون ڈیڈ ہو چکے تھے۔ کمروں میں اندھیرے ہی کے سبب ذرا بھاری جسم کا ایک بنگلا دیشی مسافر ٹھوکر کھا کر گرا اور اس کا کندھا اتر گیا۔ وہ سارا دن درد سے تڑپتا رہا مگر ڈاکٹر دستیاب نہیں تھا۔ یاور کا یہ نیا دوست تیمور جاہ فزیو تھراپی کا کچھ کام جانتا تھا۔ اس نے اپنی مدد آپ کے تحت بنگلا دیشی کی یہ کندھے والی مصیبت آسان کی۔

اسی شام ایجنٹ رانا کا انڈین ساتھی منوہر پرکاش کئی روز بعد دوبارہ نظر آیا۔ لیبیا میں انہیں کھانا وغیرہ وہی فراہم کرتا تھا۔ وہ پنجابی ہندو تھا اور نسبتاً خوش اخلاق بندہ تھا۔ کھانا وقت پر پہنچاتا تھا اور کھانا بھی اچھا ہی ہوتا تھا۔ وہ نظر آیا تو سب کو امید پیدا ہوگئی کہ اب صورتِ حال بہتر ہو جائے گی۔ شاید بجلی والا معاملہ بھی حل ہو جائے۔ یاور سے بھی پرکاش کی بات ہوتی رہتی تھی۔ یاور اسے پرکاش بھاجی کہتا تھا۔

''پرکاش بھاجی، کچھ کرو یار! حبس اور اندھیرے نے مار چھوڑا ہے۔'' یاور نے التجا کی۔

''بس ٹرانسفارمر کا کوئی مسئلہ ہے برادر! ایک آدھ دن میں ٹھیک ہو جاتا ہے۔''

pklibrary.com

یاور بولا۔ ”مگر بھاجی! سب پریشان ہیں۔ کئی دنوں سے کوئی بھی گھر میں بات نہیں کرسکا۔ میری چھوٹی بہن کی تو آج سالگرہ تھی۔ بڑا یاد کررہی ہوگی مجھے۔“

”اوہ۔“ پرکاش نے ہونٹ سکوڑے پھر اپنا موبائل نکال کر چپکے سے یاور کو دیا۔ ”چل، کیا یاد کرے گا، لے کرلے بات۔“

یاور موبائل لے کر اوپر کی منزل پر چلا گیا۔ نیٹ کے ذریعے اس کی بات اپنی بہن گوشی سے ہوگئی۔ خوشی سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔

”مجھے پتا تھا بھائی جان! آج تو ضرور ضرور کال آئے گی آپ کی۔“

”میری گوشی رانی! سالگرہ بہت بہت مبارک..... پر دور بہت ہوں۔ تحفہ کیسے دوں تمہیں؟“ وہ مغموم ہوکر بولا۔

”زیادہ ڈراما نہ کریں بھائی جان! تحفہ مجھے مل گیا ہے۔ جاتے جاتے آپ امی کو میرے گفٹ کے پیسے دے گئے تھے۔ انہوں نے بتادیا ہے مجھے۔“

وہ خاموش ہوگیا۔ آنکھوں میں نمی آگئی۔ ”اپنی گوشی رانی کو کیسے بھول سکتا تھا۔“ اس نے ہولے سے کہا۔

پھر فون ماں نے لے لیا۔ ڈھیروں بلائیں لیں، بے شمار سوالات پوچھے۔ وہ کیا بتاتا۔ ابھی اسے خود معلوم نہیں تھا کہ منزل پر کب پہنچنا ہے۔ اس نے بس اتنا کہا۔ ”امی جی! بہت دعا کرنا۔ کچھ پریشانیاں ہیں مگر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہورہا ہے۔“

”مگر اب کتنا سفر رہ گیا ہے تیرا۔ کچھ بتا بھی نا مجھے۔“ ماں روہانسی آواز میں بولی۔

”بس دعا کرتی رہیں نا آپ۔ پانچ چھ دن تک اچھی خبر سنادوں گا آپ کو۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔ ماں نے ایک بار پھر اسے ہر طرح کے لڑائی جھگڑے سے دور رہنے کی ہدایت کی۔

کال ختم کرکے وہ دیر تک سوچتا رہا۔ کیسی مہربان ہستی تھی ماں۔ قدم قدم پر اپنے دونوں بچوں کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورتوں اور خوشیوں کا خیال رکھتی تھی۔ قریباً ڈیڑھ ماہ پہلے سفر پر روانگی کی مصروفیت میں یاور کو چھوٹی بہن کی سالگرہ کا خیال دور دور تک نہیں تھا۔ یہ ماں ہی تھی جس نے اس کا بھرم رکھا تھا اور یہ ایک نہیں، ایسی لاتعداد مثالیں تھیں۔

پھر اس نے اریجہ کو کال کرنے کا سوچا۔ ایک دفعہ پہلے بھی طرابلس میں اس سے فون پر بات ہوچکی تھی اور اسے امید تھی کہ چونکہ آج گوشی کی سالگرہ ہے، اریجہ کو انتظار ہوگا کہ وہ پاکستان کال کرے گا اور ممکن ہے کہ اس سے بات بھی کرے۔

وہ اریجہ کا نمبر ملانے جا ہی رہا تھا کہ رک گیا۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل اب یہ چاہنے لگا تھا کہ اریجہ سے بھی رابطہ کرے جب وہ نہ صرف منزل پر پہنچ جائے بلکہ روشن مستقبل کی تھوڑی بہت کرنیں بھی اسے نظر آنے لگیں۔ اس نے ایک گہری آہ بھر کر کال کا ارادہ ترک کردیا۔

منوہر پرکاش کا فون وہ زیادہ دیر تک پاس نہ رکھ سکتا تھا، اس نے واپس کردیا ساتھ ہی درخواست کی۔ ”پرکاش بھاجی! اس بجلی کا کچھ کرو۔ رات کو تو اندھیرے میں دم گھٹنے لگتا ہے۔ نہ ٹی وی، نہ گل بات، نہ کوئی اور تفریح۔“

پرکاش بولا۔ ”بجلی تو شاید آج بحال نہ ہوسکے لیکن بھگوان نے کرپا کی تو تم لوگوں کے موبائل میں آج چارج کروادوں گا۔“

اور واقعی شام کو وہ سب کے موبائل اکٹھے کرکے لے گیا۔ اس نے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد واپس آجانا تھا مگر نہیں آیا۔ دونوں گروپس کے افراد رات گئے تک موبائلز کی واپسی کا انتظار کرتے رہے..... پھر اگلا دن شروع ہوگیا مگر پرکاش لوٹا اور نہ ہی موبائلز۔ سب کا ماتھا تو پہلے ہی ٹھنکا ہوا تھا۔ اب تشویش مزید بڑھ گئی۔ نوعمر راجا تو ایجنٹ مجید رانا کو غائبانہ صلواتیں سنانے لگا۔ باقی ارکان بھی سرد گرم بول رہے تھے مگر دوپہر کے وقت سب کو خاموش ہوجانا پڑا۔ بات ہی ایسی تھی۔ مجید رانا کے وہ تین چار ہرکارے اچانک ہی اوجھل ہوگئے جو اب تک ان کی دیکھ بھال کررہے تھے۔ ان میں تین پاکستانی اور ایک انڈین تھا۔ ان کی جگہ کچھ اور لوگ آگئے۔ یہ ملے جلے افراد شکلوں سے ہی خاصے کرخت نظر آتے تھے۔ پکے رنگ کے ان لوگوں کے بارے میں سب کا خیال یہی تھا کہ یہ شاید لیبیا سے ہیں۔ البتہ بعد میں پتا چلا کہ یہ سوڈانی عیسائی ہیں۔ وہ جو زبان بول رہے تھے، عربی ہی لگتی تھی مگر بے حد کرخت و خشک لہجے میں بولی جارہی تھی۔ ان میں سے فقط ایک جوزف نام کا بندہ بری بھلی انگلش میں بات کرلیتا تھا۔ یہ سانڈ جیسے مضبوط جثے کا مالک تھا۔ پاکستانیوں کے گروپ میں سے صرف تیمور ٹھیک سے انگلش سمجھتا تھا۔ البتہ جوزف کا لب ولہجہ سمجھنا اس کے لیے مشکل تھا۔

جوزف نے دوٹوک لہجے میں بتایا کہ ویزے وغیرہ لگنے کی امید بالکل نہیں۔ ان لوگوں کو سمندری راستے سے ہی اٹلی پہنچنا ہے۔ اس نے کہا۔ ”سب لوگ شام تک بالکل

ریڈی ہو جائیں۔ فالتو سامان بالکل نہیں جائے گا۔ ہر بندہ کھانے پینے کی اشیا کا ایک پیکٹ علیحدہ سے تیار کر لے۔"

تیمور جاہ نے پوچھا۔ "کیا ہم لیگل طریقے سے جا رہے ہیں؟"

جواب میں سوڈانی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ سخت لہجے میں بولا۔ "تمہیں پھل کھانے سے غرض ہونی چاہیے، پیڑ گننے سے نہیں۔ تمہیں منزل تک پہنچائیں گے اور پوری حفاظت سے پہنچائیں گے۔ کسی قسم کا خدشہ، وہم ذہن میں لانے کی بالکل ضرورت نہیں اور اب دوبارہ یہ بات نہیں کرنی۔"

جوزف نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے پانی کا ایک ایک چھوٹا کین ہر بندے کے حوالے کر دیا۔ جوزف نے کہا۔ "اس پانی کو اپنی اپنی جان سے لگا کر رکھو۔ راستے میں ضرورت پڑ سکتی ہے..... اور ایک بار پھر آگاہ کرتا ہوں کہ فالتو سامان نہیں ہونا چاہیے۔"

وہ جس طرح دندناتا ہوا آیا تھا، اسی طرح واپس چلا گیا۔ اپنی حرکات و سکنات سے وہ بہت مضبوط شخص لگتا تھا اور کافی تجربہ کار بھی۔ عمر 40 سال کے قریب تھی۔ قد لمبا، کاٹھی مضبوط اور آنکھوں میں سرخ ڈورے سے نظر آتے تھے۔

یاور نے تیمور جاہ کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے کہ جیکٹ کے نیچے اس نے پستول وغیرہ لگا رکھا تھا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" تیمور نے تائید کی۔

اس واقعے سے پہلے ہی دونوں گروپس کے نوے فیصد ارکان کو اندازہ ہو چکا تھا کہ انہیں سمندری راستے سے ہی اٹلی پہنچایا جانا ہے۔ اب اس کی مکمل تصدیق ہو گئی تھی۔ دونوں گروپس میں سے صرف دو تین بندے ہی ایسے تھے جو سمندری راستے سے سفر جاری رکھنا نہیں چاہتے تھے مگر سیکنڈ آپشن ان کے پاس بھی نہیں تھا..... بلکہ ایسا لگتا تھا کہ اگر وہ اس عمارت سے نکلنا چاہیں تو نکل بھی نہیں سکیں گے۔ ان سب کی حیثیت یہاں پابند مہمانوں کی تھی۔ بالآخر وہ بھی راضی بہ رضا ہوئے۔

☆☆☆

رات کے اندھیرے میں دونوں گروپس کے قریباً 40 افراد کو ایک بڑے لوڈر کے ذریعے ساحل تک پہنچایا گیا۔ ایک سنسان کھاڑی پر ایک خاصی بڑی بوٹ کھڑی تھی۔ اس کے ایک حصے پر مستطیل شیڈ نظر آتا تھا۔ ایک دو کیبن بھی دکھائی پڑتے تھے۔ اگر بوٹ بڑی تھی تو دونوں گروپس کے ارکان کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ جب وہ لوگ بوٹ پر سوار ہوئے تو یہ دیکھ کر یاور حیران ہوا کہ یہاں پہلے سے بھی کچھ مسافر موجود ہیں۔ اندھیرے میں ان کی شکلیں ٹھیک سے نظر نہیں آتی تھیں۔ وہ سب کے سب "میل" تھے اور بیشتر نوجوان تھے۔

"یار! یہ تو ظلم ہے۔" یاور نے کہا۔ "بوٹ میں گنجائش سے بہت زیادہ بندے ہیں۔"

"اور یہ کوئی اکیلا ظلم نہیں ہے۔" تیمور جاہ نے سرد آہ بھر کر سرگوشی کی۔

"کیا مطلب؟"

"تمہارا کیا خیال ہے، کتنا سفر ہے؟"

"زیادہ سے زیادہ چار دن کا کہا ہے انہوں نے۔"

"غلط کہا ہے۔ لوڈر سے اترتے ہوئے میں نے سوڈانی جوزف کی بات سنی ہے۔ وہ لوڈر والے سے بوٹ میں موجود ڈیزل کی بات کر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سفر ایک ہفتے سے بھی آگے چلا جائے۔"

..... رات دو بجے کے قریب یہ کھچا کھچ بھری بوٹ اس ویران ساحل سے اپنی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوئی۔ ہوا خنک تھی۔ صاف آسمان پر ستاروں کے کارواں تھے اور ایک یہ "کارواں" روشن مستقبل کا متلاشی بحرِ اوقیانوس کے تاریک پانیوں پر رواں تھا۔ سینوں میں خوف آمیز ترنگ، آنکھوں میں سپنے، ذہنوں میں جانفشانی کے ارادے..... وہ نہیں جانتے تھے کہ تقدیر کیا کھیل کھیلنے والی ہے۔

اس سفر کے انچارج سوڈانی جوزف نے شروع میں جو سخت رویہ اختیار کیا تھا، اس پر غالباً اس نے تھوڑی نظر ثانی کی۔ یوں تو بوٹ کے اوپر مضبوط فائبر کا بنا ہوا ایک بڑا شیڈ موجود تھا تاہم ہوا کی کاٹ تنگ کر رہی تھی۔ جوزف کی ہدایت پر اس کے کارندوں نے ان افراد کو کمبل فراہم کیے جن کے پاس اوڑھنے کو کچھ نہیں تھا۔ کھانے کے سینڈوچ وغیرہ بھی دیے گئے۔ کھانے کے دوران کئی افراد اپنے موبائل فونز کے بارے میں بات کرتے رہے جو پرکاش نے ان سے لیے تھے اور پھر واپس نہیں کیے تھے۔ اب اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ فون اسی لیے قبضے میں لیے گئے تھے کہ وہ لوگ اپنے گھروں میں مزید رابطہ نہ کر سکیں۔

کشتی میں اتنی جگہ تو نہیں تھی کہ آرام سے لیٹا جا سکتا۔ مسافر ایک دوسرے کے اوپر گر کر ہی بس نیند کے ہلکورے لینے لگے۔ رات کسی وقت یاور کو پیشاب کی حاجت محسوس ہوئی۔ بوٹ کے عقبی حصے میں ایک مستطیل کیبن تھا۔ اس کی بلندی گو زیادہ نہیں تھی لیکن لمبائی بیس فٹ کے قریب تھی۔

کیبن کے عقب میں سے سیڑھیاں نیچے اترتی تھیں۔ یہاں دو واش رومز تھے۔ واش رومز سے آگے ایک راہداری تھا۔ اس نیم گول، نیم روشن راستے کے آخر میں ایک دروازہ نظر آیا۔ یونہی تجسس کے تحت یاور نے دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔ اندر کھڑا گہرے سانولے رنگ کا سوڈانی جیسے بدک کر رہ گیا۔ یکا یک اس کی آنکھوں میں طیش کی بلند لہر اٹھی۔ اپنی زبان میں گرج کر کچھ بولا اور ہاتھ کے اشارے سے اسے باہر جانے کا حکم دیا۔ یاور "سوری" کہتا ہوا باہر آ گیا۔

سوڈانی مسلسل بک بک کر رہا تھا پھر اس نے دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔

..... صبح بہت نکھری ہوئی تھی۔ دور تک نیلا آسمان اور نیلا سمندر۔ لگتا تھا پوری دنیا میں نیلے رنگ کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ پانی کی سطح پُرسکون تھی۔ بوٹ کا رنگ بھی قریباً نیلا ہی تھا۔ بس کہیں کہیں سیاہ دھاریاں تھیں اور دونوں سائڈز پر ہوا سے بھری ہوئی ربر ٹیوبس بندھی تھیں۔

رات کو جو لوگ پہلے سے بوٹ میں موجود پائے گئے تھے وہ سینیگال اور مالی وغیرہ کے تھے۔ ان کی تعداد 20 کے قریب تھی۔ یوں بوٹ پر سوار افراد کی تعداد آٹھ دس رکنی عملے سمیت قریباً 70 ہو چکی تھی۔

دونوں گروپس کے ارکان نے اپنے اپنے سامان میں سے خشک راشن نکالا اور ناشتے کے طور پر استعمال کیا۔ سینیگال اور مالی وغیرہ کے مسافروں کا ناشتا ہی بتا رہا تھا کہ وہ معاشی طور پر بہت کمزور بلکہ مسکینی طرز کے افراد ہیں۔ ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے۔ یقیناً ان سے کافی تھوڑی رقوم لے کر اس بوٹ میں سوار کیا گیا تھا۔

یاور نے رات والے واقعے کا ذکر تیمور جاہ سے کیا۔ وہ بولا۔ "تمہیں کیا ضرورت تھی وہاں ناک گھسیڑنے کی؟"

"چلو، یہ تو ایک علیحدہ بات ہے، مگر جس طرح وہ بندہ بدکا اور پھر مجھ پر بگڑا، لگتا ہے کہ بوٹ کے اس حصے میں کچھ خاص موجود ہے۔"

"اگر موجود ہے بھی تو کوئی انہونی نہیں۔ یہ لوگ صرف انسانوں کو ہی اسمگل نہیں کرتے اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ منشیات، اسلحہ وغیرہ بھی۔ بہرحال ہمیں خوش گمانی رکھنی چاہیے کہ ایسا نہ ہو۔"

☆☆☆

جو تفکر اور تجسس ایک شب پہلے یاور کے ذہن میں جاگا تھا، وہ اگلی شب تیمور جاہ کے ذہن میں بھی پوری شدت سے جاگا۔ بوٹ دھیمی رفتار سے تاریک سمندر کی لہروں پر رواں تھی۔ آج سردی کل کی نسبت کچھ کم محسوس ہوتی تھی۔ سب مسافر کمبل اور گرم چادریں لپیٹے بوٹ کے شیڈ والے حصے میں الٹے سیدھے پڑے تھے۔ تیمور جاہ کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ ہولے سے اٹھا اور ریلنگ کا سہارا لیتا ہوا بوٹ کے پہلو کی طرف چلا گیا۔ اس طرف ہوا کی کاٹ کافی کم تھی۔ وہ ریلنگ کے سہارے کھڑا ہو کر دور تاریک افق کی طرف دیکھنے لگا اور سوچنے لگا۔

وہ اس کشتی کے مسافروں میں شامل تھا مگر اس کی منزل وہ نہیں تھی جو دوسروں کی تھی۔ روزگار تو بس بہانہ تھا۔ وہ کسی سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اسے اس کی غلط کاریوں کی سزا دینا چاہتا تھا۔ اس کے خوبصورت بال سمندری ہوا میں اڑتے رہے اور وہ خیالوں میں کھویا رہا۔ اس کے کان ہمیشہ سے بڑے حساس تھے۔ آج بھی اس کے ان حساس کانوں نے اپنی خصوصیت ثابت کی۔ اسے بوٹ کے تہ خانے کی طرف سے ایک بہت مدھم آواز سنائی دی۔ یہ چلانے کی نسوانی آواز تھی۔ انجن کے شور میں یہ مدھم آواز دوبارہ ابھری تو تیمور جاہ اپنی جگہ کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ بے آواز چلتا سیڑھیوں کی طرف گیا۔ نیچے اترا تو آواز مزید واضح ہوئی۔ ساتھ ہی کسی مرد کے چنگھاڑنے کی آواز آئی۔

تیمور جاہ کو یوں لگا جیسے یہ آواز اس نے پہلے بھی سنی ہوئی ہے۔ پھر اس کو شاک سا لگا۔ یہ تو اسی مہربان منوہر پرکاش کی آواز تھی جو "تواک چاؤٹ" شہر سے ان سب کے موبائل لے کر اوجھل ہو گیا تھا۔ ان سب کا خیال تھا کہ وہ اس بوٹ میں ان کا ہمسفر نہیں ہے لیکن وہ بوٹ کے زیریں حصے میں موجود تھا۔

تیمور جاہ امن پسند بندہ تھا لیکن بے حوصلہ نہیں تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے چلتا ہوا عقبی راستے سے آوازوں کے کچھ اور قریب چلا گیا..... ہاں، وہ منوہر پرکاش ہی تھا۔ وہ ہٹے کٹے سوڈانی عیسائی جوزف سے جھگڑ رہا تھا۔

"تمہیں پتا ہے ہم یہ نہیں کر سکتے..... تمہیں اچھی طرح پتا ہے۔" وہ انگلش میں بولا۔

تب جوزف کی آواز آئی۔ "تھوڑی موج مستی سے اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ویسی کی ویسی ہی رہے گی۔" جوزف کی آواز بتاتی تھی کہ وہ نشے میں ہے۔

"لیکن یہ دھوکے بازی ہے۔ ہم نے پوری رقم وصول کی ہے اور پورا سودا دینا ہے۔ سب جانتے ہیں بُرے کاموں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔"

"اتنی خوبصورت لڑکی کو ساتھ لا کر تم نے مجھ شرابی کو

اب اصولوں کی گھسن گھیری میں ڈال دیا ہے۔ بڑا سخت امتحان ہے یہ۔''

''جو کچھ بھی ہے جوزف! اس امتحان سے گزرنا پڑے گا۔'' پرکاش نے اٹل لہجے میں جواب دیا۔

''یعنی امتحان نہ دیا تو تم مجھے اٹھا کر سمندر میں پھینک دو گے؟'' جوزف بولا۔

جھگڑے کی سی صورت حال بن گئی۔ کئی افراد اکٹھے بولنے لگے۔ وہ جوزف اور پرکاش کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

یہاں جو بحث نما گفتگو ہوئی، اس سے تیمور جاہ پر انکشاف ہوا کہ پرکاش ممبئی سے کسی نرملا کوشل نامی لڑکی کو بھی اٹلی لے کر جا رہا ہے۔ یہ اٹھارہ انیس سالہ لڑکی وہاں کسی اٹالین لارڈ کی رکھیل بننے والی ہے۔ اس کی پوری قیمت یورو کی شکل میں پرکاش کو ادا کی جا چکی ہے اور اب وہ لڑکی ایک امانت کی طرح ان لوگوں کے پاس ہے۔

..... کھلے سمندر میں اگلے روز بھی ان کا سفر جاری رہا۔ یہ لوگ ایسے راستے استعمال کر رہے تھے جہاں دور دور تک کسی جہاز یا کشتی کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ اس روز بوٹ کے مسافروں پر یہ راز بھی کھل گیا کہ ان کے موبائلز قبضے میں لے کر اوجھل ہو جانے والا منوہر پرکاش بھی بوٹ میں ہی موجود ہے۔ نوعمر راجا اور ایک بنگلا دیشی لڑکے کو سیڑھیوں کے نچلے سرے پر اس کی جھلک نظر آئی تھی اور پھر یہ خبر سارے مسافروں میں پھیل گئی۔ بعد ازاں دو تین اور مسافروں نے بھی بوٹ کے نچلے حصے میں پرکاش کی آواز پہچان لی تھی۔ سب کو اپنے موبائلز یاد آ گئے تھے۔

رات کو جو لڑکی والا انکشاف ہوا تھا، اس سے تیمور جاہ نے یاور کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔ اس روز شام کے بعد بوٹ کے نچلے حصے میں خوب ہلا گلا رہا۔ میوزک بجتا رہا، زوسٹ گوشت کی خوشبو آتی رہی اور الکحل کی بو بھی محسوس ہوتی رہی۔

یہ وہی سوڈانی عیسائی ہی تھے البتہ ان میں ٹریول ایجنٹ کے پانچ چھ مصری کارندے بھی شامل تھے۔ ان میں ایک جیکب نام کا بندہ تھا جس نے اپنے پورے جسم پر بڑے بڑے ٹیٹوز بنوا رکھے تھے۔ یہ لوگ ظاہر نہیں کرتے تھے مگر یقینی بات تھی کہ ان کے پاس آتشیں ہتھیار موجود تھے۔ نیچے سے جو آوازیں آ رہی تھیں، ان سے یاور اور تیمور جاہ کو پتا چل رہا تھا کہ جوزف اور پرکاش بھی اس ہلے گلے میں شریک ہیں۔ حالانکہ کل ان دونوں میں باقاعدہ جھڑپ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔

یاور نے تیمور سے پوچھا۔ ''اس ہلے گلے کی کچھ خاص سمجھ نہیں آ رہی۔ یہ آج کیوں اتنا شور مچا رہے ہیں؟''

قریب ہی دوسرے گروپ کا ایک درمیانی عمر کا بنگالی بیٹھا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا۔ ''دراصل ہم اپنے مسئلوں اور سفر کے چکروں میں باقی سب کچھ بھولے ہوئے ہیں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' یاور نے پوچھا۔

وہ اپنی عینک درست کرتے ہوئے بولا۔ ''بھائی! آج عیسائیوں کا ایسٹر ہے۔''

یہ بنگالی اسکول ٹیچر درست کہہ رہا تھا۔ واقعی دونوں گروپوں میں دو چار افراد کے علاوہ شاید ہی کسی کو معلوم ہو کہ آج ایسٹر ہے۔ پردیسیوں کے لیے غمی خوشی کی تاریخیں، برتھ ڈیز، تہوار، برسیاں سب کچھ گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ آٹھ دس دن پہلے نواک چاؤٹ میں ہی تیمور جاہ کی والدہ کی پہلی برسی گزری تھی اور اسے اگلے روز یاد آیا تھا۔ وہ دیر تک بیٹھا آنسو پونچھتا رہا تھا۔

رات بارہ بجے کے لگ بھگ بوٹ کے زیریں حصے کا ہلا گلا ختم ہوا اور بوٹ کے عرشے پر موجود افراد بھی سونے کے قابل ہوئے۔ سردی اور ہوا کی کاٹ کے سبب بنگالی اسکول ٹیچر کو سینے کا انفیکشن ہو چکا تھا۔ وہ غنودگی کے عالم میں گاہے بگاہے بُری طرح کھانسنے لگتا تھا۔ اس کا لباس بھی ناکافی تھا۔ لیٹنے کے لیے اس کے حصے میں ایک خستہ حال شال آئی تھی۔ چٹاگانگ میں وہ اپنی بیوی اور چار بچیاں چھوڑ کر آیا تھا۔ بچیوں کے بہتر مستقبل کے لیے وہ اپنے خون پسینے کا اثاثہ لے کر اٹلی کا رخ کر رہا تھا۔ اپنی سب سے چھوٹی بچی کی تصویر اس کے چرمی بٹوے میں لگی ہوئی تھی۔ جیسے وہ اس پرانے بٹوے کے لیے ایک نیک شگون کے طور پر موجود ہو۔

یاور کی جیکٹ اسے بڑی حد تک سردی سے بچا رہی تھی۔ اس نے سوئے پڑے بنگالی ٹیچر پر اپنا کمبل ڈال دیا۔ یاور کی طرح تیمور جاہ کو بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بولا۔ ''یارا! نیچے کا چکر نہ لگایا جائے؟''

تجسس تو یاور کے ذہن میں بھی بہت کلبلا رہا تھا مگر وہ کسی نئے پنگے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک طرح سے ماں کے ساتھ وعدے کے بعد اس نے ہنگامہ خیزی اور مہم جوئی والا صفحہ ہی زندگی کی کتاب سے پھاڑ دیا تھا۔

وہ بولا۔ ''چھوڑ یار! ہمیں ان چکروں میں پڑ کر کیا لینا ہے؟''

''مگر لڑکی کا معاملہ ہے یارا! مجھے لگتا ہے یہ سوڈانی جوزف اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اگر اس کی نیت واقعی خراب ہو گئی تو پرکاش اس کی حفاظت نہیں کر پائے گا۔

پرکاش مجھے بہت گھبرایا ہوا سا لگ رہا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ اسے اعتماد میں لے کر بات کی جاسکتی ہے۔ ہوسکتا ہے اسے مدد کی ضرورت ہو۔"

یاور اس حق میں نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کوئی شریف زادی نہیں جسے اغوا کیا گیا ہے۔ پیشہ ور لڑکی ہے اور مرضی سے جارہی ہے۔ بہرحال یاور نے نیم رضامندی ظاہر کی تو تیمور جاہ اٹھ کر بڑی احتیاط سے بوٹ کے پہلو کی طرف چلا گیا۔ وہ بلی کی چال چلتا نیم تاریکی میں لوہے کی سیڑھیاں اترا تو پرکاش اسے سامنے ہی ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا نظر آگیا مگر وہ بیٹھا بیٹھا باقاعدہ خراٹے لے رہا تھا۔ تیمور جاہ کو یہی لگا کہ وہ اس کمین کا پہرا دیتے دیتے سوگیا ہے جہاں نرملا نامی لڑکی موجود ہے۔ وہ ذرا قریب ہوا تو سوئے پڑے پرکاش کے منہ سے شراب کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ اس کی جیکٹ کی ایک جیب پھولی ہوئی تھی۔ یقیناً اس میں پستول تھا۔

وہ نیم گول راستے کی طرف گھوما تو دو کمروں میں قریباً سارے ہی سوڈانی اور مصری نشے میں دھت سوئے پڑے نظر آئے۔ اشیائے خورونوش اور رم وغیرہ کی بوتلیں ان کے اردگرد بکھری ہوئی تھیں۔ آثار سے لگتا تھا کہ چار پانچ گھنٹوں سے قبل ان میں سے کوئی بھی ہوش وحواس میں آنے والا نہیں۔ سارے میں الکحل کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ بوٹ کے اس حصے میں اپریل کی اس رات کو مکمل طور پر ایسٹرنائٹ کی شکل دی گئی تھی۔

تیمور جاہ واپس اس جگہ آیا جہاں پرکاش بیٹھے بیٹھے اٹا غفیل ہوگیا تھا۔ اس کے سامنے وہ چھوٹا سا نیلگوں دروازہ تھا جس کے عقب میں نامعلوم لڑکی موجود تھی۔ یہ دیکھ کر تیمور جاہ کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی کہ پرکاش کی گود میں ایک چابی "کی رنگ" سمیت پڑی تھی۔ غالب امکان یہی تھا کہ یہ لڑکی کے کمرے کی چابی ہے۔ اس نے ہمت کرکے آہستگی سے چابی اٹھائی۔ نیلے دروازے سے کان لگا کر سنا۔ باہر تو پرکاش کے خراٹے سنائی دیتے تھے مگر اندر یکسر خاموشی تھی۔ اس نے بضمی قفل میں ہولے سے چابی گھمائی۔ دروازہ کھل گیا۔ اندر بھینی سی خوشبو تھی اور ہلکی روشنی والا سبز بلب تھا۔ دو ڈھائی فٹ چوڑے فوم کے گدے پر کوئی کمبل اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ ابھی تیمور جاہ سوچ ہی رہا تھا کیا کرے کہ اچانک بائیں جانب سے کسی نے اچانک ایک سیاہ پستول اس کی گردن سے لگا دیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ ایک ڈرامائی سین تھا۔ لمبے ہموار بالوں والی

سزا

ذاکر صاحب کراچی آئے تو شاہد ان کی خاطر تواضع کے لیے انہیں ایک اچھے سے ریستوران میں کھانا کھلانے لے گیا۔ کھانے کا بل چار سو روپے آیا تو ذاکر صاحب بولے۔ "بھئی بل تو کافی آیا ہے۔ یہ ریستوران اتنا معیاری تو معلوم نہیں ہوتا۔ لگتا ہے کہ لوگ گاہکوں کو لوٹ رہے ہیں۔"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" شاہد نے ڈبڈبائی آنکھوں سے بل دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن اللہ نے ان کی بے ایمانی کی سزا انہیں پہلے ہی دے دی ہے۔ ان کے آدھے چمچے میری جیب میں ہیں۔"

(مرسلہ: زونیرا کامران، اسلام آباد)

تشویش

ایک خاتون ماہر نفسیات کے پاس پہنچیں اور بولیں۔ "میں چاہتی ہوں کہ آپ میرے شوہر کا معائنہ کرکے کوئی علاج تجویز کریں۔ وہ ناک سے دھواں نکالتے ہیں اور اس کے چھلے بناتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو میں سخت خوفزدہ ہوجاتی ہوں۔"

"یہ کوئی ایسی انوکھی بات تو نہیں ہے۔" نفسیات کے ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "بہت سے لوگ ناک سے دھواں نکالتے رہتے ہیں اور چھلے بھی بنا لیتے ہیں۔"

"لیکن جناب! مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر سگریٹ نہیں پیتے۔" خاتون بولیں۔

☆☆☆

☆ کہا ایک جگنو نے دوسرے سے۔ "آج مجھ سے بڑی حماقت سرزد ہوئی۔ میں سگریٹ کے ایک بغیر بجھے ٹوٹے کو اپنی مادہ سمجھ کر پانچ منٹ تک باتیں کرتا رہا۔

☆ جو لوگ چاہتے ہیں کہ ہر وقت ان کے راستے میں سرخ قالین بچھائے جائیں، بعض اوقات ان کے پیروں تلے صرف قالین رہ جاتے ہیں، زمین نکال لی جاتی ہے۔

☆ شرابی اکثر دوسروں کے لیے مسائل کھڑے کرتے رہتے ہیں مثلاً ان میں سے بعض خرید کر نہیں پیتے۔

☆ سب سے زیادہ آسانی سے آپ جو چیز مول لے سکتے ہیں وہ پریشانی ہے۔

(مرسلہ: زونیرا کامران، اسلام آباد)

pklibrary.com

ایک خوبرو لڑکی نائٹ گاؤن میں اس کے سامنے تھی۔ نائٹ گاؤن کی نصف آستینوں میں سے اس کی مرمریں باہیں اور دلکش ہاتھ نمایاں دکھائی دیتے تھے مگر ان سے بھی نمایاں وہ چھوٹا پستول تھا جو اس نے فلمی انداز سے دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔

''کون ہو تم؟'' وہ سرسراتی آواز میں بولی۔

تیمور جاہ نے گھبرا کر دونوں ہاتھ اٹھا دیے کہ مبادا وہ گھبرا کر ٹریگر ہی دبا دے۔

''دشمن نہیں، دوست ہوں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

لڑکی نے بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھا پھر ادھ کھلے دروازے میں سے باہر جھانکا اور دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ وہ اپنے حلیے اور حرکات وسکنات سے ایک نوخیز ماڈل گرل دکھائی دیتی تھی (بعد ازاں وہ واقعی ماڈل گرل نکلی)۔

لڑکی نے ایک بار پھر سرتاپا تیمور کا جائزہ لیا۔ وہ خاصی ہوشیار اور معاملہ فہم لگتی تھی۔

''اٹلی جا رہے ہو؟'' وہ پھر سرسراتی آواز میں بولی۔

''ارادہ تو یہی ہے۔''

''یہاں نیچے کیوں آئے ہو؟''

''سمجھو کہ غلطی ہو گئی..... دراصل..... دراصل کل میں واش روم جانے کے لیے اس طرف آیا تو کسی لڑکی کے بولنے اور رونے کی مدھم آواز سنائی دی۔ بس یہی تجسس مجھے کھینچ کر آج پھر یہاں لے آیا۔''

لڑکی نے جیسے ایک دم ہی کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے چھوٹے سائز کا پستول واپس اپنے سرخ نائٹ گاؤن کی جہازی سائز جیب میں ڈالا۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا کر پھر محتاط نظروں سے دائیں بائیں دیکھا اور پردہ اچھی طرح برابر کر دیا۔ اگلے چار پانچ منٹ میں لڑکی اور تیمور جاہ کے درمیان سرگوشیوں میں جو گفتگو ہوئی اس سے تیمور جاہ کو پتا چلا کہ نرملا کوشل نامی یہ لڑکی اپنی مرضی سے ان لوگوں کے ساتھ اٹلی جا رہی ہے۔ پیشے کے لحاظ سے وہ ممبئی کی ایک دوسرے درجے کی ماڈل تھی (مگر شکل صورت کئی سپر ماڈلز سے بھی اچھی تھی)۔ پرکاش اسے ایک لارڈ کی ''کیپ'' کے طور پر ''میلانو'' لے جا رہا تھا۔ اب راستے میں پرکاش اور سوڈانی جوزف کے درمیان جو تنازع پیدا ہو گیا تھا، وہ نرملا کو بے حد خوفزدہ کر رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ کسی بھی وقت وہ سیاہ رنگ اور چوڑے جبڑوں والا سانڈ نما جوزف اس پر پل پڑے گا۔

''یہ پستول تمہارا اپنا ہے؟'' تیمور جاہ نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

''نہیں۔ مجھے تو یہ ٹھیک سے چلانا بھی نہیں آتا۔ پرکاش لالہ نے کل مجھے دیا تھا کہ کوئی بُرا سے آپڑے تو میں اپنی رکھشا کر سکوں۔ پرکاش لالہ خود بھی پریشان ہے۔''

''مگر آج رات تو پرکاش اور جوزف دوسروں کے ساتھ اکٹھے ہی جشن منا رہے تھے؟''

''ہاں، صلح تو ہو گئی ہے دونوں کے درمیان پر من کے بھید تو اوپر والا ہی جانتا ہے۔ اب تو یہی پرارتھنا ہے کہ جلد سے جلد یہ سفر ختم ہو۔ میری تو اسے دیکھ کر ہی جان نکل جاتی ہے۔''

''میں تو یہاں آیا ہی اس لیے تھا کہ پرکاش سے پوچھوں کہ اسے مدد وغیرہ کی ضرورت تو نہیں۔ اب تو وہ ٹن ہو کر باہر پڑا ہے۔ بہرحال تم فکر نہ کرو۔ ہم تیس پینتیس پاکستانی اور انڈین یہاں موجود ہیں۔ کوئی زور زبردستی نہیں ہونے دیں گے۔''

تیمور جاہ کی اس تسلی نے نرملا کو کچھ زیادہ متاثر نہیں کیا۔ بہرطور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں تیمور کو احسان مندی کی جھلک نظر آنے لگی۔ اس کی باتوں سے تیمور کو کافی کچھ معلوم ہوا۔ اب پتا نہیں یہ حقیقت تھی یا نہیں لیکن وہ خود کو کنواری ہی بتاتی تھی اور اسی حیثیت سے اٹالین لارڈ تک پہنچنا چاہتی تھی۔ اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ یہ قذاق صفت سوڈانی کہیں اسے جانی نقصان نہ پہنچا دیں۔

اگلے روز یاور اور تیمور کی آنکھ ایک ساتھ ہی کھلی تھی۔ بوٹ میں ہلچل سی نظر آئی۔ پہلے تو یاور نے یہی سمجھا کہ شاید وہ منزل تک پہنچ گئے ہیں لیکن سورج کی روپہلی کرنوں میں دائیں بائیں دیکھا تو دور دور تک ساحل کے آثار نظر نہیں آئے۔ نیلا آسمان بھی پرندوں سے خالی تھا جو ''قرب ساحل'' کی نشانی ہوتے ہیں۔

سوڈانی کسی کو کھینچ کر سیڑھیوں سے اوپر لا رہے تھے۔ قریباً سب ہی مسافر پریشان چہروں کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف متوجہ تھے۔ ایک لمبے تڑنگے سوڈانی کے ہاتھ میں آٹو میٹک رائفل بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ کرخت لہجے میں ناقابلِ فہم الفاظ بول کر لوگوں کو پیچھے ہٹا رہا تھا۔

''کیا ہوا جی؟'' یاور نے بنگالی استاد مستقیم سے پوچھا۔

وہ عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولے۔ ''منوہر پرکاش کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' یاور اور تیمور جاہ نے ایک ساتھ چونک کر ایک ہی سوال پوچھا۔

''شاید رات کو زیادہ شراب پی لینے سے یہ معاملہ ہوا ہے۔'' انہوں نے کہا اور بُری طرح کھانسنے لگے۔

یاور اور تیمور جاہ لپک کر سیڑھیوں کے بالائی کنارے پر پہنچے۔ پرکاش کی پلاسٹک کی شیٹ میں لپٹی لاش بوٹ کے فرش پر رکھی جا چکی تھی۔ اس کا منہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ آنکھیں ابھری ابھری تھیں اور رنگ سیاہ پڑا ہوا تھا۔

تیمور جاہ نے یاور کے کان میں لرزتی سرگوشی کی۔ ''انہوں نے مارا ہے اسے..... اور ہوسکتا ہے اسی خبیث جوزف کا کام ہو۔''

اسی اثنا میں غیر معمولی چوڑے جبڑوں والا جوزف بھی غمزدہ چہرے کے ساتھ آنسو بہاتا اوپر آ گیا۔

''یہ..... مگرمچھ کے آنسو ہیں۔'' تیمور جاہ نے پورے یقین کے ساتھ سرگوشی کی۔ ''اور وہ دیکھو، گلے کی طرف۔''

یاور بھی نوٹ کر رہا تھا۔ گلے پر دباؤ کے نشانات واضح طور پر محسوس ہو رہے تھے۔ عملے کے سوڈانی اور دیگر افراد نے مسافروں کو ڈانٹ ڈپٹ کر پیچھے ہٹایا اور چند منٹ کے اندر اندر لاش کو سمندر کے حوالے کر دیا۔

سب مسافر کتنی ہی دیر سناٹے کے عالم میں گم صم بیٹھے رہے۔ بوٹ میں قریباً سبھی لوگ اس امر سے بے خبر تھے کہ نچلے حصے میں کیا چل رہا ہے۔ کسی لڑکی یا خاتون کی موجودگی کا اندازہ تو شاید کچھ مسافروں کو ہو مگر وہاں کیا کشیدگی تھی، کوئی نہیں جانتا تھا۔ صرف بڑی عمر کے بنگالی استاد مستقیم صاحب کو یاور اور تیمور نے دبے الفاظ میں نیچے کی صورت حال سے آگاہ کیا ہوا تھا اور انہوں نے یہ معلومات اپنے تک ہی رکھی ہوئی تھیں۔

دس پندرہ منٹ کی ہلچل کے بعد سوڈانی بوٹ کے نچلے حصے میں واپس چلے گئے۔

تیمور جاہ نے تشویش ناک لہجے میں سرگوشی کی۔ ''لگتا ہے کہ اب اس ہندو لڑکی کی خیر نہیں۔ یہ جوزف اس پر اپنے دانت تیز کر چکا ہے۔ میں ایسے لوگوں کی آنکھیں پہچانتا ہوں۔ عورت کے حوالے سے بڑی بھوک ہے اس کے اندر۔''

''تو پھر کیا کرنا چاہیے؟'' یاور نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''ان لوگوں سے ٹکرانا تو شاید ہم میں سے کسی کے بس میں نہیں۔'' تیمور جاہ نے آہ سی بھری۔

قریب ہی بیٹھے مستقیم صاحب نے اپنی کھچڑی ڈاڑھی میں انگلیاں چلائیں اور بنگالی لہجے کی اردو بولتے ہوئے کہا۔ ''ایک بڑے کی حیثیت سے میرا مشورہ ہے کہ جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینا چاہیے۔ اگر دیکھا جائے تو وہ بھی کوئی ایسی پاک دامن لڑکی تو نہیں۔ تیز طرار ماڈل گرل ہے اور جہاں جا رہی ہے، وہاں کون سا اس نے اپنے مذہب کے مطابق سات پھیرے لینے ہیں۔ یہ سب کچھ ایسے ہی چلتا ہے۔''

یاور نے کہا۔ ''انکل جی! مجھے تو یہی لگتا ہے کہ مجید رانا نے ہمیں اچھے لوگوں کے حوالے نہیں کیا۔ اگر جوزف اپنے قریبی ساتھی کو مار سکتا ہے تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

شاید تیمور جاہ جواب میں کچھ کہتا مگر اچانک مستقیم صاحب نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ عملے کا ایک سوڈانی اور ایک الجیرین مسافروں کی طرف آ رہے تھے۔

سہ پہر تک کوئی اور خاص واقعہ نہیں ہوا۔ سب ٹھیک ٹھاک ہی لگ رہا تھا مگر پھر بوٹ کے عملے میں تشویش کی ایک لہر سی نظر آنے لگی۔ جوزف اور اس کا قریبی ساتھی ایڈم لارنس جدید قسم کے واکی ٹاکی پر عربی میں تیز تیز گفتگو کرتے نظر آئے۔ پھر یکایک ان لوگوں نے بوٹ کا رخ موڑ دیا اور حتی الامکان رفتار سے شمال کے بجائے مغربی سمت بڑھنے لگے۔ مڑی ہوئی ناک اور عقابی آنکھوں والا ''ایڈم'' بار بار کسی ڈیوائس پر اپنی سمت اور رخ بھی چیک کر رہا تھا۔

''لگتا ہے کہ ان لوگوں کو کوئی سنگین خطرہ محسوس ہوا ہے۔'' یاور نے کہا۔

تیمور جاہ بولا۔ ''کیا خیال ہے..... جوزف سے کچھ پوچھوں؟''

بنگالی مستقیم صاحب نے اسے روکا۔ ''ابھی رہنے دو۔ بہت اپ سیٹ نظر آ رہا ہے وہ۔''

سب مسافر ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے تھے اور دبی دبی آواز میں ایک دوسرے سے سوالات بھی پوچھ رہے تھے۔ نوعمر راجا سے یہ سارا تجسس اور تفکر برداشت نہیں ہوا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور زور زور سے بولنے لگا۔ عملے کے لوگ پہلے ہی تیوریاں چڑھائے ہوئے تھے۔ ایک سوڈانی مشتعل ہو کر راجا کی طرف بڑھا تو یاور لپک کر اس کے سامنے آ گیا۔ ہاتھ جوڑ کر اسے کسی سخت ردعمل سے روک دیا گیا۔

سوڈانی زور زور سے بولنے لگا اور ہاتھ نچانے لگا۔ یہ عربی سے ملتی جلتی زبان ہی تھی۔ یاور اسے بمشکل آگے بڑھنے سے روک پایا۔

ایک مصری کا غیظ و غضب دیکھ کر سب سہم سے گئے۔ قریباً ایک گھنٹے کے تیز رفتار اور یخ بستہ سفر کے بعد ان لوگوں

نے بوٹ ایک بالکل ویران جگہ پر روک دی۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی، سمندر تھا اور سمندر بھی اب کچھ زیادہ پُرسکون نہیں رہا تھا۔ اس میں مدوجزر پیدا ہو رہا تھا۔ ہوا بھی تیز ہوگئی تھی۔

اندھیرا تیزی سے پھیلا۔ بوٹ کے عملے نے آج مسافروں کو کسی طرح کی روشنی کرنے کی اجازت نہیں دی۔ سب نے تاریکی میں ہی خشک راشن سے کچھ پیٹ پوجا کی۔ بوٹ کے انجن بند کیے جا چکے تھے۔ اب یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ آگے کسی قانونی خطرے کے پیش نظر ان لوگوں نے بوٹ یہاں لا کھڑی کی ہے۔

☆☆☆

تیمور جاہ کی عمر قریباً 26 سال ہو چکی تھی۔ وہ دراز قد اور وجیہہ تھا۔ کالج کے دور میں دو تین لڑکیاں اس کی طرف متوجہ بھی ہوئی تھیں مگر وہ بالکل مختلف ٹائپ کا تھا۔ اپنی ہی سوچوں میں گم رہنے والا ایک منفرد شخص۔ اب بھی اس بوٹ میں وہ کسی روزگار کی تلاش میں نہیں جا رہا تھا۔ اس کے سفر کا مقصد ایک انتقام تھا۔ ایک ایسا انتقام جو انتقام اور بدلے کی عام تعریف سے بہت مختلف تھا۔

اپنی سوچوں میں گم، بار بار اس کی نگاہوں کے سامنے نرملا کی شبیہہ آنے لگی۔ پتا نہیں ایسا کیوں تھا۔ کسی سے بھی نہ متاثر ہونے والا اس لڑکی کے طلسمی نقوش اور اس کی مقناطیسیت سے متاثر ہو رہا تھا۔ پچھلے 48 گھنٹوں میں اس نے بہت کوشش کی تھی کہ اس کے بارے میں نہ سوچے پھر بھی وقفے وقفے سے سوچنے لگتا تھا۔ جو کچھ نرملا کے ساتھ ہوسکتا تھا یا ہونے والا تھا، اس کا اندیشہ بھی بار بار تیمور کو کچوکے لگاتا تھا۔ البتہ اس بات کی ہمت وہ خود میں نہیں پاتا تھا کہ کسی مشکل صورت حال میں وہ نرملا کی مدد کر سکے۔ بلکہ شاید یاور نے ٹھیک ہی کہا تھا، اس قسم کی مہم جوئی بوٹ میں سے کوئی بھی نہ کر سکتا تھا اور نہ ہی یہ مہم جوئی دانشمندی کے زمرے میں آتی تھی۔

بوٹ تاریکی کی وسیع و عریض چادر میں لپٹی کھلے سمندر میں رکی ہوئی تھی۔ جب سے ان کا یہ غیر یقینی سفر شروع ہوا تھا، پہلی بار سمندر میں تلاطم پیدا ہوا تھا۔ گو بہت زیادہ نہیں تھا مگر بوٹ مسلسل ہچکولے کھا رہی تھی۔ مسافروں میں سے کم از کم آٹھ دس ایسے تھے جن کی طبیعت بحال نہیں رہی تھی۔ ان میں سے کچھ کو قے ہو رہی تھی اور کچھ کو سردی لگ گئی تھی۔ سردی لگ جانے والوں میں بنگالی اسکول ٹیچر مستقیم صاحب سرفہرست تھے۔ وہ دوا بھی لے رہے تھے مگر افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ کل سہ پہر تک یہ سب مسافر بہت پُرامید تھے کہ یہ نہایت دشوار اور تکلیف دہ سفر اب بہت جلد سپنوں کی منزل سے ہمکنار ہونے والا ہے لیکن اب پھر سفر کی جان مسلسل مشکلات کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

رات کے آغاز میں تیمور جاہ کو نیند آنے لگی۔ گاہے بگاہے یہ اندیشہ اس کے ذہن میں سر اٹھاتا تھا کہ آج رات جوزف کہیں نرملا والے کیبن میں نہ پہنچ جائے۔

یاور نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”موجودہ صورت حال میں عملہ پریشان ہے اور سب سے زیادہ یہ سانڈ کے منہ والا جوزف ہی ہے۔ ایسی تشویش ناک سچویشن میں اس کا دھیان شاید موج مستی کی طرف نہ ہی جائے۔“

خود تیمور کے ذہن میں بھی اسی طرح کی بات آتی تھی۔ رات بارہ بجے کے قریب کمبل میں ٹانگیں پیٹ سے لگائے لگائے اسے نیند آ گئی۔ شاید یہ ذہن میں کلبلاتے ہوئے اندیشے ہی تھے جن کے سبب وہ تین چار گھنٹے بعد ہی پھر جاگ گیا۔ بوٹ مسلسل ہچکولے کھا رہی تھی۔ ہوا کی تیزی بھی برقرار تھی۔ بوٹ کے عرشے پر اور شیڈ کے نیچے مسلسل سناٹا تھا۔ صرف انجن روم کی طرف ہلکی سی روشنی تھی۔ البتہ حرکت وہاں بھی کوئی نہیں تھی۔ انجن آپریٹر بھی غالباً رات کے اس آخری پہر سو گیا تھا۔

لیٹے لیٹے اچانک تیمور جاہ کی نگاہیں بوٹ کے دائیں پہلو کی طرف اٹھیں اور وہ چونک گیا۔ وہاں جوزف، بوٹ کی ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ تیمور جاہ کی طرف اس کی پشت تھی۔ جوزف کے ایک ہاتھ میں شراب (رم) کی بوتل تھی اور دوسرے میں سگریٹ کا روشن نقطہ سلگ رہا تھا۔ وہ دور تاریک افق کی طرف دیکھ رہا تھا۔

یقیناً رات کے اس پہر بھی وہ فکرمندی کے گھیرے میں تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس فکرمندی کے ساتھ ساتھ نرملا کے نوخیز جسم کی طلب بھی اس کے دل میں کچوکے لگا رہی ہو۔ کئی لمحے بڑے مختلف اور فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ وہ عام سے بندے کو بھی عام نہیں رہنے دیتے۔ اس کے قول و فعل اور اس کی سوچوں کو ایکا ایکی بہت خاص بنا دیتے ہیں۔ یکایک تیمور جاہ کے سینے میں اس کی دھڑکن کو ٹاپ گیئر لگ گیا۔ سانس کی لے تیز ہوگئی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا وہ کب یاور کے پہلو سے بہت آہستگی کے ساتھ اٹھا..... اور کب دبے پاؤں چلتا تنہا کھڑے ہٹے کٹے دراز قد جوزف کے عین عقب میں پہنچ گیا۔

☆☆☆

pklibrary.com

صبح کے وقت یاور کی آنکھ شور شرابے کی وجہ سے ہی کھلی تھی۔ عملے کے عیسائی سوڈانی اور مصری چاروں طرف بوکھلائے پھر رہے تھے۔ دو تین کے ہاتھوں میں رائفلیں بھی نظر آرہی تھیں۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں سامان کو الٹ پلٹ کررہے تھے اور کونے کھدروں میں جھانک رہے تھے۔ تیمور جاہ پہلے سے جاگ رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' یاور نے اس سے پوچھا۔

''لگتا ہے کہ بہت اچھا ہوگیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' یاور نے چونک کر پوچھا۔

''وہ سانڈ جوزف کشتی پر موجود نہیں۔ رات اس نے بہت شراب پی تھی۔ خیال ظاہر کیا جارہا ہے کہ وہ ریلنگ کی طرف گیا ہے اور سمندر میں گر گیا ہے۔''

یاور ہونٹ سکوڑ کر رہ گیا۔

ایک انڈین لڑکا بولا۔ ''رات کو میں پیشاب کے لیے اٹھا تھا۔ میں نے بھی اسے بائیں طرف ریلنگ کے پاس کھڑے دیکھا تھا۔ تب ناؤ (کشتی) کچھ زیادہ ہی ہچکولے کھا رہی تھی۔''

مستقیم صاحب نے کھانستے ہوئے سرگوشی کی۔ انڈین لڑکے سے مخاطب ہوکر بولے۔ ''یہ بات ان لوگوں سے مت کہنا..... تمہارے لیے مصیبت کھڑی کردیں گے۔''

''ہم کوئی غلام ہیں ان کے جو اس طرح سہم کر رہیں۔'' نوعمر اکرم عرف راجا تنک کر بولا۔

تیمور جاہ بولا۔ ''راجے! تم تو چپ ہی رہو۔ یہ لوگ پہلے ہی گرم ہیں تم پر۔ کوئی مشکل بن جائے گی تمہارے لیے۔''

پوری بوٹ میں سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ مطلع مسلسل ابر آلود تھا اور سمندری تلاطم بھی برقرار تھا۔ البتہ دن کا وقت تھا اس لیے سردی کم محسوس ہوتی تھی۔ کل رات سے ہی بوٹ کے انجن بند تھے اور وہ بس لہروں کے ساتھ ہی تھوڑی بہت حرکت کررہی تھی۔ جوزف کا دستِ راست ایڈم کئی مسافروں سے پوچھ گچھ کررہا تھا۔ اس نے ایک سری لنکن لڑکے کو کسی بات پر مشتعل ہوکر تھپڑ بھی مارے تھے۔ بہرطور ریلنگ کے پاس سے سگریٹس کے ٹکڑے اور وہسکی کے جو دو خالی کوارٹر ملے تھے وہ اس امر کی تصدیق کرتے تھے کہ رات کے آخری حصے میں کسی وقت سانڈ نما جوزف یہاں موجود رہا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد جوزف کی سرخ پی کیپ اور ایک جوتی بھی لہروں پر ہچکولے کھاتی نظر آگئی اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ جوزف کا خاتمہ بالخیر ہوچکا ہے۔

..... دو تین گھنٹے تک سوڈانی عملے پر سوگواری کی سی کیفیت طاری رہی پھر ان کا دھیان اس خطرے کی طرف منتقل ہونے لگا جو ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا اور جس کے سبب وہ کل سخت افراتفری کے عالم میں بوٹ کو لے کر یہاں آگئے تھے۔ یقیناً انہیں کوسٹ گارڈز کے بارے میں ہی کوئی اطلاع ملی تھی (جیسا کہ بعد میں پتا چلا وہاں کسی سخت قسم کی ناکا بندی کا علم ہوا تھا)۔ جوزف کے بعد بوٹ کی کمانڈ اب ایڈم کے پاس آگئی تھی۔

بوٹ کے مسافروں کی زیادہ تعداد نوجوانوں پر ہی مشتمل تھی۔ وہ سب بدستور سہمے ہوئے سے تھے۔ جس سری لنکن لڑکے کو تھپڑ مارے گئے تھے اسے بعد ازاں یہ لوگ بوٹ کے نچلے حصے میں لے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد جب وہ واپس آیا تھا تو اس کے سانولے چہرے پر کئی نیلگوں ابھار تھے۔ اس سے مزید مار پیٹ کی گئی تھی۔ اب پتا نہیں کہ اس پر انہیں کسی طرح کا شک ہوا تھا یا پھر اسے بدتمیزی کی سزا دی گئی تھی۔

شام سے ذرا پہلے ایڈم سیڑھیاں چڑھ کر بالائی حصے پر آیا۔ وہ مسافروں کے درمیان سے راستہ بناتا سیدھا اسی طرف آرہا تھا جہاں بیمار بنگالی نیچر کے پاس یاور اور تیمور جاہ بیٹھے تھے۔ کسی بے نام اندیشے کے تحت تیمور کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

قریب آکر لمبے تڑنگے ایڈم نے تیمور کو مخاطب کیا اور ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا۔ ''تو اک چاؤٹ میں تم نے ہی اس موٹی ناک والے بنگلا دیشی کا اترا ہوا کندھا چڑھایا تھا نا؟''

تیمور نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ پوری کوشش کررہا تھا کہ گھبرایا ہوا نظر نہ آئے۔

''چلو اٹھو۔'' ایڈم نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری ضرورت پھر پڑی ہے۔''

ہچکولے کھاتی بوٹ پر ایک دفعہ لڑکھڑانے کے بعد تیمور سنبھل کر کھڑا ہوگیا۔

☆☆☆

بظاہر ڈرنے کی کوئی بات نہیں تھی مگر رات تیمور جو کچھ کرچکا تھا، اس کے بعد بے نام اندیشے اپنے آپ ہی اس پر حملہ آور ہورہے تھے۔ وہ دھیمے مزاج کا شخص تھا، ہمیشہ تنازعات، مار دھاڑ اور مہم جوئی سے دور رہا تھا مگر رات جو کچھ ہوا اس کی سمجھ خود اسے بھی نہیں آئی تھی۔ نہ جانے وہ کیسے لمحے تھے جب وہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔ دراز قد شرابی جوزف کے عین عقب میں پہنچا تھا اور اسے سمندر میں دھکیل دیا تھا۔ وہ اس قدر ٹن تھا کہ اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکل

pklibrary.com

پائی تھی۔

ایڈم اسے ساتھ لے کر سیڑھیاں اترا اور نیلے دروازے والے اس کیبن کے سامنے پہنچ گیا جہاں پچھلے چار پانچ دن سے نوخیز نرملا موجود تھی۔ جوزف کے بعد اب وہ ایڈم کی دسترس میں تھی تاہم تیمور کا دل گواہی دیتا تھا کہ ایڈم، نرملا کے لیے اس طرح خطرناک نہیں جیسے وہ ''جنس زدہ جوزف'' تھا۔

وہ کیبن میں پہنچے تو خوبرو نرملا چہرے پر تکلیف کے آثار لیے بستر پر دراز تھی۔ تیمور کو دیکھ کر اس کے چہرے پر شناسائی کے تاثرات ابھرے مگر پھر فوراً ہی وہ یہ کیفیت چھپا گئی۔ نرملا کا ایک پاؤں ورم زدہ تھا اور وہاں ایک گرم پٹی لپیٹی گئی تھی۔

ایڈم کرخت لہجے میں بولتا تھا تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی کنستر میں پتھر ڈال کر زور زور سے ہلائے جا رہے ہوں۔ وہ نرملا کے پاؤں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''دیکھو اس کو۔''

خود وہ باہر نکل گیا مگر اس امر کا اندیشہ موجود تھا کہ کہیں سے انہیں دیکھا یا سنا نہ جا رہا ہو۔ تیمور بہت دھیمی آواز میں بولا۔ ''کسی طرح کی جان پہچان ظاہر نہ کرنا..... اور یہ تمہارے پاؤں کو ہوا کیا ہے؟'' آخری الفاظ اس نے بلند آواز میں کہے تھے۔

نرملا نے کہا۔ ''کل رات بوٹ بہت بری طرح سے ڈول رہی تھی۔ کیبن میں اندھیرا بھی تھا۔ پانی پینے کے لیے اٹھی تو پاؤں رپٹ گیا۔ کہنی پر بھی چوٹ آئی ہے مگر پاؤں کا تو برا حال ہے۔'' اس نے سسکاری لی۔

تیمور نے گروپ میں بتایا تھا کہ وہ ایک فزیوتھراپسٹ کے ساتھ معاون کے طور پر کام کرتا رہا ہے مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ خود ہی فزیوتھراپسٹ تھا۔ اس کے پاس باقاعدہ ڈگری تھی۔ یہ تو اس کے اندر سلگتی ہوئی احتجاج اور غصے کی آگ تھی جو اسے خطرات سے گھری ہوئی اس بے سمت بوٹ تک لے آئی تھی۔

اس نے نرملا کا مرمریں پاؤں دیکھا۔ فریکچر تو نہیں لگ رہا تھا مگر بڑی سخت قسم کی موچ تھی۔ سرخ سلیپنگ گاؤن کی نصف آستین میں اس کی کہنی بھی نیلگوں اور ورم زدہ نظر آتی تھی۔

تیمور نے پاؤں کو تھوڑا ہلا جلا کر اس کی سمت درست کی۔ وہ ''اف..... آہ..... ہائے بھگوان'' کرنے لگی۔ زیتون کے آئل سے تھوڑی مالش کر کے تیمور نے اس کی پٹی کر دی۔

''آپ تو تجربہ کار ڈیڈ لگ رہے ہیں۔'' اس نے پیشانی سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

''ڈیڈ تو نہیں لیکن کچھ تجربہ ضرور ہے۔'' تب اس نے وہی بات دہرائی جو پہلے گروپ میں بتا چکا تھا یعنی وہ ایک فزیوتھراپسٹ کا معاون رہا ہے۔

نرملا کی نگاہیں بتا رہی تھیں کہ وہ تیمور کی شخصیت سے متاثر ہو رہی ہے اور اس کی یہاں موجودگی سے خوش بھی ہے۔ اب ان دونوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کیبن کے آس پاس فی الوقت کوئی موجود نہیں ہے۔

نرملا نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''کیا یہ بات سچ ہے کہ وہ راکھشس سمندر میں گر گیا ہے؟'' اس کا اشارہ یقیناً جوزف کی طرف ہی تھا۔

''کہہ تو یہی رہے ہیں۔'' تیمور نے کہا۔

''بائی گاڈ! مجھے وشواس نہیں ہو رہا۔ بہت ہی خبیث بندہ تھا وہ۔'' وہ جھرجھری سی لے کر بولی۔ ''مگر گرا کس طرح؟''

''کہہ رہے ہیں کہ بہت زیادہ شراب پی ہوئی تھی اور جنگلے کے پاس کھڑا تھا۔'' تیمور نے مختصر جواب دیا۔

وہ روہانسی ہو کر بچوں کے سے انداز میں ٹھنک کر بولی۔ ''لیکن یہ سفر ختم کب ہونا ہے؟ اب ان لوگوں نے بوٹ یہاں لا کر کھڑی کر دی ہے۔''

''کوئی مسئلہ ہے ان کا۔ کہہ تو رہے ہیں کہ جلد ختم ہو جائے گا۔'' تیمور نے تفصیل بتا کر نرملا کو مزید پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

''آپ شادی شدہ ہو؟'' اچانک ہی نرملا نے بے محل سوال پوچھا۔

''یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟''

وہ دلکش انداز میں مسکرائی۔ ''یہ جانکاری لینے کی کوشش کر رہی ہوں کہ میرا قیافہ درست ہے یا نہیں۔ شادی شدہ مردوں کے چہرے ایسے تر و تازہ نہیں ہوتے۔''

''بہت تر و تازہ چہروں والے شادی شدہ بھی ہوتے ہیں۔ بہرحال میں ابھی اس جھمیلے سے دور ہوں۔''

وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ ابھی کچھ دیر مزید اسے یہاں دیکھنا چاہتی ہے۔

☆☆☆

اگلے پانچ دن انہیں اپنی زندگی کے مشکل ترین دن لگ رہے تھے۔ جو ابر آلود موسم ہفتے کی رات شروع ہوا تھا، وہ ابھی تک چل رہا تھا۔ گاہے بگاہے بارش بھی ہو جاتی تھی۔

بوٹ کے اندر حالات بدتر ہو رہے تھے، خوراک ختم ہو رہی تھی۔ پندرہ بیس مسافر بیمار پڑے ہوئے تھے۔ بوٹ والوں سے جب بھی پوچھا جاتا تھا کہ روانگی کب ہے؟ وہ ایک آدھ دن کا کہہ کر ٹال دیتے تھے۔ وہ پہلے بھی نرم مزاج نہیں تھے، اب زیادہ ہی کرخت ہو گئے تھے۔ ایڈم جس کو اس کے کچھ ساتھی ''آدم'' بھی کہتے تھے، سوال پوچھنے پر جیسے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ چند مسافروں کو آدم اور اس کے ساتھیوں کی ٹھوکریں بھی کھانا پڑی تھیں۔ سب سے افسوسناک بات یہ تھی کہ ان ٹھوکریں کھانے والوں میں استاد مستقیم صاحب بھی شامل تھے۔ کل رات انہیں تیز بخار کے ساتھ مسلسل قے بھی شروع ہو گئی تھی۔ سانس بھی اٹک رہی تھی۔ وہ سب بہت صبر سے برداشت کرتے رہے تھے مگر اب معاملات ان کے بس سے باہر ہو رہے تھے۔ آدم قریب سے گزرا تو انہوں نے جھنجلاہٹ کے عالم میں اپنی پھنسی پھنسی آواز بلند کی اور اس سے پوچھا کہ وہ بوٹ کب چلائیں گے؟

وہ جیسے پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ اس نے یاور اور تیمور کے روکتے روکتے دو زوردار ٹھوکریں ان کے سینے اور سر پر رسید کیں اور گالیاں بکتا ہوا آگے نکل گیا۔ مستقیم صاحب کی عینک اچھل کر دور جا گری تھی، خشک ہونٹوں سے خون بہنے لگا تھا۔

شام کے بعد پھر بارش ہو گئی۔ یاور اور تیمور نے راجا کے ساتھ مل کر مستقیم صاحب کو اٹھایا اور شیڈ کے نیچے بمشکل جگہ بنا کر انہیں لٹا دیا (شیڈ کے نیچے سونے کے لیے سب مسافروں نے باری ٹھہرائی ہوئی تھی اور کوئی بھی اب اپنی باری کسی دوسرے کو دینے کو تیار نہیں تھا)۔ رات گئے تک تیمور اور یاور ان کی تیمارداری میں مصروف رہے۔ تیسرے پہر ان کی طبیعت کچھ سنبھلی ہوئی لگی۔ ان دونوں نے بھی تھوڑی سی آنکھ لگا لی۔ سورج ابھی ابھرا نہیں تھا کہ ''بنگالی استاد'' کی زندگی کا سورج ڈوب گیا۔ پہلے یاور اور پھر تیمور کو پتا چلا کہ ان کی سانس بند ہو چکی ہے۔ کچھ دیر بعد اپنی چار بچیوں کے لیے بہتر مستقبل کی تلاش میں نکلنے والا باپ سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں چلا گیا۔ پوری کشتی کے مسافر سوگوار نظر آئے۔

اور اس دن یہ اکیلی موت نہیں تھی۔ قدرے بڑی عمر کے دو اور مسافر ڈائریا کی سی کیفیت کا شکار ہو کر اپنا سفر مختصر کر گئے۔ ان میں ایک پاکستانی اور دوسرا سری لنکن تھا۔

ان چار پانچ دنوں میں تیمور جاہ تین چار بار نیلے دروازے والے کیبن میں نرملا کے پاس جا چکا تھا اور وہ اس کے کندھے پر بوجھ ڈال کر آہستہ آہستہ چلنا شروع ہو گئی تھی۔ نرملا کا جسمانی قرب تیمور کے اندر عجب سی ہلچل مچا دیتا تھا۔ کوئی ایسی کیمسٹری سی بن گئی تھی ان دونوں کے درمیان جو نرملا کی سمجھ میں تو شاید آتی ہو مگر تیمور کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی تھی۔ وہ اس طرز کا بندہ نہیں تھا۔ پھر پتا نہیں یہ سب کیوں ہو رہا تھا۔

ایک شام وہ اس کے پاس پہنچا تو وہ بیٹھی رو رہی تھی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''اب تو من گھبرانے لگا ہے۔ دم گھٹتا ہے اس کیبن میں۔ پتا نہیں کیا ہونا ہے ہمارے ساتھ۔ یہ لوگ بھی دن بدن زہریلے اور کٹھور ہوتے جا رہے ہیں۔ کل میں نے آدم سے پوچھا کہ چلتے کیوں نہیں ہو تو بولا..... انجن خراب ہو گیا ہے۔ تیمور! کیا واقعی انجن میں کوئی گڑبڑ ہے؟''

''بکواس کر رہے ہیں۔'' تیمور دھیمی آواز میں بولا۔ ''بات وہی ہے سمندر میں آگے کوسٹ گارڈز کی ناکا بندی چل رہی ہے۔ اب یہ لوگ آگے جا سکتے ہیں نہ پیچھے۔''

''پیچھے کیوں نہیں جا سکتے؟''

''پیچھے بڑا لمبا سفر ہے۔ ان کے پاس اتنا فیول ہی نہیں ہے۔''

''لیکن یہاں بھی تو خوراک ختم ہو رہی ہے اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ پانی ختم ہو رہا ہے۔ کل آپ نے ہی تو بتایا تھا کہ کچھ لوگوں نے سمندر جل پیا ہے۔''

''ہاں، چار سری لنکن لڑکے تھے۔ کل سے چاروں ہی شدید بیمار تھے۔ ان میں سے ایک..... آج دوپہر مر گیا ہے۔''

دونوں کچھ دیر گم صم بیٹھے رہے۔ تیمور ہولے ہولے نرملا کے مضروب پاؤں پر ہاتھ چلاتا رہا۔ وہ خود بھی اب سخت نقاہت محسوس کرنے لگا تھا۔ نمکین بسکٹس اور سوکھی ہوئی ڈبل روٹیوں کے سوا کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ یاور کے پاس تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے بھی تھے۔ یہ چیزیں بھی بے حد بچت کے ساتھ استعمال کی جا رہی تھیں۔ نمکین بسکٹ اور چنے وہ کھا تو لیتے تھے مگر پھر پیاس کی شدت بڑھ جاتی تھی اور صاف پانی اب نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔

نرملا کے چہرے سے بھی پہلے والی شادابی یکسر رخصت ہو چکی تھی۔ وہ کھوئی کھوئی نظروں سے تیمور کو دیکھ کر بولی۔ ''کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ یہیں پر ہمارا آخری سمے آ جائے گا۔ اس سے یہ بہتر نہیں کہ کوسٹ گارڈز ہی ہمیں پکڑ لیں؟''

اچانک بوٹ کے عرشے کی طرف سے لڑائی جھگڑے کی بلند آوازیں آئیں۔ نرملا کو وہیں چھوڑ کر تیمور سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر پہنچا تو جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ اٹھارہ انیس سالہ راجا ایک سوڈانی سے جھگڑ پڑا تھا۔ راجا کی یہی غلطی تھی جس سے یاور اور تیمور ڈر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو سوڈانی اس پر پل پڑے۔ ایک نے رائفل کے کندے سے راجا کے سر پر بڑی کاری ضرب لگائی۔ وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ وہ اسے مزید ضربیں لگانا چاہتے تھے مگر یاور اس پر گر پڑا۔ رائفل کے دستے کی باقی چوٹیں یاور نے اپنی کمر پر سہیں۔ اسی دوران میں آدم بھی پہنچ گیا اور اس نے اپنے ساتھیوں کو مزید تشدد سے روک دیا۔

راجا کے سر کا زخم دیکھ کر تیمور جاہ بھونچکا رہ گیا۔ ایک اور ضرب بھی اس کے زخم پر لگ جاتی تو اس کا بچنا محال ہو جاتا۔ مصری جیکب ایک میڈیکل باکس یاور اور تیمور کے پاس پھینک کر واپس چلا گیا۔ وہ دونوں اس کا خون بند کرنے میں مصروف ہو گئے۔

''کیا ہوا تھا؟'' تیمور نے نحیف آواز میں پوچھا۔

''تھوڑا پانی مانگا تھا اس نے۔ میرے پاس آٹھ دس گھونٹ تو ہیں۔ میں نے بہت کہا کہ مجھ سے لے لو۔ بولا نہیں، ہمارے کھانے پینے کی ذمے داری ان کی ہے۔ یہ خود تو جی رہے ہیں اور ہمیں مار رہے ہیں۔ لڑ پڑا اس موٹے سوڈانی سے۔''

''اس کا خون بند ہونا چاہیے ورنہ حالت نازک ہو جائے گی۔ پہلے ہی پیلا زرد ہو رہا ہے۔'' تیمور نے کہا۔

''صحت مند کون ہے؟ سارے ہی نیم جان ہیں۔'' یاور نے بجھے لہجے میں کہا۔

..... یوں لگتا تھا کہ حالات بہتر ہونے کے بجائے خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی رات پچھلے پہر جب بوٹ کے انجن اسٹارٹ ہوئے تو سب کے مُردہ چہروں پر زندگی کی چمک آ گئی مگر بوٹ شمال کے رخ پر جانے کے بجائے کچھ اور مغرب کی طرف بڑھ گئی اور پھر ایک جگہ دوبارہ رک گئی۔ اس مرتبہ مزید اضافہ یہ ہوا کہ بوٹ کے انچارج آدم نے بوٹ کے نچلے حصے کی روشنیاں بھی مکمل بند کرا دیں۔ بالائی حصے پر روشنی کا تو اب کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

اسی رات پو پھٹنے سے پہلے بارہ دنوں میں پہلی بار ان لوگوں کو سمندر میں پانی کے سوا کوئی اور چیز نظر آئی۔ یہ کوئی مال بردار جہاز لگتا تھا جس کی روشنیاں بہت فاصلے سے سیاہ پانیوں پر تیرتی ہوئی نظر آئیں۔

اب پتا نہیں یہ اچھا شگون تھا یا بُرا۔

☆☆☆

دو دن مزید اسی عذاب ناک کیفیت میں گزر گئے۔ اب دھوپ بھی خوب چمک دکھانے لگی تھی۔ بوٹ میں پانی کی کمی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ یاور اپنے قریب لیٹے راجے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے سر پر بندھی بینڈیج نہ صرف پرانی ہو چکی تھی بلکہ خون آلود بھی تھی۔ راجا کے گلابی ہونٹ سیاہ ہو چکے تھے اور ان پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ یاور اور تیمور اپنے حصے کا پانی بھی اسے پلا چکے تھے۔ اب ان کے پاس بھی سمندر کے پانی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

راجا کے ہونٹ ہلے اور بہت نحیف آواز سنائی دی۔

''یاور بھائی! مجھے کچھ ہو گیا تو میرا ابا بہت روئے گا..... اور فرزانہ بھی۔'' فرزانہ اس کی منگیتر کا نام تھا۔

''کچھ نہیں ہو گا تمہیں۔'' یاور نے ڈانٹنے والے لہجے میں کہا۔ ''آدم کی باتوں سے اشارہ ملتا ہے کہ معاملہ ٹھیک ہو رہا ہے۔ تم حوصلہ رکھو۔''

راجا کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو اس کے کانوں کی طرف رینگنے لگے۔ ''میں نے..... تمہاری بات نہیں مانی..... مجھے اپنا غصہ ٹھنڈا رکھنا چاہیے تھا۔''

یاور تسلی دینے والے انداز میں اس کا کندھا سہلانے لگا۔ اس کی اپنی حالت بھی اب کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی اور اگر دیکھا جاتا تو بوٹ میں موجود قریباً پچاس مسافروں میں سے کوئی بھی بہتر حالت میں نہیں تھا۔ جن کے پاس تھوڑا بہت کھانا اور پانی موجود تھا وہ پھر بھی چلتے پھرتے نظر آتے تھے، باقی بس بیٹھے یا لیٹے رہتے تھے۔

یاور بھی پشت کے بل سیدھا لیٹا نیلے آسمان کو تک رہا تھا۔ سوچتا تھا، یہی آسمان ہے جس کے نیچے کہیں رنگوں اور روشنیوں کا شہر لاہور بھی آباد ہے..... اندرون لاہور کے ایک چوبارے میں کہیں اس کی من موہنی ماں بھی بیٹھی ہو گی اور اس کی بہن گوشی بھی..... اور پھر آسمان کے نیچے وہ گھر بھی تو ہو گا جہاں جھیل سی آنکھوں والی اس کی ''محبت'' اریبہ شب و روز گزار رہی ہو گی۔ آنکھوں میں مستقبل کے رنگین سپنے سجا کر خود ہی گل رنگ ہو جاتی ہو گی..... پھر دانتوں میں انگلی دبا کر کیلنڈر کی طرف دیکھنے لگتی ہو گی۔ پھر اسے وہ وقت یاد آیا جب ماں نے اس کا ہاتھ اپنے سر پر رکھا تھا اور اس سے شریفانہ زندگی کی قسم لی تھی..... اور پھر مجید رانا جس کی ہتھیلی پر وہ اپنی جمع پونجی رکھنے کے لیے اس کے ٹھکانے پر پہنچا تھا۔ کاش وہ مجید رانا سے نہ ملا ہوتا..... کاش.....!

اس کے سینے سے ایک طویل آہ سی نکلی۔ ایک دم آدم کے گرنے کی آواز آئی۔ یہ آواز کشتی کے نیچے والے پورشن سے آئی تھی۔ پھر مصری جنیکب کسی بات پر چنگھاڑا۔ بہت سے افراد بلند آوازوں میں بولنے لگے۔ وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

یاور نے تیمور جاہ سے کہا۔ ''ٹھیک ہی کہتے ہیں، جب جان پر بننے لگے تو کوئی اپنا..... اپنا نہیں رہتا۔''

تیمور نے بس اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

اسی اثنا میں نیچے سے اوپر آنے والی سیڑھیوں پر دندناتے قدموں کی بھاری آوازیں آئیں۔ پھر بپھرا ہوا آدم دو تین ساتھیوں کے ساتھ سیدھا اس گروپ کی طرف آیا جس میں زیادہ تر پاکستانی ہی تھے۔ ان پاکستانیوں میں آٹھ دس ایسے تھے جن کے پاس دو تین دن کا کھانا پانی ابھی موجود تھا۔

''اپنا سامان سامنے لاؤ۔'' آدم گرج کر بولا۔

وہ جن سے مخاطب ہوا تھا، وہ ہکا بکا اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس کی ٹوٹی پھوٹی انگلش شاید کسی کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔

تب یاور اور تیمور جاہ یہ دیکھ کر سٹپٹا گئے کہ ان پاکستانیوں نے خود پر جبر کر کے جو معمولی سامانِ خورونوش بچایا تھا، وہ زبردستی ان سے چھینا جا رہا تھا۔ جن سے چھینا جا رہا تھا، ان میں مزاحمت کی قوت ہی کہاں تھی۔ وہ تو بس التجا کر سکتے تھے یا اپنے سر پیٹ سکتے تھے۔ وسطی پنجاب سے تعلق رکھنے والے تین چار لڑکے ایسے تھے جو اپنے سامان سے چمٹ گئے۔ انہیں رائفلوں کے آہنی کندوں سے مارا جانے لگا۔ سیالکوٹ کے ایک لڑکے سادات نے کچھ زیادہ مزاحمت کی تو آدم نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ جڑ دیا۔ وہ لڑکا بیچارہ برداشت کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ وہ اپنے دو تین ساتھیوں کو بھوک اور نقاہت کے ہاتھوں مرتا دیکھ چکا تھا۔ شاید اسے بھی پانی اور خوراک کے بغیر موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ وہ آدم کی ٹانگوں سے لپٹ گیا، التجائیں کرنے لگا مگر وہ تو پتھر ہو رہا تھا۔ وہ اس کے کندھوں اور سر پر رائفل کا آہنی دستہ مارتا چلا گیا۔

اب لڑکا تکلیف کی شدت سے چلّا رہا تھا اور بددعائیں دے رہا تھا۔ اس کا یہ مزاحمتی انداز دیکھ کر آدم بالکل ہی آگ بگولا ہو گیا۔ پوری وحشت سے لڑکے کے چہرے اور سر پر ضربیں لگانے لگا۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس کا ہاتھ روک سکتا۔ ہاتھ روکنا تو دور کی بات ہے، وہ یہ منظر

دیکھ بھی نہیں رہے تھے کہ کہیں آدم اور اس کے ہرکارے اس طرح دیکھنے پر ہی مشتعل ہو جائیں۔ یاور شیڈ کے ایک آہنی پلر سے ٹیک لگائے نقاہت اور دکھ کے عالم میں یہ سب دیکھ رہا تھا۔ چند ماہ پہلے تک جب وہ لاہور میں تھا تو زور زبردستی اور جبر کے ایسے مناظر کب برداشت کرتا تھا۔ اس کے اندر جیسے ایک آگ بھڑکتی تھی اور وہ ہر خطرے سے بے نیاز ہو جاتا تھا۔ اندرون شہر اس کے نام کی دہشت تھی۔ ہاں یہ وہی یاور تھا..... لیکن ایک قسم کی ناقابلِ شکست زنجیر میں جکڑا ہوا۔

اس سے پہلے کہ آدم اس نیم بے ہوش لڑکے کو مار ہی ڈالتا، وہ تڑپ کر اٹھا اور ان دونوں کے درمیان آنے کی کوشش کی۔ اسے بھی دو تین چوٹیں سہنا پڑیں۔

''پیچھے ہٹ جاؤ۔'' آدم وحشت میں چنگھاڑا۔

یاور نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''پلیز اسٹاپ..... پلیز..... وہ مر جائے گا۔''

''میں بھی مارنا ہی چاہتا ہوں۔'' آدم نے عالمِ غضب میں دانت نکوسے۔ ''تم لوگ..... تم باسٹرڈ لوگ مرنے کے لیے ہی تو آتے ہو یہاں۔ شراب، عورت اور عیاشیاں تمہیں کھینچ کر لاتی ہیں یہاں اور پھر ڈالرز اور یورو بھی تو ملتے ہیں تم بدبختوں کو۔ یہ یورپ جنت ہے تمہارے لیے لیکن بھول جاتے ہو کہ جنت میں جانے کے لیے پُل صراط پر سے گزرنا پڑتا ہے، جو گرنے سے بچتا ہے وہ ہی پہنچتا ہے جنت میں۔''

اس کے لہجے میں طنز کے زہریلے تیر تھے۔

مضروب لڑکے کے خوبصورت بال خون میں بھیگ

pklibrary.com

گئے تھے۔ نیم بیہوشی اور نیم جانی کے عالم میں اس کا کمزور جسم پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ایک دم یاور کو یوں لگا کہ آدم اب آدم نہیں رہا، آدم خور بن گیا ہے۔ وہ نیم جان لڑکے کو شوٹ کر کے اس کی لاش سمندر میں پھنکوا دینا چاہتا ہے۔ کل بھی اس نے ایک ایسے بنگلا دیشی کو جو بظاہر ''کومے'' میں لگتا تھا، اٹھا کر سمندر میں پھنکوا دیا تھا۔

''خدا کے لیے نہیں۔'' یاور نے آدم کی رائفل تھام لی۔

اس کی یہ حرکت آدم کی برداشت سے باہر تھی۔ اس نے یاور کے سینے پر ٹانگ رسید کی اور انگریزی میں اسے ماں کی معروف گالی دی۔

..... ہاں، وہ ماں کی گالی دے رہا تھا اور ماں نے کہا تھا..... ماں کی گالی بھی برداشت کر لینا..... میری خاطر برداشت کر لینا۔

مگر آدم تو جیسے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس پر ننگی گالیوں کی بوچھاڑ کر رہا تھا اور ان میں سے بیشتر گالیاں اس کی ماں کو ہی جاتی تھیں۔ یاور کی آنکھوں کے سامنے ایک سرخ چادر سی تن گئی۔ وہ چلایا۔ ''ماں کو گالی نہ دو..... میری ماں کو گالی نہ دو۔''

وہ باز نہیں آیا۔ گالیاں دیتا چلا گیا اور اسے رائفل سے زوردار ٹھوکے دیتا گیا۔ یکایک وہ جانور یاور کے اندر بیدار ہو گیا جو وحشت میں آدم سے کم نہیں تھا۔ شاید آدم کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بوٹ کے ان ادھ مرے، مسکین، ڈرے سہمے مسافروں میں سے ایک ایسا بھی ہو گا جو بجلی بن کر اس پر ٹوٹ پڑے گا۔

پیچھے ہٹتے ہٹتے وہ یکا یک ہی رکا تھا پھر بوٹ کے نیم جان مسافروں کے منہ کھلے رہ گئے۔ چند سیکنڈ کے اندر اس نے آدم کو دھنک کر رکھ دیا۔ ''گالی نہ دینا..... گالی نہ دینا۔'' وہ پکارتا جا رہا تھا۔

پھر آدم کی رائفل اس کے ہاتھ میں آئی۔ اس نے بڑی مہارت اور پھرتی سے سیفٹی کیچ ہٹایا اور دو گولیاں بے دریغ آدم کے سینے میں اتار دیں۔ وہ آنکھوں میں بے پناہ حیرت لیے پشت کے بل فرش پر گرا۔

اسی دوران میں تیمور جاہ نے بھی ہمت کی اور ایک سوڈانی سے گتھم گتھا ہو کر رائفل چھیننے کی کوشش کرنے لگا..... مگر تیمور جاہ باہمت ہونے کے باوجود لڑائی بھڑائی والا بندہ نہیں تھا۔ آدم کے تین چار سوڈانی ساتھیوں میں سے دو نے اپنی سیمی آٹومیٹک رائفلیں یاور پر تان لیں۔ یاور نے بھی رائفل ان کی طرف سیدھی کر کے انگلی ٹریگر پر رکھ لی۔ اسی اثنا میں بائیں پہلو سے دو مصری بھی اسلحہ تان کر آ گئے۔ یاور نے پہلے تو یہی سمجھا کہ وہ دو طرف سے گھر گیا ہے مگر پھر وہ یہ دیکھ کر چونکا کہ مصریوں نے اپنی ایک رائفل اور ایک پستول کا رخ سوڈانیوں کی طرف کیا ہوا تھا۔

سوڈانیوں کے رنگ ایک دم پھیکے پڑ گئے۔ گٹھے جسم اور چہرے پر زخم کے نشان والا دیوہیکل مصری جیکب اپنی سیون ایم ایم سونت کر دہاڑا۔ اس کی عربی نما زبان سمجھ میں نہیں آئی البتہ صاف پتا چل گیا کہ وہ سوڈانیوں کو اپنی رائفلیں پھینکنے کا کہہ رہا ہے۔ یہ ان لوگوں کا آپس کا تنازعہ تھا اور یاور کے سر اسر حق میں جا رہا تھا۔

آدم کا خون فرش پر دور تک پھیل گیا تھا، وہ مر چکا تھا۔ جس سیالکوٹی لڑکے سادات کو آدم نے مار مار کر بے ہوش کیا تھا، اسے تیمور جاہ طبی امداد پہنچانے میں مصروف ہو گیا۔ مصری عملے نے سوڈانیوں کو غیر مسلح کر کے ان کو ایک کیبن میں لاک کر دیا۔

انہوں نے یاور سے بھی رائفل لے لی۔ یاور اور تیمور وغیرہ سے ان کا رویہ نرم تھا مگر کچھ ایسا دوستانہ بھی نہیں تھا۔ بہرحال یہ لوگ یاور کی غیر متوقع اور دلیرانہ مزاحمت سے متاثر نظر آتے تھے۔

کچھ دیر بعد جیکب نے ٹوٹی پھوٹی انگلش اور اشاروں کی زبان سے یاور اور تیمور کو سمجھایا کہ اب وہ زیادہ دیر یہاں نہیں رکیں گے۔ یہاں رک کر بھوکا پیاسا مرنے کے بجائے ناکابندی سے بچ کر نکلنے کی ایک کوشش کرنا ہو گی۔

اب بات یاور اور تیمور جاہ کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ تیمور جاہ بولا۔ ''مطلب یہ کہ ان لوگوں کے درمیان یہی تنازعہ تھا جو ہمارے حق میں گیا ہے۔ خاص طور پر تمہارے حق میں ورنہ یہ لوگ شوٹ کر دیتے تمہیں۔''

یاور نے کہا۔ ''مجھے پہلے ہی تھوڑا بہت شک تھا کہ ان کی آپس میں کوئی پھوٹ پڑی ہوئی ہے۔''

''اب جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں، اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ اب یہ لوگ یہاں سے حرکت کریں گے۔ اللہ خیر کرے، اب کوئی اس سے بھی بڑی مصیبت نہ پڑ جائے۔ میرا تو راجا کی حالت دیکھ دیکھ کر دل رو رہا ہے۔''

راجا ان سے آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر ہی بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے جبڑے کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی، سر کا زخم گہرا تھا جس سے خون مسلسل رستا جا رہا تھا۔ اس کا ایک بازو بھی کہنی سے بے طرح سوج گیا تھا۔

☆☆☆

رات کو نئے انچارج مصری جیکب سے اجازت لے کر تیمور جاہ، نرملا کے پاس نیچے والے کیبن میں پہنچا تو وہ چھوٹے سے صوفے پر خاموش بیٹھی نظر آئی۔ خوراک اور پانی کی کمی اب اس پر بھی ظاہر ہونا شروع ہوگئی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں ذرا ابھر آئی تھیں، چہرہ بھی زرد تھا لیکن جاذبیت موجود تھی۔ آج دوپہر جو ہنگامہ ہوا اس کے بارے میں اسے سب معلوم ہو چکا تھا۔

تیمور جاہ نے اس کا کومل ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''تم چپ بیٹھی ہو، آج تو تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ ایڈم (آدم) سے ہماری جان چھوٹی۔ اب مصری جیکب انچارج ہے اور وہ کشتی کو حرکت دینے کا بھی سوچ رہا ہے۔''

''تیمور! ہمارے لیے یہ سب ایک جیسے ہیں۔ ان کے آنے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرق کیول یہ ہے کہ ان کی اپنی اپنی کمینگیاں ہیں۔''

''جیکب کی کیا کمینگی ہے؟''

''مجھے لگتا ہے کہ یہ بھی میرے لیے اپنے ڈھنگ سے برا ثابت ہوگا۔ منوہر پرکاش مجھے پوری رکھشا کے ساتھ میلانو کے لارڈ اسمتھ کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔ بے شک لارڈ بھی عیاش ہے مگر میں جب تک اس کے پاس رہتی، محفوظ رہتی۔ جب چند ماہ یا برس ڈیڑھ برس بعد ایسے لارڈ اپنی کیپ (رکھیل) کو فارغ کرتے ہیں تو تحفوں سے لاد دیتے ہیں۔ یہ دھن ان کے پورے جیون کے لیے کافی ہوتا ہے..... مگر اب مجھے لگتا ہے کہ یہ جیکب خود کو اس ایگریمنٹ کا پابند نہیں سمجھتا جو لالہ منوہر پرکاش اور اس لارڈ اسمتھ کے درمیان ہوا تھا۔''

''اس کا کیا مطلب ہے؟'' تیمور نے پوچھا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ اگر قسمت نے زور مارا اور ہم اٹلی پہنچ گئے تو یہ جیکب مجھے کسی بازار میں بیچ ڈالے گا۔ ایسے بازاروں میں بدیشی لڑکیوں کے ساتھ جو کچھ ہوجاتا ہے، سارا جگ جانتا ہے۔''

''تو تم چاہتی ہو کہ تم اسی لارڈ اسمتھ کے پاس پہنچو جس کے بارے میں تمہیں پورا اطمینان ہے؟''

اس نے بڑی عجیب نظروں سے تیمور جاہ کی طرف دیکھا۔ ''طنز کر رہے ہو نا۔ تمہیں پتا ہے اب میں کہیں بھی جانا نہیں چاہتی۔ بس ایک ایسے شخص کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں جس کے ساتھ پتا نہیں کب، کیوں اور کیسے میرا من جڑ گیا ہے۔'' اس نے معنی خیز لہجے میں کہا اور دلفریب بے باکی سے اپنے ہونٹ تیمور کے کندھے پر رکھ دیے۔

نرملا کی اس طرح کی پیش قدمی تیمور کے رگ و پے میں عجب سا گداز جگا دیتی تھی۔ کچھ بے نام سے شگوفے اس کے بدن میں کھل جاتے تھے۔

وہ اس کے کومل ہاتھ کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''آہستہ بولو، اس طرح کی بات اگر یہاں کے نئے کرتا دھرتا جیکب کے کانوں میں پڑ گئی تو اور بھی خطرناک ہوجائے گا۔''

''تو تم اس کو بھی مار دینا۔'' نرملا نے اسے نیم باز آنکھوں سے دیکھتے ہوئے عجیب لہجے میں کہا۔

تیمور بری طرح چونک کر رہ گیا۔ ابھی تک اس نے یاور سمیت کسی فرد کو یہ بات نہیں بتائی تھی کہ اس بوٹ کا ناپسندیدہ ترین شخص جوزف بوٹ سے گرا نہیں تھا بلکہ اسے گرایا گیا تھا اور گرانے والا وہ خود تھا۔ نرملا کے تحفظ کے لیے ہی اس نے یہ انتہائی قدم اٹھایا تھا۔ وہ فی الحال نرملا کو بھی یہ بات بتانا نہیں چاہتا تھا لہٰذا اس کا معنی خیز فقرہ سن کر حیران رہ گیا۔

نرملا نے ایک بار پھر اس کے شانے کو چوما اور شانے پر ہی سر رکھتے ہوئے بولی۔ ''حیران ہو رہے ہو نا؟ میں بھی اس رات بہت حیران ہوئی تھی۔ بوٹ کے ہچکولوں اور اس راکھشس کے خوف کے سبب مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کیبن کا دروازہ کھول کر میں سیڑھیوں کے نچلے سرے تک آئی تو مجھے وہاں اوپر وہ سانڈر ریلنگ کے ساتھ کھڑا نظر آیا۔ وہ پی بھی رہا تھا۔ مجھے ہر گھڑی یہی لگ رہا تھا کہ ابھی وہ دندناتا ہوا میرے کیبن کی طرف چلا آئے گا۔ کچھ دیر بعد اچانک مجھے ایک سایہ نظر آیا جو عقب سے جوزف پر جھپٹا تھا اور اسے سمندر میں گرا دیا تھا۔ وہ سایہ مڑا تو سیڑھیوں کی مدھم روشنی میں ایک سیکنڈ کے لیے اس کے سندر چہرے پر نظر پڑی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔'' نرملا نے اپنی گردن لمبی کر کے ایک بار پھر تیمور جاہ کو چوما لیکن اس مرتبہ اس نے تیمور کے شانے کو نہیں، رخسار کو چوما تھا۔

☆☆☆

بری بوٹ کے مسافر اب یاور کو پہچاننے لگے تھے۔ آدم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا اور پھر بڑی دلیری کے ساتھ اس سے ٹکر لینا سب کے لیے ناقابلِ فراموش تھا۔ آدم کے سوڈانی ساتھی بدستور ایک کمرے میں لاک تھے۔ نئے انچارج جیکب اور اس کے چاروں ساتھیوں کا رویہ یاور سے خاصا نرم تھا۔

دوپہر کو جیکب نے یاور اور تیمور جاہ کو نیچے بلایا اور اپنے ساتھ کھانے میں شریک کیا۔ بوٹ میں خوراک اور پانی کی بدترین قلت تھی البتہ یہاں نیچے ان لوگوں کے پاس

پیٹ پوجا کا سامان موجود تھا بلکہ پینے پلانے کا تھوڑا بہت اسٹاک بھی تھا۔ جیکب نے یاور اور تیمور کو بھی رم پینے کی دعوت دی مگر دونوں نے ہی شکریے کے ساتھ انکار کیا بلکہ شدید بھوک کے باوجود یاور سے زیادہ کھایا بھی نہیں گیا۔ اس کی نگاہوں میں ہر دم عرشے کا منظر تھا جہاں قریباً سبھی مسافر بھوک پیاس کے ہاتھوں نیم جان ہو چکے تھے۔

''ہم کب تک یہاں سے نکلیں گے؟'' یاور نے جیکب سے پوچھا۔

اس نے ٹوٹی پھوٹی انگلش اور اشاروں کی زبان سے بتایا کہ اب زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ سمندر پُرسکون رہا تو آدھی رات کے بعد وہ کسی بھی وقت بوٹ کو حرکت میں لے آئیں گے۔

کھانے کے بعد وہ لوگ اوپر آ گئے۔ ہلکی ہوا چل رہی تھی جو اچھے موسم کی نشانی تھی۔ یاور اور تیمور تھوڑا تھوڑا کھانا بچا کر لے آئے تھے۔ یہ بیف کے قیمے کا ایک ٹن پیک اور تھوڑے سے ٹن پیک چاول ہی تھے۔ یاور نے راجے کو بمشکل چند نوالے کھلائے۔ ٹوٹے ہوئے جبڑے کے سبب اس کے لیے نگلنا بہت دشوار ہو رہا تھا۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اس بدقسمت کشتی کا یہ اٹھارہ انیس سالہ مسافر کسی معجزے کے سبب ہی بچ پائے گا۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں وہ کسی وقت بڑبڑانے لگتا۔ ''ماں جی..... ماں جی..... بڑی بھوک لگی ہے..... آپا کہاں ہے ماں جی؟''

کسی وقت وہ اپنی منگیتر کا نام لیتا اور اس سے وعدہ کرتا کہ وہ اسے بھولا بالکل نہیں۔ ایک دو دن میں اسے فون کرے گا۔

بوٹ میں اب ہر کسی کو رات کا انتظار تھا۔ جیکب کی بات قریباً ہر ایک کی سمجھ میں آئی تھی۔ یہاں رک کر بھوکا پیاسا مرنے کے بجائے منزل تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اب تک بوٹ کے قریباً آٹھ مسافر ہیضے اور دیگر امراض کا شکار ہو کر سمندر کی نذر ہو چکے تھے۔ ان میں مہربان چہرے اور بہت دھیمے لہجے والا بنگالی استاد مستقیم بھی تھا۔ مستقیم صاحب کی عینک، گھڑی، بٹوا اور ایسی ہی کچھ دیگر اشیا یاور نے اپنے پاس سنبھال رکھی تھیں۔ اس کے دل میں خیال تھا کہ اگر وہ زندہ بچ گیا تو کسی نہ کسی وقت ضرور اس ماں اور ان چار بچیوں سے ملے گا جنہوں نے اپنے باپ کو بوسے دے کر ایک اچھے مستقبل کے لیے خود سے جدا کیا تھا، ایک طویل سفر پر روانہ کیا تھا۔ بوٹ سے نکل کر سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جانے والے کم از کم تین افراد قتل ہوئے تھے۔ مٹوہر پرکاش جو نرملا کوشل کو سہارا دے کر لا رہا تھا، سانڈ نما جوزف جس پر جنس کا شدید غلبہ تھا اور آخر میں ایڈم عرف آدم۔ جوزف کو دھکا دے کر سمندر میں گرانے والا بھید اب تیمور، یاور کو بتا چکا تھا۔

بوٹ میں کم و بیش دس افراد ایسے موجود تھے جو شدید بیمار تھے اور اگلے ایک دو دن میں کسی بھی وقت داعیِ اجل کو لبیک کہہ سکتے تھے۔ ان میں مضروب راجا بھی شامل تھا۔ کئی بیمار ایسے تھے جو اب نیچے واش رومز تک بھی نہ جا سکتے تھے لہٰذا بوٹ میں تعفن پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ آہ..... غربت کی خوش گمانیاں..... کہاں پردیس کے سنہری سپنے اور کہاں موت کا یہ دردناک گھیرا۔

سہ پہر کے وقت لکڑی کے تختے پر لیٹے لیٹے یاور کا دماغ ابلنے لگا۔ اس کا جی چاہا ٹریول ایجنٹ مجید رانا اس کے سامنے ہو، وہ اس پر کسی تیز دھار آلے سے اتنے وار کرے کہ ٹکڑے کر ڈالے۔ ایسے لوگوں کے لالچ نے اپنی عیاری اور چرب زبانی کے وسیلے سے راجا اور سادات جیسے نہ جانے کتنے نوجوانوں کو موت کی لہروں پر سوار کیا تھا۔

پھر تختے پر لیٹے لیٹے اسے اونگھ سی آنے لگی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے دلکش اریجہ کا ملیح چہرہ آیا۔ اسے لگا کہ وہ اس سمندر سے ہزاروں میل دور لاہور کے جناح باغ میں ہے جہاں بہار کی نیم گرم ہوا انگڑائیاں لیتی ہیں اور رنگ برنگے پھول خوشبوئیں بکھیرتے ہیں۔

اریجہ کی کہی ہوئی بات کی بازگشت یاور کے کانوں میں سرسرائی۔ ''یاور! جب پیار ہو گیا تو پھر ہو گیا اور یہ تو ہوتا ہی اس جگہ ہے جہاں مشکلیں زیادہ ہوں۔''

''ان مشکلوں سے گزر سکو گی؟'' یاور نے پوچھا تھا اور اس کے نم رخسار کو بوسہ دیا تھا۔

وہ عزم سے بولی تھی۔ ''تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہا تو ہر مشکل سے گزر جاؤں گی اور نہ گزر سکی تو ایسی دردناک زندگی کو بھی فل اسٹاپ لگا دوں گی۔''

یاور کو محسوس ہوا جیسے وہ اپنی لمبی نازک انگلیوں کو اس کے بالوں میں حرکت دے رہی ہے۔ وہ اپنے سر کے نیچے اس کے زانو کی نرمی محسوس کرنے لگا پھر کچھ دیر کے لیے نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

شاید یہ مسافروں کی دلی آرزو تھی کہ موسم ٹھیک رہے..... اور ہلکی ہوا کے باوجود وہ ٹھیک ہی رہا۔ آخر رات ایک بجے کے لگ بھگ بوٹ کے انجن اسٹارٹ ہوئے اور

وہ حرکت میں آ ہی گئی۔ سب کے دل انجانے خدشوں اور بے نام امیدوں کی شدت سے بے طرح دھڑک رہے تھے۔ جیکب کا یہی کہنا تھا کہ وہ ان راستوں کا شناور ہے اور ناکا بندی کرنے والوں سے بچ بچا کر آگے بڑھنے کی پوری کوشش کرے گا۔ بوٹ کے بیشتر مسافروں کو اس وقت جیکب اس شکستہ کشتی کا مہربان ناخدا محسوس ہو رہا تھا..... لیکن وہ ناخدا نہیں تھا، وہ انہیں بدترین دھوکا دے رہا تھا۔

کشتی کے رخ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شمال کے بجائے شمال مشرق کے رخ پر جا رہی ہے۔ اسی بات کا ذکر جب یاور نے تیمور جاہ سے کیا تو وہ بولا۔ ''اور یارا! اس کی رفتار بھی وہ نہیں جو دوپہر کو جیکب بتا رہا تھا۔''

''نیچے جا کر پوچھوں اس سے؟''

''نہیں، ابھی کچھ دیر دیکھ لینا چاہیے۔'' تیمور نے کہا۔

لیکن انہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایکا ایکی انہیں وہ نظارہ نظر آیا جس کے لیے ان کی نگاہیں قریباً پندرہ دنوں سے ترس رہی تھیں۔ نیم تاریکی میں انہیں ساحل کے آثار نظر آئے لیکن یہ کون سا ساحل تھا؟ اتنی جلدی منزل پر پہنچنے کا تو کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

یکا یک بوٹ کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگنا شروع ہوئے اور اس کی رفتار مزید کم ہو گئی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' یاور نے کہا۔

قریب بیٹھا ایک انڈین مسافر بولا۔ ''لگتا ہے یہاں پانی زیادہ گہرا نہیں..... یا پھر نیچے سطح اونچی نیچی ہے۔ ناؤ کا پیندا نیچے لگ رہا ہے۔''

ابھی اس کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ بھاری قدموں کی چاپیں سنائی دیں اور انہوں نے جیکب کی صورت دیکھی۔ اس کے پیچھے اس کے ساتھی تھے اور ان میں سے دو کے کندھوں پر رائفلیں جھول رہی تھیں۔

جیکب کے تاثرات دیکھ کر یاور کچھ چونکا۔ ''یہ ہم کہاں آئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''سمجھو کہ منزل پر پہنچ گئے ہیں۔'' ٹوٹی پھوٹی انگلش میں جواب ملا۔ ''اب بوٹ سے اترنا ہوگا۔''

''یہ کیا بات کر رہے ہو جیکب؟'' یاور نے کہا۔ ''ہم یہاں سمندر میں اتریں گے؟''

''بوٹ آگے جائے گی تو ریت میں پھنس جائے گی۔ یہیں پر اترنا ہوگا۔''

''لیکن یہ جگہ کون سی ہے؟'' اس مرتبہ تیمور جاہ نے قریباً چلا کر پوچھا۔

''کہا ہے نا پہنچ گئے ہیں۔ یہیں پر اترنا ہوگا۔'' اس مرتبہ جیکب کا لہجہ اٹل تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کے سانولے چہرے پر ہلال نما زخم نمایاں نظر آتا تھا۔ کسی خنجر کا یہ پرانا زخم آج معمول سے زیادہ کریہہ محسوس ہوتا تھا۔

یکا یک یاور کو اندازہ ہو گیا کہ ایک بار پھر ان سارے بے یار و مددگار مسافروں کے ساتھ دھوکا کیا جا رہا ہے۔

''یار! یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ؟'' اس نے تیمور جاہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

تیمور ہولے سے بولا۔ ''لگتا ہے ان کے ہوش ٹھکانے پر نہیں۔ مسافروں کا جو حال ہے، وہ یہاں پانی میں اتر سکتے ہیں بھلا؟ پندرہ بیس تو چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں۔''

''لیکن ہم کیوں اتریں یہاں؟'' یاور تپ کر بولا۔

''پہلے ہمیں بتائیں نا کون سی جگہ ہے۔''

یاور کے گلے کی رگیں پھولتی جا رہی تھیں۔ ماں سے جو وعدہ کیا تھا، وہ تو ماں ہی کی خاطر کل توڑنا پڑ گیا تھا اسے، اب اسے اپنے سامنے کوئی خاص رکاوٹ نظر نہیں آ رہی تھی۔ آج بحر اوقیانوس کی اس نیم تاریک رات میں اس نیم تاریک کشتی پر ان نیم جان مسافروں کے درمیان اندرونِ لاہور کا وہی یاور کھڑا تھا جس نے راشی اور ''سکندر موبائیلاں والا'' جیسے غنڈوں کی ناک میں نکیل ڈال دی تھی۔ جو وقت پڑنے پر سرتاپا آتش ہو جاتا تھا۔ اس کے پہلو میں کھڑے تیمور جاہ نے کہا

''ویسے یاور.....! کل تمہیں آدم سے چھینی ہوئی رائفل اپنے پاس ہی رکھ لینی چاہیے تھی۔''

''اب بھی کوئی بات نہیں۔'' وہ پھنکارا۔

پھر وہ دہشت زدہ مسافروں کے درمیان سے راستہ بناتا جیکب کے قریب پہنچ گیا۔ مسافروں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''کیا ان مرے ہوؤں کو اب تم ڈبو کر مارنا چاہتے ہو؟''

''پانی زیادہ گہرا نہیں ہے۔ جو بیمار ہیں، ہم انہیں لائف جیکٹ بھی دے دیں گے لیکن شرط یہی ہے کہ جلدی کرو، ہمارے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔'' جیکب نے بہت کھردرے لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں تیمور جاہ نے لوہے کی ایک نالی پانی میں ڈبوئی جو چھ سات فٹ کے قریب پانی کے اندر چلی گئی۔ یہ دیکھ کر جیکب اپنی شکستہ انگلش میں گرجا۔

''زیادہ ہوشیار مت بنو۔ آگے پانی زیادہ گہرا نہیں۔ میں کہہ رہا ہوں تم لوگ پیدل چل کر چلے جاؤ گے۔'' اس

کے ساتھ ہی اس نے پیچھے کھڑے اپنے ایک ساتھی سے رائفل پکڑ لی۔

دفعتاً یاور پھٹ پڑا۔ ''تم انسان ہو یا جانور..... کیوں دھکیل رہے ہو ہم سب کو سمندر میں..... اور اس سے پہلے ہمیں یہ بتاؤ یہ جگہ کون سی ہے، کس ویرانے میں لا کھڑا کیا ہے ہمیں؟''

جیکب کا ایک اور ساتھی نکل آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لوڈڈ کلاشنکوف تھی۔ اس لیے تڑنگے نے اپنے ساتھی سے مل کر مسافروں کو پانی میں دھکیلنا شروع کر دیا۔ تین چار بندے گرے۔ دوبری طرح غوطے کھانے لگے۔ یہی وقت تھا جب بجلی سی کوندی اور یاور مکروہ چہرے والے جیکب پر جا پڑا۔ دونوں اوپر تلے گرے۔ یاور نے اپنا بایاں ہاتھ جیکب کی رائفل پر ڈالا۔ وہ رائفل چھیننے میں کامیاب رہا۔ اس کا ارادہ تھا کہ رائفل کا بیرل جیکب کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر اسے عقب سے دبوچ لے اور اس کے ساتھیوں کو اسلحہ پھینکنے کا کہے مگر زور آور جیکب مچھلی کی طرح تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گیا۔ اس کے ایک ساتھی نے یاور پر سیدھا فائر کیا جو اس کے سر کو چھوتا ہوا گزرا۔

یاور نے ایک دن پہلے تک کسی کی جان نہیں لی تھی مگر کل آدم کے سینے میں دو گولیاں اتارنے کے بعد یہ حد پار ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے دفاع میں گولی چلائی جو فائر کرنے والے کے چہرے پر لگی اور وہ مردہ چھپکلی کی طرح سیڑھیوں کے قریب گرا۔ کشتی میں بھگدڑ سی مچی۔ بیشتر مسافر چلانے اور آہ و بکا کرنے لگے۔ یاور جست لگاتا ہوا اس کمرے کی اوٹ میں ہو گیا جہاں سوڈانی لاک کیے گئے تھے۔

یاور ہر خطرے سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ اس پر فائر ہوئے تو اس نے بھی جوابی فائر کیے۔ ایک اور مصری جو گلے میں چمکدار سی صلیب آویزاں رکھتا تھا، عین سر میں گولی کھا کر اسی تاریک پانی میں گرا جہاں پہلے سے دو تین مسافر جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔

اس فائر کے جواب میں یاور پر کلاشنکوف کا برسٹ چلا۔ کڑاکے دار آواز کے ساتھ شعلے لپکے اور تب وہ کچھ ہوا جو کسی کے گمان میں نہیں تھا۔ طیش اور حماقت میں چلائے گئے اس برسٹ کی کوئی گولی انجن روم کے ساتھ رکھے ڈیزل کے ڈرموں میں جا لگی۔ ممکن ہے کہ یہ ایک سے زیادہ گولیاں ہوں۔ قریب ہی گیس کے دو تین سلنڈر بھی رکھے ہوئے تھے۔

پہلے ایک دم آگ کے شعلے بلند ہوئے پھر ایک چھوٹے دھماکے کے بعد ایسا زوردار دھماکا ہوا کہ کشتی کے کئی تختے ہوا میں اڑتے نظر آئے اور کشتی کا تین چوتھائی حصہ آناً فاناً شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ یہ بڑا ہولناک منظر تھا۔ پلک جھپکتے میں کئی مسافروں کے کپڑوں میں آگ لگ گئی اور وہ جو پہلے کشتی چھوڑنے کو تیار نہیں تھے، آگ میں جھلسے تو اس پانی میں کود گئے جو موت کے عفریت کی طرح منہ پھاڑے کھڑا تھا۔

سیڑھیوں کے پاس وہ جگہ جہاں جیکب اور اس کے ساتھیوں نے یاور کے خلاف گھات لگائی تھی، اس بری طرح آگ کی لپیٹ میں آئی کہ ان میں سے کوئی ایک بھی باہر نہ نکل سکا۔ کشتی میں قیامت کا سماں تھا۔ دھوئیں نے تاریکی کو مزید گہرا کر دیا۔

''تیمور! کہاں ہو؟'' یاور پکارا۔

کہیں پاس سے ہی تیمور کی آواز آئی۔ ''یاور.....! یہاں آ جاؤ، راجے کے پاس۔''

یاور نے اندھوں کی طرح گرتے پڑتے چار پانچ قدم طے کیے۔ راجے کی پنڈلیوں کو آگ نے اذیت ناک بوسہ دیا تھا۔ یاور اور تیمور جاہ اسے گھسیٹتے ہوئے بوٹ کے اس مختصر سے حصے میں لے آئے جو ابھی تک شعلوں سے محفوظ تھا۔

کچھ انڈین مسافروں نے لائف جیکٹس تک رسائی حاصل کر لی تھی مگر جیکٹس پہننے کی مہلت بھی نہیں تھی۔ کچھ نے جیکٹس ہاتھوں میں لے کر ہی پانی میں چھلانگ لگا دی۔

''تیمور..... تیمور!'' یاور نے وحشت کے عالم میں آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ دھوئیں کے مرغولے تھے اور شورِ محشر تھا۔ اچانک یاور سمجھ گیا کہ وہ کہاں گیا ہے۔

☆☆☆

انڈین مسافروں کے پاس لائف جیکٹس دیکھ کر تیمور جاہ نے ایک جیکٹ پکڑی اور سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ اس کی شرٹ کی ایک آستین جل چکی تھی۔ دھوئیں کے سبب سانس سینے میں نہیں سما رہی تھی مگر وہ بوٹ کے زیریں حصے کی طرف لپکتا چلا گیا۔ چند زینے طے کرتے ہی اسے نرملا کی دبی دبی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ تیمور جاہ کو دیکھتے ہی وہ اس کی طرف لپکی اور چمٹ گئی۔ تیمور جاہ نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹایا اور حتی الامکان تیزی سے اورنج کلر کی جیکٹ اسے پہنا دی۔ اسے اپنے دائیں بازو کے کلاوے میں لے کر وہ بڑی عجلت کے

pklibrary.com

ساتھ اوپر آیا اور ایک لاش کو پھلانگتا ہوا دھڑادھڑ جلتے عرشے پر آ گیا۔

"یہ کیا ہوا ہے تیمور؟ کیا ہو گیا ہے؟" نرملا مسلسل بلند آواز میں پوچھ رہی تھی۔

تب تیمور کو اپنے سامنے چند فٹ کے فاصلے پر یاور نظر آیا۔ اس نے شدید زخمی اکرم عرف راجا کو اپنے دائیں کندھے پر لاد رکھا تھا۔ ایک چوکور "بیک پیک" اس کی پشت پر تھا۔

"جلدی چھلانگ لگانا ہوگی تیمور..... ابوٹ پر کسی بھی وقت اور دھماکا ہو سکتا ہے۔" یاور نے بلند آواز میں کہا۔

بائیں طرف ایک آہنی دروازہ دیوانہ وار پیٹا جا رہا تھا اور کربناک آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"یہ کیا ہے؟" تیمور جاہ نے دھوئیں میں سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا۔

یاور نے بری طرح کھانستے ہوئے جواب دیا۔ "یہ وہی چار سو ڈانی ہیں جنہیں جیکب نے بند کیا تھا۔ اب ان کا..... کچھ نہیں ہو سکتا..... دروازہ آگ کی طرح گرم ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے مگر چابی کے بغیر یہ نہیں کھلے گا۔"

تیمور جاہ کا دماغ سنسنا اٹھا۔ یہ بڑی دہشت انگیز اور ہولناک آوازیں تھیں جیسے کچھ بدروحیں آگ کا عذاب جھیل رہی ہوں۔ کشتی کا آخری محفوظ گوشہ بھی اب لپکتے نارنجی شعلوں کی لپیٹ میں آنے والا تھا۔ تیمور نے نرملا کو اپنے بازو کے مضبوط حصار میں لیا اور پانی میں چھلانگ لگا دی۔ اس کے عقب میں یاور بھی دیوانہ وار کود گیا۔ راجا اس کے کندھے پر تھا۔

پانی پر آگ کے شعلوں کا نیم سرخ، نارنجی عکس تھا۔ اس روشنی میں کشتی کے اردگرد موت رقصاں تھی۔ کچھ ڈوب چکے تھے، کچھ ڈوبنے والے تھے، باقی ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ اپنے وطن سے ہزاروں میل دور اپنے پیاروں سے بے شمار فاصلے پر اس رات آگ اور پانی کے عفریتوں کے درمیان یہ تھی زندگی اور یہ تھا عالم مرگ۔

تیمور جاہ کا بازو نرملا کی کمر میں تھا۔ وہ دائیں ہاتھ سے تیر رہا تھا اور وہ بہت اچھا تیراک تھا۔ کالج کے زمانے میں اس نے تیراکی کے مقابلوں میں بھی حصہ لیا تھا۔ باپ بہت پیار کرتا تھا اس سے۔ اس کی کوئی خواہش بھی نہیں ٹالتا تھا..... لیکن پھر سب کچھ چھوٹ گیا۔ باپ کی بے پناہ محبت چھوٹ گئی، اس کے لاڈ پیار چھوٹ گئے، خود باپ چھوٹا، اس کا گھر چھوٹا..... اب تو کچھ نہیں تھا تیمور کے پاس۔ بس ایک انتقام تھا۔ یہ انتقام اسے پتا نہیں کہاں کہاں اڑائے لیے پھرا تھا..... اور آج رات وہ بحر اوقیانوس کے اس نامعلوم ساحل پر تھا۔ ایک ہاتھ سے تیر رہا تھا اور اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک لڑکی تھی جو اپنی ہی کسی کہانی کی لہروں میں بہتی بہتی اس کے پہلو میں آ گئی تھی۔

بے پناہ شور میں وہ چلا کر بولی۔ "مجھے تیرنا نہیں آتا تیمور! میں مر جاؤں گی۔"

"لیکن مجھے بہت اچھا تیرنا آتا ہے۔ میں تمہیں ڈوبنے نہیں دوں گا۔" اس نے ہانپتی سانسوں کے ساتھ کہا۔

عقب میں بوٹ کے اندر ایک اور دھماکا ہوا۔ کئی جلتے ہوئے تختے پانی کے اندر گرے۔ ایسے ہی ایک جلتے تختے کی روشنی میں تیمور نے دیکھا کہ شدید زخمی راجا بدستور یاور کے کندھے پر ہے۔ پانی یاور کے سینے سے اوپر تک آ رہا تھا اور وہ بڑی احتیاط سے پاؤں جما جما کر رکھتا کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اردگرد دیکھنے کا ہوش کسی کو نہیں تھا اور شاید ہمت بھی نہیں تھی۔ وہ لمبا فاصلہ نہیں تھا لیکن اس کی مسافت جیسے صدیوں پر محیط تھی۔ بالآخر وہ کنارے کی ریتیلی زمین پر پہنچے۔ پہلے تیمور ہی پہنچا تھا۔ لائف جیکٹ کے باوجود نرملا کو کئی غوطے آئے تھے۔ وہ تیمور کے بازو سے نکلی تو بے دم سی ہو کر اوندھے منہ ریت پر گر پڑی۔

یاور بھی راجے کو پشت کے بل ریت پر لٹا چکا تھا۔ دونوں پھر پانی کی طرف بڑھے۔ ڈبکیاں کھاتے دو مسافروں کو تیمور کنارے پر لانے میں کامیاب ہوا۔ یاور نے ایک کو بچایا۔ یہ وہی لڑکا سادات تھا جس نے اپنا راشن بچانے کی پاداش میں دو دن پہلے جیکب سے بری طرح مار کھائی تھی۔ وہ شاید اسے مار ہی ڈالتا اگر یاور درمیان میں نہ آ جاتا۔ اب بھی وہ بیچارہ زخم زخم تھا۔

سادات کو ریت پر لٹانے کے بعد یاور اور تیمور، راجے کی طرف بڑھے۔ آگ نے اس کی پنڈلیوں کو بھی نقصان پہنچایا تھا۔ ریت پر چت لیٹا تھا۔ اس لق و دق ویرانے میں اسے طبی امداد کی ضرورت تھی مگر پھر ایک دم تیمور کو اندازہ ہوا کہ اسے طبی امداد کی ضرورت نہیں۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر اس طرح کھلی تھیں کہ اب بند نہیں ہو سکتی تھیں۔ وہ مر چکا تھا۔

یاور نے زور زور سے اس کا کندھا ہلایا۔

"راجے..... راجے!"

راجے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بس اپنی کھلی

آنکھوں کے ساتھ تاریک آسمان کو تکتا رہا جیسے نجم شماری کر رہا ہو۔

تیمور نے یاور کا کندھا تھام لیا۔ ''نہیں یاور! یہ اب نہیں بولے گا۔ بہت تھکا ہوا تھا..... سو گیا ہے۔'' وہ خود بھی سسک اٹھا۔

یاور نے اس جواں مرگ کا بالائی دھڑ ریت سے اٹھایا، اسے بیٹھنے والی پوزیشن میں کیا اور گلے سے لگا لیا۔ وہ اس کا دور کا کزن تھا لیکن جو لوگ اکٹھے کسی ہولناک سفر کی صعوبتیں جھیلتے ہیں وہ ''دور کے'' کہاں رہتے ہیں۔ یاور سسکیوں سے رونے لگا۔

اور یہاں کس کس کو رویا جاتا، کس کس کی نوحہ خوانی کی جاتی۔ نوعمر راجا کی طرح اور بھی کئی تھے جو ڈوبے نہیں تھے مگر گاڑھے دھوئیں نے اور آگ نے انہیں زندہ نہیں رہنے دیا تھا۔

☆☆☆

اس ریتیلی زمین پر اس بے مہر تاریکی میں یہ بڑے کرب کی رات تھی۔ کشتی میں اتنی سرعت سے اتنی ہولناک آگ لگی تھی کہ بیشتر افراد اندر ہی جھلس کر ختم ہو گئے تھے۔ کچھ ڈوبنے سے مر گئے تھے..... کنارے تک فقط نو افراد پہنچے تھے۔ ان میں یاور، تیمور، نرملا، راجا اور سادات تھے۔ باقی چار میں سے دو افراد کا تعلق سینیگال اور دو کا مالی سے تھا۔

راجا کنارے تک پہنچا تو تھا مگر لگتا یہی تھا کہ وہ راستے میں ہی دم توڑ گیا تھا۔ یاور اور تیمور نے دیگر افراد کے ساتھ مل کر اس کے لیے جگہ کھودی تھی اور اسے زمین کے حوالے کرنے سے پہلے اس کی زخمی پیشانی پر کئی بوسے دیے تھے۔ ماں کو بیہوشی کی حالت میں پکارنے والا اب بالکل چپ تھا تاہم اس کی آواز گونجتی محسوس ہوتی تھی۔

''ماں جی..... ماں جی! بڑی بھوک لگی ہے..... آپا کہاں ہے ماں جی؟''

..... اور پھر اس کی منگیتر جسے وہ کہتا تھا کہ بہت جلد اسے فون کرے گا..... یاور سوچنے لگا، پتا نہیں کہ آج رات بھی وہ اپنے گاؤں میں موبائل فون سرہانے رکھے لیٹی ہو کہ شاید راجے کا فون آجائے..... تب یاور کو اپنی اریجہ کا خیال آ گیا۔ کیا پتا وہ بھی ایسے ہی اس کے فون کی منتظر ہو۔

تیمور جاہ کی آواز نے یاور کو خیالوں سے چونکایا۔

''یاور! ہم زیادہ دیر یہاں رک نہیں سکتے۔ اندھیرا چھٹنے سے پہلے ہمیں نکل جانا ہوگا۔ سینیگال والے لڑکوں کا بھی یہی خیال ہے۔''

''جائیں گے کہاں؟'' یاور نے پژمردہ لہجے میں پوچھا۔

''کہیں بھی، مگر کشتی کے ملبے کے قریب رہنا کسی صورت بھی ٹھیک نہیں۔''

اندھیرے میں اجالے کی آمیزش ہونا شروع ہو گئی تھی۔ سمندر کی سطح پر جلی ہوئی بوٹ کا کچھ حصہ اب بھی پانی سے باہر نظر آتا تھا۔ کچھ لاشوں کے آثار بھی دکھائی دیتے تھے۔ دو بدنصیب مسافروں کے ریگزین کے بیگ بھی تیرتے ہوئے کنارے پر آ لگے تھے۔ یہ اب یاور کی تحویل میں تھے۔ کچھ دیگر اشیاء بھی کشتی کے قریب تیرتی نظر آتی تھیں مگر ان کی شناخت مشکل تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ کنارے سے دور جانے کے لیے تیار تھے۔ نرملا نے ابھی تک لائف جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے لمبے بال بھیگ کر چہرے اور گردن سے چپک گئے تھے۔ وہ سکتہ زدہ سی تھی۔ تیمور اور یاور کے لیے سب سے اہم مسئلہ زخمی سادات کا تھا۔ اس کے سر کی چوٹ بہت شدید تھی۔ اب تک گاہے بگاہے اس میں سے خون رسنے لگتا تھا۔ اسے تیز بخار بھی ہو چکا تھا۔

''یہ کیسے چل سکے گا؟'' تیمور نے افسردگی سے کہا۔

''اس کے گھٹنے پر بھی سخت چوٹ ہے۔ مجھے تو لگتا ہے شاید فریکچر بھی ہے۔''

''کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔'' یاور بولا۔

''تم چل سکو گے سادات؟'' یاور نے ریت پر چت لیٹے سادات سے پوچھا۔

وہ نوجوان تھا، زندگی پیاری تھی اسے۔ ابھی اس نے دیکھا ہی کیا تھا۔ تکلیف میں ہونے کے باوجود اس نے زور زور سے اثبات میں سر ہلایا۔

تیمور جاہ نے پانی پر تیر کر آنے والی ایک بڑی شال سے دو پٹیاں پھاڑیں اور انہیں اچھی طرح سادات کے مضروب گھٹنے کے گرد لپیٹ دیا۔ سینیگال کے ایک لڑکے کے پاس ایک لٹھ نما لکڑی تھی۔ اسے بیساکھی کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مضروب سادات کو ایک طرف سے یاور نے سہارا دیا، دوسری طرف اس نے لاٹھی کی مدد لی اور زندگی کی چاہ نے اس کے اندر اتنی ہمت پیدا کر دی کہ وہ چلنے کے قابل ہو گیا۔

یاور نے نمناک آنکھوں سے بحر اوقیانوس کے کنارے اس اجنبی جگہ کو دیکھا جہاں وہ ریت کے نیچے راجا کو چھوڑ کر جا رہے تھے۔

''ماں جی.....! بڑی بھوک لگی ہے۔'' اس کے الفاظ یاور کو اپنے کانوں میں گونجتے محسوس ہوئے۔ تیمور جاہ نے

یاور کے رخساروں پر رینگتے آنسوؤں کو دیکھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"اب چلنا ہوگا یار!" اس نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

ابھی سورج دیوتا نے اپنا چہرہ نہیں دکھایا تھا اس لیے ریت قدرے ٹھنڈی تھی۔ بھیگے کپڑوں کی وجہ سے وہ سب خنکی سی محسوس کر رہے تھے۔ ابھی وہ کنارے سے بمشکل پچاس ساٹھ قدم دور ہی گئے ہوں گے کہ اچانک سمندر کی جانب سے کافی فاصلے پر روشنی سی دکھائی دی پھر تیز ہوا کے دوش پر تیر کر فائرنگ کی آواز ابھری۔ وہ سب بری طرح چونکے..... جیسے تھرا کر رہ گئے۔ سفر کے پچھلے تمام دنوں میں یہ پہلی بیرونی آواز تھی جو آج انہیں سنائی دی تھی..... اور یہ بڑی پُرخطر تھی۔

یاور نے تیمور جاہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "لگتا ہے یہ وہی لوگ ہیں جن سے ڈر کر وہ کمینہ جیکب ہمیں یہاں اتار رہا تھا۔ شاید مرا کی پولیس یا پھر سیکیورٹی گارڈز وغیرہ۔"

"ہوسکتا ہے انہوں نے فاصلے سے کشتی میں لگی آگ دیکھ لی ہو۔" تیمور جاہ نے ہانپتی آواز میں کہا۔

"ہمیں تیز چلنا ہوگا۔" یاور بولا۔ "وہ سامنے جو ٹیلا نظر آرہا ہے، اس کی اوٹ میں ہو جائیں تو بچت ہو سکتی ہے۔"

وہ سب حتی الامکان تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔

گھٹنے کی تکلیف کے سبب زخمی سادات بار بار کراہ رہا تھا۔ وہ ٹیلے کی اوٹ میں پہنچے تو انہوں نے خود کو قدرے محفوظ محسوس کیا مگر خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ ہوا تیز ہوتی جا رہی تھی اور ان کے کپڑے بری طرح پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ہوا کے ساتھ اب ریت بھی اڑنے لگی تھی جو سوئیوں کی طرح چہرے پر چبھ رہی تھی۔

نرملا بے ساختہ پکار اٹھی۔ "اف، یہ تو بہت تکلیف دے رہی ہے۔"

جس شال سے پٹیاں پھاڑ کر تیمور نے سادات کے گھٹنے پر باندھی تھیں، اس کا کچھ حصہ ابھی تیمور کے پاس موجود تھا۔ اس کے ذریعے اس نے نرملا کا سر اور چہرہ اچھی طرح ڈھانپ دیا۔ اب ٹیلے کی اوٹ میں ہو جانے کے سبب انہیں سمندر نظر نہیں آرہا تھا مگر یقینی بات تھی کہ وہ جو لوگ بھی ہیں، جلی ہوئی تباہ حال بوٹ کے قریب پہنچ چکے ہیں۔

صحرائی ہوا کے جھکڑ بڑھتے جا رہے تھے۔ یاور نے ایسی ریتیلی آندھیوں کے بارے میں بڑی خوفناک باتیں سن رکھی تھیں۔ بہرحال ابھی تک تو ہوا کی شدت قابلِ برداشت ہی تھی۔

کیا آپ

لبوب مُقوّی اعصاب

کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے، اعصابی کمزوری دور کرنے، تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مقوی اعصاب ٹیلیفون پر باقاعدہ حکیم صاحب سے گفتگو کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں۔ اپنے دوستوں کو بھی ہماری دوائی کا بتائیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

فون دوپہر 2 بجے تا رات 10 بجے تک کریں۔

0301-6690383

0300-6526061

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب، ہم پہنچائیں گے

''ایک کے بعد دوسری گھٹنا (مصیبت)۔'' نرملا نے بری طرح کراہتے ہوئے کہا۔

یاور بولا۔ ''کبھی کبھی مشکل کے اندر کچھ آسانیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ ہوا ہمارے قدموں کے نشان بھی مٹا رہی ہوگی۔ بس یہ دعا کریں کہ یہ مزید تیز نہ ہو۔''

وہ ٹیلوں کے درمیان گرتے پڑتے آگے بڑھتے چلے گئے۔ لگتا تھا کہ یہ دعا کی قبولیت کا وقت نہیں۔ ہوا کی رفتار بڑھتی چلی گئی۔ ریت کی سوئیاں تیکھی ہوتی چلی گئیں۔ انہیں یوں محسوس ہونے لگا کہ ہوا انہیں دھکیل دھکیل کر اوندھے منہ زمین پر گرا دے گی پھر ان سے اٹھنا مشکل ہو جائے گا اور ریت کی تہیں ان پر چڑھ جائیں گی۔

ایک درمیانی عمر کا سینیگالی جس کا نام زید تھا، کچھ تجربہ کار لگتا تھا۔ تیز ہوا کے بالکل آغاز میں ہی اس نے اور اس کے ساتھیوں نے اپنے چہرے اپنے صافوں سے بڑی اچھی طرح ڈھانپ لیے تھے۔ وہ بڑی ہمت سے آگے آگے چل رہا تھا اور ہاتھ کے اشاروں سے یاور وغیرہ کو سمجھا رہا تھا کہ وہ ذرا جھک کر تیز چلنے کی کوشش کریں۔ زخمی سادات کے سبب زیادہ تیز چلنا ممکن نہیں تھا پھر بھی جیسے تیسے وہ آگے بڑھتے رہے۔ زید انہیں ایک ایسے ٹیلے کی اوٹ میں لے آیا جہاں ہوا کی کاٹ کافی کم محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنے سر جھکا کر اور چہرے چھپا کر یہاں نیم دراز ہو گئے۔ خوفزدہ نرملا کو تیمور جاہ نے اپنی بانہوں کے کلاوے میں لے رکھا تھا۔ وہ گاہے بہ گاہے سسکیاں لینے لگتی تھی۔

قریباً ایک گھنٹے کے تند و تیز جھکڑوں کے بعد جب ہوا اور ریت کی رفتار کچھ کم ہوئی تو وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور ایک بار پھر ٹیلوں کی بھول بھلیوں میں آگے بڑھنے لگے۔ اب سورج طلوع ہو چکا تھا مگر گہرے گرد و غبار کے سبب جھٹپٹے کی سی کیفیت تھی۔ ان کے اردگرد زردی مائل ریت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

☆☆☆

.....آج انہیں صحرا میں تیسرا دن تھا۔ یہ ایک طرح ''آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا'' والی صورتِ حال تھی۔ ساحلی گارڈز یا سرحدی پولیس سے بچتے بچتے وہ اس علاقے میں بھٹک گئے تھے۔

جو دو بیگ انہیں جلتی کشتی کے پاس پانی میں تیرتے ملے تھے، ان میں کچھ خشک راشن، بسکٹ اور بھنے چاول وغیرہ موجود تھے۔ کھانے کی کچھ اشیا سینیگالرز کے پاس بھی موجود تھیں، اصل مسئلہ پانی کا تھا جو بہت تھوڑی مقدار میں تھا اور جس کی ضرورت بہت شدید تھی۔ بحر اوقیانوس سے ملحق مغربی صحرا کا یہ علاقہ درجۂ حرارت کے لحاظ سے بھی انوکھا تھا۔ دن کے وقت سورج جیسے سوا نیزے پر آجاتا تھا مگر رات کے وقت خنکی محسوس ہونے لگتی تھی۔ دوپہر کے وقت پانی کی کمی کے سبب ان کی حالت خاص طور پر بہت پتلی ہو جاتی تھی۔ ایسا ایک دو دن تو مزید چل سکتا تھا اس سے زیادہ نہیں۔

زید کا خیال تھا کہ یہیں کہیں آس پاس صحرا کے درمیان سے ایک سڑک گزاری گئی ہے۔ وہ اس سڑک تک پہنچ جائیں تو کوئی شخص انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ان کی مدد کر سکتا ہے یا کوئی اور وسیلہ نکل سکتا ہے۔ سب سے زیادہ تکلیف میں سادات تھا۔ اب بخار اور سر کا زخم تو وہ بھول ہی چکا تھا، اصل مسئلہ پانی کی شدید کمی اور گھٹنے کی تکلیف کا تھا۔ سورج ڈھلنے کے بعد رات ہوئی تو انہیں یوں لگا کہ وہ دوزخ سے برزخ میں آگئے ہیں۔ منہ جو بالکل خشک ہو چکے تھے اور جسم جو گرمی سے تڑخ گئے تھے، قدرے بہتر حالت میں آگئے۔

یاور نے زید سے مشورے کے بعد راشن اور پانی کی مقدار مقرر کر دی تھی تاکہ کم از کم دو دن تو مرتے جیتے گزارے جا سکیں۔

ایک بیگ میں سے چند ادویات بھی نکل آئی تھیں۔ تیمور نے سادات کے گھٹنے کی پٹی بدل دی تھی اور ایک پین کلر بھی اسے دی تھی جس کے سبب اسے نیند آگئی تھی۔ بہت ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ دن بھر کا عذاب جھیلنے کے بعد وہ سب بے دم سے ہو کر لیٹ گئے۔ ٹھنڈی ریت پر کپڑا بچھا کر نرملا اور تیمور جاہ پاس پاس ہی لیٹے ہوئے تھے۔ آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ بہت واضح نظر آتے تھے۔ بہت ٹھہری ہوئی اور خاموش رات تھی..... لیکن وہ جانتے نہیں تھے کہ یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی ہے۔

نرملا نے اپنا ہاتھ تیمور کے ہاتھ میں دے دیا۔ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''کیا یہاں سے بچ کر نکل جائیں گے تیمور؟''

''مجھے لگتا ہے کہ کل تک کہیں نہ کہیں سڑک کے آثار نظر آجائیں گے۔''

''اور اگر نہ آئے تو؟'' وہ بے حد اداسی سے بولی پھر خود ہی کہنے لگی۔ ''اگر کچھ نہ ہو سکا تو پھر ہم سب کے ڈھانچے بھی یہیں کہیں ریت میں دبے پڑے رہ جائیں گے جیسے کل ہم نے ایک اونٹ کا ڈھانچا دیکھا تھا۔''

''اچھی باتیں سوچو نرملا!'' تیمور نے اس کا ہاتھ

pklibrary.com

سہلاتے ہوئے کہا پھر ایک دم موضوع بدلنے کے لیے بولا۔

''اچھا..... ایک بات بتاؤ نرملا! اب تمہارے میرے درمیان کچھ چھپا نہیں رہا۔ تم نے بتایا ہے کہ تمہیں میلانو کے اسمتھ نامی ایک بڑے لارڈ کے پاس ''کیپ'' کے طور پر بھیجا جا رہا تھا۔ اگر وہ اتنا اثر رسوخ والا شخص تھا اور اس نے تمہارے لیے بہت روپیا بھی دیا تھا تو پھر تم ان گھٹیا ایجنٹوں کے ذریعے غیر قانونی طور پر اٹلی کیوں جا رہی تھیں؟''

''تم اسے میری بدقسمتی کہہ سکتے ہو..... اور خوش قسمتی بھی۔'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس نے تیمور کا ہاتھ دلگداز انداز میں دبایا۔

''مگر تم سفری کاغذات کے ساتھ لیگل طریقے سے کیوں نہ گئیں؟''

''میرا کریمنل ریکارڈ تھا۔'' وہ ہولے سے بولی۔ ''میرے ہاتھوں میرا سوتیلا پتا جان سے چلا گیا تھا۔ سمجھو کہ میں نے ہتھیا کر دی تھی اس کی۔'' نرملا نے انکشاف کیا۔

تیمور سکتہ زدہ سا لیٹا رہا۔ نرملا خود ہی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''میرے پتا کے مرنے کے بعد میری ماں نے میرے تحفظ اور میری رکھشا کے لیے ہی دوسری شادی کی تھی مگر جس نے رکھشا کرنا تھی، اسی نے بے آبرو کرنے کی کوشش کی۔ وہ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا منیجر تھا۔ مدراس میں وہی مجھے ماڈلنگ کی طرف بھی لایا پھر ایک وقت ایسا آیا جب اس نے چوری چھپے میری کچھ عریاں تصاویر بنائیں اور ان کے ذریعے ہی مجھے بلیک میل کر کے میرے ساتھ ریپ کرنا چاہا۔ اس نے بلاننگ کے ساتھ میری ماتا کو کہیں بھیج دیا تھا۔ پہلے وہ مجھے آمادہ کرنے کا جتن کرتا رہا پھر مجھ پر پل پڑا۔ میں نے کچن کی چھری سے اس کے پہلو میں وار کیا..... اور اسے گھائل کر کے اپنی ایک دوست کے گھر بھاگ آئی۔ میرا اوچار یہی تھا کہ وہ صرف گھائل ہوا ہے، پر اسی رات پتا چلا کہ وہ مر گیا ہے۔ میں اتنی خوفزدہ ہوئی کہ مدراس سے بھاگ کر ممبئی آ گئی۔'' نرملا کی آواز بھرا گئی اور اس مشکل وقت کو یاد کر کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

..... بوجھل خاموشی کو توڑتے ہوئے تیمور نے پوچھا۔ ''منوہر پرکاش سے تمہاری ملاقات ممبئی میں ہی ہوئی ہوگی؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہ اسی طرح ماڈل گرلز اور عام لڑکیوں کو ماڈل ایسٹ اور اٹلی وغیرہ بھجواتا تھا۔ میرے گرد بھی پولیس کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا میرے ساتھ۔ اس لیے جب پرکاش نے مجھے باہر بھجوانے کی پیشکش کی تو نہ چاہنے کے باوجود میں نے ہامی بھر لی۔ میں ماں سے رابطہ کرنا چاہتی تھی مگر موبائل استعمال نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے ماں کو ایک طویل پتر لکھا۔ ان دکھوں کی شما مانگی جو میرے کارن انہیں مل رہے تھے اور انڈیا چھوڑ دیا۔''

دونوں چپ چاپ لیٹے رہے۔ سادات نیند میں ہی کسی وقت ہولے سے کراہ دیتا تھا۔ بڑے خوبصورت بال تھے اس کے مگر اب خشک خون میں جڑ کر اور گنجلک ہو کر رہ گئے تھے۔ تیمور جاہ کو یادر کے کزن راجا کی یاد آئی جسے وہ سمندر کے نامعلوم ساحل پر سپرد خاک اور سپرد بریت کر کے آئے تھے۔ کبھی کوئی اس کا نشان ڈھونڈنا چاہتا تو وہ بھی نہ مل سکتا..... اور نشان تو ان کا بھی کوئی نہیں تھا جو سمندر کی تہ میں مچھلیوں کی خوراک بن گئے تھے۔ آہ..... کیوں نکلتے تھے نوجوان اپنی زمینوں کو چھوڑ کر گمنام منزلوں کی طرف.....

نرملا کی آواز نے اسے چونکایا۔ ''تم نے مجھ سے تو پوچھ لیا لیکن اپنے بارے میں کچھ خاص نہیں بتایا؟''

''خاص کچھ بھی تو نہیں۔''

''لیکن مجھے کیوں لگتا ہے کہ کچھ خاص ہے۔ مجھے تم بوٹ کے دوسرے مسافروں سے مختلف لگتے تھے اور اب بھی لگتے ہو۔ پتا نہیں کیوں مجھے وشواس نہیں ہوتا کہ تم روزگار کے کھوج میں ہی نکلے ہوئے ہو۔''

''اب میں تمہاری سوچ کا کیا کر سکتا ہوں؟'' اس نے نرملا کے بالوں کی لمبی لٹ جو ہوا کے جھونکے سے اس کے اپنے چہرے تک پہنچ گئی تھی، انگلیوں سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''تم کہتے ہو کہ تم کسی فزیوتھراپسٹ کے ساتھ بطور ہیلپر کام کرتے رہے ہو مگر تم اس طرح کے کام کی نسبت زیادہ پڑھے لکھے ہو اور..... اور.....'' وہ جیسے الجھ کر رہ گئی۔

''دماغ پر زیادہ زور مت دو نرملا! سو جاؤ..... اور..... اپنے ان شرارتی بالوں کو بھی ذرا سنبھالو۔'' اس نے بال پھر اپنے چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

وہ ہلکے پھلکے دلگداز لہجے میں بولی۔ ''میں کیا کروں، یہ خود بخود ہی تمہاری طرف آتے ہیں اور.....'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

''کیا کہنے لگی تھیں؟''

اس نے کروٹ بدل کر اپنے ہونٹ تیمور کے شانے سے لگائے اور بولی۔ ''میرے یہ بال ہی نہیں، میرا یہ دل..... یہ شریر سب ہی تمہاری طرف آتا ہے۔'' اس کی

pklibrary.com

سانس بھاری ہو رہی تھی۔ اس کا گھٹنا تیمور کی ٹانگ سے ٹکرا رہا تھا پھر اس نے سر اٹھا کر دائیں بائیں دیکھا۔ تھکے ہارے اور نڈھال سب سو رہے تھے۔ وہ عجب وارفتگی سے تیمور کے چہرے پر جھک گئی۔

..... چند سیکنڈ اسی طرح گزرے، پھر تیمور کو کچھ سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس کے چہرے کو نرملا کے بالوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس نے آہستگی سے نرملا کو پیچھے ہٹایا اور گردن اٹھا کر اس رخ پر دیکھا جہاں زید کے علاوہ دوسرے سینٹگالرز ایک ریتیلے ابھار کی دوسری جانب موجود تھے۔ تیمور نے دیکھا کہ زید کسمسایا ہے اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا ہے۔ اس کا رخ دوسری جانب تھا۔

''کیا ہوا تیمور؟'' نرملا نے جذبات کے حصار سے نکلتے ہوئے سرگوشی کی۔

تیمور نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا کہا اور ساتھ ہی زید کی جانب اشارہ کیا۔

وہ اب اٹھ کر اکڑوں بیٹھ گیا تھا اور کسی چوکنے جانور کی طرح گردن پھیر کر دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ نرملا اور تیمور نے اپنے درمیان تھوڑا سا فاصلہ بنالیا اور زید کی طرف دیکھنے لگے۔ رخ دوسری جانب ہونے کی وجہ سے اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن لگتا ایسے ہی تھا جیسے وہ ہوا میں کچھ سونگھ رہا ہو۔

.....اور یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ کل شام کے بعد بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ جب وہ کچھ دیر کے لیے رکے تھے، زید اچانک گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا تھا اور بڑے تجسس سے چاروں طرف دیکھنے لگا تھا۔ اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے مادر تاثرات سے یوں لگتا تھا جیسے وہ کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہے۔ تیمور نے اس سے پوچھا تھا کہ کیا ہے؟ وہ بہت کم بولتا تھا۔ تیمور کے سوال پر اس کے دہقانی چہرے پر کئی سلوٹیں ابھری تھیں۔ عربی سے ملتی جلتی زبان میں اس نے چند نا قابلِ فہم جملے بولے تھے اور اشاروں کی زبان میں اسے بتایا تھا کہ اسے اپنے اردگرد کسی کی موجودگی کا احساس ہوا ہے۔

آج پھر ویسا ہی منظر تھا۔ یکا یک زید پلٹا اور ریت پر دوڑتا ہوا تیمور کی طرف آیا۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا اور قریبی ٹیلے کی طرف اشارے کر رہا تھا۔ گھنگرالے بالوں کے نیچے اس کی گہری سانولی پیشانی پر سلوٹیں ہی سلوٹیں تھیں۔ اس کے تینوں ساتھی بھی بہت ٹھٹکے ہوئے نظر آتے تھے۔ یاور اور زخمی سادات بھی جاگ گئے۔

''کیا ہوا؟'' یاور نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

''اس کا خیال ہے کہ ہمارے آس پاس کوئی موجود ہے۔'' تیمور نے پھٹے پرانے دیہاتی لباس والے زید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ یاور جواب میں کچھ کہتا، ٹیلے کے پیچھے اچانک روشنی دکھائی دی پھر دو سائے دوڑتے ہوئے ان کی طرف آئے۔ یہ دیکھ کر تیمور اور یاور بے طرح چونکے کہ ایک سائے کے پاس گن کی موجودگی ظاہر ہو رہی تھی۔ جو روشنی نظر آئی تھی وہ ٹارچ کی تھی اور گن بھی اسی ٹارچ والے کے پاس تھی۔

چند لمحے میں تیمور کے ذہن میں کئی سوال ابھرے اور اوجھل ہوئے۔ اس نے کہیں سن رکھا تھا کہ اس ''ویسٹرن صحارا'' میں اجنبیوں کا سفر کرنا خطرات سے خالی نہیں ہوتا۔ اس ویرانے میں کئی جگہوں پر فاسفیٹ کے ذخائر پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے مقامی لوگوں اور مراکشی حکام میں جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بدامنی کی کئی وجوہات تھیں۔ پہلا خیال تیمور کے ذہن میں یہی آیا تھا کہ شاید یہ کسی ایسے ہی متحارب گروہ کے افراد ہیں لیکن ان کے قریب آنے پر جو کچھ سامنے آیا، وہ جہاں بے حد حیران کن تھا، وہاں ان سب کے لیے بہت لرزہ خیز بھی۔

ٹارچ کے عقب سے جو آواز ابھری، وہ ان کے لیے کچھ جانی پہچانی سی تھی۔ ''ہاتھ اوپر اٹھاؤ..... ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔'' گرج کر کہا گیا۔

ان پر عقدہ کھلا کہ طاقتور آٹومیٹک رائفل ہاتھ میں لیے ان کے سامنے جو شخص کھڑا ہے، وہ کوئی اور نہیں جیکب ہے۔ قاہرہ کا وہی عیسائی جو آخر میں بوٹ کا انچارج بنا تھا اور ان کے خیال میں بوٹ کے اندر ہی جل کر مر گیا تھا۔ اس کا ایک ساتھی بھی ہاتھ میں ماؤزر لیے اس کے پہلو میں کھڑا تھا۔

ٹارچ کی بکھرتی ہوئی روشنی میں جیکب کا چہرہ معمول سے زیادہ کریہہ نظر آرہا تھا۔ اس کے سر کی ایک جانب کے بال جھلس گئے تھے اور چہرے پر بھی جلنے کے نشانات نظر آرہے تھے۔ اسے دیکھ کر نرملا بے ساختہ تیمور کے عقب میں ہو گئی۔ نرملا کو حرکت کرتا دیکھ کر جیکب زہر خند انداز میں اسی سے مخاطب ہوا۔

''تیرا کیا خیال تھا، تیرے جیسے ہیرے کو اتنی آسانی سے چھوڑ دوں گا؟ مر بھی جاتا تو میری روح تیرے پیچھے آتی۔'' وہ نرملا کے چہرے اور نوخیز جسم پر ٹارچ کی تیز روشنی پھینکتے ہوئے بولا۔

وہ سب نہتے تھے اور دو آتشیں ہتھیار ان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔

(جاری ہے)